افلا یتدبرون القرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

المؤمن ۴۰ — الذّٰریٰت ۵۱

تدبرِ قرآن

— جلد ہفتم —

فہرست

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد ہفتم

تفاسیر

سورۂ مومن (۴۰) ــــ تا ــــ سورۂ ذاریات (۵۱)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور ــــ پاکستان

دیباچہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللہ تدبرِ قرآن کی چھٹی جلد بھی پریس کے حوالہ کی جارہی ہے۔ خدا نے چاہا تو اختتام سال سے پہلے پہلے کتاب قدردانوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔ تفسیر کا کام سورۂ مزمل تک ہوچکا ہے جس کے معنی ہیں کہ ساتویں جلد بھی تیار اور آٹھویں ــــ یعنی آخری جلد ــــ زیرِ تکمیل ہے۔ صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اپنا اندازہ یہ ہے کہ زندگی اور صحت حاصل رہی تو آنے والے سال کے اندر اندر، ان شاء اللہ، اس طویل اور پُر مشقت سفر کی آخری منزل آجائے گی۔

اب چودھویں صدی ہجری بھی قریبِ اختتام ہے۔ کتاب کے ناشر ــــ خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ــــ دل میں یہ ارمان رکھتے ہیں کہ صدی کے اختتام کے ساتھ تدبرِ قرآن کا کام بھی تکمیل کو پہنچ جائے۔ ان کا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں کا قِران ایک مبارک قِران ہوگا اور وہ نئی صدی ہجری کا خیر مقدم تدبرِ قرآن کے مکمل سیٹ کے ساتھ کرسکیں گے۔ ان کے اس مخلصانہ جذبۂ شوق سے مجھے بھی ہمدردی ہے۔ میں نے ان کی دل داری میں کام کی مقدار بھی بڑھادی ہے اور اوقاتِ کار کی پابندی کا بھی خاص طور پر اہتمام کررہا ہوں۔ اگرچہ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا اور جو وہ چاہے گا اسی میں حکمت ہے اور میں اس پر دل سے راضی و مطمئن ہوں لیکن ناشر اور مولف دونوں کے دل میں جو خواہش ہے وہ یہی ہے۔

آخری گروپ کی سورتوں میں، جیسا کہ جلد پنجم کے دیباچہ میں اشارہ کرچکا ہوں، زبان اور نظم کی مشکلیں زیادہ ہیں۔ بعض مقامات میں تعبیرِ مطالب کے لیے اردو میں موزوں الفاظ اور اسلوب نہیں ملتے لیکن الحمدللہ میں پوری دل جمعی سے کام کررہا ہوں۔ محنت تو کرنی پڑ رہی ہے لیکن اب ہر قدم پر منزل قریب آتی جارہی ہے اس وجہ سے بحمداللہ قلم کا حوصلہ اور طبیعت کا نشاط قائم ہے اور امید یہی ہے کہ، ان شاء اللہ، آخر تک یہ قائم رہے گا۔

---

۱ ترتیبِ نو ــــ جلد ہفتم

۲ ترتیبِ نو ــــ جلد ششم

اس دوران میں کتاب کے قدردانوں کے بہت سے خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں جن میں میری توقعات سے بہت بڑھ کر اس خدمت کی تحسین کی گئی ہے۔ میں ان تمام مخلصین کا دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر اصحابِ علم اس خدمت پر مطمئن ہیں تو اس دنیا میں مجھے اس کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ اب صرف یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور میری نجات کا ذریعہ بنے۔ کتاب کے قدردانوں سے التماس ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں میری اس آرزو کو یاد رکھیں۔

رفیقِ عزیز خاور صاحب سلمہٗ کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کو مبارک باد بھی دیتا ہوں کہ جس کام کا انھوں نے بیڑا اٹھایا اس کو نہایت خوبی و نفاست سے انجام دیا۔ اگرچہ وہ اس کوچہ میں نووارد تھے جس کے سبب سے قدردانوں کو مختلف قسم کے اندیشے لاحق ہوئے لیکن جلد پنجم کو دیکھ کر ہر صاحبِ ذوق نے ان کے سلیقہ کی داد دی۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی کتاب کی خدمت کے لیے خاص کرے اور علمِ صحیح اور عملِ صالح کی برکتوں سے نوازے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

رحمان آباد

۱۰۔ نومبر ۱۹۷۸ء

۸۔ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

۴۰

المؤمن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود

گروپ کی پچھلی سورتوں کی طرح اس سورہ کی بنیاد بھی توحید ہی پر ہے۔ قرآن کے دوسرے اصولی مطالب بھی اس میں زیر بحث آئے ہیں لیکن اصلاً نہیں بلکہ ضمناً توحید کے لوازم و مقتضیات کی حیثیت سے آئے ہیں۔

اس کا قرآنی نام حٰمٓ ہے اور یہی نام اس کے بعد کی چھ سورتوں کا بھی ہے۔ یہ ساتوں حوا میم کے نام سے مشہور ہیں اور اپنے ناموں کی طرح اپنے مطالب میں بھی مشترک ہیں۔ یہ تمام سورتیں دعوت کے اس دور سے تعلق رکھنے والی ہیں جب توحید و شرک کی بحث نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر مکہ میں عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا تھا۔ ہجرت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے۔ اب اس میں اور آگے کی سورتوں میں وقت کے یہ حالات بالتدریج نمایاں ہوتے جائیں گے اور ان کے تقاضے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نصرت و حمایت بھی بالکل واضح ہوتا جائے گا۔ جو مسلمان اس وقت حالات سے نبرد آزما تھے ان کی اس میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے، جو خطرات میں تھے ان کو تسلی دی گئی ہے اور جو دعوت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے باوجود، کسی مصلحت سے، اب تک کھل کر اس کی حمایت کے لیے میدان میں نہیں اترے تھے ان کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ مصلحتوں سے بے پروا ہو کر وہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) اس کتاب کی تنزیل اس خدا کی طرف سے ہے جو غالب و مقتدر بھی ہے اور علیم بھی۔ گناہوں کو بخشنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا بھی ہے اور سخت پاداش والا اور صاحبِ قدرت و اختیار بھی۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی کی طرف سب کا لوٹنا اور اسی کے آگے سب کو پیش ہونا ہے۔ اس قرآن کی مخالفت میں کج بحثی وہی لوگ کر رہے ہیں جو جزا و سزا کے منکر ہیں۔ اس وقت اس ملک میں یہ لوگ جو دندنا رہے ہیں اس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ ان سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کی تاریخ سبق آموزی کے لیے کافی ہے۔ ان قوموں نے بھی اسی طرح اپنی کج بحثیوں سے حق

کو پسپا کرنے اور رسولوں کو شکست دینے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ اللہ کے رسول پر ہاتھ ڈالیں ان کو عذاب نے آپکڑا۔ اسی طرح ان متمردین پر بھی اللہ کا قانونِ عذاب صادق ہو چکا ہے اور یہ اپنے طغیان و فساد کی پاداش میں جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

(۷ - ۹) جو لوگ فرشتوں کی سفارش کے بل پر خدا اور اس کے روزِ جزا سے بے پروا بیٹھے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کے مقرب فرشتے خدا کے باغیوں کے سفارشی نہیں ہیں بلکہ وہ ہر وقت خدا کی حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے اور ان اہلِ ایمان کے لیے برابر استغفار کرتے رہتے ہیں جو اپنی گمراہیوں سے توبہ کر کے خدا کے راستہ کی پیروی کریں۔

(۱۰ - ۱۲) قیامت کے دن مشرکین جس طرح اپنے جرم کا اقرار اور خدا سے فریاد کریں گے اور ان کی فریاد کے جواب میں خدا کی طرف سے ان پر جو پھٹکار ہوگی، اس کی طرف اجمالی اشارہ۔

(۱۳ - ۲۰) تمام رحمت اور نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے بندگی اور اطاعت کا حق دار وہی ہے۔ وہ بہت بلند رتبہ اور عالی مقام ہے۔ اس کے بھیدوں سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ قیامت کے دن تنہا وہی مالک ہوگا اور مشرکوں کی سفارش کوئی نہیں کر سکے گا۔

(۲۱ - ۲۲) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں نے توحید کی دعوت دینے والے رسولوں کو جھٹلایا ان پر اللہ کا عذاب آیا اور جب ان پر عذاب آیا تو ان کے مزعومہ شرکاء ان کے کچھ کام نہ آسکے۔ قریش کو تنبیہ کہ یہی حشر تمھارا بھی ہونا ہے اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی۔

(۲۳ - ۵۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا ایک خاص حصہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے صحابہؓ اور قریش کو مندرجہ ذیل امور کی یاددہانی کی گئی ہے۔

- قریش کو یہ تنبیہ کہ قوت و صولت میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے، لیکن جب حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی پاداش میں ان پر عذاب آیا تو کوئی چیز بھی ان کے کام آنے والی نہ بن سکی۔
- نبیؐ اور آپؐ کے صحابہ کو یہ یاددہانی کہ دعوتِ حق کے مخالفین کے ہاتھوں جو آزمائشیں پیش آرہی ہیں، صبر و عزیمت کے ساتھ، ان کو برداشت کرو۔ اگر تم اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہے تو بالآخر کامیابی تمہی کو حاصل ہوگی۔
- اس سرگزشت کے ذیل میں خاندانِ فرعون کے ایک مردِ مومن کا کردار بھی بیان ہوا ہے، جو قریش کے لیڈروں کے لیے بھی نہایت سبق آموز ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی نہایت ہمت افزا ہے جو دعوتِ حق سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اب تک اس کے اظہار و اعلان میں ہچکچا رہے تھے۔

(۵۶ - ۶۵) توحید اور قیامت کے آفاقی و انفسی دلائل کا حوالہ۔ قریش کو نہایت کھلے الفاظ میں انذار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ سے نہایت قطعی الفاظ میں فتح و نصرت کا وعدہ۔

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ (۴۰)

مَکِّیَّۃٌ ——— اٰیات : ۸۵

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۲۲

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝۲ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ۝۳ مَا یُجَادِلُ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ اِلَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَا یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُہُمْ فِی الْبِلَادِ ۝۴ کَذَّبَتْ قَبْلَہُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِہِمْ ۪ وَہَمَّتْ کُلُّ اُمَّۃٍۭ بِرَسُوْلِہِمْ لِیَاْخُذُوْہُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُہُمْ ۟ فَکَیْفَ کَانَ عِقَابِ ۝۵ وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّہُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶ ۘ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقف لازم

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَکَ وَقِہِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝۷ رَبَّنَا وَاَدْخِلْہُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ۣ الَّتِیْ وَعَدْتَّہُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِہِمْ وَاَزْوَاجِہِمْ وَذُرِّیّٰتِہِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝۸

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَهٗ ؕ
وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ
اللّٰهِ اَكۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَى الۡاِيۡمَانِ
فَتَكۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ وَاَحۡيَيۡتَنَا اثۡنَتَيۡنِ
فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمۡ
بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِىَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ ۚ وَاِنۡ يُّشۡرَكۡ بِهٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ
فَالۡحُكۡمُ لِلّٰهِ الۡعَلِىِّ الۡكَبِيۡرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ
لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنۡ يُّنِيۡبُ ﴿۱۳﴾ فَادۡعُوا
اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ رَفِيۡعُ
الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ يُلۡقِى الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ
مِنۡ عِبَادِهٖ لِيُنۡذِرَ يَوۡمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ۙ يَوۡمَ هُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۚ لَا
يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡهُمۡ شَىۡءٌ ؕ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ؕ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ
الۡقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ ؕ لَا ظُلۡمَ الۡيَوۡمَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۷﴾ وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ
اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ
وَّلَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾ؕ يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾
وَاللّٰهُ يَقۡضِىۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا يَقۡضُوۡنَ
بِشَىۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ﴿۲۰﴾ اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا

فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِىٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

ترجمۂ آیات ۱-۲۲

یہ حٰمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و علیم کی طرف سے ہے، جو گناہوں کو بخشنے والا، توبہ کو قبول کرنے والا، سخت پاداش اور بڑی قدرت والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱-۲

اللہ کی ان آیات میں وہی لوگ کج بحثیاں کر رہے ہیں جو جزا کے منکر ہیں۔ تو ملک میں ان کا دندنانا تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے تکذیب کی اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی اور ہر امت نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ذریعہ سے کج بحثیاں کیں تاکہ اس سے حق کو پسپا کر دیں تو میں نے ان کو دھر لیا تو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا! اور اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جنھوں نے کفر کیا ہے۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۴-۶

جو عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے ارد گرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اس کی حمد کے ساتھ، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جو توبہ کریں اور تیرے راستہ کی

پیروی کریں اور ان کو عذاب جہنم سے بچا۔ اور اے ہمارے رب! ان کو ہمیشگی کے ان باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ اور ان کو بھی جو ان کے آباء اور ازواج و ذریات میں سے جنت کے لائق ٹھہریں۔ بے شک عزیز و حکیم تو ہی ہے۔ اور ان کو بُرے نتائجِ اعمال سے بچا اور جن کو تو نے اس دن بُرے نتائج سے بچایا تو وہی ہیں جن پر تو نے رحم فرمایا۔ اور یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ ۷-۹

اور جنھوں نے کفر کیا ان کو منادی کی جائے گی کہ خدا کی بیزاری تم سے اس کی نسبت سے کہیں زیادہ رہی ہے جتنی تم کو اس وقت اپنے سے ہے جب کہ تم کو ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے۔ وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! تو نے ہم کو دوبار موت دی اور دوبارہ زندگی دی تو ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا تو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے! یہ انجام تمھارے سامنے اس وجہ سے آیا کہ جب اللہ واحد کی دعوت دی جاتی تو تم اس کا انکار کرتے اور اگر اس کے شریک ٹھہرائے جاتے تو تم مانتے۔ تو اب فیصلہ خدائے بلند و عظیم ہی کے اختیار میں ہے۔ ۱۰-۱۲

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔ اور یاددہانی نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اللہ ہی کو پکارو اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ، کافروں کے علی الرغم۔ وہ بلند درجوں والا اور عرش کا مالک ہے۔ وہ ڈالتا ہے روح، جو اس کے امر میں سے ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو روزِ ملاقات سے آگاہ کر دے۔ جس دن وہ خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوں گے۔ ان کی کوئی چیز بھی خدا سے مخفی نہیں ہوگی۔ آج کی بادشاہی کس کے اختیار میں ہے!

خدائے واحد و قہار کے اختیار میں! آج ہر جان کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ ۱۶-۱۷

اور ان کو قریب آ لگنے والی آفت سے ڈرا جب کہ دل حلق میں آ پھنسیں گے اور وہ غم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کا نہ کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کی بات سنی جائے۔ وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کو بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے۔ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔ ۱۸-۲۰

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں! وہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے قوت میں بھی اور ان آثار کے اعتبار سے بھی جو انھوں نے زمین میں چھوڑے۔ پس اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑا اور کوئی ان کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا نہ بنا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آتے تھے تو انھوں نے انکار کیا پس اللہ نے ان کو پکڑ لیا، بے شک وہ طاقتور اور سخت پاداش والا ہے۔ ۲۱-۲۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۱-۳)

تمام حوامیم نام کی طرح مزاج میں بھی بالکل یکساں ہیں

'حٰمٓ' اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ حروف مقطّعات پر مفصل بحث سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ بس اتنی بات یہاں یاد رکھیے کہ یہ سورہ اور اس کے بعد کی تمام مکی سورتیں، جو اس گروپ میں شامل ہیں، سب اسی نام سے موسوم بھی ہیں اور سب کا مزاج بھی بالکل یکساں ہے۔

مخالفین پر امتنان اور ان کو تنبیہ

'تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ...... الاٰیۃ': یہ قرآن کے مخالفین پر امتنان بھی ہے اور ان کو تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نہایت اہتمام سے جو اتاری ہے تو اس لیے اتاری ہے کہ لوگ اس کی قدر کریں، اس سے ہدایت حاصل کریں اور اپنے رب کے اس اہتمام کے شکرگزار ہوں جو ان کی ہدایت کے لیے اس نے کیا ورنہ یاد رکھیں کہ جس نے یہ کتاب اتاری ہے وہ 'عزیز' بھی ہے اور علیم بھی۔ 'عزیز' ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ وہ مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں ہر سزا دے سکتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں بن سکتا۔ 'عزیز' ہونے کے ساتھ ساتھ وہ علیم بھی ہے اس وجہ سے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کتاب کی تنزیل سے جو کشمکش برپا ہوئی ہے وہ کس مرحلہ میں ہے، اس کے پیش کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اور اس کی مخالفت کرنے میں جو لوگ پیش پیش ہیں ان کے ارادے کیا ہیں، وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں اور کب ان کا ہاتھ پکڑا جانا ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ خدائے عزیز و علیم کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے اس وجہ سے اس کی موافقت بھی بڑی اہمیت رکھنے والی بات ہے اور اس کی مخالفت کے نتائج بھی نہایت سنگین اور دُور رس ہیں۔

'غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ-الاٰیۃ'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید صفات بیان فرمائیں کہ وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا بھی ہے اور سخت پاداش والا اور بڑی قدرت والا بھی۔ 'طَوْل' کے معنی فضل، غنیٰ، قدرت اور بخشش کے ہیں۔ یہاں تقابل کے اصول کو پیش نظر رکھ کر میں نے قدرت کے معنی کو ترجیح دی ہے۔

فیصلہ کن مرحلہ

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں قسم کی صفات سے متصف اور دونوں طرح کے اختیارات کا مالک ہے تو اس کتاب کی تنزیل کے بعد ہر شخص کے لیے راہ کھلی ہوئی ہے کہ وہ یا تو اس کو قبول کر کے خدا کی رحمت و مغفرت کا امیدوار بن جائے یا اس کی مخالفت کر کے اس کے عذاب اور اس کی قدرت کی شان کے ظہور کا انتظار کرے۔

'لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ'۔ یعنی اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے تو وہ اپنی اس غلط فہمی کی اصلاح کرے۔ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ قیامت کے دن سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے اور سب کے معاملات کا فیصلہ وہی فرمائے گا، نہ کسی اور کی طرف لوٹنا ہو گا نہ کوئی اور خدا کے اذن کے بغیر کسی کے لیے سفارش کر سکے گا۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴)

'اٰيٰتِ اللّٰهِ' سے مراد اس کتاب کی آیات ہیں جس کی تنزیل کا ذکر اوپر آیت ۲ میں ہوا ہے۔ یہاں اس کو 'اٰيٰتِ اللّٰهِ' سے تعبیر کر کے اس کے دلیل و حجت ہونے کے پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اس عذاب کے منکر تھے جس سے قرآن آگاہ کر رہا تھا۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ کے رسولوں نے جب اپنی قوموں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے اس کو بالکل جھوٹ جانا اور اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر رسول کے اس انذار کی تکذیب کی اور اس کا مذاق اڑایا۔

انذار کی تکذیب کرنے والوں کو تنبیہ

اس آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ آج قرآن کی مخالفت میں جو کج بحثیاں کر رہے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو اس کے انذارِ عذاب کے منکر ہیں۔ ان کے کبر پر یہ چیز بہت شاق گزر رہی ہے کہ انھوں نے اس کتاب اور اس کے لانے والے کا انکار کیا تو ان پر کوئی عذاب آ جائے گا۔ وہ یہ بات اپنی رعونت کے سبب سے ماننی نہیں چاہتے اور ظاہری حالات کے اعتبار سے وہ اپنے کو کامیاب و خوش حال دیکھ رہے ہیں اس وجہ سے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ان کی موجودہ خوش حالی سے کسی کو مغالطہ نہ ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی قوموں کو عین ان کے دورِ عروج و اقبال میں پکڑ لیا اور وہ اس کی پکڑ سے اپنے کو بچا نہ سکیں۔

'فَلَا یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُھُمْ فِی الْبِلَادِ' میں خطاب اگرچہ، ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو زجر و عتاب ہے اس کا رُخ قریش کے متکبرین کی طرف ہے جو اپنے اقتدار اور اپنی سیادت و امارت کے گھمنڈ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان پر کوئی عذاب آنے والا ہے۔ وہ قرآن کی بار بار کی تنبیہ پر حیران تھے کہ بھلا ان پر عذاب کیوں اور کدھر سے آئے گا!

'تَقَلُّبٌ' کے معنی چلت پھرت اور آزادانہ آمد و شد کے ہیں۔ موقع و محل سے اس کے اندر غرور و تکبر کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْأَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍۭ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ ۖ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۵)

مذکورہ دعوے پر تاریخ سے دلیل

یہ اوپر والی بات 'فَلَا یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُھُمْ فِی الْبِلَادِ' کی دلیل تاریخ سے پیش کی گئی ہے کہ ان سے (قریش سے) پہلے قوم نوح اور ان کے بعد آنے والی قوموں (اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف ہے) نے بھی اسی طرح اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور ہر قوم نے اپنے رسول کو پکڑ لینا چاہا اور اپنی کٹ حجتیوں سے اس کے حق کو پسپا کرنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ رسول پر ہاتھ ڈالیں اللہ نے انھیں کو پکڑ لیا، پھر دیکھو کہ خدا نے ان کے عمل کی پاداش میں ان کو کیسا سخت پکڑا! اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' جو بیان فرمائی ہے یہ اس کی شہادت پیش کی گئی ہے اور عذاب کے لیے لفظ 'عقاب' جو یہاں آیا ہے اس سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے متمردین پر جو عذاب بھیجتا ہے

وہ ان کے اعمال کا قدرتی ردِ عمل ہوتا ہے۔ وہ ہرگز ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان کے انجام سے عبرت تو پکڑنی چاہیے لیکن وہ ہمدردی کے مستحق ہرگز نہیں ہوتے۔

قریش کو ایک بروقت تنبیہ

اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش کے لیڈر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مشورے کرنے لگے تھے۔ قرآن نے ان کو آگاہی دے دی کہ اگر وہ اس قسم کا کوئی اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے نتائج پر دور تک نگاہ ڈال لیں! اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے لیے جو تسلی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۶)

'کَلِمَۃُ رَبِّ' سے وہی کلمۃ العذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۂ زمر کی آیت ۷۱ میں گزر چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ کلّی فیصلہ جس سے اس نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا کہ جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی کریں گے، اللہ ان سب کو جہنم میں بھر دے گا۔ فرمایا کہ تیرے رب کا یہ فیصلہ جس طرح پچھلی قوموں پر صادق آیا اسی طرح ان کافروں (کفارِ قریش) پر بھی صادق آ چکا ہے اور یہ بھی انہی کی طرح جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنا فرض انجام دو۔ ان کے لیے جو انجام مقدر ہو چکا ہے یہ اس سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب چونکہ جہنم کا دیباچہ ہے اس وجہ سے عذاب کو تعبیر جہنم سے کیا۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۷-۹)

فرشتوں کی حیثیت کی وضاحت

اب یہ فرمایا کہ اگر ان لوگوں کو فرشتوں کی سفارش اور ان کی مدد پر بھروسہ ہے اور ان کے بل پر یہ پیغمبر کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں تو ان کا حال یہ لوگ کان کھول کر سن لیں کہ عام فرشتے تو درکنار، خدا کے جو خاص مقرب فرشتے ہیں یعنی حاملینِ عرش اور ان کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے، وہ بھی برابر خدا کی خشیت سے لرزاں و ترساں اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔

'وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' وہ الوہیت کے کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندوں کی طرح اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

'وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' اور ان لوگوں کے لیے جو خدا پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ برابر

استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت دونوں کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ گویا یہی استغفار ان کی سفارش ہے اور یہ اہل ایمان کے لیے مخصوص ہے۔

فرشتوں کی اس خشیت اور اہل ایمان کے لیے ان کے استغفار کا ذکر سابق سورہ کی آخری آیت میں بھی گزر چکا ہے اور سورۂ شوریٰ میں بھی بدیں الفاظ آیا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ	اور خدا کی خشیت و جلال سے قریب ہے کہ
فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ	آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب
رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي	کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار
الْاَرْضِ ...... (الشوریٰ: ۵)	کرتے رہتے ہیں۔

فرشتوں کی اس خشیت کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ خدا کے اتنے چہیتے اور اس پر اتنا زور و اثر رکھنے والے ہیں کہ اپنے پجاریوں پر وہ کسی حال میں بھی خدا کو ہاتھ ڈالنے نہیں دیں گے وہ اس حقیقت سے باخبر ہو جائیں کہ فرشتے اس قسم کے کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ وہ ہر وقت خدا کے آگے سرفگندہ اور اس کے قہر و غضب سے پناہ مانگتے رہنے والے ہیں۔

فرشتوں کی سفارش کی نوعیت

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔ یہ فرشتوں کے استغفار کی وضاحت ہے کہ وہ کوئی بات اپنے رب سے ناز و تدلل کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے علم ہی کے حوالہ کرتے ہیں کہ تیری رحمت بھی ہر چیز پر حاوی ہے اور تیرا علم بھی ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے تو ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو تیری رحمت اور علم کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ اس عقیدے کے ساتھ وہ ان لوگوں کے لیے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں جو اپنی غلطیوں سے توبہ کرلیں اور ان کی اصلاح کرکے اللہ کے رستہ کے پیرو بن جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے دعا اور سفارش تو برابر کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی دعا اور سفارش ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی جاہلیت کی بدعقیدگی و بدعملی سے توبہ کرکے اللہ کے رستہ کے پیرو بن جائیں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو اس کے رسول اور اس کے دین کے دشمن ہیں۔

فرشتے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جنت توبہ اور اصلاح سے حاصل ہوگی

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یہ اسی استغفار کی مزید تفصیل ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے جنت کی دعا کرتے ہیں جو توبہ اور اصلاح کرکے اس کا حق پیدا کر لیتے ہیں اور جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ نیز وہ ان کے آباء، ازواج اور ذریات میں سے بھی صرف ان لوگوں کے لیے دعا کرتے ہیں جو توبہ و اصلاح سے

اس کے لیے استحقاق پیدا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجرد کسی کے طفیل اور کسی کے نسب و خاندان کی بنا پر کسی کو جنت حاصل ہونے والی نہیں ہے بلکہ جس کو بھی حاصل ہوگی اس کے استحقاق اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوگی۔

'اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ' یہ بعینہٖ وہی کلمۂ شفاعت ہے جو مائدہ کی آیت ۱۲۰ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے یعنی تو جو چاہے کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی تو حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہی کرے گا جو عدل و حکمت پر مبنی ہوگا۔ فرشتوں کا یہی استغفار درحقیقت اہل زمین کے لیے سفارش ہے اور اس کی نوعیت یہی ہے جو قرآن نے بیان فرمائی ہے نہ کہ وہ جو جاہلوں نے سمجھی ہے۔

'وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ ط وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ط وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ'۔ لفظ 'سَیِّاٰت' یہاں نتائج سیئات کے معنی میں ہے۔ عمل اور نتیجہ کے لزوم کو ظاہر کرنے کے لیے بعض اوقات فعل نتیجۂ فعل کے مفہوم میں بولتے ہیں یعنی فرشتے اہل ایمان کے لیے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے رب، تو ان کو بدیوں کے نتائج سے محفوظ رکھ۔ یعنی ان کے گناہوں کو جھاڑ دے کہ وہ ان کے شر سے محفوظ رہیں۔

'وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ ..... الآیۃ' فرشتوں کے اس فقرے سے روز حساب و کتاب کی ہولناکی کا اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کی نگاہوں میں اصلی خوش قسمت وہ ہے جس کو اللہ نے اس دن اس کے گناہوں کے نتائج سے محفوظ رکھا۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہے اور اصل خوش بخت وہی ہے جس نے یہ کامیابی حاصل کی۔

فرشتوں کے اس استغفار کے بیان سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ واضح کرنا ہے کہ فرشتے اہل زمین کے لیے سفارش تو ہر وقت کر رہے ہیں لیکن ان کی سفارش کی نوعیت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے نہ کہ وہ جس کے بل پر لوگ آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں اور جب ان کو اصل حقیقت کی یاددہانی کی جاتی ہے تو مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَی الْاِیْمَانِ فَتَکْفُرُوْنَ (۱۰)

اصل صورت حال جس سے جھوٹی شفاعت پر تکیہ کرنے والوں کو سابقہ پیش آئے گا

یعنی یہ لوگ تو امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کے سفارشی ان کو اللہ کے ہاں اونچے سے اونچے درجے دلوائیں گے لیکن وہاں ان کو منادی کے ذریعہ سے یہ آگاہی دی جائے گی کہ آج جتنا غم و غصہ تم کو اپنی بدبختی و محرومی اور اپنے لیڈروں کی کج اندیشی و ضلالت پر ہے اس سے زیادہ تمہارے حال پر غصہ و غضب خدا کو اس وقت تھا جب کہ تم کو رسول کے ذریعہ سے ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم نہایت رعونت کے ساتھ دعوت کو

ٹھکراتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اپنی اس رعونت اور خدا کے اس غصہ و غضب کا انجام بھگتو اور اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹو۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ جو کچھ تمہارے سامنے آیا ہے اللہ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آیا ہے اس وجہ سے تم اسی کے سزاوار ہو۔

'اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ' ظرف ہے 'لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ' کا۔ 'ایمان' سے خاص طور پر توحید پر ایمان مراد ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ سورۂ زمر آیت ۴۵ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ منکرینِ آخرت کو سب سے زیادہ چڑ توحید کی دعوت سے ہے۔ یہاں بھی آگے والی آیت میں وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ غصہ ان پر اس وجہ سے ہو گا کہ جب ان کو توحید کی دعوت دی جاتی تو اس سے بدکتے اور شرک کو بڑی خوش دلی سے قبول کرتے۔ 'ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ' (۱۲) (یہ سب تمہیں اس وجہ سے پیش آیا کہ جب اللہ واحد کی دعوت دی جاتی تو تم اس کا انکار کرتے اور جب اس کے شریک ٹھہرائے جاتے تو تم مانتے تو اب تو فیصلہ خدائے بلند و عظیم ہی کے اختیار میں ہے)۔

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (۱۱)

اقرار بعد از وقت

اس وقت یہ لوگ بڑی سعادت مندی اور بڑی صفائی کے ساتھ کہیں گے کہ اے رب، اب ہم اپنے تمام جرائم کا اقرار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ناممکن تھا اس وجہ سے ہم تیرے مواخذہ و محاسبہ سے بے خوف ہو کر تیرے رسول اور اس کی دعوت کا مذاق اڑاتے رہے لیکن اب تو نے ہمیں دو بار موت اور دو بار زندگی دے کر موت کے بعد کی زندگی کا اچھی طرح مشاہدہ کرا دیا تو کیا اب اس کی بھی کوئی سبیل ہے کہ اس دوزخ سے ہمیں نکلنا نصیب ہو کہ ہم از سرِ نو دنیا میں جا کر ایمان اور عمل صالح کی زندگی بسر کریں! 'دو بار موت' سے ایک تو وہ حالتِ موت مراد ہے جو اس دنیا میں وجود پذیر ہونے سے پہلے انسان پر طاری ہوتی ہے اور دوسری وہ موت ہے جس سے ہر زندہ کو لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح زندگی ایک تو وہ ہے جو اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہ جو قیامت کو حاصل ہو گی۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب دلوایا جائے گا کہ یہ جو کچھ تمہیں پیش آیا تمہاری اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ تمہیں توحید کی دعوت دی جاتی تو تم اس سے بدکتے اور شرک کے تم بڑے حامی بنے رہے تو اب فیصلہ خدائے برتر و عظیم ہی کے اختیار میں ہے اور اس کا فیصلہ تمہارے حق میں یہی ہے جس سے تم دوچار ہو۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ (۱۳)

رحمت اور عذاب دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے

یعنی رحمت اور نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اس وجہ سے ڈرنا بھی اسی سے چاہیے اور امید بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔ وہ اپنی ان دونوں شانوں کا برابر مشاہدہ کراتا رہتا ہے۔ وہی آسمان سے رعد و برق اور صاعقہ کا بھی مشاہدہ کراتا رہتا ہے اور وہی بارش بھی نازل کرتا ہے جو زمین کے تمام رزق و فضل کے دروازے کھولتی ہے۔ یہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک ہی خدا کے تصرف میں ہیں اور اس کے ہاتھ میں صاعقۂ عذاب بھی ہے اور رزق و فضل کے خزانے بھی۔

نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اصل شے توجہ ہے

'وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ' یعنی خدا کی یہ شانیں لوگوں کو تعلیم و تذکیر کے لیے ظاہر تو برابر ہوتی رہتی ہیں لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کا انحصار اس بات پر ہے کہ آدمی کے اندر متوجہ ہونے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر اپنی خواہشوں کے پیچھے کوئی ایسا اندھا بن جائے کہ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز کی طرف دیکھنے اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ اس کے اندر پایا ہی نہ جاتا ہو تو ایسے شخص کی آنکھیں کوئی بڑی سے بڑی نشانی بھی نہیں کھول سکتی۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۱۴)

اہل ایمان کو دعوتِ عزم

یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ مشرکین آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور تمہاری دعوتِ توحید سے یہ چڑتے اور تم سے لڑتے ہیں تو اب ان کی کوئی پروا نہ کرو بلکہ ان کے علی الرغم تم اپنے رب ہی کو بلا شرکت غیرے پکارو اور خالص اطاعت کے ساتھ اسی کی بندگی کرو۔

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵)

یعنی اللہ تعالیٰ بڑے بلند درجات والا اور تمام کائنات کے عرشِ حکومت کا مالک ہے۔ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ یہ مشرکین جن کو اس کا شریک و سہیم اور اس کا مقرب بنائے بیٹھے ہیں، یہ سب ان کے خود تراشیدہ مقربین ہیں، خدا کی بارگاہِ بلند سب کی پہنچ سے بالا ہے۔

خدا کی مرضیات کے علم کا واحد ذریعہ وحی ہے

'یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ'۔ 'رُوْح' سے مراد یہاں 'وحی' ہے۔ وحی کو 'رُوح' سے تعبیر کرنے کی وجہ واضح ہے کہ جس طرح روح سے جسم کو زندگی حاصل ہوتی ہے اسی طرح وحی سے انسان کی عقل اور اس کے دل کو زندگی، حرارت اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے"۔ 'مِنْ اَمْرِهٖ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ وحی امورِ الٰہیہ میں سے ہے جس کی پوری کیفیت و ماہیت ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، اس کی کیفیت وہی سمجھتا ہے جو اس کو نازل

کرتا ہے یا پھر وہ سمجھتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہی حقیقت دوسرے مقام میں یوں واضح فرمائی ہے کہ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (الاسرآء : ۸۵) وہ تم سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں، کہہ دو، روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو علم نہیں دیا گیا ہے مگر تھوڑا) سورۂ اسرآء کی مذکورہ آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

یہاں اس ٹکڑے کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ خدا کی بارگاہِ بلند تک کسی جن و بشر کی رسائی نہیں ہے کہ وہ اس کے غیب سے واقف ہو سکے۔ اس کی مرضیات جاننے کا واحد ذریعہ صرف وہ وحی ہے جو وہ اپنے بندوں میں سے اس پر نازل فرماتا ہے جس کو اس کارِ خاص کے لیے انتخاب فرماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے اپنے زعم کے مطابق غیب کے جاننے کے جو ذرائع ایجاد کر رکھے ہیں وہ بالکل لایعنی ہیں۔ خدا کی پسند و ناپسند جاننے کا ذریعہ بس وحی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر نازل فرماتا ہے لیکن بہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے لانے والے کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کو زعم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنانے والا ہوتا تو ان میں سے کسی کو رسول بناتا۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ اس منصب کے لیے اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے منتخب فرماتا ہے اور وہ جس کو منتخب فرماتا ہے وہی اس کا اہل ہوتا ہے؛ ہر مدعی اس کا اہل نہیں ہوتا۔

'لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ'۔ 'يَوْمَ التَّلَاقِ' سے مراد روزِ قیامت ہے اس لیے کہ اس دن سب کی پیشی خدا کے آگے ہونی ہے۔ وحی اور رسالت کا مقصود دراصل اسی دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔ اصل مسئلہ جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے یہی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائے تو دوسرے تمام مسائل کو سمجھنے کے لیے راہ کھل جاتی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو انسان کا کوئی قدم بھی صحیح سمت میں نہیں اٹھ سکتا۔ اس وجہ سے انبیاء کرام کا اصل مشن اسی منزل کی رہنمائی رہا ہے۔

يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۶)

نہ خدا سے کوئی چیز مخفی ہوگی اور نہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہوگا

اس دن ہر شخص کا سارا ظاہر و باطن خدا کے آگے بالکل بے نقاب ہوگا۔ کسی کی کوئی بات بھی اس سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہوگی کہ کسی گواہی و ثبوت کی ضرورت پیش آئے یا کوئی غلط بیانی کر سکے یا کوئی اپنے کسی جرم کو چھپا سکے یا اس کی کوئی غلط تاویل کر سکے یا کوئی اس کے باب میں کوئی جھوٹی سفارش کر سکے۔

'لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ' یعنی اس وقت جب کہ ہر شخص خدا کے آگے بالکل بے نقاب اور بے بس ہوگا مجرموں سے خطاب کر کے پوچھا جائے گا کہ اب بولو، آج بادشاہی کس کی ہے؟ تم جن کو خدا کا شریک و سہیم

بنائے بیٹھے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ تم کو خدا سے بچا لیں گے، وہ کہاں گئے؟

'لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ' چونکہ اس وقت کسی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہو گا اس وجہ سے خود ہی جواب دیا کہ آج کے دن بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار کی ہے۔ یہاں نہ کوئی کسی کا یار و مددگار بن سکے گا اور نہ کوئی خدا کے کسی فیصلہ کو بدلوا سکے گا۔ لفظ 'قَهَّار' کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۷)

یعنی آج کا دن خدا کے عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج ہر شخص کو اس کے اپنے عمل کا بدلہ ملے گا۔ کسی کی کوئی حق تلفی یا کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی اور یہ سارا کام چشم زدن میں ہو گا۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں بڑی مدت صرف ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ بڑی جلدی حساب چکا دینے والا ہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ڛ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۱۸)

لفظ 'ازفۃ' کا مفہوم

'اٰزِفَة' کے معنی وہ چیز جو قریب آ لگی ہو۔ یہاں یہ لفظ قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس صفت کے استعمال سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ قیامت کو بہت بعید نہ سمجھو، وہ بالکل پاس ہی کھڑی ہے۔ 'مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ' (جو مرا اس کی قیامت آ گئی) قیامت کے دن اس فاصلہ کا کسی کو بھی احساس نہیں ہو گا جو اس کے اور قیامت کے درمیان حائل ہے، بلکہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر شخص کی قیامت میں بس اتنے ہی دن باقی ہیں جتنے دن اس دنیا میں اس کی زندگی کے باقی ہیں۔ جس طرح ہر شخص کی موت اس کے پہلو میں کھڑی ہے اسی طرح قیامت بھی اس کے بغل میں موجود ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ رسول اس کے لیے خدا کی عدالت کی منزلت میں ہوتا ہے۔ اگر قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہ اس قوم کے لیے گویا قیامتِ صغریٰ ہوتی ہے جو تمہید ہوتی ہے قیامتِ کبریٰ کی۔ اس لفظ (ازفۃ) کے استعمال سے مقصود قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ قیامت کو بعید نہ سمجھیں۔ ان کی عدالت کا وقت اب آ چکا ہے۔ ایک عدالت ان کے لیے قائم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ آخرت کی عدالت کا انتظار کریں جو سارے معاملات کا آخری فیصلہ کر دے گی۔

'اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۥ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ' یہ اس قیامت کی ہولناکی کی تصویر ہے کہ اس دن مجرموں کے دل گویا حلق میں آئے ہوئے ہوں گے اور وہ غم و الم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ نہ اس دن کسی کے اپنے حلق سے اپنی مدافعت میں کوئی آواز نکلے گی

اور نہ ان کا کوئی ہمدرد یا سفارشی ہوگا جو ان کی حمایت یا سفارش میں اپنی زبان کھولے۔

'شفیع' کے ساتھ 'یطاع' کی صفت مشرکین کے اس وہم پر ضرب لگانے کے لیے ہے کہ وہ اپنے معبودوں کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ خدا کے ایسے لاڈلے اور چہیتے ہیں کہ خدا ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات لازماً مانے گا۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں ان کا کوئی سفارشی ایسا نہیں ہوگا جس کی کوئی شنوائی ہو۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۱۹)

سفارش کے خلاف ایک دلیل

کسی کے باب میں کسی کی سفارش تو اس کے ہاں کچھ کارگر ہو سکتی ہے جو ساری صورتِ حال سے خود واقف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کی ہر چھوٹی بڑی بات سے خود واقف ہے۔ وہ تو نگاہ کی خیانتوں اور سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے تو اس کے آگے کسی کی کوئی سفارش کیا کارگر ہو سکے گی!

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۲۰)

رہی یہ بات کہ کوئی اپنی سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے تو اس کا بھی امکان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ حق کے مطابق ہوگا اور کوئی اپنی سفارش سے اس کے فیصلۂ حق کو باطل سے نہیں بدلوا سکتا۔

'وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ' رہے ان مشرکین کے معبودانِ باطل تو ان کے اختیار میں سرے سے کسی امر کا فیصلہ ہی نہ ہوگا کہ وہ کسی کی حمایت یا مخالفت میں کچھ کر سکیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ' یہ اوپر کی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ حقیقی دیکھنے والا اور سننے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تو اس کے سوا حق کسے ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کرے اور جب وہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اپنی سفارش سے اس کو دھوکا دے کر غلط فیصلے کرا سکے اور یہ معبودانِ باطل جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں آخر کس بنا پر ان کے متعلق یہ تصور کیا گیا ہے کہ یہ بھی کسی کے معاملہ کا فیصلہ کرنے والے بنیں گے!

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۲۱)

قریش کو صاف الفاظ میں تہدید

یہ قریش کو صاف الفاظ میں تہدید ہے کہ اس جسارت کے ساتھ رسول کے انذار کی جو وہ تکذیب کر رہے ہیں تو کیا کبھی اس ملک کی سیاحت انھوں نے اس قصد سے نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے ان قوموں کا کیا حشر ہو چکا ہے جو اپنی قوت و جمعیت میں ان سے بڑھ کر اور تعمیر و تمدن کے آثار کے اعتبا

سے ان پر کہیں فوقیت رکھنے والی تھیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جرموں کی پاداش میں ان کو پکڑا تو نہ ان کی قوت و جمعیت ان کے کچھ کام آسکی، نہ ان کی تعمیری و تمدنی ترقیاں آڑے آسکیں اور نہ ان کے وہ اصنام و الٰہہ ہی ان کی حفاظت کر سکے جن کو وہ اپنا حامی و ناصر سمجھتے تھے۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور اہلِ مدین وغیرہ کی طرف ہے جن کی قوت و جمعیت اور تمدنی و تعمیری ترقیوں کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

لفظ 'اشد' یہاں 'اعظم و اکثر' کے مفہوم پر بھی متضمن ہے اس وجہ سے 'قوۃ' کے ساتھ 'اثاراً' کا ذکر بالکل موزوں ہے۔ 'اثار' سے مراد تمدنی و تعمیری ترقیوں کے آثار ہیں۔ دنیا میں انہی آثار کو ہمیشہ قوموں کی عظمت و شوکت کی دلیل سمجھا گیا ہے۔ لیکن قرآن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر قوم ایمان سے عاری ہو تو یہ آثار اس کے زوال کی نشانی ہیں اور بالآخر یہی اس کے قومی وجود کے لیے مقبروں کی صورت میں تبدیل ہو کے رہتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۲)

یہ ان قوموں کی تباہی کا سبب بیان فرمایا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے اپنی قوت و جمعیت اور اپنی دنیوی ترقیوں کے زعم میں رسولوں کے انذار کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا اور جب پکڑا تو وہ اس کی پکڑ سے چھوٹ نہ سکے۔ اللہ تعالیٰ قوی اور سخت پاداش والا ہے۔ جب وہ پکڑتا ہے تو کوئی سائنس اس سے چھڑا نہیں سکتی۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۲۳-۵۵

آگے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت آرہی ہے جس سے اصل مقصود تو اس دعوے کی دلیل پیش کرنا ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوتی ہے اور قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے اگرچہ قوت و شوکت اور تعمیر و تمدن کے اعتبار سے وہ کتنی ہی برتر قوم ہو۔ یہ سرگزشت سنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ، یہی حشر قریش کے ان فراعنہ کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ ساتھ ہی اس سرگزشت کے ضمن میں خاندانِ فرعون کے ایک مردِ مومن کی داستان بیان ہوئی ہے جو ایک مدت تک تو، بربنائے مصلحت، اپنے ایمان کو چھپائے رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی دعوت کے لیے آخری خطرہ پیش آگیا ہے تو کھل کر میدان میں آگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں اپنی جان لڑا دی۔

اس مردِ مومن کی سرگزشت میں جو سبق مضمر ہیں ان کی وضاحت تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی، یہاں اس کے چند نمایاں پہلو پیشِ نظر رکھیے۔

قریش کے لیڈروں کو یہ اس پہلو سے سنائی گئی ہے کہ اپنی قوم کی حقیقی خیر خواہی یہ ہے جو اس بندۂ مومن نے کی نہ کہ وہ جو اپنے زعم کے مطابق تم کر رہے ہو۔ اس مردِ مومن نے جب دیکھا کہ اس کی قوم تباہی کے راستہ پر چل پڑی ہے تو اپنے تمام مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اس کو اس خطرناک اقدام سے روکنے کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم اپنا سارا زور و زر اپنی قوم کو عذابِ الٰہی کی طرف دھکیلنے میں صرف کر رہے ہو۔

جو لوگ کسی مصلحت سے اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے ان کو اس سرگزشت کے ذریعہ سے یہ سبق دیا گیا ہے کہ ایمان کے معاملے میں مصلحت کا لحاظ اسی وقت تک جائز ہے جب تک اس سے مقصود ایمان کی حفاظت اور اہلِ ایمان کی بہبود ہو۔ اگر ایمان اور اہلِ ایمان کے لیے آخری خطرہ پیش آ جائے تو تمام مصالح کو بالائے طاق رکھ کے اس مردِ مومن کی طرح ہر شخص کو میدان میں آ جانا چاہیے۔

کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو اس سرگزشت کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو لوگ کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے اس مردِ مومن کی طرح بازی کھیلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا یار و ناصر ہوتا ہے۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۵۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖۗ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ

ع ۳/۸

يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِنْ
يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ
ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا ۚ
قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ
الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ
يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ
مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيَا قَوْمِ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ
مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ
هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ
فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ
اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ
مُرْتَابٌ ﴿۳۴﴾ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ
أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ
يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ أَسْبَابَ

السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ
فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ (۳۷) وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ ع ۱۰ / ۹
اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۳۸) يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (۳۹) مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى
اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (۴۰) وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ
اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ (۴۱) تَدْعُوْنَنِيْ النصف
لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى
الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ (۴۲) لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ
فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ
هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۳) فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ
اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۴۴) فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا
مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ (۴۵) اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ
عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ
فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۶) وَاِذْ يَتَحَاۗجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ
الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ (۴۷) قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا

كُلٌّ فِيهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿٤٨﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِى النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾ ع اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿٥٣﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿٥٤﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٥٥﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۵۵

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو، اپنی نشانیوں اور ایک واضح سند کے ساتھ، فرعون، ہامان اور قارون کی طرف۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر لپاٹیا ہے۔ پس جب وہ آیا ان کے پاس، ہمارے پاس سے حق لے کر، انھوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ اور ان کافروں کی چال بالکل رائگاں گئی۔ ۲۳-۲۵

اور فرعون نے کہا، مجھے چھوڑو، میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنے رب کو پکارے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمھارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں بغاوت نہ پھیلا دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لی ہر اس متکبر کے شر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ ۲۶-۲۷

اور آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے، جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، کہا، کیا تم لوگ ایک شخص کو اس بنا پر قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمھارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے! اور اگر وہ جھوٹا ہو گا تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور اگر وہ سچا ہوا تو اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا جس کی وہ تم کو وعید سنا رہا ہے۔ اللہ اس کو بامراد نہیں کرے گا جو حد سے گزرنے والا لپاٹیا ہو گا۔ اے میری قوم کے لوگو، آج تمھارے ہاتھ میں اقتدار ہے، تم ملک میں غالب ہو، تو اللہ کے عذاب کے مقابل میں ہماری مدد کون کرے گا اگر وہ ہم پر آگیا! فرعون بولا کہ میں تم کو اپنی سوچی سمجھی رائے بتا رہا ہوں اور میں تمھاری رہنمائی ٹھیک سیدھی راہ کی طرف کر رہا ہوں۔ ۲۸-۲۹

اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب گروہوں پر آیا۔ مثلاً وہ عذاب جو قومِ نوح، اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں پر آیا جو ان کے بعد ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں چاہتا — اے میرے ہم قومو، میں تم پر ہانک پکار کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اور تم کو خدا سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ اور یوسف اس سے پہلے واضح تعلیمات کے ساتھ آئے تو تم ان کی لائی ہوئی باتوں کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی تو تم نے سمجھا کہ اب اللہ کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو حدود سے تجاوز کرنے والے

اور شبہات میں پڑے رہنے والے ہوتے ہیں۔ ۳۰-۳۴

جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک وہ نہایت مبغوض ہیں۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے ہر متکبّر و جبّار کے دل پر۔ ۳۵

اور فرعون نے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک عمارت بنوا کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پس موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔ اور فرعون کی چال برباد ہو کے رہی۔ ۳۶-۳۷

اور مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، تم میری پیروی کرو، میں تمھاری رہنمائی سیدھی راہ کی طرف کر رہا ہوں۔ اے میری قوم، یہ دنیا کی زندگی تو متاعِ چند روزہ ہے۔ اصل دارالقرار تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا وہ اسی کے مانند بدلہ پائے گا اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوا، تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں وہ بے حساب رزق و فضل پائیں گے۔ اور اے میرے ہم قومو! کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہو! تم مجھے بلا رہے ہو کہ میں خدا کا کفر کروں اور اس کا شریک ایسی چیزوں کو ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں۔ اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی دعوت دے رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی کوئی آواز نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔ اور ہم سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہونی

ہے اور جو حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں وہی دوزخی ہوں گے تو تم عنقریب ان باتوں کو یاد کروگے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔ بے شک اللہ ہی بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۳۸-۴۴

پس اللہ نے اس کو ان کی چالوں کی آفتوں سے محفوظ رکھا اور فرعون والوں کو میرے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس پر صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت ہوگی حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔ ۴۵-۴۶

اور جب کہ وہ دوزخ میں، آپس میں جھگڑیں گے تو زیردست ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے کہیں گے کہ ہم آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آپ لوگ عذاب دوزخ کا کچھ حصہ بھی ہماری جگہ اپنے سر لینے والے بنیں گے؟ جو بڑے بنے رہے وہ جواب دیں گے، اب تو ہم سب ہی اس میں ہیں۔ اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا۔ اور اہل دوزخ، دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں سے ایک دن کی تخفیف فرما دے، وہ جواب دیں گے، کیا تمھارے پاس تمھارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے! وہ جواب دیں گے، ہاں، آتے تو ضرور رہے۔ وہ کہیں گے، تو اب تم ہی درخواست کرو۔ اور کافروں کی پکار بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ ۴۷-۵۰

اور بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی مدد کریں گے جس دن گواہوں کی روبکاری ہوگی، جس دن اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہیں دے گی اور ان کے اوپر لعنت ہوگی

اور ان کے لیے برا ٹھکانا ہوگا۔ ۵۱-۵۲

اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا، اہلِ عقل کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے۔ تو تم ثابت قدم رہو۔ یقیناً اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور اپنے گناہ کی معافی چاہتے رہو اور شام و صبح اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو اس کی حمد کے ساتھ۔ ۵۳-۵۵

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۲۳)

'اٰیٰتٌ' سے مراد وہ احکام و ہدایات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس لے کر آئے اور 'سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ' سے اشارہ یہاں معجزۂ عصا کی طرف ہے جس کی نوعیت ایک خدائی سند کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی کہ فرعون اور اس کے اعیان کو ان کے خدائی سفیر ہونے کے باب میں کسی شک کی گنجائش نہ رہے۔ لفظ 'سلطان' قرآن میں سند، اختیار نامہ، پروانہ اور اتھارٹی کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ مزید وضاحت سورۂ رحمان میں 'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ' کے تحت آئے گی۔

اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۲۴)

فرعون اور اس کے دو بڑے لیڈروں کا ذکر

یہاں فرعون کے ساتھ اس کے ان دو بڑے لیڈروں کا بھی ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ ان دونوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں بھی تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک — قارون — نسلاً اسرائیلی تھا لیکن اس نے فرعونی حکومت کے زیرِ سایہ بے شمار دولت اکٹھی کر لی تھی اور یہی دولت اس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب بنی۔ اس کا ذکر سورۂ قصص میں ہو چکا ہے اور وہاں ہم نے یہ اشارہ کیا ہے کہ اس کے حالات اور ابولہب کے حالات میں بڑی مشابہت ہے۔ یہاں فرعون کے ان لیڈروں کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح تمہاری مخالفت میں قریش کے لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں فرعون اور اس کی قوم کے لیڈر اٹھے تھے، لیکن خدا نے ان کو ذلیل و پامال کیا۔ وہی حشر قریش کے ان لیڈروں کا بھی ہوگا اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے۔

'فَقَالُوا سٰحِرٌ كَذَّابٌ' یعنی انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو تو سحر پر محمول کیا اور ان کے اس دعوے کو کہ خدا نے ان کو رسول بنا کر بھیجا ہے بالکل جھوٹ قرار دیا۔

فَلَمَّا جَآءَهُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا اقْتُلُوٓا أَبْنَآءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَآءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ (۲۵)

حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا فرعونیوں پر الٹا اثر

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس جو پیغامِ حق لے کر آئے تھے اس کا حق تو یہ تھا کہ اس کو مانتے اور اپنے رویّے کی اصلاح کرتے لیکن اس کا اثر ان کے اوپر اس کے بالکل برعکس پڑا۔ انھوں نے یہ محسوس کر کے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ایک منظم اور طاقتور قوم بنانا چاہتے ہیں بنی اسرائیل کے ذکور کو قتل کرنے اور عورتوں کو لونڈیاں بنانے کے لیے زندہ رکھنے کی اس پالیسی پر پوری شدت کے ساتھ عمل کرنے کے احکام جاری کر دیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے بہت پہلے سے چل رہی تھی

'وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ' بنی اسرائیل کے ذکور کو قتل کرنے کی یہ پالیسی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، اس مقصد سے اختیار کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کی تعداد کنٹرول میں رکھی جائے کہ وہ زیادہ ہو کر قبطیوں کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائیں لیکن اس کو نافذ کرنے کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب ناکام رہیں۔ بنی اسرائیل کی تعداد میں، جیسا کہ اس کے محل میں ہم حوالے نقل کر چکے ہیں، روز افزوں ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ میدان میں آ گئے اور فرعونیوں کو جس بات کا اندیشہ تھا وہ ایک حقیقت بن کر سامنے نظر آنے لگی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِيٓ أَقْتُلْ مُوسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۚ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ (۲۶)

فرعون اور اس کے اعیان کی بدحواسی

اپنی اسکیم کی ناکامی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مطالبہ سے فرعون اور اس کے اعیان بالکل حواس باختہ ہو گئے۔ اس حواس باختگی کے عالم میں فرعون نے اپنے درباریوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے کہ میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں۔ اگر اس کا کوئی خدا ہے جس نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ اپنی مدد کے لیے اس کو بلائے۔ اپنی اس تجویز کی تائید میں اس نے دلیل یہ پیش کی کہ اگر اب موسیٰ علیہ السلام کو مزید مہلت دی گئی تو مجھے ڈر ہے کہ وہ یا تو آپ لوگوں کے دین کو بدل کے رکھ دے گا یا ملک میں بغاوت کرا دے گا۔ یہ امر واضح رہے کہ فرعون اپنی قوم والوں کے نزدیک سورج دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا اور اس کی حیثیت ایک اوتار بادشاہ کی تھی۔ اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ توحید کی زد براہِ راست اس کی خدائی پر پڑتی تھی۔ اگر قبطی اس کو قبول کر لیتے تو ان کا دین بدلتا اور اگر نہ قبول کرتے اور بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں منظم ہو جاتے تو اس کا لازمی نتیجہ (فرعون کے خیال کے مطابق) یہ تھا کہ ملک میں بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ ان خطرات کی بنا پر اس نے قوم کے اعیان سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی اجازت مانگی۔ لفظ ذَرُوْنِیْ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت نے اس دور میں اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ فرعون جیسے مطلق العنان کے لیے بھی اپنے اعیان کی تائید کے بغیر ان پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (۲۷)

حضرت موسیٰؑ کا رویہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنا معاملہ اپنے رب کے حوالے کیا کہ میں ہر اس متکبر کے شر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔ تمھارے رب کے الفاظ یہاں بطور تذکیر و تنبیہ ہیں یعنی یاد رکھو کہ وہی تمھارا بھی رب ہے، اس کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے جس کے بل پر کوئی کچھ کر سکے۔

مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ: تکبر درحقیقت حق سے اعراض کا نام ہے جو نتیجہ ہے انانیت و خود پرستی کا اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے آخرت پر ایمان نہ ہونے سے۔ جو شخص آخرت کو نہیں مانتا وہ ایک مطلق العنان ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر گزرے اس سے بعید نہیں۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۲۸)

ایک مردِ مومن کی سرگزشت

یہاں سے ایک بندۂ مومن کی سرگزشت شروع ہو رہی ہے۔ یہ تھے تو فرعون کے خاندانِ شاہی سے لیکن نہایت حق پسند اور خدا ترس آدمی تھے اس وجہ سے ان کی تمام ہمدردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ ان کا ذکر سورۂ قصص میں بھی گزر چکا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا اتفاقی واقعہ پیش آگیا اور اعیانِ حکومت نے ان کے قتل کے مشورے شروع کر دیے تو انہی نے حضرت موسیٰؑ کو اعیانِ حکومت کے اس ارادے سے باخبر کیا اور ان کو مصر سے کہیں باہر جانے کا مشورہ دیا، جس کے بعد حضرت موسیٰؑ مدین چلے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت سے پہلے بھی ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصلاحی سرگرمیوں سے پوری ہمدردی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے واپسی کے بعد جب نبوت کا اعلان کیا تو یہ ان کی دعوت پر ایمان لائے لیکن اپنے ایمان کو انھوں نے ایک عرصہ تک پوشیدہ رکھا۔ انھوں نے غالباً یہ محسوس فرمایا کہ اس دور میں ایمان کو پوشیدہ رکھ کر حضرت موسیٰؑ اور ان کی دعوت کی جو خدمت وہ کر سکتے ہیں وہ خدمت علانیہ نہیں کر سکتے۔ وہ شاہی خاندان کے ایک فرد اور تمام شاہی حقوق و مراعات سے بہرہ مند تھے۔ آگے کی آیات

سے واضح ہو جائے گا کہ وہ فرعون کے دارالامراء کے رکن بھی تھے۔ اگر اسی مرحلہ میں وہ اپنے ایمان کا اعلان کر دیتے تو فرعونی فوراً ان کے اوپر قومی غدار ہونے کا الزام لگا کر پوری قوم میں ان کو نکو بنا دیتے۔

دین کے معاملہ میں مصلحت کا لحاظ صرف اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ دین کے لیے نافع ہو

لیکن دین و ایمان کے معاملے میں مصلحت کا لحاظ اسی وقت تک جائز ہے جب تک اس سے دین کو نفع پہنچنے کی توقع ہو۔ اگر معاملہ اس مرحلے سے گزر جائے اور دین کو کوئی فیصلہ کن خطرہ پیش آ جائے تو اس وقت اپنے ایمان کو چھپانا منافقت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس بندۂ مومن نے بھی اس وقت تک تو اپنے ایمان کو پردے میں رکھا جب تک اس کے چھپانے میں دین کی مصلحت دیکھی۔ لیکن جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی ہے تو انھوں نے مصلحت کی نقاب اتار کر پھینک دی اور خم ٹھونک کر فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت بھی کی اور اپنے ایمان کا علیٰ رؤس الاشہاد اعلان بھی کر دیا۔

یہ واقعہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اس نازک مرحلہ میں اس لیے سنایا گیا کہ جو لوگ کسی مصلحت یا کسی اندیشہ کی بنا پر اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ جب اعداء کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں تو اب کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ایمان کو چھپائے بلکہ اس بندۂ مومن کی طرح ہر شخص کو سر بکف ہو کر میدان میں آ جانا چاہیے۔

مرد مومن کے ایک فقرے کے مضمرات

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ۔ یہ امر واضح رہے کہ یہ بات اس مرد مومن نے فرعون اور اس کے تمام درباریوں کو مخاطب کر کے کہی ہے۔ فرمایا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو اس بنا پر قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمھارے رب کی طرف سے نہایت واضح نشانیاں بھی لے کر آیا ہے۔

اس ایک ہی فقرے میں انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کئی حقیقتیں رکھ دیں۔

ایک تو یہ کہ اللہ ہی کو اپنا رب ماننا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس میں کسی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے تو وہ ایک نہایت روشن حق کا اظہار کر رہا ہے جس پر وہ تائید و تحسین کا سزاوار ہے نہ کہ قتل کا۔ بڑے ہی ظالم ٹھہریں گے وہ لوگ جو ایسے شخص کے قتل کی جسارت کریں گے۔

دوسری یہ کہ جو نشانیاں لے کر آئے ہیں وہ ان کے فرستادۂ الٰہی ہونے کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ صرف اندھے ہی ان کے خدائی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جس رب کے رسول کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں وہ تمھارا بھی رب ہے۔ یہ تمھاری جہالت ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کو رب بنائے بیٹھے ہو۔

ایک تنبیہ

'وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ يَعِدُكُمْ' یہ انھوں نے ان کے اقدامِ قتل کے نتیجہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگر وہ اپنے دعوائے رسالت میں جھوٹے ہوئے جیساکہ تم سمجھتے ہو تو اس کا وبال ان کے اوپر ہوگا اور اگر وہ سچے ہوئے (جیساکہ فی الحقیقت ہے) تو یاد رکھو کہ جس عذاب کی وہ تم کو وعید سنا رہے ہیں اس کا کوئی حصہ تم پر نازل ہو کے رہے گا۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مکذبین یا ان کے قتل کا ارادہ کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جذبات سے اندھے ہو کر معاملہ کے ایک ہی پہلو کو نہ دیکھو، بلکہ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نگاہ میں رکھو جو بڑا ہی سنگین ہے۔ تم نے ان کو جھوٹا فرض کر رکھا ہے اس وجہ سے ان کے قتل کر دینے کو ایک سہل بازی سمجھے ہوئے ہو، تمھیں کیا معلوم کہ وہ جھوٹے ہیں، اگر وہ سچے ہوئے تو پھر سمجھ رکھو کہ تمھارا یہ اقدام بڑا مہنگا پڑ جائے گا۔ اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ قتل کی جسارت کر کے اپنی تباہی کا سامان نہ کرو۔

زبان کا ایک اسلوب

'وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا' کے الفاظ انھوں نے مخاطب کے خیال کو سامنے رکھ کر فرمائے جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ شرط کے اسلوب میں جس شک کا اظہار ہوتا ہے وہ شک کے مفہوم کے لیے صریح نہیں ہوا کرتا بلکہ اس سے شک کا صرف وہم ہوتا ہے۔ اس میں اصل فیصلہ کا انحصار موقع و محل اور سیاق و سباق پر ہوتا ہے۔ زبان کے اس اسلوب کو سامنے رکھنا ضروری ہے اس سے دوسری بعض آیتوں کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

فرعون پر ایک بلیغ تعریض

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ' 'هَدٰی يَهْدِیْ' کے مختلف معانی پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں یہ کسی کو اس کی جدوجہد اور مقصد میں بامراد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ بظاہر تو یہ ایک حکیمانہ کلیہ ہے کہ جو حدود سے تجاوز کرنے والا اور جھوٹا ہوگا اللہ اس کو بامراد نہیں کرے گا، لیکن غور کیجیے تو اس میں فرعون پر نہایت بلیغ تعریض ہے جو انھوں نے عین اس کے منہ پر اس کے بھرے دربار میں اس پر کی۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِی الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۲۹)

مردِ مومن کی تقریر بالتدریج واضح ہوتی جا رہی ہے۔ انھوں نے قوم کے اعیان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آج آپ لوگوں کو ملک میں اقتدار حاصل ہے۔ آپ لوگ جو چاہیں کر سکتے ہیں، کوئی آپ کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ لیکن اس سوال پر سنجیدگی سے غور کر لیجیے کہ اگر اس کے نتیجہ میں ہم پر خدا کا عذاب آ دھمکا تو خدا کی پکڑ سے ہم کو بچانے والا کون بنے گا!

فرعون کی ایک بے محل مداخلت

'قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ' مردِ مومن کی یہ تقریر بھرے دربار میں، فرعون کے سامنے، ہو رہی تھی اس وجہ سے فرعون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ

ہیں نے جو تجویز (در باب قتل موسیٰؑ) آپ لوگوں کے سامنے رکھی ہے وہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یہ میں بالکل صحیح پالیسی کی طرف آپ لوگوں کی راہ نمائی کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ میں نے محض جذبہ سے مغلوب ہو کر عاجلانہ طور پر یہ تجویز رکھ دی ہے بلکہ خوب اچھی طرح اس کے نتائج و عواقب پر دور تک سوچ لیا ہے اور یہی پالیسی صحیح ہے اگر یہ فوراً نہ اختیار کی گئی تو اس کے نتائج اس ملک کے حق میں نہایت مہلک ہوں گے۔

'ظٰھِرِیْنَ' یہاں 'لَکُمْ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ ضمیر مجرور سے حال پڑنے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

فرعون کی اس بے محل مداخلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس مردِ مومن کی تقریر بغیر کسی مداخلت کے جاری رہی تو اس سے اس کے بہت سے درباری متاثر ہو جائیں گے اس وجہ سے ہوشیار سیاسی لیڈروں کی طرح اس نے اپنی نیک نیتی، اصابت رائے اور مصلحت اندیشی کی دھونس جمانے کی کوشش کی۔

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ۙ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ ؕ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۳۰-۳۱)

مردِ مومن کی تقریر جاری رہی

مردِ مومن نے فرعون کی اس مداخلت کی کوئی پروا کیے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔ فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کو گزند پہنچانے کی کوشش کی گئی تو آپ لوگوں پر اسی طرح عذاب آ دھمکے گا جس طرح پچھلی قوموں یعنی قومِ نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد کی قوموں پر آیا۔ ان قوموں نے اپنے رسولوں کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں؛ اسی طرح آپ لوگ بھی تباہ ہو کر رہیں گے اگر انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

'وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ'۔ اور یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی رحیم ہے اس وجہ سے کوئی عذاب بھیجنے سے پہلے آپ لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اس نے اپنا رسول بھیج دیا ہے تاکہ جو لوگ توبہ و اصلاح کرنی چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر لیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و عنایت کی قدر کرنے کے بجائے اس کے رسول کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ لوگوں پر حجت تمام ہو گئی اور آپ لوگوں نے اپنی شامت خود بلائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ فرعون عاد و ثمود وغیرہ کے بعد ہوا ہے اور یہ قومیں اس کے پاس پڑوس کی قومیں تھیں جن کے حالات اس طرح معلوم و معروف تھے کہ ان کو اس عہد کے لوگوں کے سامنے تذکیر و تنبیہ کے لیے پیش کیا جا سکتا تھا۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۲-۳۳)

يوم التناد کا مفہوم

'يَوْمَ التَّنَادِ' کے لغوی معنی ہیں 'ہانک پکار کا دن' یہ اس یوم عذاب کی تعبیر کے لیے آیا ہے جس سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ جب کوئی بڑی ہلچل برپا ہوتی ہے تو دوڑو، بھاگو، لیجیو، جلیو کا ہر طرف شور ہوتا ہے اس وجہ سے یوم عذاب کی تعبیر کے لیے یہ نہایت موزوں لفظ ہے۔ اس میں اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے آپ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنا رہے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حملہ ہوگا تو تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ' اس وقت پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے لیکن یہ بھاگنا بالکل بے سود ہوگا اس لیے کہ خدا کی پکڑ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا۔ اس وقت آپ لوگ ہانک پکار کریں گے لیکن یہ صدا بصحرا ہوگی۔

'وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ' یعنی میرا کام آپ کو نیک و بد سے آگاہ کرنا ہے وہ میں کر رہا ہوں۔ میری نصیحت ماننا نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے۔ اگر آپ لوگوں نے وہی اقدام کیا جس کا ارادہ کر رہے ہیں تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو اللہ گمراہ کر دے ان کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس پر اس کتاب میں جگہ جگہ گفتگو ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ (۳۴)

قوم کی ضلالت کی تاریخ اور اس کا فلسفہ

یہ قوم کی ضلالت کی انھوں نے تاریخ بیان فرمائی ہے کہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام بھی، نہایت واضح دلائل کے ساتھ، آپ لوگوں کے پاس آئے لیکن ان کی تعلیمات و ہدایات کے باب میں بھی آپ لوگ برابر شک ہی میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بادشاہِ وقت کی غیر معمولی عقیدت کے سبب سے، جو اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ تھی، ان کے معاملے میں کوئی معاندانہ رویہ تو نہیں اختیار کیا گیا لیکن جن باتوں کی انھوں نے تعلیم دی ان کی کوئی خاص قدر بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ ان کی تعلیمات کو نفس کی خواہشوں کے خلاف پا کر ان کے باب میں آپ لوگ بے پروائی اور شک میں مبتلا رہے۔

'حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا' یعنی ان کو اور ان کی تعلیمات کو اللہ کی رحمت سمجھنے کے بجائے قوم کے لوگوں نے ایک بوجھ خیال کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو لوگوں نے ٹھنڈا سانس لیا کہ یہ بوجھ اترا اور مطمئن ہوگئے کہ اب اللہ کوئی اور رسول نہیں بھیجے گا جو ان

کی طرح آپ لوگوں کی خواہشوں کو لگام لگانے کی کوشش کرے گا۔

'كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ'۔ یعنی آپ لوگوں کی موجودہ گمراہی اسی پچھلی گمراہی کا مولود فساد ہے۔ جو لوگ محض نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اللہ کے حدود کو توڑنے والے اور اتباعِ نفس کے جنون میں علم و یقین کے بجائے شک کی راہ اختیار کرنے والے بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسند کردہ ضلالت ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا ہے۔ پھر ان کو کبھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے اس کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو خیر و شر کی جو معرفت اور عقل و فہم کی جو نعمت اس نے بخشی ہے، لوگ اس کی قدر کریں۔ جو لوگ ان کی قدر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہدایت و معرفت کی مزید راہیں کھولتا ہے۔ جو اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ اپنے نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر واضح سے واضح حق کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے اور اسی مقصد کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کرتے ہیں ان کو مزید ہدایت دینا تو الگ رہا ان کی اس ناقدری کی پاداش میں اللہ تعالیٰ ان کا وہ نور بھی سلب کر لیتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔ یہاں اس بندۂ مومن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ چیز ان لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے جو اس زمانے میں نہایت واضح حقائق کو مشتبہ بنانے کے لیے رات دن خاکبازی کر رہے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵)

دین کے معاملے میں بے دلیل دخل در معقولات کا انجام

یعنی اللہ کی آیات اور اس کے احکام کے باب میں جو گفتگو بھی ہونی چاہیے وہ سند اور دلیل کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ جو لوگ بغیر اس طرح کی کسی دلیل و سند کے ان کی مخالفت کرتے ہیں وہ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔

'كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ'۔ اس ٹکڑے سے ایک بات تو یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اس طرح کی کٹ حجتی کرتے ہیں یہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ ٹھپہ کر دیا کرتا ہے جس کے سبب سے ان کی عقلیں الٹ جاتی ہیں اور وہ کوئی بات بھی اپنی خواہش کے خلاف ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اگرچہ وہ کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو۔

دوسری بات یہ واضح ہوئی کہ ان کے دلوں پر یہ مہر ان کے تکبر اور ان کی فرعونیت کے سبب سے لگتی ہے۔ یہ لوگ اپنے غرور کے سبب سے ہر اس بات کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کی خواہش کے خلاف ہو۔ اگر کوئی نبی و رسول بھی ان کو کوئی بات سمجھائے تو اس کو بھی وہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ آخر وہ کیوں نبی ہوا جب کہ اس سے زیادہ نبوت کے اہل وہ خود ہیں! ــــــ اس زمانے میں بہت سے برخود غلط

اسلام کی نہایت واضح تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ انھیں دین کی الف، ب کی بھی خبر نہیں ہے۔ اگر کوئی ان کی اس جسارت پر ٹوکے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دین پر کسی گروہ کا اجارہ نہیں ہے وہ بھی اس پر کلام کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی درحقیقت یہی غرور سمایا ہوا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ (۳۶-۳۷)

فرعون کا ایک شگوفہ

اوپر آپ نے دیکھا کہ مردِ مومن کی تقریر بالتدریج اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس سے قدرتی طور پر اہلِ دربار متاثر ہوتے نظر آئے ہوں گے۔ اس وجہ سے فرعون نے پہلے کی طرح پھر مداخلت کی اور درباریوں کو بےوقوف بنانے کے لیے ایک شگوفہ چھوڑا۔ ہامان[1] کو مخاطب کرکے اس نے حکم دیا کہ ہامان! ایک بلند عمارت بنواؤ، میں آسمانوں کے اطراف میں پہنچ کر ذرا موسیٰ کے اس رب کو جھانک کے دیکھنا چاہتا ہوں جس نے اس کے زعم کے مطابق اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھے تو یہ شخص بالکل جھوٹا مدعی معلوم ہوتا ہے۔

'وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ'۔ یعنی اتنی واضح تقریر کے بعد بھی فرعون کو قبولِ حق کی توفیق نہیں ہوئی۔ فکر ہوئی تو اس بات کی ہوئی کہ کسی طرح اپنے درباریوں کو اس تقریر کے اثر سے بچا لے جائے۔ توفیقِ خیر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ دیدہ دانستہ برائیاں کرتے کرتے دیدہ دلیر ہو جاتے ہیں بالآخر ان کی برائیاں اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دی جاتی ہیں کہ ان کو چھوڑنے کا تصور بھی ان پر شاق گزرتا ہے۔ چنانچہ فرعون کو بھی یہی افتاد پیش آئی۔ اس کے آگے بھی اس کے برے اعمال سدِ راہ بن کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اس کو سیدھی راہ اختیار کرنے سے روک دیا۔

'وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ'۔ فرعون نے یہ بات محض درباریوں کو فریب دینے اور حضرت موسیٰ کے استخفاف کے لیے کہی تھی اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'کید' سے تعبیر فرمایا اور یہ 'کید' اس کے لیے بھی موجبِ تباہی ہوا اور اس کی قوم کے لیے بھی۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۳۸)

فرعون کو جواب

مردِ مومن نے فرعون کی اس مداخلت کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ نہایت واضح الفاظ میں قوم کو دعوت دی کہ لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھاری رہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرعون کی اس بات کا جواب ہے جو اوپر گزر چکی ہے کہ 'وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ' اس سے ثابت ہوا کہ انھوں نے قوم کو واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ فرعون کی پیروی میں قوم کی تباہی ہے۔ اگر فلاح مطلوب ہے تو

---

[1] 'ہامان' پر بحث سورۂ قصص میں گزر چکی ہے۔

لوگوں کو ان کی پیروی کرنی چاہیے۔

یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ز وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ (۳۹)

آخرت کی یاد دہانی

انھوں نے فرعون کو چیلنج تو کر دیا لیکن دنیوی لیڈروں کی طرح اپنی جمعیت و اکثریت کا رعب نہیں جمایا بلکہ انبیائے کرام کے طریقہ پر لوگوں کو آخرت کی یاد دہانی کی کہ اس دنیا کی زندگی اور اس کا تمام عیش و آرام چند روزہ ہے، اصل قیام کا گھر آخرت ہے تو اس چند روزہ عیش کی خاطر ابدی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہیے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ (۴۰)

اس عالم آخرت میں جزاء و سزا کا جو ضابطہ نافذ ہو گا یہ اس کا بیان ہے کہ اس میں جو لوگ گناہ کر کے پہنچیں گے ان کو تو ہر بدی کا بدلہ اسی کے مانند ملے گا تاکہ ان کے اوپر کوئی زیادتی نہ ہو لیکن جو نیکی کما کر جائیں گے وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اس میں ان کو بے حساب رزق و فضل ملے گا ــــــ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مرد مومن کا یہ خطاب ارسٹوکریسی (ARISTOCRACY) کے اعیان سے ہے جن میں سے اکثر کا مدعا اس حیاتِ چند روزہ کا عیش و آرام ہی رہا ہو گا اور اسی کی خاطر وہ فرعون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے توجہ دلائی کہ اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر ابدی زندگی کی بادشاہی کو قربان نہ کرو۔

وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَى النَّارِ ؕ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ز وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ (۴۱-۴۲)

قوم کے بعض اعیان کے اعتراض کا جواب

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون نے ان کی تقریر میں بعض مداخلتیں کیں اسی طرح اس مرحلہ میں قوم کے بعض اعیان نے بھی ان پر بعض اعتراضات کیے۔ فرعون کی مداخلت کا تو، جیسا کہ آپ نے دیکھا، انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اس لیے کہ اس سے انھیں کسی خیر کی امید نہیں تھی۔ لیکن قوم کے لیڈروں کی بات کا انھوں نے جواب دیا اور نہایت دلسوزی و ہمدردی کے انداز میں جواب دیا۔ ان لیڈروں نے ظاہر ہے کہ یہی اعتراض اٹھایا ہو گا کہ آپ کی ساری تقریر ہمارے ان معبودوں کے خلاف ہے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے۔ آپ کو اپنے باپ دادا کے دین پر رہنا چاہیے نہ کہ کوئی الگ دین کھڑا کرنا چاہیے۔ مرد مومن نے نہایت دلسوزی کے ساتھ ان کو جواب دیا کہ یہ عجیب ماجرا ہے کہ میں تو آپ لوگوں کو نجات کی راہ کی طرف بلا رہا ہوں لیکن آپ لوگ مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کو خدائے عزیز و غفار کی بندگی کی دعوت دے رہا ہوں، جو پکڑ بھی سکتا ہے اور بخشنے والا بھی ہے، اور آپ لوگ مجھے اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ میں ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے شریک ہونے کے بارے میں مجھے

کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ایک خدائے عزیز و غفّار کا تعلق ہے وہ تو ایک مسلّم بات ہے۔ اس کو تو وہ لوگ بھی مانتے ہیں جو مشرک ہیں اور اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کے کچھ شریک بھی ہیں تو یہ چیز دلیل و ثبوت کی محتاج ہے اور اس کی کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے۔ اگر میں بے دلیل کسی کو خدا کا شریک بناؤں تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا!

'لِاَکۡفُرَ بِاللّٰہِ وَاُشۡرِکَ بِہٖ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرک اور کفر میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ جو شخص خدا کے شریک ٹھہراتا ہے وہ درحقیقت اس کا کفر کرتا ہے اس لیے کہ دین میں خدا کا صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی تمام صفات اور اس کے تمام حقوق کے ساتھ ماننا معتبر ہے اور ان حقوق میں سب سے بڑا حق اس کی توحید و یکتائی کا تسلیم کرنا ہے۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ لَیۡسَ لَہٗ دَعۡوَۃٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَا فِی الۡاٰخِرَۃِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَاَنَّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ہُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ (۴۳)

'لَا جَرَمَ' کے معنی ہوں گے 'لابدّ'، 'لامحالہ'۔ یہ حقیقت ہے، اس میں کسی بحث یا کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ قسم کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔

'لَیۡسَ لَہٗ دَعۡوَۃٌ' میں فعل کی نفی اس کے فائدہ کی نفی کے پہلو سے ہے۔ یعنی ان کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ اس دنیا میں ہے، نہ آخرت میں ہوگا۔ اس حقیقت کی وضاحت قرآن کے دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے۔

خلاصۂ بحث

مردِ مومن نے اوپر کی دلیل قائم کرنے کے بعد خلاصۂ بحث ان کے سامنے یہ رکھا کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ لوگ مجھے جن بتوں کی عبادت کی دعوت دے رہے ہیں وہ محض آپ کے وہم کی ایجاد ہیں۔ ان سے دعا و فریاد کا کوئی فائدہ نہ اس جہان میں ہے اور نہ آخرت میں ہوگا۔ اس دنیا میں ہمیں جو کچھ ملتا ہے خدا سے ملتا ہے اور آخرت میں ہم سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہونی ہے۔ ان فرضی دیویوں دیوتاؤں میں سے کوئی مولیٰ و مرجع بننے والا نہیں ہے۔

'وَاَنَّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ہُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ'۔ 'مُسۡرِفِیۡن' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہوں گے ان کا کوئی سفارشی نہیں ہوگا بلکہ اس قسم کے سارے لوگ جہنم میں پڑیں گے۔

فَسَتَذۡکُرُوۡنَ مَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ (۴۴)

آخری ہمدردانہ تنبیہ

یہ اس مردِ مومن کی تقریر کا آخری اور نہایت ناصحانہ و ہمدردانہ فقرہ ہے۔ فرمایا کہ آج تم لوگ میری بات مانو یا نہ مانو لیکن آگے جو مراحل آنے والے ہیں ان میں تم میری یہ باتیں یاد کرو گے مگر اس وقت ان کو

یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ اشارہ آخرت کی جزاء و سزا کی طرف بھی ہے اور اس عذاب کی طرف، بھی جس سے رسول کی تکذیب کی صورت میں انھوں نے اوپر اپنی قوم کو ڈرایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عذاب نمودار ہو جائے گا یا آخرت سامنے آن کھڑی ہوگی تو اس وقت یہ باتیں یاد کر کے پچھتائیں گے تو سب لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔

'وَاُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ'۔ یعنی میں نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ اب تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ اگر تم اس کلمۂ حق کے سبب سے میرے دشمن بنتے ہو تو میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا محافظ اور ان کا نگرانِ حال ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ۔

فَوَقٰىہُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِ مَا مَکَرُوۡا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ (۴۵)

فرعون اور اس کے اعیان کی سازشوں کی ناکامی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تقریر کے بعد فرعون اور اس کے تمام اعیان ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں لگ گئے کہ کسی طرح ان کو اپنے دین میں واپس لائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کے شر سے ان کو محفوظ رکھا۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے جو سازشیں ان کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے کیں ان میں کوئی کامیابی ان کو نہیں ہوئی۔ اسی طرح اللہ کے جو بندے حق کا اعلان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دین و ایمان کی حفاظت فرماتا ہے۔

فرعون اور اس کے اتباع کا انجام

'وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ'۔ 'اٰلِ فِرۡعَوۡنَ' سے ظاہر ہے کہ یہاں اس کے آل و اتباع سب مراد ہیں۔ فرمایا کہ بندۂ مومن کو تو اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کے شر سے محفوظ رکھا البتہ فرعون اور اس کے اتباع کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ 'برے عذاب' سے مراد وہ فیصلہ کن عذاب ہے جس نے فرعون اور اس کی ساری فوجوں کو غرق کر دیا۔ اس کو برے عذاب سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے دوران میں متعدد عذاب اہلِ مصر پر آئے لیکن یہ عذاب تنبیہ و تذکیر کے لیے تھے جن میں مومن و کافر دونوں ہی آزمائے گئے لیکن یہ آخری عذاب جو آیا تو اس سے مومن تو محفوظ رکھے گئے لیکن فرعون اور اس کی نسل کی اس نے جڑ کاٹ دی۔ لفظ 'حَاقَ' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس عذاب نے اس طرح ان کو اپنے احاطہ میں لے لیا کہ ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہا۔

اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ (۴۶)

فرعون اور اس کے اتباع کا حال برزخ میں

یہ اس عذاب کی تفصیل ہے کہ برزخی زندگی میں ان کو صبح و شام دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے کہ دیکھتے رہیں کہ ان کا اصلی ٹھکانا یہ ہوگا اور جب قیامت کا دن آئے گا تو حکم ہوگا کہ فرعون اور اس کے تمام اتباع کو دوزخ کے شدید ترین عذاب میں جھونک دو۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ مرنے

کے بعد نیک ارواح پر ان کے اعمال کے اعتبار سے کیفیات کا صدور ہونے لگتا ہے اور ارواحِ خبیثہ پر ان کے اعمال کے اعتبار سے۔ یہ گویا ان کے لیے جنت یا دوزخ کی تمہید ہوتی ہے۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو جزا اور سزا اپنی اصلی شکل میں لوگوں کے سامنے آئے گی۔ حدیثوں میں عذابِ قبر کا جو ذکر آیا ہے وہ اسی برزخی زندگی سے متعلق ہے۔

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ٥ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ (۴۷-۴۸)

لیڈروں اور پیرؤوں کا حال دوزخ میں

اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ مردِ مومن کی سرگزشت ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی سنائی گئی ہے جو اپنے لیڈروں کے رعب کے سبب سے اظہارِ حق میں ہچکچا رہے تھے۔ اب یہ دکھایا ہے کہ دنیا کی مجالس میں جو لوگ اپنے لیڈروں کے ڈر سے حق کے اعتراف و اعلان کی جرأت نہیں کر رہے ہیں، ایک دن آئے گا جب یہ لیڈر اور ان کے پیرو دونوں دوزخ میں ہوں گے اور ایک دوسرے پر لعنت و نفرین کریں گے۔ کمزور اور دبے ہوئے لوگ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم آنکھ بند کر کے آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آج آپ لوگ اس عذابِ دوزخ میں سے بھی کچھ اپنے سر لینے والے بنیں گے جو ہمارے حصہ میں آیا ہے؟ بڑے بننے والے جواب دیں گے کہ اب شکوہ و شکایت کا وقت گزر گیا۔ اب تو ہمیں اور تمہیں دونوں کو اسی میں رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل عدل کے ساتھ بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا ــــــ مطلب یہ ہے کہ یہ عذر کسی کے لیے کچھ نافع نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کے دباؤ میں تھا اس وجہ سے باطل کا پیرو بنا رہا۔ اپنے نفس کی ذمہ داری ہر شخص پر خود ہے۔ یہ ذمہ داری وہ دوسروں پر ڈال کر سبک دوش نہیں ہو سکتا اس وجہ سے ہر شخص، خواہ وہ کتنا ہی دبا ہوا ہو، اللہ پر بھروسہ کر کے حق کا اعلان کرے اور یہ اعتماد رکھے کہ اللہ اس کی حفاظت فرمائے گا اور اگر اس راہ میں اس کی موت بھی آئی تو یہ موت شہادت کی موت ہوگی۔

فاسقانہ قیادت کی بنیاد استکبار پر ہوتی ہے

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ کفر و فسق کے ان لیڈروں کے لیے قرآن نے لفظ 'استکبروا' استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہوں گے، وہ جو بڑے بنے رہے، یا 'وہ جو بڑائی کے گھمنڈ میں رہے'، یہ فاسقانہ قیادت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ موزوں و معنی خیز لفظ ہے۔ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ کے لیے ہے اس وجہ سے ہر وہ قیادت جو اللہ کے راستہ سے ہٹانے والی ہے وہ استکبار پر مبنی ہے اور اس کا انجام بالآخر دوزخ ہے اس قیادت کے مدعیوں کے لیے بھی اور اس کے پیرؤوں کے لیے بھی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ٥ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۴۹-۵۰)

اہلِ دوزخ کی آخری تدبیر اور اس کی ناکامی

جب دوزخی دیکھیں گے کہ یہاں نہ ان کے شرکاء و شفعاء کام آنے والے بنے اور نہ ان کے لیڈر ہی ان کی کوئی مدد کر سکے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوزخ کے داروغوں ہی سے التجا کریں گے کہ آپ ہی لوگ اپنے رب سے درخواست کیجیے کہ ہمارے عذاب میں زیادہ نہیں تو ایک ہی دن کی تخفیف کر دی جائے کہ ہم ذرا دم لے لیں۔ وہ جواب دیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تمہارے رسول نہایت واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے ہیں؟ وہ کہیں گے، ہاں! یہ بات تو ضرور رہے۔ وہ جواب دیں گے، اگر یہ بات ہے تو تم ہی درخواست کرو، ہم تمھارے جیسے لوگوں کے لیے کوئی درخواست نہیں کر سکتے۔

'وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ' یعنی اس وقت کافروں کی ہر دعا و فریاد اور ہر چیخ و پکار بالکل صدا بصحرا ہو گی۔ نہ ان کے مزعومہ دیوی دیوتا ان کی فریادیں سنیں گے، نہ ان کے لیڈران کے کچھ کام آئیں گے اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کچھ شنوائی ہو گی۔ امید کے تمام دروازے ان کے لیے بند ہو جائیں گے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۵۱)

رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی

اس آیت کا تعلق اوپر آیت ۴۵ سے ہے۔ بیچ میں پانچ آیتیں ضمنی طور پر اس عذاب کی وضاحت کے لیے آ گئی ہیں جس سے فرعون اور اس جیسے ستکبروں اور ان کے پیروؤں کو سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس مردِ مومن کی مدد فرمائی اسی طرح ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جس دن گواہ گواہی کے لیے کھڑے ہوں گے۔

اس آیت کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں نہایت صراحت کے ساتھ اس بات کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی اس دنیا میں بھی مدد فرماتا ہے۔ اس الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے وہ فرق واضح طور پر نہیں ہے جو رسول اور نبی کے درمیان ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس فرق کو واضح کرتے آ رہے ہیں اس کو نگاہ میں رکھیے۔ رسولوں کے لیے سنتِ الٰہی یہی ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس کے لیے وہ خدا کی عدالت ہوتے ہیں۔ اگر قوم ان کی تکذیب کر دیتی ہے تو وہ لازماً فنا کر دی جاتی ہے عام اس سے کہ وہ کسی خدائی عذاب سے تباہ ہو یا اہلِ حق کی تلوار سے شکست کھائے اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کے سامنے ہی پیش آئے یا رسول کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک ہر رسول کی زندگی اس سنتِ الٰہی کی شہادت دیتی ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

'يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ' سے مراد ظاہر ہے کہ قیامت کا دن ہے اس لیے کہ اس دن اللہ تعالیٰ ہر نبی اور رسول سے گواہی دلوائے گا کہ اس نے لوگوں کو کیا تعلیم دی۔ اسی طرح امتوں سے سوال ہو گا کہ انھوں نے اپنے رسولوں کو

کیا جواب دیا۔ خدا کے ملائکہ بھی لوگوں کے اعمال کے رجسٹر کے ساتھ پیش ہوں گے۔ ان احوال کی تفصیل سورۂ مائدہ اور بعض پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔

يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ ۖ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ (۵۲)

یہ اسی 'يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ' کی وضاحت ہے کہ اس دن خدائی گواہوں کی گواہی ایسی واضح، ایسی قطعی اور اتنی زبردست ہوگی کہ جن بدقسمت لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوں گے ان کا کوئی عذر بھی کچھ کارگر نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اپنی گمراہی کا ذمہ دار اپنے لیڈروں کو بنانا چاہیں گے ان کا عذر بھی مسموع نہیں ہوگا۔ ان کے لیڈر خود ان کے منہ پر بات پھینک ماریں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے یہ جانتے ہوئے کہ ہم ضلالت پر ہیں تم نے ان کی پیروی نہیں کی تو اب ہم اور تم دونوں یکساں ہیں اور دونوں ہی کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنی ہے۔

'وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ' یعنی ان کی معذرت کے جواب میں ان پر خدا اور اس کے فرشتوں کی پھٹکار ہوگی اور ان کے اعمال کی پاداش میں ان کے لیے برا ٹھکانا ہوگا۔

وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْرَثْنَا بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ الْكِتَٰبَ ۝ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُو۟لِى الْأَلْبَٰبِ (۵۳-۵۴)

وعدۂ نصرت کی وضاحت

یہ وضاحت ہے اس نصرت کی جس کا ذکر اوپر ہوا کہ فرعون اور اس کے آل و اتباع تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے بنی اسرائیل، ہدایت اور کتاب الٰہی کی وراثت سے نوازے گئے۔

'وَأَوْرَثْنَا بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ الْكِتَٰبَ' کے اندر اس دنیا میں غلبہ و تمکّن کا وعدہ خود مضمر ہے اس لیے کہ کتاب احکام و قوانین الٰہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس ملّت کو یہ عطا ہو اس کو زمین میں غلبہ و تمکّن بھی حاصل ہو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو یہ چیز حاصل رہی جب تک وہ اپنی کتاب پر عامل رہے۔

'هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُو۟لِى الْأَلْبَٰبِ'، یہ کتاب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے دی کہ یہ لوگوں کو اللہ کی طرف رہنمائی اور اس کی باتوں کی یاد دہانی کرتی رہے لیکن یہ فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر عقل و بصیرت ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں ان کے لیے کوئی چیز بھی نافع نہیں ہوتی۔ اس میں تعریض ہے ان بنی اسرائیل پر جنھوں نے اپنی ضلالت پسندی و بے عقلی کے سبب سے اپنے کو اس کتاب کی ارشادات سے محروم کر لیا۔

فَٱصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ وَٱسْتَغْفِرْ لِذَنۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِٱلْعَشِىِّ وَٱلْإِبْكَٰرِ (۵۵)

خلاصۂ بحث

یہ بطور خلاصۂ بحث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ تم اپنی دعوت پر جمے رہو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔ یہ اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵۱ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں

کو دنیا اور آخرت دونوں میں فتحمند کرے گا۔

'وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ..... الآیۃ' یہ تدبیر ارشاد ہوئی ہے اس صبر و استقامت کے حصول کی جو اس وعدے کے ظہور کے لیے شرط لازمی ہے کہ برابر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے اور اپنے رب کی تسبیح و حمد کرتے رہو۔ یہ بات اس کے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ حصولِ صبر کے لیے وسیلۂ ظفر استغفار و نماز ہے۔ اور یہ بات بھی اس کے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ اس طرح کے خطابات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم شخصًا مخاطب نہیں ہوتے بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جو لوگ خطاب کی اس نوعیت اور اس کی بلاغت سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف 'ذنب' کے لفظ کی نسبت سے متوحش ہوتے ہیں حالانکہ اس کا ایک خاص محل ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات : ۵۶-۸۵

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کے ساتھ نہایت واضح الفاظ میں فتح و نصرت کی بشارت اور قریش کے لیڈروں کو دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اس بشارت اور وعید کے بیچ بیچ میں توحید اور قیامت کے ان آفاقی، انفسی اور اخلاقی دلائل کا حوالہ ہے جن پر یہ بشارت اور یہ وعید مبنی ہے۔

آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۶-۸۵

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِن فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ

جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ
اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ
اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۴﴾ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۵﴾
قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا
جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۶﴾
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ
وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّكُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا
یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۶۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ
اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰی یُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾ۛ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ
اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ
اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِی الْحَمِیْمِ ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ

يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ
قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ
لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ
بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
ع ۸ ۱۳
الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَفَلَمْ
يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ
اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ

كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ ع ۹ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۵۶-۸۵

جو لوگ اللہ کی آیات کے باب میں، بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو، کٹ حجتی کر رہے ہیں، ان کے دلوں میں بس ایک گھمنڈ سمایا ہوا ہے جس میں وہ کبھی بامراد ہونے والے نہیں ہیں تو تم اللہ کی پناہ مانگو، وہی حقیقی سننے دیکھنے والا ہے۔ ۵۶

آسمانوں اور زمین کا پیدا کر دینا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اندھے اور بینا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ جو برائی کرنے والے ہیں دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو! بے شک قیامت آ کے رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں! اور تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری بندگی سے سرتابی کر رہے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔ ۵۷-۶۰

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کام کرو۔ اللہ لوگوں پر بڑا فضل والا ہے لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہوتے۔ وہی اللہ تمھارا خداوند ہے، ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تم لوگ کس طرح اوندھے ہو جاتے ہو! اسی طرح وہ لوگ بھی اوندھے ہو جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں۔ ۶۱-۶۳

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھاری

صورت گری کی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں۔ اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ وہی اللہ تمہارا خداوند ہے۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، عالم کے خداوند کی! وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو پکارو، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ۔ شکر کا سزاوار اللہ ہے، عالم کا خداوند۔ ۶۴-۶۵

کہہ دو، مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح آیتیں آ چکی ہیں۔ اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اپنے تئیں خداوند عالم کے حوالہ کروں۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر خون کی ایک پھٹکی سے۔ پھر وہ تم کو وجود میں لاتا ہے ایک بچہ کی صورت میں۔ پھر وہ تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو پھر وہ تم کو مہلت دیتا ہے کہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض اس سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض کو مہلت دیتا ہے کہ تم ایک مدتِ معین پوری کرو۔ اور یہ اس لیے ہے کہ تم سمجھو۔ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور جو مارتا ہے۔ پس جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کو حکم فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۶۶-۶۸

ذرا ان کو تو دیکھو جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کرتے ہیں! وہ کہاں پھیر دیے جاتے ہیں! جنھوں نے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا اور ان چیزوں کو بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، وہ عنقریب جانیں گے! جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور (ان کے پاؤں میں) زنجیریں ہوں گی، وہ گرم پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا، کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کے سوا شریک ٹھہراتے تھے۔ وہ کہیں گے، وہ سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ پہلے ہم کسی چیز کو بھی نہیں پوجتے رہے۔

اس طرح اللہ کافروں کے حواس گم کر دے گا۔ یہ اس سبب سے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے اور اکڑتے رہے۔ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبروں کا! ۶۹-۷۶

پس ثابت قدم رہو، بے شک اللہ کا وعدہ شُدنی ہے۔ یا تو ہم تم کو اس کا کچھ حصہ جس کی ان کو وعید سنا رہے ہو، دکھا دیں گے یا تم کو وفات دیں گے پس ان کی واپسی ہماری طرف ہو گی۔ ۷۷

اور ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے جن میں سے کچھ کے حالات تم کو سنا دیے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے حالات تم کو نہیں سنائے اور کسی رسول کا بھی یہ مقدور نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی اللہ کے اذن کے بدون لا سکے۔ پس جب اللہ کا حکم آ جائے گا، عدل کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اس وقت اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے۔ ۷۸

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے پیدا کیے کہ تم بعض سے سواری کے کام لو اور ان میں سے کچھ تمھاری غذا کے کام آتے ہیں اور ان میں تمھاری دوسری منفعتیں بھی ہیں اور اس لیے بھی بنائے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے اپنے دلوں کے کسی مقصد تک پہنچو اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔ ۷۹-۸۰

اور وہ تم کو اور بھی اپنی بے شمار نشانیاں دکھاتا ہے تو تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے؟ کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ تھے زمین میں اپنے آثار کے اعتبار سے اور بڑھ چڑھ کر تھے اپنی قوت و جمعیّت کے لحاظ سے تو ان کے یہ سارے کارنامے ان کے کچھ

کام نہ آئے۔ ۸۱ - ۸۲

پس جب ان کے پاس ان کے رسول نہایت واضح دلیلوں کے ساتھ آئے تو وہ اپنے اسی علم پر نازاں رہے جو ان کے اپنے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ پس جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا بولے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ان چیزوں کے ہم منکر ہوئے جن کو ہم اللہ کا شریک گردانتے تھے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں پہلے ظاہر ہوتی رہی ہے اور اس وقت کفر کرنے والے نامراد ہوئے۔ ۸۳ - ۸۵

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰہُمۡ ۙ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ ۚ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (۵۶)

منکرین کے انکار کی اصل علت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آج جو لوگ، بغیر کسی دلیل و سند کے، اللہ کی آیات کے باب میں تم سے جھگڑ رہے ہیں ان کی پروا نہ کرو۔ 'آیات' سے مراد توحید و آخرت کی وہ دلیلیں ہیں جو اوپر مختلف اسلوبوں سے مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی مخالفت کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان سے حق مخفی ہے یا ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل ہے بلکہ یہ صرف اس وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے تمھاری بات تسلیم کر لی تو یہ تمھاری برتری تسلیم کر لینا ہے جس سے ان کا پندارِ سیادت مجروح ہوتا ہے۔

منکرین کے علی الرغم غلبۂ حق کی بشارت

'مَا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ' فرمایا کہ اپنے اس پندار میں یہ بامراد ہونے والے نہیں ہیں، اب فیصلۂ تقدیر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں اس کلمۂ حق کا بول بالا کرے گا اور تمھارے یہ مخالفین دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوں گے۔

مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنے کی بشارت

'فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ' یعنی اپنے اس غرور کے سبب سے یہ تمھارے درپے آزار بھی ہوں گے لیکن تم اس کی پروا نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اپنے اللہ کی پناہ میں دو اور اطمینان رکھو کہ اصل سننے دیکھنے والا وہی ہے۔ وہی تم کو ان متکبروں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷)

لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے آسان ہے

فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ مرکھپ جانے کے بعد لوگوں کا از سرِ نو پیدا کرنا ناممکن ہے تو یہ ان کی جہالت ہے۔ جو خدا اپنی قدرت سے آسمانوں اور زمین کو وجود میں لا سکتا ہے۔ آخر اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا! زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا! اگر اللہ تعالیٰ اتنے بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اور ثابت ہے کہ کر سکتا ہے تو یہ کام کیوں نہیں کر سکتا جو ان سے کہیں چھوٹا ہے! 'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' یعنی ہے تو یہ بالکل واضح حقیقت، ہر شخص کی سمجھ میں آنی چاہیے' لیکن اکثر لوگ اتنی واضح حقیقت بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۸-۵۹)

آخرت کی اخلاقی ضرورت

یہ آخرت کی اخلاقی ضرورت واضح فرمائی کہ اگر آخرت نہیں ہے، جیسا کہ یہ لوگ گمان کیے بیٹھے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے۔ اس کے خالق کے نزدیک عقل و دل کے اندھے اور عقل و بصیرت رکھنے والے دونوں یکساں ہیں اور نیکوکار اور بدکار میں اس کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اس سے خدا کی صفاتِ عدل، حکمت، رحم اور قدرت کی نفی ہو جاتی ہے جو دوسرے الفاظ میں خود خدا کی نفی کے ہم معنی ہے۔ اس وجہ سے قیامت کا آنا لازمی ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے لیکن تعجب ہے کہ اکثر لوگ اس بدیہی حقیقت پر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں

'اَعْمٰى' یہاں عقل و دل کے اندھوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور 'بَصِيْرٌ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والے اور اللہ کی نشانیوں پر غور کرنے والے ہیں۔

'قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ حقائق ایسے مخفی نہیں ہیں کہ کسی کی سمجھ میں آ ہی نہ سکیں۔ لیکن جو لوگ سرے سے اپنے سمع و بصر سے کام ہی نہیں لینا چاہتے ان کا کیا علاج۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (۶۰)

لفظ 'استکبار' یہاں اعراض کے مفہوم پر متضمن ہے۔ حرف 'عن' اس پر دلیل ہے۔

اللہ سے مانگنے کے لیے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں

آخرت کی یاد دہانی کے بعد یہ توحید کی یاد دہانی ہے کہ تمہارا رب یہ اعلان کر چکا ہے کہ مجھ سے مانگنے کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کو مانگنا ہو وہ مجھی سے مانگے، میں اس کی درخواست قبول کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں نے اپنے دروازے پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا ہے تو دوسروں کو

سفارشی بنانے اور ان کی خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان اس قسم کے وسائط حائل نہیں کیے ہیں بلکہ ہر بندہ اس سے براہِ راست تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس سے دعا و التجا کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔

'اَسْتَجِبْ لَكُمْ' کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی ہر صحیح دعا ضرور قبول فرماتا ہے۔ اگر کوئی دعا قبول نہیں فرماتا یا اس کو مؤخر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قبول نہ کرنے یا اس کے مؤخر کرنے ہی میں اس کی حکمت ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اس پر راضی رہے اس لیے کہ اسی میں اس کے لیے خیر ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کا دامن پکڑنا بالکل بے سود ہے اس لیے کہ ردّ و قبول تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اپنی حکمتوں کو صرف وہی جانتا ہے۔ قبولیتِ دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

'اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ ...... الاٰية' فرمایا کہ میری اس منادی عام کے باوجود جو لوگ محض اپنے غرور کے سبب سے میری بندگی سے اعراض کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ عنقریب اس غرور کی پاداش میں ذلیل ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔

اوپر آیت ۵۶ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے وہ کسی دلیل یا کسی واقعی شبہ کی بنا پر ایسا نہیں کر رہے تھے بلکہ محض اس بنا پر کر رہے تھے کہ اس سے ان کے غرور سیادت کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے ان کی بات مان لی تو ہم ہیٹے اور یہ ہم پر بالا ہو جائیں گے۔ انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ حق سے اعراض، محض بربنائے غرور کر رہے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں پڑیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶۱-۶۲)

ان آیات میں 'الَّيْلَ' کے بعد 'مُظْلِمًا' اور 'مُبْصِرًا' کے بعد 'لِتَعْمَلُوْا' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ اس حذف کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

توحید اور معاد کے آفاقی دلائل

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ایک ہی ساتھ توحید اور معاد دونوں کو ثابت کرنے والی ہیں۔ ربوبیت کے پہلو سے یہ قیامت پر دلیل ہیں اور توافق کے پہلو سے توحید پر۔ فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے خنک اور تاریک بنایا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا کہ تم اس میں کام کرو۔ یہ لوگوں پر اللہ کا عظیم فضل و احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کے شکر گزار

نہیں ہوتے۔

مطلب یہ ہے کہ دوسری تمام نشانیوں سے قطع نظر کر کے اگر رات اور دن کی خلقت ہی پر غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان کا خالق نہایت ہی مہربان ہے۔ اس نے ان کی معاشی سرگرمیوں کے لیے دن بنایا تو آرام و سکون کے لیے رات بھی بنائی۔ حالانکہ اگر وہ برابر دن ہی دن رکھتا جب بھی کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا یا رات ہی رات مسلط رکھتا جب بھی کسی کی قدرت نہیں تھی کہ دن کی روشنی سے فیضیاب کر سکے۔ اس کی اس رحمت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ لوگ اس کے شکر گزار رہیں لیکن اکثر لوگ اس کے شکر گزار نہیں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و ربوبیت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور اسی کے شکر گزار رہے اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھایا لیکن اس کی ناشکری کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ناشکرے اور شکر گزار دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت غلط اور اس کے عدل کے خلاف ہے۔

رات اور دن کی یہ سازگاری کہ دونوں مل کر انسان کی پرورش کرتے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات میں جو چیزیں بظاہر اضداد کی شکل میں نظر آتی ہیں ان کے اندر بھی بڑی گہری وابستگی و پیوستگی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک بالاتر حکیم ہستی ان تمام اضداد کو اپنی حکمت کے تحت استعمال کر رہی ہے۔ اسی کا ارادہ سب پر حاکم اور وہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶۳)

ایک تنبیہ

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ جس طرح تمھاری عقل الٹ گئی ہے کہ قرآن کی سیدھی سادی بات کا انکار کر کے الٹی راہ چل رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے بھی قومیں گزری ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کر کے الٹی چال چلتی رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام تمھارا بھی ہوگا اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۴)

توحید اور معاد کا مضمون ایک نئے اسلوب سے

توحید اور معاد کا وہی مضمون جو اوپر گزرا، ایک نئے اسلوب سے واضح فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور اس طرح تمھارے لیے وہ گہوارہ تعمیر ہوا جس میں تم زندگی

بسر کرتے ہو۔ ان دونوں کا تلازم اور ان کی باہمی سازگاری اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان دونوں پر ایک ہی خدا کا تصرف ہے۔ اگر ان کے الگ الگ خدا ہوتے تو اس مکان کا تمھاری رہائش کے لیے موزوں ہونا تو درکنار اس کا وجود میں آنا ہی ممکن نہیں تھا۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے یہ گھر بنایا ہے اور آسمانوں اور زمین دونوں میں اسی کی حکمرانی و کارفرمائی ہے۔

'وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ'۔ یعنی ایک آراستہ و پیراستہ گھر تیار کر کے اس میں تم کو وجود بخشا پھر تمھاری صورت گری کی، اس صورت گری میں بھی تمھارے اوپر یہ خاص فضل فرمایا کہ اس دنیا کی دوسری مخلوقات کے مقابل میں تمھاری صورت نہایت اچھی بنائی۔ 'احسان' کے معنی کسی کام کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ' (التین: ۴) (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا) بہترین ساخت سے مراد ظاہر ہے کہ صرف شکل و صورت کی ساخت نہیں ہے بلکہ ان مادی و معنوی قوتوں اور صلاحیتوں کی نہایت اعلیٰ ترتیب و تشکیل بھی ہے جن کی بدولت انسان کو اس دنیا کی دوسری مخلوقات پر برتری حاصل ہوئی۔

'وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ'۔ یعنی جس طرح اس نے تمھاری رہائش کے لیے نہایت اعلیٰ مکان آراستہ کیا اسی طرح تمھیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔

'ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ'۔ پس لاریب وہی تمھارا بھی رب ہے اور اس عالم کا بھی رب ہے اور وہ بڑا ہی بافیض اور برکت والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶۵)

یعنی حقیقی زندہ اور زندگی بخش وہی ہے۔ اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ، جیسا کہ دوسرے مقام میں ارشاد ہوا ہے 'اموات غیر احیاء' زندگی سے محروم مردے ہیں۔ وہ نہ سنتے ہیں نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ان کو پکارنا بالکل لاحاصل ہے تو اللہ ہی کو پکارو اور پورے اخلاص کے ساتھ اسی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جو تمام عالم کا رب ہے۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۶۶)

مناظرہ بازوں کو فیصلہ کن جواب

یہ ان مناظرہ بازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فیصلہ کن جواب دلوایا ہے جو آبائی دیوتاؤں کی حمایت میں آپ سے لڑ رہے تھے۔ فرمایا کہ ان کو خبردار کر دو کہ مجھے ان تمام دیوتاؤں کی پرستش سے روک دیا گیا ہے جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو۔ خواہ تم کتنا ہی زور لگاؤ میں ان کی پرستش نہیں کر سکتا بالخصوص

جب کہ میرے رب کے پاس سے اس باب میں نہایت روشن دلیلیں بھی میرے پاس آ چکی ہیں۔ مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ میں اپنے آپ کو کلیۃً عالم کے خداوند کے حوالہ کر دوں یعنی عبادت بھی اسی کی کروں اور اطاعت بھی اسی کی کروں ـــــ یہ اعلانِ براءت اس لیے کیا گیا کہ مخالفین کے ذہن کے کسی گوشہ میں اگر یہ توقع ہو کہ وہ دباؤ ڈال کر آپ کو کچھ نرم کر لیں گے تو وہ اس سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۶۷)

اس آیت میں کلام کے بعض اجزا عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہیں۔ ترجمہ میں ہم نے وہ محذوفات واضح کر دیے ہیں اور دوسرے مقام میں ان کے نظائر بھی ہم پیش کر چکے ہیں۔

انسان کی خلقت کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خلقت جن ادوار و مراحل میں سے گزرتی ہے اگر انسان انہی پر غور کرے تو خدا کی قدرت و حکمت اور توحید و آخرت ہر چیز واضح کر دینے کے لیے وہی کافی ہیں۔ فرمایا کہ اس نے تمہاری خلقت کا آغاز مٹی سے کیا، پھر تمہاری نسل کا سلسلہ پانی کی بوند سے چلایا۔ پانی کی یہ بوند اولاً خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے پھر بتدریج نشوونما پا کر ایک جنین کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو ایک جیتے جاگتے بچہ کی صورت میں ماں کے پیٹ سے برآمد کرتا ہے۔

'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا' یعنی پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور پھر تمہیں زندگی کی مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ تم بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہو۔ گویا دونوں فعلوں سے پہلے پروان چڑھانے اور مہلت دینے کا مضمون محذوف ہے۔

'وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى' یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ تم میں سے ہر ایک کو جوانی تک پہنچنا نصیب ہوتا ہو بلکہ تم میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو بچپن ہی میں فوت ہو جاتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کو زندگی کی مہلت نصیب ہوتی ہے لیکن بس ایک وقت معین تک۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کو غیر محدود زندگی حاصل ہو جائے۔ اس ٹکڑے میں بھی 'لِتَبْلُغُوْۤا' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ تم میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کو زندگی کی مہلت نصیب ہوتی ہے۔

'وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' یہ علت بتائی ہے اس بات کی کہ اللہ نے تمہاری زندگی کو اتنے پیچ و خم سے کیوں گزارا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوا کہ وہ بنے بنائے انسان زمین سے اٹھا کھڑے کرتا یا آسمان سے اتار دیتا؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس لیے کیا کہ تم اپنے وجود کے ان تمام مراحل پر غور کرو اور اپنے رب کی شانوں اور اس کی قدرت و حکمت کو سمجھو اور ان پر ایمان لاؤ۔ یہ اشارہ اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس طرح بنائی ہے کہ یہ ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تعلیم گاہ بن

گئی ہے جن کا سمجھنا اور ماننا انسان کی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہے۔ یہاں بھی 'تَعۡقِلُوۡنَ' سے پہلے یہ مضمون محذوف ہے کہ اللہ نے تمھاری خلقت جو اس طرح بنائی ہے تو اس لیے کہ تم اس خلقت پر غور کرو اور اپنے رب کی قدرت و حکمت کو سمجھو۔

جو خدا اتنی قدرت و حکمت کے ساتھ انسان کو وجود میں لاتا ہے، جس کو بلا شرکت غیرے ہر ایک کی زندگی اور موت، جوانی اور پیری پر کلی اختیار حاصل ہے، جس نے ہر ایک کے لیے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا رکھی ہے، کیا وہ خدا لوگوں کو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتا یا کوئی اور اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکتا ہے! پس ثابت ہوا کہ وہ وحدہٗ لا شریک ہے اور وہ لازماً لوگوں کو ایک روز جزا و سزا کے لیے اکٹھا کرے گا اور اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ اس مضمون کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ فاطر آیت ۱۱ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

هُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ (۶۸)

یعنی زندگی اور موت تمام تر اسی کے اختیار میں ہے اور اس کی قدرت کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کوئی چیز اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ وہ فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے اور اسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح وہ چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کو بھی یوں ہی سمجھو۔ جب وہ اس کو لانا چاہے گا تو اس کے ایک کلمۂ کن سے وہ چشم زدن میں آجائے گی۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰی یُصۡرَفُوۡنَ (۶۹)

مخالفین کو دھمکی

یعنی یہ حقائق بالکل واضح ہیں لیکن ان شامت زدوں کو دیکھو، کس طرح ان کی مت ماری گئی ہے کہ وہ اللہ کی ان واضح آیات کی تکذیب کے لیے کٹ حجتی کر رہے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِالۡكِتٰبِ وَ بِمَاۤ اَرۡسَلۡنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۟ۛ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ (۷۰)

'کتاب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ ان کے جرم کا بیان ہے کہ انھوں نے قرآن کی بھی تکذیب کی اور ان تمام تعلیمات کی بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ تمام رسولوں کی تعلیم بنیادی طور پر یہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے تو قرآن کی تکذیب سب کی تکذیب ہوئی۔ 'فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ' یہ دھمکی ہے۔ یعنی اگر انھوں نے یہ جسارت کی ہے تو عنقریب وہ اس کا انجام بھی دیکھیں گے۔

اِذِ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ وَ السَّلٰسِلُ ؕ یُسۡحَبُوۡنَ ۙ فِی الۡحَمِیۡمِ ۬ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسۡجَرُوۡنَ (۷۱-۷۲)

'وَالسَّلٰسِلُ' کے بعد 'فِیۡۤ اَرۡجُلِهِمۡ' کے الفاظ میرے نزدیک محذوف ہیں۔ ترجمہ میں ان کو میں نے کھول دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے استکبار کی بنا پر اللہ کی آیات کی تکذیب کی اس وجہ سے ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی۔ اس کے بعد

وہ گرم پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے۔ 'سَجَرَ التَّنُّور' کے معنی ہیں 'تنور کو ایندھن سے بھر دیا'۔

ثُمَّ قِیْلَ لَهُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَیْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِیْنَ (۷۳-۷۴)

مشرکین کی بدحواسی

اس کے بعد ان سے سوال ہوگا کہ اب بتاؤ، خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے اس کے مقابل میں دوسرے جو شریک تم نے ٹھہرا رکھے تھے، وہ کہاں گئے! اگر وہ ہیں تو ان کو بلاؤ، تمھیں اس عذاب سے چھڑائیں! 'مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' یہاں اللہ کے مدِ مقابل کے مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ آتا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

وہ جواب دیں گے کہ وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم کسی چیز کو پوجتے ہی نہیں تھے۔ یعنی پہلے وہلہ میں تو وہ اقرار کر لیں گے کہ ان کے کچھ معبود تھے جن کی وہ پرستش کرتے رہے تھے لیکن یہاں ان میں سے کوئی بھی ان کی مدد کے لیے موجود نہیں ہے لیکن پھر جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ ان کی عبادت کی پاداش ہی میں ان کو اس ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑا ہے تو ان کا انکار کر دیں گے کہ شاید یہ انکار ان کے لیے کچھ نافع ہو جائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت کے دن مشرکین پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ وہ ایک ہی سانس میں اپنے معبودوں کا اقرار بھی کریں گے اور انکار بھی۔ سورۂ انعام کی آیات ۲۳-۲۴ کے تحت اس پر بحث گزر چکی ہے۔

'كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِیْنَ'۔ یہ اشارہ ان کے اسی اقرار و انکار کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کو اس طرح حواس باختہ کر دے گا کہ ان کو کچھ ہوش نہیں رہے گا کہ ابھی وہ کیا کہہ گزرے ہیں اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کی وضاحت پیچھے بھی ہو چکی ہے اور آگے یہ مضمون حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۸ میں بھی آ رہا ہے وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۷۵)

کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے

یعنی یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے نتیجہ ہے اس بات کا کہ تم زمین میں بلا کسی حق کے اکڑتے اور اتراتے تھے۔ دنیا میں جو چیزیں بھی تمھیں ملیں ان میں سے کوئی چیز بھی تمھاری ذاتی نہیں بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی تھی اس وجہ سے ان کا حق یہ تھا کہ تم اپنے رب کے شکر گزار اور اس کے فرمانبردار بنتے لیکن تم نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنا ذاتی حق سمجھا اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر اکڑنے اور اترانے لگ گئے اور اس غرور میں اللہ کے ان رسولوں کی بھی تم نے توہین و تکذیب کی جنھوں نے تمھیں اصل حقیقت کی یاددہانی کرنی چاہی۔

آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے اس وجہ سے صرف اسی کے

لیے تکبر زیبا ہے کسی دوسرے کے لیے یہ زیبا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا تکبر کرتا ہے تو یہ بِغَیْرِ الْحَقِّ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کر رہا ہے جو شرک ہے۔ اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ میں اسی حقیقت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِیْنَ (۷۶)

متکبرین کا انجام

یعنی اب عذر و معذرت بالکل بے سود ہے۔ یہ جہنم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اشارہ جہنم کے ان سات دروازوں کی طرف ہے جن کی تفصیل دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔ ارشاد ہو گا، ان میں داخل ہو جاؤ اور اب اسی میں ہمیشہ رہنا ہے، کبھی اس سے نکلنے کی توقع نہ رکھنا۔ فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِیْنَ۔ یہ ان سے منہ پھیر کر ارشاد ہو گا کہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہو گا جو ان متکبروں کے حصہ میں آئے گا!

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ (۷۷)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ ان لوگوں کی ان حرکتوں پر صبر کرو۔ جس عذاب کی دھمکی ان کو دی جا رہی ہے، اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ لازماً ظہور میں آ کے رہے گا۔ یا تو تمھاری زندگی ہی میں اس کا کچھ حصہ ظہور میں آئے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بالآخر انھیں ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے، ہم آخرت میں ان کو اس کا مزا چکھائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو قسم کے عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک وہ عذاب جو اسی دنیا میں پیش آتا ہے اگر قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے اور دوسرا وہ عذاب جس سے آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ یہاں بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ سے اسی دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی عذاب آخرت کا ایک حصہ ہے جس سے تمام کفار و مشرکین کو لازماً آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو، رسولوں کی عام سنت کے مطابق، بصورت تکذیب اس دنیا میں بھی۔ عذاب کی وعید سنائی گئی تھی لیکن آپ کی قوم کی اکثریت اسلام لائی اس وجہ سے اس پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اس کے اشرار کا مواخذہ آخرت پر اٹھا رکھا گیا جس کی طرف فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ ۚ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۷۸)

تسلی کا ایک خاص پہلو

یہ وہی تسلی کا مضمون ایک خاص پہلو سے واضح فرمایا جا رہا ہے۔ رسولوں کے مکذبین کی یہ عام روش رہی ہے کہ جب ان کو رسول نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو قوم نے رسول کو زچ کرنے کے لیے اس

عذاب کا کوئی نمونہ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کا ایک جواب اوپر والی آیت میں دیا گیا اب اسی کا ایک اور پہلو واضح فرمایا گیا ہے کہ رسولوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کی نشانیاں دکھانے کا معاملہ رسول کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے۔ اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ عذاب بھیجتا ہے اور اگر نہیں ہوتا تو نہیں بھیجتا۔ اس چیز کا مطالبہ لوگوں کو نہ رسول سے کرنا چاہیے اور نہ رسول کو لوگوں کے اس مطالبہ سے پریشان ہونا چاہیے۔ البتہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ جب اللہ کا حکم عذاب کے لیے صادر ہو جاتا ہے تو ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس وقت شامت انہی لوگوں کی آتی ہے جو حق کو جھٹلاتے اور رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖۗ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ (۷۹ - ۸۱)

ربوبیت کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر کی آیت میں نشانیٔ عذاب کے مطالبہ کی طرف اشارہ گزرا۔ وہاں رسولؐ کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس چیز کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اس وجہ سے معاملہ اسی کے سپرد کرنا چاہیے۔ اس آیت میں عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرنے والوں کو ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ عذاب ہی کی کوئی نشانی کیوں مانگتے ہو، خدا کی ربوبیت کی بے شمار نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو تمھارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں! اس نے تمھارے لیے چوپائے پیدا کیے جن میں کچھ تمھاری سواری کے کام آتے ہیں اور بعض سے تم اپنی غذائی ضروریات پوری کرتے ہو، علاوہ بریں تمھارے دوسرے بہت سے مفاد بھی ان سے وابستہ ہیں۔ ان کو خالق نے ایسا بنایا ہے کہ ان پر سوار ہو کر تم اپنی مہمات کے لیے نکلتے ہو اور اپنے منصوبے بروئے کار لاتے ہو! یہ اشارہ اونٹ کی طرف ہے جو اہلِ عرب کے لیے ان کے صحرائی سفینہ کی منزلت میں تھا۔ فرمایا کہ تم اپنے صحرا کے طویل سفروں میں ان پر سوار ہوتے ہو اور اسی طرح سمندر میں کشتیوں سے سفر کرتے ہو۔ فرمایا کہ کیا یہ سب خدا کی نشانیاں نہیں ہیں! آخر کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے! مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ جس پروردگار نے تمھاری ضروریات کا یہ کچھ اہتمام کیا ہے کیا وہ تمھیں یوں ہی چھوڑے رکھے گا، ان نعمتوں کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں کرے گا! اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اسی کی وعید تم کو پیغمبر سنا رہا ہے۔ پھر اس کی تکذیب کے لیے یہ کیا بہانہ تم نے تلاش کیا ہے کہ وہ تمھیں کوئی نشانیٔ عذاب نہیں دکھا رہا ہے! نشانیوں کی کمی تو نہیں ہے لیکن تمھارے پاس نشانیوں کو دیکھنے والی آنکھیں نہیں ہیں۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۸۲)

یہ عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو پچھلی قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ دلائی کہ اگر خدا کی ربوبیت کے آثار ان کو نظر نہیں آتے تو کیا انھوں نے اپنے ملک کی بھی سیاحت نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے کی ان قوموں کا کیا انجام ہو چکا ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی، اگرچہ وہ اپنی قوت و جمعیت کے اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ طاقتور اور اپنے تمدنی و تعمیری کارناموں کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کے کام آنے والی نہ بنی جن کا اندوختہ وہ فراہم کرتے رہے تھے۔

لفظ 'آثار' کا تعلق 'اکثر' سے ہے۔ یہ عاد و ثمود کے ان تعمیری آثار کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب قوم اخلاقی زوال میں مبتلا ہو جاتی ہے تو مجرد اپنی عددی اکثریت اور اپنے تمدنی آثار کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتی۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۸۳)

فرمایا کہ جب اللہ کے رسول ان قوموں کے پاس توحید، آخرت اور جزا و سزا کی نہایت کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی باتوں کا مذاق اڑایا اور اپنے علم پر نازاں رہے۔ بالآخر اس عذاب نے ان کو گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ یعنی اپنے تھوڑے سے علم کو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے انھوں نے بہت بڑی چیز سمجھا اور یہ خیال کر لیا کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں بس دنیا کل اتنی ہی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۸۴-۸۵)

یعنی رسولوں کے دلائل سے تو وہ نہیں مانے لیکن جب انھوں نے اللہ کا عذاب دیکھ لیا تب وہ پکار اٹھے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور جن چیزوں کو اب تک خدا کا شریک گردانتے رہے تھے، ان کا ہم نے انکار کیا! فرمایا کہ ان کا یہ ایمان جو وہ عذاب دیکھ چکنے کے بعد لائے، ان کے لیے کچھ نفع دینے والا نہیں بنا بلکہ عذاب نے ان کو پامال کر کے رکھ دیا۔ ایمان معتبر وہ ہے جو عذاب دیکھنے سے پہلے دلائل کی روشنی میں لایا جائے۔ اگر اس کا وقت گزر گیا اور عذاب کی گھڑی سر پر آگئی تو اس وقت کا ایمان بالکل بے سود ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہمیشہ سے اس کے بندوں میں جاری رہی ہے۔ جب عذاب آجاتا ہے تو اس وقت اس کا انکار کرنے والے

لازماً نامراد ہو کے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

لاہور

۲۷۔ اگست، ۱۹۷۵ء

۱۹۔ شعبان، ۱۳۹۵ھ

۴۱

حٰمٓ السّجدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا بھی اصل مضمون سابق سورہ کی طرح توحید ہی ہے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی بیان ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو انذار بھی کیا گیا ہے جو قرآن کی دعوتِ توحید کی مخالفت کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان ایمان والوں کو ابدی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے جو مخالفوں کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے علی الرغم، توحید پر استوار رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تمھارے دشمن خواہ کتنا ہی جاہلانہ رویہ اختیار کریں لیکن تم ان کی جہالت کا جواب صبر و بردباری سے دینا۔ یہی طریقہ بابرکت اور اسی میں تمھاری دعوت کی کامیابی مضمر ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۸) سورہ کی تمہید، جس میں یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ خدائے رحمان و رحیم نے اہلِ عرب پر یہ عظیم احسان فرمایا کہ قرآن کو عربی زبان میں ان کے لیے نذیر و بشیر بنا کر اتارا۔ اس احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کی قدر کرتے لیکن یہ نہایت رعونت سے اس نعمت کو ٹھکرا رہے ہیں اور ایمان لانے کے بجائے اس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان کو بتا دو کہ مجھے جس توحید کی وحی ہوئی تھی وہ میں نے تم کو پہنچا دی، رہا عذاب کا معاملہ تو یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں ایک بشر ہوں، خدا نہیں ہوں۔

اہلِ ایمان کو استغفار و استقامت کی تلقین اور اجرِ دائمی کی بشارت اور مشرکین کو ابدی تباہی کی وعید جو ایمان و انفاق کے بجائے محض اپنے مزعومہ شفعاء کے بل پر آخرت سے بالکل بےفکر بیٹھے تھے

(۹ - ۱۲) اس کارخانۂ کائنات میں جو قدرت و حکمت، جو رحمت و ربوبیت اور جو نظم و اہتمام کارفرما ہے وہ شاہد ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل یا مختلف دیوتاؤں کی بازی گاہ یا رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی سے وجود میں آیا ہے اس وجہ سے جو لوگ شرکاء و شفعاء کے بل پر خدا اور آخرت سے غافل ہیں وہ صرف اپنی شامت کے منتظر ہیں۔

(۱۳ - ۱۸) قریش کو تہدید و وعید کہ اگر تم رسول کی دعوت کی تکذیب ہی پر تل گئے ہو تو رسولوں کی تکذیب کرنے والی

قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔ تم سے پہلے عاد و ثمود نے بھی تمہاری ہی روش اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو تباہ کر دیا اور یاد رکھو کہ قوت و شوکت میں وہ تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔

(۱۹-۲۴) مشرکین جو اپنے شریکوں کی شفاعت کی امید لیے بیٹھے ہیں یاد رکھیں کہ قیامت کے دن ان کے کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں خود ان کے خلاف گواہی دیں گے اور کسی کی شفاعت ان کے کچھ کام نہیں آئے گی۔ اس دن ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سب سے زیادہ ان کی تباہی کا سبب یہ چیز ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اس وہم میں مبتلا رہے کہ اس کو بندوں کے سارے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔ اس دن ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ان کا واحد ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ اگر وہ معافی کی درخواست کریں گے تو ان کو معافی نہیں ملے گی۔

(۲۵-۲۹) گمراہ لیڈروں اور ان کے گمراہ پیروؤں کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں جمع کرے گا۔ قرآن کی دعوتِ توحید کی مخالفت میں انھوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کیا، اس بات کا انجام اس دن ان کے سامنے آئے گا۔ اس وقت وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور گمراہ ہونے والے عوام اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے رب! انسانوں اور جنوں میں سے جنھوں نے بھی ہمیں گمراہ کیا ہے تو ان کو ہمیں دکھا کہ ہم ان کو اپنے پاؤں سے روند ڈالیں۔

(۳۰-۳۲) جو لوگ تمام مخالفتوں اور سازشوں کے علی الرغم توحید پر جمے رہیں گے قیامت کے دن ان کے پاس فرشتے اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و نعمت کی بشارت لے کر آئیں گے۔

(۳۳-۳۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی کہ تم نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ دعوت لے کر اٹھے ہو۔ اگر جاہل لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو ان کی جہالت کا مقابلہ شرافت اور عفو و درگزر سے کرو۔ اگرچہ یہ کام نہایت مشکل ہے لیکن یہ نہایت اعلیٰ حکمت ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور نصیبہ ور درحقیقت وہی لوگ ہیں۔ اس وجہ سے تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے یہی روش زیبا ہے۔ اور اگر کبھی شیطان کی وسوسہ اندازی سے اس کی کوئی خلاف ورزی ہو جائے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

(۳۷-۴۰) ابتدائے سورہ میں توحید اور معاد کی جو دلیل بیان ہوئی ہے بعض دوسرے دلائل آفاق سے اس کی تائید اور ان لوگوں سے اظہارِ بیزاری، جو ان واضح آیات کے بعد بھی توحید اور آخرت کی مخالفت کر رہے تھے۔

(۴۱-۴۴) قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب پر جو احسان فرمایا اور جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ گزر چکا ہے، اس کی تائید ایک نئے اسلوب سے۔ قرآن کی شان اور اس کی عظمت کے بیان کے ساتھ ساتھ قرآن کے خلاف اہلِ کتاب کے القاء کیے ہوئے ایک اعتراض کا جواب اور مکذبین کی اصل بیماری کی نشان دہی۔

(۴۵-۴۶) یہود کے القاء کیے ہوئے اس سوال کا جواب کہ جب قرآن تورات کو آسمانی کتاب تسلیم کرتا ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور آسمانی کتاب کی کیا ضرورت پیش آئی؟

(۴۷-۵۱) جو لوگ آخرت کا مذاق اس وجہ سے اڑا رہے تھے کہ اس کا ظہور نہیں ہو رہا ہے یا پیغمبر اس

کی تاریخ نہیں متعین کرسکتے، ان کو جواب اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے نچنت تھے ان کو تنبیہ کہ اس دن سب اپنے شریکوں سے برأت کا اعلان کریں گے۔ علاوہ ازیں قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کی تنک ظرفی پر اظہار افسوس کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا خدا کی گرفت میں آجاتے ہیں تو فوراً بلبلا اٹھتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کو ذرا ڈھیل دے دیتا ہے تو شیخی بگھارنے اور عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔

(۵۲-۵۴) خاتمہ سورہ جس میں تکذیب قرآن کے ہولناک انجام کی طرف اشارہ اور اس بات کی تہدید ہے کہ اب قرآن کی صداقت کی نشانیاں آفاق و انفس میں ظاہر ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جو لوگ شک میں مبتلا ہیں وہ عنقریب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

سُوْرَةُ حٰمٓ السَّجْدَةِ (۴۱)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ اٰيات : ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱ - ۱۲

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝۶ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝۱۰ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ

الثلثة

ع ۱۵

كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ڰ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾

ترجمۂ آیات: ۱ - ۱۲

یہ حٰم ہے۔ قرآن خدائے رحمان و رحیم کی تنزیل ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں ان لوگوں کے لیے کی گئی ہے جو جاننا چاہیں خوشخبری دینے والی اور آگاہ کر دینے والی۔ پس ان کی اکثریت نے اس سے اعراض کیا اور وہ اس کو نہیں سن رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل ان باتوں سے اوٹ میں ہیں جن کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو اور ہمارے کان اس چیز سے بہرے ہیں جو تم ہمیں سنا رہے ہو اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک حجاب حائل ہے تو جو کچھ تمھیں کرنا ہے وہ کر گزرو، ہم بھی جو کچھ کرنے والے ہیں کر کے رہیں گے۔ ۱ - ۵

ان سے کہہ دو، میں تو تمھارے ہی مانند ایک بشر ہوں۔ میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے تو اسی کی طرف یکسو ہو کر اپنا رخ کرو اور اس سے مغفرت مانگو اور ان مشرکوں کے لیے تباہی ہے جو انفاق نہیں کرتے اور آخرت کے تو اصلی منکر وہی ہیں۔ البتہ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کیے ان کے لیے دائمی صلہ ہے۔ ۶-۸

ان سے پوچھو، کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کر رہے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور اس کے شریک ٹھہراتے ہو، وہی تو تمام عالم کا خداوند ہے! اور اس نے اس زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں اس کے غذائی ذخیرے ودیعت کیے سب ضرورتمندوں کے لیے یکساں طور پر۔ یہ سب ملا کر چار دنوں میں۔ پھر اس نے آسمان

کی طرف توجہ فرمائی، اور وہ اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا، پس اس کو اور زمین کو حکم دیا کہ تم ہمارے احکام کی تعمیل کرو، طوعاً یا کرہاً، وہ بولے کہ ہم رضامندانہ حاضر ہیں۔ پس ان کے سات آسمان ہونے کا فیصلہ فرمایا دو دنوں میں۔ اور ہر آسمان میں اس کے متعلقہ فرائض وحی کر دیے اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سنوارا اور اس کو اچھی طرح محفوظ کیا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔ ۹-۱۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۱-۲)

حٰمٓ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ پچھلی سورہ میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جو سورتیں اس نام سے موسوم ہیں ان سب میں مضامین مشترک سے ہیں۔ تالیفِ کلام اگرچہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو مبتدا مان کر بعد کے جملہ کو اس کی خبر قرار دیجیے لیکن ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا اس میں محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ میں بھی مبتدا میرے نزدیک حذف ہے یعنی یہ قرآن خدائے رحمان

ظاہر کرنا بھی ہے جو قرآن جیسی عظیم رحمت کی ناقدری اور اس پر ایمان لانے کے بجائے اس عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ گویا ان کو بتایا جا رہا ہے کہ خدائے رحمان و رحیم نے تو ان کے لیے ایک عظیم برکت و رحمت نازل فرمائی لیکن وہ اپنی شامت کے باعث رحمت کی جگہ نقمت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ مضمون واضح ہوتا جائے گا۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۳-۴)

اہلِ عرب پر قرآن کا خاص حق

یہ خبر کے بعد دوسری خبر اور اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و عنایت کی تفصیل ہے جو قرآن کی صورت میں خاص طور پر اس نے اہلِ عرب پر فرمائی کہ اس کو عربی زبان میں اتارا تاکہ ان کو اس کلام کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کی وضاحت ان کے لیے خود ان کی زبان میں کیوں نہیں فرمائی؟ چنانچہ آگے اسی سورہ میں اسی بات کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ (فصّلت: ۴۴)

اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن کی صورت میں اتارتے تو یہ لوگ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیتیں ہمارے لیے اچھی طرح کھولی کیوں نہ گئیں؟ کلام عجمی اور مخاطب عربی!

'لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ' میں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ہم نے یہ سارا اہتمام ان لوگوں کے لیے کیا جو جاننے اور سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو جاننے کی خواہش ہی سے محروم ہیں ان کے لیے سارے جتن بیکار ہیں۔ اس اسلوبِ بیان میں عربوں کے لیے ایک تحریض و ترغیب بھی ہے کہ انھیں جاننے اور سمجھنے کا حریص ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ اُمّی رہے ہیں اور اب پہلی بار اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کی تعلیم کے لیے ان کی زبان میں اپنی کتاب اتاری ہے۔

قرآن کے ردّ و قبول دونوں کے دور رس اثرات

'بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا' یہ قرآن کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ بشیر و نذیر بن کر نازل ہوا ہے۔ جو لوگ اس کو قبول کریں گے ان کے لیے یہ دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح کی بشارت ہے اور جو تکذیب کریں گے ان کے لیے یہ عذابِ الٰہی کا پیش خیمہ ہے۔ یعنی کوئی اس کو سہل چیز نہ سمجھے۔ اب یہ سب سے بڑی رحمت بھی ہے اور سب سے بڑی نقمت بھی اس وجہ سے جو لوگ اس کی مخالفت کے درپے ہیں وہ اس مخالفت کے انجام کو دُور تک سوچ لیں۔

قرآن محض وعظ نہیں بلکہ خدائی انذار ہے

'فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ' یعنی اکثر لوگوں نے اس کی اس اہمیت کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اس کو ایک معمولی چیز سمجھ کر اس سے اعراض اختیار کر رکھا ہے اور اس کو سننے سمجھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ انھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ یہ محض کسی واعظ کا وعظ نہیں ہے بلکہ یہ خدائی انذار ہے اور یہ جن باتوں سے آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ہر بات لازماً سامنے آ کے رہے گی۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (۵)

یہ اس اعراض اور نہ سننے کی تفصیل ہے کہ وہ بڑی رعونت و تمکنت کے ساتھ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کی طرف تم ہمیں دعوت دے رہے ہو ان کو قبول کرنے کے لیے ہمارے دل بالکل بند ہیں یعنی جس توحید اور آخرت کی تم دعوت لے کر اٹھے ہو یہ دعوت کسی طرح ہمارے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو یہود کی زبانی 'قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ' کے الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ لفظ 'اَكِنَّةٌ' پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

'وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ' کے بعد 'من استماع القراٰن' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں۔ 'مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ' کا تقابل اس حذف کی طرف اشارہ کر رہا ہے؛ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی یہ قرآن جو تم ہم کو سنا رہے ہو اس کے سننے کے لیے ہمارے کان بہرے ہیں۔

'وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ'۔ یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان عقائد و نظریات اور مسلک و مذہب کے اختلاف کی ایک ایسی دیوار حائل ہو گئی ہے کہ اب ہمارے مل سکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

مخالفینِ قرآن کا آخری مطالبہ

'فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ'۔ یعنی جب ہمارے درمیان ایسی دیوار حائل ہو چکی ہے کہ اب ہم ایک دوسرے سے کبھی مل ہی نہیں سکتے تو اب جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور ہم بھی جو کچھ کرنے والے ہیں وہ اب بلا پس و پیش کر کے رہیں گے۔ اگرچہ الفاظ سے ظاہر نہیں ہے لیکن اوپر 'بشیر و نذیر' کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھ کے غور کیجیے تو 'فَاعْمَلْ' کے اندر ان کی طرف سے عذاب کا مطالبہ مضمر ہے۔ یعنی تم اپنے قرآن میں جس عذاب کی روز دھمکی سنا رہے ہو اب ہمارے اس فیصلہ کن اعلان کے بعد اس کو لاؤ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو ورنہ ہم تو بہر حال جو کچھ کرنے والے ہیں کر کے رہیں گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا

اس کا شریک و سہیم نہیں ہے تو بالکل یکسو ہو کر اسی کی طرف توجہ کرو اور اب تک جس شرک میں آلودہ رہے ہو اس کی معافی مانگو اور اپنے ربِّ حقیقی کی طرف رجوع کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سن لو کہ ان مشرکوں کے لیے ہلاکی و بربادی ہے جو اللہ کی راہ میں انفاق تو کرتے نہیں، بس اپنے مزعومہ سفارشیوں کے بل پر نچنت بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ آخرت کے اصلی منکر یہی ہیں۔

لفظ زکوٰۃ انفاق کے عام مفہوم میں

'لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ' میں 'زکوٰۃ' سے مراد 'انفاق فی سبیل اللہ' ہے۔ اس مفہوم کے لیے یہ لفظ اسلام کے مکی دور میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ مدنی دور میں آکر اس کی ایک باضابطہ شکل معین ہو گئی اور پھر اس کا اطلاق اسی پر ہونے لگا۔ یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس مفہوم میں اس زمانے میں معروف تھا۔

اس جواب کا مدعا یہ ہے کہ قرآن جس عذاب کی دھمکی سنا رہا ہے اس کو لانا تو میرا کام نہیں ہے بلکہ اللہ ہی کا کام ہے البتہ یہ انذار کان کھول کر سن لو کہ جو مشرکین ایمان و عمل صالح کے بجائے اپنے شرکاء و شفعاء پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان کی ہلاکی ہے!!

شرک و شفاعت کے ساتھ آخرت کو ماننا اس کے انکار کے حکم میں داخل ہے

'وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ'۔ اس جملہ میں مبتدا کے اعادہ سے حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ آخرت کے منکر یہی ہیں۔ اس حصر کا فائدہ یہ ہوا کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جب یہ آخرت کو مانتے ہیں، اگرچہ شرک و شفاعت کے تصور کے ساتھ سہی، تو کسی نہ کسی درجے میں ان کے اس ماننے کا بھی اعتبار ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں، جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے شفعاء و شرکاء ان کو بہرحال بخشوا ہی لیں گے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں وہ آخرت کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے اصلی منکر و مکذب وہی ہیں۔ اس زور و تاکید کے ساتھ اس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے اس عدل اور اس حکمت ہی کی نفی کر دی جس پر آخرت کی بنیاد ہے۔ دوسرے اگر منکر ہیں تو محض استبعاد یا شک میں مبتلا ہیں لیکن انھوں نے تو قیامت کا سارا فلسفہ ہی ہدم کر دیا۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے شرک کو بھی صاف صاف کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شرک درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تمام بنیادی صفات کی نفی کر دیتا ہے جن کی نفی کے بعد خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں بالکل یکساں ہو کر رہ جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۸)

توحید خالص پر قائم رہنے والوں کے لیے بشارت

یہ اس انذار کے مقابل میں بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر منقطع اجر صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کریں گے یعنی بلا شائبۂ شرک توحید پر ایمان لائیں گے اور خدا کی بندگی اور اطاعت کے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو پورے اخلاص اور کامل استقامت کے ساتھ ادا کریں گے۔

'غَیْرُ مَمْنُوْنٍ' کی تاویل بعض لوگوں نے اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن قرآن کے نظائر سے تائید اسی

تاویل کی ہوتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ قرآن میں بعض جگہ یہی مضمون عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ایسی بخشش کے ہیں جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۹)

نظامِ کائنات میں توحید کے شواہد

اب یہ آسمان و زمین کے نظام کے اندر خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کی توحید کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف توجہ دلائی ہے اور آگے آیت ۱۲ میں اس بحث کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ یعنی جو شخص اس کائنات کے ان پہلوؤں پر غور کرے گا وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ یہ نہ تو ایک حادثہ کے طور پر آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے، نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے اور نہ یہ مختلف دیویوں دیوتاؤں کی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی اور اس کے علم و حکمت سے وجود میں آئی ہے۔ یہ مضمون چار آیتوں میں پھیلا ہوا ہے اس وجہ سے قارئین کی سہولت کے لیے ہم پہلے آیتوں پر الگ الگ بحث کریں گے پھر آخر میں خلاصۂ بحث پیش کر کے اس پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلہ کی پہلی آیت کو لیجیے جو اوپر نقل ہوئی ہے۔ فرمایا کہ کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کر رہے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور اس کے شریک ٹھہراتے ہو، عالم کا خداوند تو وہی ہے!

خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو اس کی تمام صفات کے اقرار کے ساتھ ہو

یہاں پہلی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خطاب اگرچہ مشرکین قریش سے ہے جو خدا کے منکر نہیں بلکہ اس کے شریک ٹھہرانے والے تھے لیکن قرآن نے ان کے اس شرک کو کفر (اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ) سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ماننا معتبر صرف وہ ہے جو اس کی تمام صفات اور ان کے تمام حقوق و مقتضیات کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانے لیکن اس طرح مانے کہ اس سے خدا کی کل یا بعض صفات کی نفی ہو رہی ہو تو یہ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت کفر ہی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے شرک کو جگہ جگہ کفر سے تعبیر اور مشرکین کو صریح الفاظ میں 'يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ' سے خطاب فرمایا ہے۔ اوپر ہم نے مشرکین کے منکرِ قیامت ہونے کی جو توجیہ کی ہے اس کو بھی پیشِ نظر رکھیے۔ یہ دونوں باتیں درحقیقت ایک ہی اصول پر مبنی ہیں۔

خدائی ایام ہمارے دنوں سے مختلف ہیں

'فِيْ يَوْمَيْنِ' میں دو دنوں سے مراد ہمارے دن نہیں ہیں بلکہ، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، اس سے خدائی دن مراد ہیں جو ہمارے شمار سے ہزار سال بلکہ بعض صورتوں میں پچاس ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ادوار کے مفہوم میں لینا چاہیے۔

آسمانوں اور زمین کی خلقت کی تفصیل

قرآن کے دوسرے مقامات میں آسمان و زمین اور ان کے متعلقات کی خلقت چھ دنوں میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں اس مجموعی تعداد کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ کس چیز کی خلقت پر کتنے دن صرف ہوئے ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین دو دنوں میں پیدا کی۔ اس کے اس کام میں کوئی اس کا ساجھی اور شریک و مددگار نہیں ہوا لیکن تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو! حالانکہ جو اس کا خالق ہے وہی اس زمین اور تمام عالم کا خداوند بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہی خداوند ہے بھی اور اسی کو ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ وہی خالق ہے لیکن تمہاری خرد باختگی کا یہ حال ہے کہ تم نے عقل و فطرت کے بالکل خلاف اور بالکل بے دلیل اس کے شریک اور مدِّمقابل بنا رکھے ہیں! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب آسمان و زمین بلکہ تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے شریک بھی ٹھہراتے تھے یہاں ان کے اسی مسلمہ پر دلیل قائم فرمائی ہے اور انداز ملامت کا ہے۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا فِيٓ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۭ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ (۱۰)

زمین اور اس کے بعض آثار — یہ زمین کی برکات کی تفصیل بیان ہو رہی ہے کہ اللہ ہی نے اس کے اندر پہاڑ گاڑے۔ ان پہاڑوں کے گاڑنے کی ایک حکمت دوسرے مقام میں بیان فرمائی ہے کہ یہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ تمام مخلوقات سمیت کسی طرف کو لڑھک جائے۔ 'مِنْ فَوْقِهَا' کے الفاظ سے مقصود ان کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی یہ نشانیاں کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہیں بلکہ یہ زمین کے اوپر ہی موجود ہیں جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ سورہ غاشیہ میں بھی پہاڑوں کی طرف اسی پہلو سے توجہ دلائی گئی ہے: أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (الغاشیۃ: ۱۷-۲۰) (کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کی خلقت ہوئی ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح اس کو بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح وہ گاڑے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح وہ سطح کی گئی ہے!!)

وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا' یعنی اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں تمام قسم کے غذائی ذخیرے ودیعت کیے۔

زمین اور اس کی برکات — اسی برکت کا کرشمہ ہے کہ یہ ہر قسم کی نباتات اگاتی ہے جن کے پھل اور پھول انسان اور دوسری مخلوقات کے کام آتے ہیں، یہ اسی کا فیض ہے کہ ایک دانہ انسان بوتا ہے اور زمین سینکڑوں دانوں کی شکل میں اس کا اصل اس کو واپس کرتی ہے۔ ایک گٹھلی یا ایک قلم آدمی زمین میں لگاتا ہے اور ایک مدتِ دراز تک اس کا پھل وہ اور اس کے اخلاف کھاتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اسی برکت کا ثمرہ ہے کہ انسان اپنی سائنس کے ذریعہ سے اس کے جتنے پرت الٹتا جاتا ہے اتنے ہی اس کے اندر سے خزانے پر خزانے نکلتے آرہے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی سائنس تھک جائے گی لیکن زمین کے خزانے کم ہونے والے نہیں ہیں۔

'وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا' یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کی آغوش میں یہاں جتنی مخلوقات ڈالی ہیں یا ڈالے گا ابھی

حساب سے اس کے اندر غذائی ذخائر بھی مقدر کر دیے ہیں۔ یہ ذخائر قیامت تک انسان کی سعی و تدبیر سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ ہر مخلوق جو اس زمین پر پیدا ہو گی اس کے حصے کا رزق اللہ تعالیٰ نے زمین کو تحویل میں دے رکھا ہے اور اس کے برآمد کرنے کی تدبیر بھی انسان کو الہام کر رکھی ہے۔

ایام کی مجموعی تعداد جو آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں لگے

'فِیْۤ اَرْبَعَۃِ اَیَّامٍ'۔ یہ سارے کام چار دنوں میں انجام پائے۔ یعنی زمین کی خلقت کے دن اور اس کے اندر پہاڑ گاڑنے اور تقدیر اقوات کے دن سب ملا کر چار دن ہوئے۔ مذکورہ کاموں میں جتنے دن صرف ہوئے۔ یہ آخر میں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اللہ نے ہر قسم کی مخلوقات کے لیے ان کے جبلی تقاضوں کے مطابق غذا فراہم کی ہے

'سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں اور ان کے بقا کے لیے جس قسم کی غذا کی احتیاج ان کے اندر رکھی ہے، ان سب کی جبلی احتیاج کے اعتبار سے یہ غذائی ذخیرے ودیعت فرمائے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ مخلوقات تو وجود میں آگئی ہوں لیکن ان کی پرورش کے لیے جس غذا کی ضرورت ہے وہ وجود میں نہ آئی ہو۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، زمین کی تہوں میں، سمندروں کی تاریکیوں میں، جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی یا بڑی مخلوق موجود ہے اس کے گرد و پیش میں اس کا طبعی رزق موجود ہے۔ ایک بکری گھاس کھا کر زندہ رہتی ہے اس کے لیے اللہ نے گھاس پیدا کی ہے۔ ایک شیر گوشت سے زندہ رہتا ہے اس کو اللہ نے شکار کے اسلحہ بھی دیے ہیں اور شکار کے لیے جانور بھی پیدا کیے ہیں۔ اور یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ کسی کو بھی اپنی مایحتاج سے زبردستی مناسبت نہیں پیدا کرنی پڑی ہے بلکہ جس کو جو کچھ بھی ملا ہے اس کے جبلی تقاضوں کے مطابق ملا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہو سکتی ہے کہ وہ اتنی بے شمار قسم کی مخلوقات پیدا کرے اور پھر ہر جنس و نوع کے جبلی تقاضوں کے متعلق ان کے لیے غذا فراہم کرے۔ خدا کے سوا اور کون ہے جو اس پر قادر ہو سکے؟

لفظ 'سوال' ایک خاص مفہوم میں

لفظ 'سوال' یہاں اسی معنی میں ہے جس معنی میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۴ میں ہے: 'وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ' (اور تم کو ان سب میں سے دیا جن کے تم محتاج ہوئے) یعنی تمہارے اندر اس نے جن چیزوں کی احتیاج رکھی وہ چیزیں بھی مہیا فرمائیں۔

اشتراکیت پسندوں کا ایک بے بنیاد استدلال

زیر بحث ٹکڑے سے اشتراکی حضرات نے غذائی مساوات کا ثبوت فراہم کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے آیت کی صحیح تاویل واضح کر دی اور یہی ہماری ذمہ داری ہے۔ لوگوں کے اندر صحیح بات سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دینا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (۱۱)

پہلے آسمان پیدا ہوا یا زمین؟

'اِسْتَوٰی اِلَی الشَّیْءِ' کے معنی ہیں اس کی طرف توجہ کی، اس کا قصد فرمایا، اس کا ارادہ کیا۔ فرمایا

کہ تخلیقِ زمین کے ان مراحل کے بعد آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور اس وقت وہ دھوئیں کی شکل میں تھا۔ دھوئیں سے مراد غبار ہے یا سائنسدانوں کی اصطلاح میں اس کو نیبولا (NEBULA) یا سحابیہ کہہ لیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت آسمان اپنی ایک ابتدائی اور ناتمام تشکل میں موجود تھا۔ اس کی یہ تشکل ظاہر ہے کہ انہی دو دنوں میں وجود پذیر ہوئی ہوگی جن میں زمین کی ابتدائی خلقت کا مرحلہ طے پایا ہے اس وجہ سے اس 'استواء' سے مقصود وہ توجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمان کو ایک تکمیلی تشکل دینے کے لیے فرمائی۔ چنانچہ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے آسمان کو سات آسمانوں کی صورت میں متشکل کیا اور نظامِ کائنات میں ہر آسمان کا جو فریضہ ہے اس کا اس کو پابند کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین دونوں کی خلقت کا آغاز تو ایک ہی ساتھ ہوا ہے لیکن جس طرح ایک وسیع الاطراف عمارت کے مختلف حصوں میں تعمیر کے مصالح کے تحت کبھی اس کے کسی گوشہ میں کام ہوتا ہے کبھی کسی گوشہ میں اسی طرح آسمان و زمین کی تعمیر کا کام بھی ہوا ہے اس وجہ سے یہ سوال غیر ضروری ہے کہ پہلے زمین پیدا ہوئی ہے یا آسمان؟ ایک مکان کی پلاننگ لازماً ایک ہی وقت میں ہوتی ہے۔ اس کے ہر حصہ کی تعمیر کے لیے ضروری میٹریل بھی فراہم کر لیا جاتا ہے۔ کام کا آغاز اگرچہ بنیادوں اور دیواروں سے ہوتا ہے لیکن ابھی ان کی تکمیل کا مرحلہ باقی ہی ہوتا ہے کہ چھت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ چھت سے متعلق ابھی کچھ مزید کام باقی ہی رہتے ہیں کہ دیواروں کے پلاستر کا کام سامنے آجاتا ہے۔ اس سے فارغ ہوئے کہ چھت کا بقیہ کام تکمیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے فراغت حاصل ہوئی تو فرش کی تکمیل کی طرف توجہ ہوئی۔ غرض ایک مکان کی تعمیر کا معاملہ ایک مرکب اور مجموعی نوعیت رکھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔

اگرچہ اس چھوٹی سی مثال کو آسمان و زمین سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن بات کو سمجھنے کے لیے اسی پر آسمان و زمین کو بھی قیاس کرنا پڑے گا اس لیے کہ قرآن نے ان دونوں کا ذکر ایک مکان ہی کی نوعیت سے کیا ہے۔ کبھی آسمان کا ذکر مقدم کیا ہے کہیں زمین کا۔ کہیں یہ خیال گزرتا ہے کہ چھت پہلے بنی ہے اور کہیں یہ شبہ دل میں پیدا ہوتا ہے کہ چھت سے پہلے فرش کی تکمیل ہوئی ہے حالانکہ اس قسم کے شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ آسمان و زمین دونوں کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کو الگ الگ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ان اشارات پر قناعت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورۂ نازعات کی آیات ۳۰-۳۳ کے تحت ہم اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

اس کائنات کی ہر چیز اپنی جبلت کے اعتبار سے مسلم ہے

'فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین دونوں کو وجود بخشنے کے بعد یہ ہدایت فرمائی کہ تم دونوں کو بہرحال میری اطاعت کرنی ہے، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم رضامندانہ اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کائنات کی جو چیزیں جبلی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں ان کی اطاعت بھی مجبورانہ نہیں بلکہ رضامندانہ ہے

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جبلت اسلام ہی کے سانچہ پر بنائی ہے۔ گویا اس کائنات کی ہر چیز اپنی جبلت کے لحاظ سے مسلم ہے۔ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جو نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری پر مجبور ہیں بلکہ ان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے اسلام کے رنگ میں اس طرح رنگی ہے کہ ان سے کبھی اس کی خلاف ورزی صادر نہیں ہو سکتی۔

'اِئْتِیَا طَوْعًا' اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو اپنے نامہ میں لکھا تھا کہ 'وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ'۔ جن لوگوں نے اس کے معنی اس سے الگ لیے ہیں انھوں نے اسلوبِ زبان سے ناواقفیت کے باعث بالکل غلط معنی لیے ہیں۔

جمادات بھی اپنے رب کے احکام کے سمجھنے اور ان کی تعمیل کے معاملہ میں عاقل ہیں

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کائنات کی جن چیزوں کو ہم لایعقل جمادات کے درجہ میں رکھتے ہیں وہ بھی اپنے رب کے حکموں کو سمجھنے، اس کی باتوں کا جواب دینے، اس کے ارشادات کی تعمیل کرنے اور اس کی تحمید و تسبیح کے معاملہ میں پوری طرح عاقل ہیں۔ چنانچہ یہاں آسمان و زمین کی زبان سے جو قول نقل ہوا ہے اس میں بھی لفظ 'طَآئِعِیْنَ' آیا ہے جو ذوی العقول اور ذی ارادہ چیزوں ہی کے لیے موزوں ہے۔ اگر ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے یا ان کو خطاب نہیں کر سکتے تو اس کی بنا پر ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کو بالکل لایعقل خیال کریں بلکہ یہ محض ہمارے علم کی نارسائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے ایک ایک ذرّے کی تحمید و تسبیح کو سمجھتا ہے، اور ہر ذرہ اس کے حکموں کو سمجھ کر اس کی تعمیل کرتا ہے۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۱۲)

ساتوں آسمانوں کی تکمیل

اس سے معلوم ہوا کہ جس وقت آسمان کی طرف توجہ فرمائی ہے اس وقت ساتوں آسمانوں کا ہیولیٰ تو موجود تھا اگرچہ ابھی وہ تکمیلی عمل (FINISHING TOUCH) کا محتاج تھا۔ اس کا اشارہ جمع کی ضمیر اور بعد کے قرائن سے نکلتا ہے۔ فرمایا کہ پس ان کا فیصلہ فرما دیا کہ وہ سات آسمان بن جائیں۔

'وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا' اور ان میں سے ہر آسمان کی اس کائنات کے مجموعی نظام میں جو ڈیوٹی ہے وہ اس کو وحی فرمائی۔

'وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ': اور آسمانِ زیریں کو ستاروں کے قمقموں سے سجایا۔ یہاں اسلوب کی یہ تبدیلی ملحوظ رہے کہ اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ہیں اور یہ بات متکلم کے اسلوب میں۔ اسلوب کی اس تبدیلی کی بلاغت کی طرف اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'وَحِفْظًا': یہ مصدر فعل کی تاکید کے لیے ہے یعنی اس آسمانِ زیریں کو شیاطین جن کی دراندازیوں سے اچھی طرح محفوظ کیا۔ اس کی وضاحت اس کتاب کے متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے سورۂ جن کی تفسیر میں اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ آئے گی۔ یہ سارے کام دو دنوں میں تکمیل کو پہنچے اور مجموعی طور پر یہ کل چھ

دن ہوئے۔ یہ اس اجمال کی تفصیل ہوگئی جو آسمان و زمین کی خلقت سے متعلق قرآن کے دوسرے مقامات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

ساری تفصیل کا خلاصہ

ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۔ یہ اس ساری تفصیل کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ جو شخص اس کارخانۂ کائنات پر غور کرے گا وہ پکار اُٹھے گا کہ یہ ایک عزیز و علیم کی منصوبہ بندی کا کرشمہ ہے۔ یعنی یہ کوئی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آجانے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر نہایت حکیمانہ پلاننگ ہے اور یہ پلاننگ ایک ایسی ہستی کی کی ہوئی ہے جو ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کا علم محیطِ کل ہے کہ اس کائنات کے بعید سے بعید گوشوں کی ہر چیز سے بھی وہ باخبر، اس کی ضروریات سے واقف اور اس کائنات کے مجموعی نظام میں اس کا جو تصرف ہے اس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اس خلاصہ کو سامنے رکھتے ہوئے اب ابتدا کے سوال اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ ..... (الآیۃ) کو اس کے ساتھ ملائیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی کہ یہ کائنات اپنے وجود سے تو اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ ایک عزیز و علیم کی بنائی ہوئی اور اسی کے تصرف میں ہے لیکن تمہاری جہالت کا یہ عالم ہے کہ بہت سے فرضی دیویوں دیوتاؤں کو اس کا شریک مان کر تم اس کا انکار کر رہے ہو! اس بات کو سوال کی صورت میں تعجب و کراہیت کے اظہار کے لیے رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی حماقت کے لیے کوئی وجہ جواز تو نہیں ہے لیکن جب عقل الٹ جاتی ہے تو انسان سے کوئی حماقت بھی بعید نہیں رہ جاتی۔

ان آیات کی تعلیم

ان آیات سے جو تعلیم نکلتی ہے اگرچہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف ہم اشارہ کرتے آرہے ہیں لیکن چونکہ اس کا تعلق دین کی بنیادی حکمت سے ہے اس وجہ سے آخر میں ہم اس کی پھر یاد دہانی کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات یہ نکلتی ہے کہ یہ دنیا نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ ایک طے کردہ پروگرام کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس کو کسی نے بس یوں ہی کھیل تماشے کے طور پر بنایا ہے اور یہ یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ اہتمام اس کے بامقصد و باغایت ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے اور اس بات کا باغایت و بامقصد ہونا لازماً آخرت کو مقتضی ہے۔

دوسری یہ کہ اس کا خالق بے نہایت قدرت اور غیر محدود علم کا مالک ہے اس وجہ سے اس کام میں نہ اس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوئی اور نہ کوئی اس کی مدد کر سکنے کا اہل ہے۔

تیسری یہ کہ آسمان و زمین دونوں نے مل کر ایک مکان کی شکل اختیار کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو فروکش کیا ہے اس وجہ سے یہ خیال بالبداہت غلط ہے کہ اس کی چھت پر کسی اور کا تصرف ہے اور اس کے فرش کا کوئی اور مالک ہے بلکہ آسمان و زمین دونوں کی سازگاری اس بات کی دلیل ہے کہ جس عزیز و علیم نے ان کو

پیدا کیا ہے وہی ان پر متصرف بھی ہے۔

چوتھی یہ کہ اس دنیا میں ربوبیت کا جو ہمہ گیر نظام ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ خدائے عزیز و علیم ہی کا قائم کیا ہوا ہے، کوئی دوسرا اس نظام کو قائم کرنے پر قادر نہیں ہے اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ اسی کے آگے دستِ سوال دراز کریں اس لیے کہ حقیقی نافع و ضار وہی ہے۔

پانچویں یہ کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام اس بات کا متقضی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں لوگ اپنے منعم حقیقی کے روبرو حاضر ہوں۔ ان سے نعمتوں کے حق سے متعلق پرسش ہو۔ جنھوں نے ان کا حق پہچانا ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۱۳-۲۴

آگے قریش کی تنبیہ کے لیے اس رسواکن انجام کی بعض تاریخی مثالوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۲۴

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ

الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾

ع ۱۶

ترجمۂ آیات ۱۳-۲۴

پس اگر وہ اعراض کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اس طرح کے کڑکے سے آگاہ کرتا ہوں جس طرح کا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا۔ جب کہ آئے ان کے رسول ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اس دعوت کے ساتھ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے اتارتا تو ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ ۱۳-۱۴

عاد کا معاملہ یوں ہے کہ انھوں نے زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کیا اور بولے کہ ہم سے بڑھ کر طاقت میں کون ہے۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس

خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے۔ اور وہ ہماری نشانیوں کا برابر انکار کرتے رہے تو ہم نے ان پر چند منحوس دنوں میں ایک بادِ تند بھیجی تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہاں ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ ۱۵-۱۶

رہے ثمود تو ہم نے ان کو ہدایت کی راہ دکھائی لیکن انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی تو ان کو بھی عذابِ ذلّت کے کڑکے نے آدبوچا ان کے اعمال کی پاداش میں اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ڈرنے والے تھے۔ ۱۷

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے پس ان کی درجہ بندی ہوگی۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس حاضر ہو جائیں گے تو ان کے کان، اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کے رونگٹے ان پر ان باتوں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے رہے۔ اور وہ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہمیں اسی اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا اور وہی ہے جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اب اسی کی طرف لوٹائے جا رہے ہو۔ ۱۸-۲۱

اور تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان یا تمھاری آنکھیں یا تمھارے جسموں کے رونگٹے گواہی دیں گے بلکہ اس پر مزید تم نے یہ گمان کیا کہ اللہ بھی ان بہت سی باتوں کو نہیں جانتا جو تم کرتے ہو۔ اپنے رب کے بارے میں تمھارا یہی وہ گمان ہے جس نے تم کو غارت کیا اور تم خسارے میں پڑنے والے بنے۔ ۲۲-۲۳

پس اگر وہ صبر کریں تو دوزخ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ معافی مانگیں گے تو

ان کو معافی نہیں ملے گی۔ ۴۲

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (۱۳)

قریش کے اعراض کا ذکر اوپر آیات ۴-۵ میں گزر چکا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے اعراض ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ان کو آگاہ کر دو کہ اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو میں تم کو اسی طرح کے کڑکے کے عذاب سے ڈراتا ہوں جس طرح کا عذاب عاد اور ثمود اور ان کی ہم مشرب دوسری قوموں پر آیا۔ یہاں اسلوب بیان سے واضح ہے کہ عاد و ثمود کا ذکر محض بطور مثال بیان ہوا ہے مقصود ان تمام قوموں کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے جو رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں ہلاک ہوئیں اور جن کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

صاعقۃ کا ذکر بطور عذاب کی ایک نمایاں علامت کے

'صاعقۃ' کا ذکر اس عذاب کی ایک نمایاں علامت کے طور پر ہوا ہے جس سے یہ قومیں ہلاک ہوئیں۔ دوسرے مقام میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ ان قوموں پر جو عذاب آیا وہ شمال کی بادِ تند، ژالہ باری اور ہولناک رعد و برق کا مجموعہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی تعبیر مختلف الفاظ سے ہوئی ہے۔ یہاں اس کے ایک نمایاں وصف 'صاعقۃ' سے اس کا ذکر فرمایا لیکن مقصود اس کے ان تمام لوازم کی طرف اشارہ کرنا ہے جو دوسرے مقامات میں مذکور ہوئے ہیں اور ان میں بعض کا ذکر یہاں بھی آگے آ رہا ہے۔

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (۱۴)

لفظ 'رسل' کے جمع لانے کی علت

ان قوموں کی طرف اگرچہ دو ہی رسولوں ——— حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام ——— کا مبعوث ہونا قرآن میں مذکور ہوا ہے لیکن یہاں لفظ 'رسل' بصورت جمع استعمال ہونے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ ان قوموں کا ذکر یہاں بطور مثال ہوا ہے۔ مقصود ان تمام قوموں کی طرف اشارہ کرنا ہے جنھوں نے ان کی روشِ بد کی پیروی اور اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔

رسولوں کی ہر جہت جدوجہد کی تعبیر

'مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ' یہ ان رسولوں کی اس انتھک، ہمہ جہت اور شبانہ روز جانفشانی کی تعبیر ہے جو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کو دعوتِ توحید پہنچانے میں صرف کی۔ ابلیس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو چیلنج دیا تھا اس کے الفاظ ہیں: 'لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ' (الاعراف ۷: ۱۷) (میں ان پر ان کے آگے اور پیچھے سے گھیرے ڈالوں گا) قرآن نے یہاں رسولوں کا یہ وصف بیان کر کے گویا یہ واضح فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ابلیس کے فتنوں سے بچانے کے لیے اپنے رسول بھی ایسے بھیجے جنھوں نے ان کو ہر جہت سے گھیرنے میں اپنے رات دن ایک کر دیے۔

'قَالُوْا لَوْ شَآءَ ...... الآیۃ' لیکن رسولوں کی اس ساری تگ و دو کی انھوں نے قدر کی تو یہ کہ ان کی رسالت کی تکذیب کر دی کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرف رسول بھیجنے والا ہوتا تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے آدمیوں کو اور تم چونکہ ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اس وجہ سے ہم تمھاری رسالت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ پس جو پیغام (اشارہ پیغامِ توحید کی طرف ہے) تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم کو اس کے قبول کرنے سے صاف انکار ہے۔

قوموں کی طرف سے رسولوں کو جواب

'فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ' کے اسلوب میں جو طنز ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ لوگ بزعم خویش جس پیغام کے حامل بن کر آئے ہوئے ہیں اس سے صاف انکار ہے یعنی نہ ہم آپ لوگوں کو رسول مانتے اور نہ آپ لوگوں کے پیغام کو پیغام۔ اس وجہ سے ہم پر اس قسم کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۱۵)

عاد کا رویّہ

یہ ان کے اس رویّہ کی کسی قدر وضاحت ہے جو انھوں نے اپنے رسولوں کے انذار کے مقابل میں اختیار کیا۔ پہلے زمانی تقدم کی بنا پر عاد کو لیا ہے۔ فرمایا کہ عاد کو، جو قوت و شوکت اللہ تعالیٰ نے بخشی اس کو پا کر خدا کے شکر گزار ہونے کے بجائے وہ خدا کی زمین میں اکڑنے والے بن گئے۔ ان کے اس 'استکبار' کو 'بغیر الحق' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ تکبر صرف اس کے لیے زیبا ہے جو اس تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے سوا اور کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے۔

'وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً' یہ ان کے اسی تکبر کی وضاحت ہے کہ جب اللہ کے رسول نے ان کو ڈرایا کہ اگر وہ اپنی سرکشی کی اس روش پر جمے رہے تو جلد اللہ کی پکڑ میں آ جائیں گے تو اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ اگر ہماری روش تباہی کی روش ہوتی تو کیا اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آج اس سرزمین پر ہم قوت و شوکت میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے! اس وجہ سے ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ہم تباہی کے راستہ پر نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ دماغی خرابی میں مبتلا ہیں جو ہمیں عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔

'اَوَلَمْ يَرَوْا ...... الآیۃ' یہ ان کے مذکورہ احمقانہ چیلنج کا جواب ہے کہ اگر وہ ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو وہ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ جس خدا نے ان کو اور اس ساری کائنات کو وجود بخشا ہے وہ زور و قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس سے مزاحم ہو سکے۔

'وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ' اس کا تعلق اصل سلسلۂ کلام سے ہے۔ بیچ میں 'اَوَلَمْ يَرَوْا ...... الآیۃ' کا ٹکڑا ان کے چیلنج کے فوری جواب کے طور پر آ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے استکبار کے سبب سے

کوئی بات بھی سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اللہ کے رسول نے ان کو جو آیتیں سنائیں یا جو نشانیاں دکھائیں وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کا انکار کرتے رہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۶)

عاد پر عذاب

'ریح صرصر' سے مراد وہ بادِ تند ہے جو عرب میں شدید سردیوں کے زمانے میں شمال سے چلتی ہے اور جس کے ساتھ سرما کے بادل بھی ہوتے ہیں اور گرج چمک بھی۔

'اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ' سخت سردی کے ان دنوں کو بھی کہتے ہیں جن میں سردی کی شدت کے سبب سے ہر چیز پر اداسی، افسردگی، خشکی اور ایک قسم کی نحوست چھا جاتی ہے۔

فرمایا کہ چونکہ انھوں نے استکبار اور حق سے اعراض کی روش اختیار کر لی اس وجہ سے ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب چکھانے کے لیے، ان پر سرما کی نحوست کے ایام میں، بادِ صرصر مسلّط کر دی جس نے ان کو بالکل تاراج کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ ان لوگوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہوئے جن کے انذار کے جواب میں وہ 'مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً' کا نعرہ لگاتے تھے اور اپنی دوسری ہم چشم قوموں کی نگاہوں میں بھی ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گئے اور اس عذابِ دنیا کے بعد ان کو عذابِ آخرت سے بھی سابقہ پیش آنا ہے جو اس عذاب سے بھی زیادہ رسواکن ہوگا اس لیے کہ اس کی رسوائی ابدی اور تمام خلائق کے سامنے ہوگی۔

'وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ' - اور اس دن کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ نہ ان کی وہ قوت و جمعیت ان کے کچھ کام آئے گی جس پر وہ نازاں رہے اور نہ ان کے وہ دیوی دیوتا کچھ کام آئیں گے جن کی حمایت میں انھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۷)

ثمود کا رویہ اور ان پر عذاب

فرمایا کہ یہی حال عاد کے بعد ثمود کا بھی ہوا۔ ہم نے ان کے لیے بھی ہدایت کی راہ کھولی لیکن انھوں نے ہماری ہدایت پر اپنی ضلالت ہی کو ترجیح دی بالآخر ان کے اعمال کی پاداش میں ہم نے ان کو بھی ذلت کے عذاب میں پکڑا اور وہ بالکل پامال و ذلیل ہو کر رہ گئے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان کے عذاب کی نوعیت بھی کم و بیش وہی تھی جس کی وضاحت قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں ہو چکی ہے۔ نظائر قرآن کی روشنی میں اس کی تفصیل اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۸)

یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان عذابوں سے نجات دی۔ سنت الٰہی یہ ہے

کہ جو لوگ رسولوں پر ایمان لائے اور انذار سے متنبہ ہو کر انھوں نے تقویٰ کی زندگی اختیار کر لی اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب سے بچا لیا۔ اس آیت میں اشارہ عاد اور ثمود دونوں قوموں کے مومنین کی طرف ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ ان قوموں میں سے جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے رسول کے ساتھ ان کو بھی عذاب سے محفوظ رکھا۔

وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰہِ اِلَی النَّارِ فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ (۱۹)

دنیا کے عذاب کے بعد آخرت کی رسوائی

دنیا کے عذاب کے بعد اب یہ ان کی اس رسوائی اور عذاب کا ذکر آ رہا ہے جس سے ان کو قیامت کے دن سابقہ پیش آئے گا۔

'یُحْشَرُ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'یُسَاقُوْنَ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ 'یُوْزَعُوْنَ' کی وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۱۷ کے تحت ہو چکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے ترجمہ میں لفظ کے اس مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔

فرمایا کہ اس دن کا بھی دھیان کرو جس دن اللہ کے یہ سارے دشمن ہانک کر جہنم کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اور وہاں ان کی درجہ بندی ہو گی۔ جو جہنم کے جس طبقہ کے سزاوار ٹھہریں گے وہ اپنے مخصوص دروازے سے اس طبقہ میں داخل ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ الگ الگ مجرمین کے ساتھ، ان کے اعمال کے اعتبار سے، الگ الگ معاملہ ہو گا۔

حَتّٰٓی اِذَا مَا جَآءُوْھَا شَھِدَ عَلَیْھِمْ سَمْعُھُمْ وَاَبْصَارُھُمْ وَجُلُوْدُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲۰)

فرمایا کہ جب دوزخ کے پاس سب اکٹھے ہو لیں گے تو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون کس درجہ کا مجرم اور جہنم کے کس طبقہ کا سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کو کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی اس لیے کہ اس دن کوئی اپنے کسی عمل کو چھپا نہیں سکے گا۔ آدمی کے کان، آنکھ، بلکہ اس کے جسم کے رونگٹے تک اس کے تمام اعمال کی گواہی دیں گے۔

لفظ 'جُلُوْدٌ' یہاں خاص کے بعد عام کی حیثیت سے آیا ہے۔ 'سمع' اور 'بصر' کا خاص گواہ ہونا تو واضح ہے کہ ہر چیز کے سننے اور دیکھنے والے یہی ہیں لیکن آدمی کے پاس اور بھی اعضاء و جوارح ہیں جن سے وہ بدی یا نیکی میں کام لیتا ہے۔ لفظ 'جلود' نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ گویا اس دن آدمی کے بدن کا رواں رواں گواہی کے لیے زبان بن جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ لفظ 'جلود' قرآن مجید میں رونگٹوں کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت 'تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ ...... الاٰیۃ' (الزمر: ۲۳) کے تحت لفظ کے اس مفہوم پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا ط قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَّھُوَ خَلَقَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۱)

آدمی کے اعضاء کی گواہی خود اس کے خلاف

اپنے اعضاء کی گواہی خود اپنے خلاف سن کر وہ اپنے سر پیٹ لیں گے اور ان کو ملامت کریں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ آج تو ہر چیز ناطق بن گئی ہے تو جس نے ہر چیز کو آج ناطق بنا دیا ہے اسی نے ہم کو بھی ناطق بنا دیا ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی

ہے کہ قیامت کے دن ہر چیز اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی۔ مثلاً فرمایا ہے: اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَہَا ۙ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَہَا ۙ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَہَا ۚ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَہَا (الزلزال: ۱-۴) (جب کہ زمین پوری شدت کے ساتھ ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے سارے بار بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان پکار اٹھے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے!! اس دن وہ اپنی سرگزشت سنا ڈالے گی)

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز ناطق تو آج بھی ہے اس لیے کہ ہر چیز اللہ کی نشانی ہے اور اس کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی گواہ بن کر وہ انسان پر حجت قائم کر رہی ہے لیکن آج ان کی گواہی کو صرف وہی لوگ سن رہے ہیں جن کے دل بیدار ہیں۔ البتہ قیامت کے دن ان کی گواہی سب سنیں گے اور سب ان کی تصدیق کریں گے اس لیے کہ جو حجابات آج حائل ہیں وہ اس دن دور ہو جائیں گے۔

وَّ ہُوَ خَلَقَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ۔ اگرچہ یہ بات بھی اسی بات کا ایک حصہ ہو سکتی ہے جو جُلُوۡد کی زبان سے نقل ہوئی ہے لیکن میرے نزدیک اس کا عطف اصل سلسلۂ کلام پر ہے۔ جُلُوۡد سے سوال اور ان کے جواب کا ذکر بیچ میں بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔ اصل بات جو اوپر فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس دن ان کے کان، آنکھ اور ان کے دوسرے تمام اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے اور مقصود اس سے اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ آدمی کے اپنے ہی اعضا اس کے سارے راز کھول دینے کے لیے ناطق ہو جائیں گے تو کسی اور کی گواہی اور شہادت و شفاعت اس کے لیے کیا نافع ہو سکے گی، مدعی کی اپنی گواہی تو لاکھوں کی گواہی پر بھاری ہو سکتی ہے۔ اسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ یعنی اگر تم نے یہ امید باندھ رکھی ہے کہ تمہاری واپسی تمہارے ان مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کی طرف ہو گی جن کی تم پرستش کرتے ہو تو یہ خیال محض وہم پر مبنی ہے۔ جن کو خلق و تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے آخر وہ مولیٰ و مرجع کس طرح بن جائیں گے!

وَ مَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَتِرُوۡنَ اَنۡ یَّشۡہَدَ عَلَیۡکُمۡ سَمۡعُکُمۡ وَ لَاۤ اَبۡصَارُکُمۡ وَ لَا جُلُوۡدُکُمۡ وَ لٰکِنۡ ظَنَنۡتُمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَعۡلَمُ کَثِیۡرًا مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (۲۲)

تَسۡتَتِرُوۡنَ کا مفہوم

تَسۡتَتِرُوۡنَ کی تاویل بعض اہل تاویل نے تَخَافُوۡنَ سے کی ہے۔ ان کے نزدیک مفہوم یہ ہے کہ تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے کہ تمہارے کان، آنکھ اور دوسرے اعضا تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ میرے نزدیک لفظ کی یہ تعبیر صحیح ہے۔ یہ لازم سے ملزوم پر استدلال کی نوعیت کی ایک چیز ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ یہ اندیشہ رکھتے ہوتے تو کوئی برا کام کرتے ہوئے ان سے چھپتے لیکن جب ان سے وہ نہیں چھپتے تھے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ ان سے کوئی اس نوعیت کا اندیشہ نہیں رکھتے تھے۔

وَ لٰکِنۡ ظَنَنۡتُمۡ ..... الاٰیۃ۔ لٰکِنۡ یہاں بَلۡ کے مفہوم میں ہے یعنی اعضا کی گواہی کا اندیشہ تو درکنار تمہاری بلادت کا تو یہ عالم رہا ہے کہ تم خدا کے متعلق بھی اس گمان میں مبتلا رہے ہو کہ اس کو بھی

تمہارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۲۵-۳۶

قیامت کے دن کفر کے سرغنوں اور ان کے پیرؤوں کا جو حال ہوگا پہلے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آج تو قرآن کی مخالفت کے لیے انھوں نے آپس میں بڑا گٹھ جوڑ کر رکھا ہے لیکن جب اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن بن جائیں گے کہ عوام اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کریں گے کہ ان کے لیڈر ان کو دکھا دیے جائیں کہ وہ ان کو اپنے قدموں سے روند ڈالیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو ان تمام غوغا آرائیوں کے علی الرغم توحید پر ثابت قدم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ ان کے پاس بشارت لے کر آئیں گے کہ اب آپ کی آزمائشوں کا دور ختم ہو گیا۔ آگے اب آپ لوگوں کے لیے ابدی بادشاہی کی جنت ہے۔

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ سب سے زیادہ مبارک دعوت تم لے کر آئے ہو۔ اگر تمھارے نادان مخالفین اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں، اس کو گوش دل سے سننے کے بجائے، اس میں گڑبڑ پیدا کرنی چاہتے ہیں تو تم ان کی ان بدتمیزیوں کا مقابلہ عفو و درگزر سے کرو۔ تمھاری یہی کریمانہ روش تمھاری دعوت کے لیے موجب خیر و برکت ہوگی ــــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۲۵-۳۶

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَٰسِرِينَ ﴿٢٥﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْءَانِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿٢٦﴾ فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ جَزَآءُ أَعْدَآءِ اللَّهِ النَّارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۖ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا بِـَٔايَٰتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٢٨﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَآ أَرِنَا الَّذَيْنِ

أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿٢٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٦﴾

ع ۴ / ۱۸

ترجمۂ آیات ۲۵-۳۶

اور ہم نے ان پر بُرے ساتھی مسلّط کر دیے تو انھوں نے ان کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز ان کو خوشنما بنا کر دکھائی، بالآخر ان پر بھی وہی بات پوری ہو کے رہی جو جنّوں اور انسانوں کے ان گروہوں پر پوری ہوئی جو ان سے پہلے گزر چکے تھے۔ وہ نامراد ہونے والوں میں سے بنے! ۲۵

اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے بیچ میں شور و شغب برپا کرو تاکہ تم غالب رہو۔ پس ہم ان کافروں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو

ان کے عمل کا بدترین صلہ دیں گے۔ یہ اللہ کے دشمنوں کا بدلہ ہے: یعنی دوزخ! ان کے لیے اسی میں ہمیشگی کا ٹھکانا ہوگا، بدلے میں اس بات کے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تھے۔ ۲۶-۲۸

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں کو دکھا جنھوں نے جنّوں اور انسانوں میں سے ہم کو گمراہ کیا، ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے ڈالیں گے، وہ ذلیل ہوں۔ ۲۹

بے شک ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، فرشتے اتریں گے کہ اب نہ کوئی اندیشہ کرو اور نہ کوئی غم اور اس جنت کی خوش خبری قبول کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی رہے اور آخرت کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں؛ اور تم کو اس جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کو تمھارا دل چاہے گا اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔ —— ربِّ غفور و رحیم کی طرف سے سامانِ ضیافت کے طور پر! ۳۰-۳۲

اور اس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں! اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی، جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ دانش نہیں ملتی مگر انھی لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر انھی کو جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں! اور اگر شیطان تمھارے دل میں کوئی

اکساہٹ پیدا کرہی دے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔ بے شک حقیقی سننے والا جاننے والا وہی ہے۔ ۳۳-۳۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۲۵)

اللہ کی یاد دہانی سے اعراض کا انجام

یعنی ان لوگوں کے اس انجام سے دوچار ہونے کا سبب یہ ہوا کہ انھوں نے اللہ کی یاد دہانی سے اعراض کیا اور اس کے رسولوں کی تعلیم پر کان دھرنے کے بجائے اس کی ناقدری کی۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان پر نہایت برے لیڈر مسلط کر دیے جنھوں نے ان کو خوب خوب سبز باغ دکھائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وہ وعدۂ عذاب ان کے بارے میں بھی پورا ہو کے رہا جو ان سے پہلے گزرنے والی نافرمان قوموں پر پورا ہوا۔

'وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۂ زخرف میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے، 'وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ' (الزخرف: ۳۶) (اور جو اللہ کی تذکیر سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے) یہ شیطان جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی اور جب کوئی قوم اپنی خدا فراموشی کے سبب سے ایسے شیطانوں کو اپنے اوپر مسلط کر لیتی ہے تو پھر یہ شیاطین اس کی جان اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اس کو عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ کرا لیں۔

'فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ' یعنی وہ قوم کے ماضی و حاضر کو اس طرح مزین کر کے اس کے آگے پیش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے اعمال و کردار اور عقائد و نظریات میں کسی پہلو سے کوئی غلا نظر نہ آئے تاکہ انبیاء اور مصلحین کی تذکیر و تنبیہ سے بالکل بے پروا ہو کر وہ اسی راہ پر چلتی رہے جس پر وہ اس کو چلانا چاہتے ہیں۔

'وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ' میں 'القول' سے مراد عذابِ الٰہی کی وہ دھمکی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دی اور جو ان تمام قوموں پر پوری ہوئی جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ان میں سے بعض قوموں کے عذاب کا اجمالی حوالہ اوپر اس سورہ میں بھی گزر چکا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۲۶)

حق سے روکنے کے لیے گنڈوں کا ہتھیار

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد کفر کے وہ سرغنے ہیں جو مشرکین عرب پر مسلط تھے اور حق کے رویہ پر اوپر والی آیت میں اجمالی تبصرہ ہوا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ قرآن کی دعوت سے لوگوں کو روکنے کے لیے اپنے گنڈوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ جب دیکھو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو قرآن سنا رہے ہیں تو نہ اس کو خود سنو اور نہ دوسروں کو سننے دو بلکہ اپنے شور و شغب اور اپنی ہوٹنگ سے ایسا گھپلا پیدا کرو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات بالکل دب جائے اور تمہاری بات اونچی رہے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۷)

فرمایا کہ یہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرلیں ہم بھی ان کی ان حرکتوں کی پاداش میں ایک عذابِ شدید کا مزا ان کو چکھائیں گے۔ اور ان کے اعمال کا وہ بدترین پہلو ان کے سامنے لائیں گے جن کا ان کو ابھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔

اعمال کے اثرات کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہوگا

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں انسان اپنے اعمال کے اثرات و نتائج کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔ انسان کا ہر عمل، خواہ وہ نیک ہو یا بد، اپنے اندر متعدی اثرات رکھتا ہے۔ اپنی اس صفت کے سبب سے بعض حالات میں انسان کی ایک چھوٹی سی نیکی بڑھتے بڑھتے اُحد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک برائی جو اپنے ابتدائی مرحلے میں معمولی نظر آتی ہے آہستہ آہستہ ایک خوفناک جنگل بن جاتی ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرکے قتلِ ناحق کی جو طرح ڈالی وہ ایک ایسی متعدی برائی نکلی کہ دنیا کے ہر قتلِ ناحق میں سے ایک حصہ برابر اس کے کھاتے میں بھی جمع ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب قیامت میں ہر شخص کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے تب ہی وہ صحیح صحیح اندازہ کرسکے گا کہ اس کی فلاں برائی کس درجہ کی برائی تھی۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں 'وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ ابھی ان نادانوں کو اندازہ نہیں ہے کہ قرآن سے لوگوں کو روک کر اور اس میں گھپلا پیدا کرکے یہ اپنے لیے کیسی بس بھری فصل تیار کر رہے ہیں جب اس کا پورا حاصل ان کے سامنے آئے گا تب وہ اس کا بدترین پہلو (اسوأ) دیکھیں گے اور اس وقت انھیں اندازہ ہوگا کہ اپنی تباہی کا کیا سامان کرکے وہ آئے ہیں۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۲۸)

'ذٰلِكَ' کا اشارہ اسی بدترین جزاء (جزاء اسوأ) کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ 'اَعْدَآءِ اللّٰهِ' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ قریش کے وہی لیڈر ہیں جو اپنے گنڈوں کے ذریعہ سے قرآن کی دعوت دبا دینے کے درپے تھے۔ 'النَّارُ' مستقل جملہ ہے۔ خبر پر زور دینے کے لیے اس میں مبتدا

کو حذف کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جزا جو بیان ہوئی ہے ان لوگوں کے سامنے آئے گی جو آج اللہ اور اس کے دین کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اور اس بات کو خوب سمجھ لو کہ اس سے مراد دوزخ ہے۔ اسی میں ان کفر کے سرغنوں کے گھر ہوں گے جن میں ان کو ہمیشہ رہنا ہو گا۔ یہ سزا ان کو اس جرم میں ملے گی کہ وہ برابر اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے۔ نہ خود ان کی طرف توجہ کی اور نہ دوسروں کو ان کی طرف متوجہ ہونے دیا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِیَکُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِیْنَ (۲۹)

عوام کا غصہ اپنے لیڈروں کے خلاف

یہاں بھی اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ عوام ہیں جو اپنے لیڈروں کے ورغلانے سے گمراہ ہوئے۔ نہ انھوں نے خود قرآن کی طرف توجہ کی اور نہ دوسروں کو، جہاں تک ان کا بس چلا، اس کی طرف متوجہ ہونے دیا۔ فرمایا کہ یہ عوام آج اس وفاداری کے ساتھ اپنے لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے لیڈروں نے ان کو کس گھاٹ میں لا کر اتارا ہے تو وہ غصہ سے دانت پیسیں گے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اے رب! جن انسانوں اور جنوں نے ہم کو یہ راہ دکھائی ہے، ایک نظر تو ان کو بھی دکھا دے کہ ہم ان کو اپنے قدموں کے نیچے روند کر ان کے استکبار اور ان کی لیڈری کا مزا ان کو چکھا دیں اور ان کو ذلیل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۰)

ایمان پر ثابت قدم رہنے والوں کو بشارت

قیامت کے دن مخالفین حق کا جو حشر ہو گا اس کو سنانے کے بعد اب یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جنھوں نے رسول کی دعوت قبول کر لی اور پھر تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر، پوری یکسوئی و دلجمعی کے ساتھ، اس پر جم گئے۔ فرمایا کہ قیامت کے دن فیصلۂ امور سے پہلے ان کی دلداری و تسلی کے لیے ان کے پاس اللہ کے فرشتے آئیں گے جو ان کو اطمینان دلائیں گے کہ بس اب آپ لوگوں کی آزمائش کا دور ختم ہوا، اب آپ کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ کوئی غم، اب آپ لوگ اس جنت کی بشارت قبول کریں جس کا نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا میں آپ لوگوں سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۳۱)

اہل ایمان کو اس دنیا میں بھی فرشتوں کی معیت حاصل ہوتی ہے

یعنی کفار کے ساتھی تو شیاطین جن و انس بنے رہے اور انھوں نے بالآخر جہنم کے گھاٹ ان کو لا اتارا لیکن آپ کے ساتھی دنیا میں بھی ہم رہے ہیں اور آخرت میں بھی ہم آپ کے ساتھی ہیں۔ اب جو جنت آپ لوگوں کو ملنے والی ہے اس میں آپ کے لیے وہ سب کچھ ہے جن کو آپ کا جی چاہے گا اور مزید وہ چیزیں بھی آپ کو ملیں گی جو آپ طلب کریں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس دنیا میں بھی اہل ایمان کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کی راہ بھی سجھاتے ہیں اور اس راہ میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں ان میں ہمت بھی بندھاتے ہیں۔ ان کی مدد سے انسان اسی وقت محروم ہوتا ہے جب وہ ان کی رہنمائی و حوصلہ افزائی کی قدر کرنے کے بجائے اپنی باگ کلیۃً شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے۔ فرشتوں کی مدد و معیت پر سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔

نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ (۳۲)

'نُزُلٌ' مہمان کی ابتدائی ضیافت کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو جو کچھ آپ لوگوں کو ملے گا اس کی حیثیت ابتدائی ضیافت کی ہے۔ آگے جو کچھ ملنے والا ہے اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (۳۳)

اسلام کی دعوت سے بڑھ کر کوئی دعوت نہیں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے اور آپ کے ان مخالفین کے لیے ملامت بھی جو کہتے تھے کہ قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَیۡنِنَا وَبَیۡنِکَ حِجَابٌ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۵) (ہمارے دل تمہاری دعوت سے پردے میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب حائل ہے) مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں اور مخالفت کے جنون میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ لوگوں کو یہ سکھاتے پھر رہے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب اس کو سنانے کی کوشش کی جائے تو شور و شغب سے اس کو دبا دو، تو اب ان لوگوں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ساری خرابی خود انہی لوگوں کے اندر ہے، اس میں تمہارا یا تمہاری دعوت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہاری دعوت اللہ کی توحید اور اس کی بندگی کی دعوت ہے۔ آخر اس دعوت سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے اور کس بات کی دعوت ہو سکتی ہے! تم اس دعوت کے ساتھ ساتھ خود بھی عمل صالح کے پیکر ہو اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دے رہے ہو، یہ اس بات کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ تم کوئی مصنوعی قسم کے آدمی نہیں ہو اور نہ تم ملک میں کوئی فساد برپا کرنا چاہتے ہو۔ بلکہ تمہارے قول اور عمل میں پوری مطابقت ہے اور تم اس زمین میں نیکی اور عدل قائم کرنا چاہتے ہو۔ تمہارا قول یہ ہے کہ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (میں اپنے رب کے فرمانبرداروں میں سے ہوں) اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لوگوں پر تم اپنی حکومت و سیادت قائم کرنے کی فکر میں سرگرداں نہیں ہو بلکہ سب کو اللہ کا مسلم اور فرمانبردار بنانا چاہتے ہو۔ یہی اسلام اس تمام کائنات کی فطرت ہے اور اسی دین کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی جن کے یہ لوگ نام لیوا ہیں۔ اگر ان واضح حقائق کے بعد بھی یہ لوگ تمہاری دعوت کی مخالفت پر کمربستہ ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ ان کے دلوں کے پردے اللہ کے سوا کوئی دوسرا

نہیں ہٹا سکتا۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (۳۴)

ایک داعی کے بے مخالفین کے ساتھ صحیح رویّہ

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رویّے کی تعلیم دی گئی ہے جو مخالفین کی بدتمیزیوں کے مقابل میں آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اچھا رویّہ اور بُرا رویہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ آخرت کے انجام اور مقصدِ دعوت کے اعتبار سے دونوں کے اثرات و نتائج میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کی بدتمیزیوں کے جواب میں وہ رویّہ اختیار کرو جو زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمھارے دشمنوں میں سے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، تمھاری دعوت کی معقولیّت اور تمھارے شریفانہ رویّہ سے متاثر ہو کر، تمھارے سرگرم حامی بن جائیں گے۔

'اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ'۔ لوگوں کی بدتمیزیوں کے مقابل میں احسن طریقہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کسی برائی کے جواب میں برابر سرابر کا طرزِ عمل اختیار کرنا آدمی کے لیے جائز ہے لیکن صبر اور عفو و درگزر کا رویّہ زیادہ بہتر ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند یہ ہے کہ اس کے صالح بندے یہی رویّہ اختیار کریں۔ یہ ہدایت بالکل اسی سیاق و سباق میں متعدد جگہ قرآن میں دی گئی ہے۔ ایک نظیر سورۂ نحل سے ہم پیش کرتے ہیں جس سے اس آیت کی وضاحت ہوتی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ	نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان سے اس طریقہ
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ	پر بحث کرو جو اس کا اچھا طریقہ ہے بےشک تمھارا
ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ	رب خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی راہ سے
سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ہ	بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ان کو بھی جو
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	ہدایت یافتہ ہیں اور اگر تم ان کی کسی بات کا بدلہ لو تو
مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ ط وَلَئِنْ	بس اسی کے مانند بدلہ لو جو تمھارے ساتھ کیا گیا ہے
صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ہ	اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے زیادہ
(النحل : ۱۲۵-۱۲۶)	بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ مخالفین کی تعدّیوں کا جواب دینے کا حق ایک شخص کو حاصل ہے لیکن دعوت و اصلاح کے نقطۂ نظر سے صبر اور عفو و درگزر کا طریقہ زیادہ بہتر ہے اس وجہ سے اسی زیادہ بہتر طریقہ کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ رویّہ اہلِ ایمان کو اس وقت تک اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے

جب تک مخالفین پر اچھی طرح اتمامِ حجت نہ ہو جائے۔ اگر اتمامِ حجت ہو چکا ہو لیکن اس کے باوجود مخالفین اپنی روشِ مخالفت سے باز نہ آ رہے ہوں بلکہ اہلِ حق اور دعوتِ حق کو مٹا دینے کے درپے ہوں تو اس وقت واضح اعلانِ برارت کے بعد ان کی پوری سرکوبی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں عفو و درگزر کے بجائے زیادہ بہتر طریقہ بلکہ بعض حالات میں واحد طریقہ یہی ہو گا۔ چنانچہ جن اہلِ مکہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو یہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے انہی کے ساتھ اتمامِ حجت کے بعد، وہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی جس کی تفصیلات سورۂ برارت میں زر چکی ہیں۔

سلیم الفطرت لوگوں پر شریفانہ رویہ کا اچھا اثر پڑتا ہے

'فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ' یہ بات انسان کی عام فطرت کو پیشِ نظر رکھ کر ارشاد ہوئی ہے۔ جن کی فطرت مسخ نہیں ہو چکی ہوتی ہے وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لوگوں کی بہی خواہی و ہمدردی میں اتنا بے چین ہے کہ ان کی تمام گستاخیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود اپنے کریمانہ رویہ میں کوئی فرق آنے نہیں دیتا بلکہ لوگوں کی اینٹوں اور پتھروں کا جواب دعاؤں سے دیتا ہے تو ان کے دلوں میں اگر اس کے خلاف کسی غلط فہمی کے باعث عداوت بھی ہو تو اس کے اس طرزِ عمل سے متاثر ہو کر ان کی یہ عداوت محبت سے بدل جاتی ہے اور وہ اس کے جاں نثار ساتھیوں میں سے بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں سب سے زیادہ مؤثر عامل کی حیثیت آپ کے اسی کردار کو حاصل رہی ہے۔ آپ کے دشمنوں میں سے جن کے اندر شرافت کا جوہر موجود تھا وہ سب آپ کے اسی کردار سے متاثر ہو کر آپ کے وفادار اور اسلام کے جاں نثار بنے۔ صرف وہی اشقیا اس چیز سے متاثر نہیں ہوئے جن کی فطرت بالکل مسخ ہو چکی تھی۔

وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (۳۵)

ایک گنج گراں مایہ

ضمیرِ مفعول کا مرجع یہاں الفاظ میں مذکور نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ حکمت و موعظت ہے جس کی ہدایت اوپر والی آیت میں فرمائی گئی ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیر لانے کا طریقہ معروف ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۴۵ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ کے تحت اس ضمیر کی نوعیت پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر صبر کی صفت ہوتی ہے اور یہ حکمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک گنجِ گراں مایہ ہے، بڑے ہی نصیبہ ور ہیں وہ لوگ جو اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں!

اس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ اوپر جو بات فرمائی گئی ہے وہ ایک عظیم حکمت ہے۔

دوسری یہ کہ اس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے اندر صبر کا جوہر ہو۔ جن کے

اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اس کے طالبوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک لازوال خزانہ ہے اس وجہ سے ہر سمت ور کو اس کے حاصل کرنے کے لیے بازی کھیلنی چاہیے۔ بڑے ہی خوش بخت و بلند اقبال ہیں وہ لوگ جو اس بازی میں کامیاب ہو جائیں۔

شیطان کی اکساہٹ کا علاج

وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (۳۶)

یہ علاج بتایا ہے کہ اگر مخالفوں کی شرارت اور شیطان کی شرانگیزی سے طبیعت میں کوئی ایسا جذبہ ابھرے جو اس حکمت کے منافی ہو تو اس وقت آدمی کو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ آدمی اگر جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے صدقِ دل سے اللہ کی پناہ کا طالب ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور اپنی پناہ میں لے لے گا اور شیطان کو اس پر قابو نہیں پانے دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقی سمیع و علیم ہے۔ کوئی بات اس سے مخفی نہیں رہتی۔ بندہ جب صدق دل سے شیطان کے مقابل میں اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہوتا ہے تو وہ ضرور اس کی مدد فرماتا ہے۔

۶۔ آگے کا مضمون ــــ آیات : ۳۷ - ۴۶

سورہ کی ابتدا میں آفاق کی نشانیوں سے توحید اور معاد پر جو دلیلیں قائم فرمائی ہیں آگے کی آیات میں ان کی مزید وضاحت اور ساتھ ہی ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی آیات کی رہنمائی سے خود بھی منحرف ہیں اور دوسروں کو بھی منحرف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن خدائے عزیز کا اتارا ہوا صحیفہ ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا بلکہ خود اپنی ہی ہلاکت کا سامان کریں گے۔ اسی ضمن میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب اور اہلِ کتاب دونوں ہی پر ایک عظیم احسان فرمایا ہے۔ جو اُنھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔ اللہ نے ان پر حجت تمام کر دی ہے اس وجہ سے اب جس انجام سے بھی وہ دوچار ہوں یہ اسی کے سزاوار ہیں۔ یہ ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۷ - ۴۶

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الَّیۡلُ وَالنَّہَارُ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ ؕ لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَلَا لِلۡقَمَرِ وَاسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَہُنَّ اِنۡ کُنۡتُمۡ

إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣٧﴾ فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ
يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ﴿٣٨﴾ السجدة وَمِنْ آيَاتِهِ
أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ
اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۚ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ
عَلَيْنَا ۗ أَفَمَنْ يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ
الْقِيَامَةِ ۚ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۖ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤٠﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ
عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ
تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ
لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ
أَلِيمٍ ﴿٤٣﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ
آيَاتُهُ ۖ ءَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ
شِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ
عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿٤٤﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا
مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ﴿٤٥﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿٤٦﴾

ترجمۂ آیات ۳۷-۴۶

اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ ۳۷

پس اگر یہ تکبر کریں (تو کریں)، جو فرشتے تیرے رب کے پاس ہیں وہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں شب و روز اور وہ کبھی نہیں تھکتے۔ ۳۸

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو بالکل بے جان، پس جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ متحرک ہو جاتی اور پھول جاتی ہے۔ بے شک جس نے اس کو زندہ کر دیا وہ مُردوں کو بھی زندہ کر دینے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۹

جو لوگ ہماری نشانیوں کے باب میں کج روی اختیار کر رہے ہیں وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں۔ کیا وہ بہتر ہے جو دوزخ میں ڈالا جائے گا یا وہ جو قیامت کے دن امن کے سایہ میں آئے گا! کر لو جو تم چاہو۔ وہ اچھی طرح دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۴۰

جن لوگوں نے اللہ کی یاددہانی کا انکار کیا جب کہ وہ ان کے پاس آ گئی (ان کی شامت آئی ہوئی ہے)، بے شک یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے۔ ۴۱-۴۲

تمھیں وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے آنے والے رسولوں کو کہی جا چکی ہیں۔ بے شک تمھارا رب بڑی مغفرت والا بھی ہے اور دردناک عذاب

دینے والا بھی۔ ۴۳

اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی! کہہ دو، یہ ان لوگوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے جو اس پر ایمان لائیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کے کانوں میں بہرا پن ہے اور یہ ان کے اوپر ایک حجاب ہے۔ اب یہ لوگ ایک دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے! ۴۴

اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور یہ لوگ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈال دینے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور تیرا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے ۴۵-۴۶

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۳۷)

خدا کی نشانیوں کو خدا نہ بناؤ

سورہ کے شروع میں آیات ۹-۱۲ تک آسمان و زمین کی خلقت سے توحید و معاد پر جو استدلال کیا ہے، یہ آیت اسی سے متعلق ہے۔ بیچ میں جو مطالب تنبیہ و تذکیر یا تسکین و تسلی کی نوعیت کے آ گئے ہیں وہ اسی مدعا کے تحت ہیں اس وجہ سے ان کے سبب سے کوئی بُعد نہیں پیدا ہوا ہے چنانچہ اسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو خدا آسمان و زمین کا خالق ہے اسی خدا کی نشانیوں میں سے یہ رات اور دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ یہ خود اپنی گردش، اپنے ایاب و ذہاب، اپنے عروج و زوال سے اپنی تسخیر اور اپنی محکومیت کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہ زبان حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ

یہ نہ تو خدا ہیں اور نہ کسی پہلو سے خدا کی خدائی میں شریک ہیں بلکہ خالقِ کائنات نے اس کائنات کی مشین میں ان کو پرزوں کی طرح جوڑا ہے اور وہ اس کے حکم سے اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کی اس شہادت کے بعد ان کو خدا یا شریکِ خدا سمجھنا محض جہالت و حماقت ہے۔ ان کی حیثیت خدا یا شریکِ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کی ہے اور اس طرح کی نشانیاں صرف یہی نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار نشانیاں ہیں جن میں سے یہ بھی ہیں۔

'لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ'۔ یہ اوپر والی بات کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب یہ خدا یا شریکِ خدا نہیں بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے بنایا ہے تو ان کی عبادت اپنے رب کی بھی تحقیر ہے اور اپنی بھی۔ عبادت کا حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند ہر چیز کو وجود بخشا اور ان کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ 'سجدہ' یہاں عبادت کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ یہ عبادت کے سب سے زیادہ نمایاں مظاہر میں سے ہے۔ سورج اور چاند کی عبادت کی ممانعت خاص طور پر اس وجہ سے فرمائی کہ مشرک قوموں نے ہر دور میں ان دونوں کی عبادت کی ہے۔ 'خَلَقَهُنَّ' کی ضمیر جمع ان تمام چیزوں کی طرف لوٹتی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

'اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کو سجدہ نہ کیا جائے۔ سجدہ، بندگی کی سب سے بڑی علامت ہے اس وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کی جو بندگی کرتے تھے تو اس کے متعلق ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ صرف اس لیے وہ کرتے ہیں کہ یہ چیزیں خدا کی قربت کا ذریعہ ہیں۔ گویا ان کی بندگی، ان کے زعم میں، خدا ہی کی بندگی تھی۔ اس ٹکڑے میں ان کے اسی زعم کی تردید ہے کہ خدا کی بندگی اس طرح بلا شرکتِ غیرے ہونی چاہیے کہ اس کی بندگی کی مخصوص علامات میں بھی کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ (۳۸)

خدا کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ہے

یعنی اگر یہ لوگ بربنائے استکبار تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں اور بڑے طنطنہ کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمہاری باتوں کے لیے ان کے کان بہرے اور تمہارے اور ان کے درمیان حجاب حائل ہے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں اور تم بھی ان کی کوئی پروا نہ کرو۔ یہ اگر خدا کی عبادت نہیں کریں گے تو اس سے خدا کی بزم نہیں اجڑ جائے گی۔ تیرے رب کے پاس جو

فرشتے ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح میں سرگرم ہیں اور ان کے ذوق و شوق کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی اس کام سے نہیں تھکتے۔ 'اَلَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ' سے ملائکہ بحیثیت مجموعی مراد ہیں، صرف ملائکہ مقربین مراد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ کی جو صفت یہاں مذکور ہوئی ہے وہ تمام ملائکہ کی مشترک صفت ہے۔ 'عِنْدَ رَبِّکَ' کے الفاظ سے صرف اس قرب الٰہی کا اظہار مقصود ہے جو ملائکہ کو جنوں اور انسانوں کے مقابل میں حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ناہنجار لوگ خدا کی بندگی سے گریز کر رہے ہیں تو کریں، جو ان سے اعلیٰ و اشرف ہیں اور جن کو یہ معبود بنائے بیٹھے ہیں ان کو خدا کی بندگی سے عار نہیں ہے، وہ شب و روز خدا کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور اس طرح سرگرم ہیں کہ ان کی سرگرمی میں ایک پل کے لیے بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنَّکَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَۃً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاھَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۹)

قیامت کی یاد دہانی

توحید کے بعد یہ قیامت کی یاد دہانی فرمائی کہ جو لوگ قیامت کو مستبعد خیال کر رہے ہیں وہ اس زمین میں اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں۔ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک، بے جان اور بے برگ و گیاہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی عنایت سے اس پر رحمت کی گھٹا برسا دیتے ہیں تو دیکھتے دیکھتے اس میں زندگی کی حرکت نمایاں ہو جاتی ہے، اس کی پستی میں سبزہ اور نباتات سے ابھار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے ہر گوشے میں روئیدگی اور نشو و نما کی بہار آ جاتی ہے۔

'اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاھَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی' فرمایا کہ جو خدا اپنی قدرت سے اس زمین کو بار بار مردہ اور بار بار زندہ کرتا رہتا ہے وہ ضرور اس بات پر قادر ہے کہ انسانوں کو بھی ان کے مر جانے کے بعد جب چاہے اٹھا کھڑا کرے۔ 'اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر وہ ہر چیز پر قادر نہ ہو تو خدا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۴۰)

اشرار کو تنبیہ

'الحاد' کے معنی انحراف اور کج روی اختیار کرنے کے ہیں۔ 'یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں تو کسی اور سمت میں رہنمائی کر رہی ہوں لیکن آدمی اپنی دھاندلی، ضد اور کرپزی یا کج بحثی سے کوئی اور راہ اختیار کرے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔

آیت ۲۵ میں بُرے ساتھیوں اور گمراہ لیڈروں کی اس سعی نامراد کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اسی قسم کے اشرار کو اس آیت میں دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اس طرح کی حرکتیں کر رہے ہیں ان کی حرکتیں ہم سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں تو ایک دن ہم ان کو اس کا مزا چکھائیں گے۔ یہ بات یہاں مبہم چھوڑ دی ہے اور اس ابہام میں جو غضبناکی مضمر ہے وہ محتاج وضاحت

نہیں ہے۔

'اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِى النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِیْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ' یہ اسی ابہام کی وضاحت سوالیہ اسلوب میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ لوگوں کی ساری حرکتیں دیکھ رہا ہے تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ جو روش بھی اختیار کریں اس سوال کا فیصلہ کر کے اختیار کریں کہ خوش انجام وہ ہے جو دوزخ میں جھونکا جائے گا یا وہ جو محشر میں اس طرح آئے گا کہ ہر خوف سے بالکل نچنت ہو گا؟ اللہ تعالیٰ کا سب کچھ دیکھنا اور لوگوں کو دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر ہونا جزا اور سزا کو مستلزم ہے اس وجہ سے جس کو بھی اس دنیا میں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ فیصلہ کر کے کرے کہ وہ اپنے لیے دوزخ کا انتخاب کرتا ہے یا جنت کا؟ ان دونوں کی راہیں ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس راہ کو آدمی اپنے لیے بہتر سمجھے اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کو واضح کر کے ان کے درمیان انتخاب کا فیصلہ ہر شخص کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

'اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' یہ اسی اختیار و آزادی کا بیان ہے کہ اللہ نے نیکی اور بدی اور ان دونوں کے انجام کو واضح کر کے تمھیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ چاہے تم نیکی کرو یا بدی البتہ یہ یاد رکھو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس آخری فقرے میں جو وعید ہے الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱-۴۲)

ایک بلیغ حذف

'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے اس کو ذکر سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر اس کے محل میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اسی مضمون کو از سر نو لیا ہے جو سورہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں جب کہ وہ ان کے پاس آ چکا ہے، وہ .... اس کے بعد اس کی خبر حذف کر دی ہے اور اس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ ان کی بدانجامی ظاہر کرنے کے لیے ان کے اس جرم کی سنگینی ہی کافی ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہی روز بد دیکھیں گے جو ان سے پہلے رسولوں اور ان کی تعلیمات کے مکذّبین دیکھ چکے ہیں۔

ایک بلیغ وضاحت

'كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ' کے بعد 'لَمَّا جَآءَهُمْ' کے الفاظ بھی خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔ اس سے ان کے جرم کی غایت درجہ سنگینی کا اظہار مقصود ہے۔ ایک چیز اگر ایک شخص نے دیکھی نہ ہو اور اس کے حسن و قبح کو پرکھنے کا اس کو موقع نہ ملا ہو اور وہ اس کی ناقدری کرے تو اس کو ایک حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جس نے قرآن کو دیکھ لیا، اس کے اعجاز کو پرکھ لیا اور اس کے دلائل کی قوت کو اچھی طرح آزما لیا وہ اگر قرآن کا انکار کرتا ہے تو وہ سورج کی تابانی کا اس وقت انکار کر رہا ہے جب وہ اس کے سر پر چمک رہا ہے۔

قرآن کی بعض صفات کا حوالہ

'وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ' میں یہاں دو پہلو ہیں۔ ایک تہدید و وعید کا، دوسرا قرآن کی پاکیزگی و طہارت کا۔ تہدید و وعید کے پہلو سے یہ سابق مضمون سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ آگے والی آیت کی تمہید ہے۔

'عَزِيْزٌ' کے ایک معنی غالب و مقتدر کے ہیں۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے یہ تہدید کے مضمون کی دلیل ہے کہ جو لوگ قرآن کا انکار کر رہے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ یہ قرآن کسی سائل کی درخواست نہیں ہے بلکہ اس کا بھیجنے والا بھی عزیز یعنی غالب و مقتدر ہے اور یہ کتاب خود بھی عزیز ہے اسی وجہ سے اس کی حیثیت ایک فرمانِ واجب الاذعان کی ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ یہ کتاب ان کا فیصلہ کر کے رہے گی۔ یہاں اس سنتِ الٰہی کو ذہن میں رکھیے جو رسولوں سے متعلق جگہ جگہ بیان ہو چکی ہے۔

'عَزِيْزٌ' کے دوسرے معنی 'مَنِيْعٌ' کے ہیں۔ 'مَنِيْعٌ' اس چیز کو کہتے ہیں جو دسترس سے بالاتر ہو۔ اس کی وضاحت آگے والی آیت میں آ رہی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ شیاطین جن و انس خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن وہ اس میں کوئی گڑبڑ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ باطل نہ اس کے آگے سے اس میں گھس سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کی دراندازی سے اس کو ہر جانب سے بالکل محفوظ بنایا ہے۔ یہ گویا جواب ہوا مخالفین کی اس سعی نامراد کا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ 'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ' (اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گھپلا پیدا کرو تاکہ تم غالب رہو)۔

'لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ'۔

یہ قرآن کی عظمت اور اس کے شرف کا ایک جامع بیان ہے جس کے دو پہلو خاص طور پر اہمیت رکھنے والے ہیں۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

ایک یہ کہ قرآن اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کو اتارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس کو لانے والے جبریل امینؑ ہیں، اس کے حامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کو نقل و قبول کرنے والے اس خلق کے پاکیزہ ترین اخیار و صالحین ہیں۔ گویا ابتدا سے لے کر انتہا تک 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است'۔ اس میں کہیں بھی شیطان کی دراندازی کے لیے کوئی روزن نہیں ہے، نہ اس کے آغاز کی طرف سے نہ اس کی انتہا کی طرف سے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا، جیسا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' کے الفاظ سے واضح ہے، خود اہتمام فرمایا اور یہ قرآن مجید کا وہ امتیاز ہے جو اس سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں کو حاصل نہیں ہوا۔ تورات و انجیل وغیرہ کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے حاملین پر ڈالی گئی تھی جو اس کا حق ادا

نہ کرسکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صحیفے بالکل محرف ہو کے رہ گئے اور ان کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور اس کو قیامت تک کے لیے ہر قسم کی آمیزش سے بالکل محفوظ کر دیا۔

اس حفاظت کے کئی پہلو ہیں:۔

قرآن کی حفاظت کے بعض پہلو

ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اس نظامِ کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملأ اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں لیکن سورۂ جن کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ ان کو قرآن میں اس کے آگے سے (مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ) کچھ گھسانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اپنے جس فرشتہ کو منتخب کیا اس کی صفت قرآن میں ذِیۡ قُوَّۃٍ، مطاع، قوی، امین اور عند ذی العرش مکین وارد ہوئی ہے۔ یعنی وہ فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ ارواحِ خبیثہ اس کو مغلوب نہیں کر سکتیں، وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے، وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اس کے حوالہ کی جاتی ہے وہ اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اس میں زیر زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے ــــــ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن میں اس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا اوّل تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اس کے اوپر نہیں ڈالی بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے 'لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ؕ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ۚ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ' (القیٰمۃ: ۱۶-۱۹) (اور تم اس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اس کے جمع کرنے اور اس کے سنانے کی ذمہ داری تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت) روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریلؑ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے اور یہ مذاکرہ اس ترتیب کے مطابق ہوتا جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی حیاتِ مبارک کے آخری رمضان

میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اسی ترتیب اور اسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ نے اسی کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتّب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحتِ الفاظ اور بلاغتِ معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجودیکہ آپ اس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی ان کی مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ ان کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے۔ دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا۔ اس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَمِنْ خَلْفِہٖ) قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچواں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرمالیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے، بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی اس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اس میں کسی باطل کے گھسنے کا کوئی امکان نہیں ہے اگر اس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہلِ علم اصل پر پرکھ کر اس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔

یہ ہم نے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کے پہلو بعض اور بھی ہیں لیکن یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان چند باتوں سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کی یہ شان کیوں ہے کہ باطل نہ اس کے آگے سے اس میں راہ پا سکتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔

درشتی و نرمی　تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ۔ لفظ تنزیل کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اس کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدائے عزیز و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے یہاں دو صفتوں ـــــ حکیم اور حمید ـــــ کا حوالہ ہے۔ حکیم یعنی جس کی ہر بات اور جس کے ہر کام میں حکمت ہے چنانچہ اس نے یہ حکیمانہ کلام نہایت اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ حَمِیْد یعنی جو سزاوارِ حمد، ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد کاموں کا منبع و سرچشمہ ہے چنانچہ اس نے اپنی اس عظیم نعمت سے اپنی خلق کو محض اپنے جود و کرم سے نوازا۔ اوپر والی آیت میں

ہم دو برابت

صفت عَزِیْزٌ کا حوالہ ہے جس میں تنبیہ و تہدید کا پہلو ہے۔ اس آیت میں حکیم و حمید کا حوالہ اپنے اندر

ترغیب کا پہلو رکھتا ہے۔ ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ‎(۴۳)

آنحضرت صلعم کو تسلّی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی ہے کہ یہ نہ گمان کرو کہ یہ خاص تمھاری ہی قوم نے تمھارے ہی ساتھ یہ رویہ اختیار کیا ہے بلکہ جس طرح کی باتیں تمھیں کہی جا رہی ہیں اسی طرح کی باتیں دوسری امتوں کے اشرار اپنے اپنے رسولوں کو کہہ چکے ہیں۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی یہ ایک مشترک روایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمھاری کسی خامی کا نتیجہ نہیں ہے کہ قوم کے اشرار تمھارے دشمن بن گئے ہیں بلکہ ہمیشہ سے رسولوں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے تو جس طرح دوسرے اولوالعزم رسولوں نے اپنی قوموں کی ایذا رسانیوں کا صبر کے ساتھ مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر کرو۔

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ۔ یعنی یہ اطمینان رکھو کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ اگر اللہ ان لوگوں کی تمام تعدیوں کے باوجود ان کو ڈھیل دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے یہاں جزا اور سزا کا کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ وہ بڑی مغفرت فرمانے والا بھی ہے اور بڑا دردناک عذاب دینے والا بھی۔ وہ آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو اس کی مغفرت کا سزاوار بننا چاہیں وہ سزاوار بن جائیں لیکن جب اس مہلت سے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے یا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں تو ان کو سزا بھی ایسی دردناک دیتا ہے کہ اس طرح کی دردناک سزا کوئی اور نہیں دے سکتا۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ‎(۴۴)

یہود کا القاء کیا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب

قرآن سے اعراض و فرار کے لیے مخالفین جو بہانے پیدا کرتے تھے ان میں سے بعض کو نقل کر کے ان کی لغویت واضح کی گئی ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے بعض دوسرے اعتراضات اصلاً یہود کے القاء کیے ہوئے تھے جو بنی اسماعیل کو قرآن کی نعمت سے محروم کرنے کے لیے انھوں نے ایجاد کیے تھے لیکن قریش کے نادان لیڈر، ان کے حسد اور ان کی چالوں سے بے خبر ہونے کے باعث، محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں، ان کے القاء کیے ہوئے اعتراضات نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔ یہود کے سکھائے ہوئے متعدد اعتراضات جو قریش کے لیڈروں نے اپنا لیے تھے پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی آئیں گے۔ ازآنجملہ ایک اعتراض یہ بھی ان کا تھا کہ وحی کی مخصوص زبان تو اب تک عبرانی رہی ہے جس میں وہ تمام صحیفے نازل ہوئے جن کے آسمانی ہونے کا اقرار قرآن کو بھی ہے

تو اب اللہ میاں نے اپنی زبان کیوں بدل لی اور یہ نئی وحی عربی میں کیوں نازل ہوئی!

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض محض برائے اعتراض[1] قرآن کی مخالفت کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر قرآن کسی عجمی زبان میں اترتا تو یہی لوگ یہ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیتیں ہماری اپنی زبان میں اچھی طرح وضاحت کیوں نہیں کی گئی لیکن جب ہم نے اس کو عربی زبان میں اتار کر ان کے لیے اچھی طرح کھول دیا تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کے شکرگزار ہوتے یہ دشمنوں کا سکھایا ہوا یہ اعتراض لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ سابق روایت کے خلاف اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ وحی عربی زبان میں کیوں اتاری! گویا اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عظیم احسان ان کے لیے وجہ اعتراض بن گیا!

'ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ' یہ فقرہ ان کے اعتراض ہی کا حصہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ یہ بات بناتے کہ پیغام عجمی اور مخاطب عربی!! یعنی یہ کیا بے تکا پن ہے کہ جو لوگ اس کتاب کے سب سے پہلے مخاطب ہیں وہ اس کی زبان سے بالکل نابلد ہیں! ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

'قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ' فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ یہ نعمت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی قدر کریں۔ جو اس پر ایمان نہیں لانا چاہتے وہ تو اس کی مخالفت کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لیں گے لیکن جن کے اندر ہدایت کی طلب اور جن کو اپنی عقلی و روحانی بیماریوں کا احساس ہے وہ اس کے اندر ہدایت بھی پائیں گے اور اپنے دکھوں کا مداوا بھی۔

'وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى' رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں کو یہ اپیل نہیں کر رہی ہے بلکہ فی الواقع انہی کے دلوں کے کان بہرے ہیں۔ قبولِ حق کی صلاحیت ان کے اندر مردہ ہو چکی ہے اس وجہ سے اس کی صدائیں ان کے دلوں پر اثر نہیں کر رہی ہیں بلکہ ان کے کانوں سے ٹکرا کے واپس آ جاتی ہیں۔

'وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى' اسی طرح جو لوگ اس سے راہ یاب نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ یہ ہدایت کی روشنی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روشنی نے ان کی نگاہیں خیرہ کر دی ہیں جس کے سبب سے یہ ان کے لیے رہنمائی کے بجائے اندھے پن کا ذریعہ بن گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں کو روشنی کے بجائے تاریکی ہی کا خوگر کر رکھا تھا اس وجہ سے جب یہ آسمانی روشنی نمودار ہوئی تو ان کی نگاہیں اس کی تاب نہ لا سکیں بلکہ ان کی رہی سہی

---

[1] جیسا کہ آیت ۳ میں فرمایا ہے: 'كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ'۔

روشنی بھی سلب ہو گئی۔ اس مقام کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جو قریب سے نہیں سن سہے ہیں وہ دور سے سننے پر مجبور ہوں گے

'اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍۭ بَعِیْدٍ'۔ یعنی ابھی تو ان کو بہت قریب سے پکارا جا رہا ہے، اللہ کا رسول، اللہ کی کتاب اور اس کا پیغام لیے ہوئے، ان کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے لیکن یہ اپنی رعونت کے سبب سے بہرے بنے ہوئے ہیں، گویا کوئی بات سنتے ہی نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ عنقریب وہ دن بھی آنے والا ہے جب قیامت کا داعی بہت دور سے ان کو پکارے گا اور یہ اس کی پکار سنتے ہی اس کی طرف بھاگیں گے، مجال نہیں کہ ذرا بھی تاخیر یا سرِ مُو انحراف اختیار کر سکیں۔

سورۂ طٰہٰ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَہٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا (۱۰۸)' (جس دن پکارنے والے کے پیچھے وہ بھاگیں گے ذرا بھی اس سے انحراف نہ اختیار کر سکیں گے اور سب کی آوازیں خدائے رحمان کے آگے پست ہوں گی پس تم سرگوشی کے سوا اور کوئی چیز بھی نہ سنو گے)۔

اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اسی سورہ کی آیات ۱-۵ بالخصوص آیت ۵ 'وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ' پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ متکبرین تو بطور رعونت یہ بات کہتے تھے کہ ہمارے دل تمہاری دعوت سے پردے میں ہیں، ہمارے کان بہرے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب حائل ہے لیکن قرآن نے ان کی ایک ایک بات کی تصدیق کر دی اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرما دی کہ ان کے بہرے پن، اندھے پن اور ان کے حجاب کی نوعیت کیا ہے اور ان کی ان بیماریوں کا علاج اب کس دن اور کس طرح ہو گا!

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْہِ ۭ وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیْنَہُمْ ۭ وَاِنَّہُمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ (۴۵)

یہود کا اللہ کیا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ آیت بعینہٖ سورۂ ہود میں بھی گزر چکی ہے، ملاحظہ ہو آیت ۱۱۰۔ وہاں ہم اس کی تفسیر کر چکے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت اسی طرح کے اعتراض کا جواب ہے جس طرح کے اعتراض کا جواب اوپر والی آیت میں دیا گیا ہے۔ یہود، یہ اعتراض بھی لوگوں کو سکھاتے تھے کہ جب تورات، اللہ کی کتاب موجود ہے اور اس کا کتاب الٰہی ہونا قرآن کو بھی تسلیم ہے تو آخر ایک نئی کتاب نازل کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس اعتراض کا جواب قرآن نے مختلف پہلوؤں سے دیا جو مختلف سورتوں میں مذکور ہے۔ یہاں یہ جواب دیا ہے کہ یہ تو امر واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا فرمائی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس میں اختلاف اور تناقض پیدا کر دیا گیا۔ 'فَاخْتُلِفَ فِیْہِ' سے مراد یہاں وہ تناقض ہے جو مختلف اسفارِ تورات میں بہت بھونڈے طور پر پایا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز میں محض تاویل کا اختلاف ہو تو اس کا ازالہ

اصل کی مراجعت اور دوسرے شواہد و نظائر سے ممکن ہے لیکن جب اصل ہی میں کھلا ہوا تضاد و تناقض ہو تو پھر اس اختلاف کا ازالہ ناممکن ہے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات کے مختلف حصوں میں ایک ہی بات اتنے متضاد طریقوں سے بیان ہوئی ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہماری اس کتاب میں تورات کے تضادات کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف اس تضادِ بیان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشین گوئیوں سے متعلق تورات میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہود نے تحریف کی راہ سے یہ تضاد نہ پیدا کر دیے ہوتے تو ان کو اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ پیش آتی کہ تورات کے بعد قرآن کو اللہ تعالیٰ نے کیوں نازل فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دین کی کون سی کمی پوری کرنے کے لیے ہوئی۔ لیکن یہود نے اپنی بدبختی سے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے صرف اپنی ہی گمراہی کا سامان نہیں کیا بلکہ ایک خلقِ کثیر کی گمراہی کا وبال بھی اپنے سر لیا۔

تورات میں اس طرح کے تضادات کے پیدا ہونے کی وجہ کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں کہ حفاظت کا وہ اہتمام اس کو حاصل نہ ہو سکا جو قرآن کو حاصل ہوا۔ اس پر متعدد بار ایسی آفتیں آئیں کہ پوری تورات ناپید ہو گئی۔ بعد میں جن لوگوں نے اس کو مرتب کیا محض اپنی یادداشت سے مرتب کیا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے مرتب کرنے والے کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ اس کے بعض صحیفے بالکل صیغۂ راز میں رکھے جاتے تھے جن کے مندرجات سے خاص محرمانِ راز کے سوا دوسرے لوگ واقف نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کہ ان میں ایسی باتیں بھی تھیں جن کی عام اشاعت علمائے یہود اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں میں انھوں نے اپنے حسبِ منشا تحریفات بھی کیں اور وہ اس تحریف میں کامیاب ہو گئے۔ کسی ایسی کتاب میں تناقضات کا پیدا ہو جانا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے اور ان تناقضات کا بالکل بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو جائے، لوگ اسی تاریکی میں پھر گھر جائیں جس سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ روشنی نازل فرمائی تھی اور ان کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو جائیں جن کے دور کرنے کی کوئی سبیل باقی ہی نہ رہ جائے۔

ایک سخت دھمکی

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ'۔ یہ نہایت سخت دھمکی ہے اور چونکہ یہ اعتراض، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہود کا سکھایا ہوا تھا، اس وجہ سے دھمکی بھی انہی کی طرف اشارہ کر کے دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود ابھی تک اپنے آپ کو تورات کا حامل سمجھے ہوئے بیٹھے اور اس غلط میں مبتلا ہیں کہ تورات کی بدولت جو امامت و سیادت ان کو حاصل ہوئی تھی وہ بدستور ان کو حاصل ہے' اس کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو ظلم وہ کر چکے ہیں اس کے بعد وہ مستحق تو تھے کہ اللہ کی عدالت اور اس کے عذاب کے ذریعہ سے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر

امت کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اس وجہ سے ان کو مہلت دی گئی لیکن یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن پوری ہو جائے گی اور یہ اپنے اس ظلم کا مزا چکھیں گے۔

تورات میں اختلافات کا نتیجہ

'وَاِنَّھُمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ'۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس اختلاف و تناقض کا جو تورات میں پیدا کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تورات کی ہر چیز خود اہلِ تورات کی نگاہوں میں مشکوک ہو گئی جس سے حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا۔ ان کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقے نے جو بات اپنی خواہش کے مطابق پائی اسی کو اپنا دین بنا لیا اور دراصل دین ان تناقضات کے اندر گم ہو گیا۔

امام رازیؒ کے نزدیک 'مِنْہُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع تورات ہی ہے اور اس کے مشکوک ہونے کا پہلو وہی ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

یہ مضمون آگے سورۂ شوریٰ میں بھی آئے گا۔ وہاں اس آیت کے بعض اجمالات کی وضاحت ہو جائے گی۔ شوریٰ میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ ط وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَھُمْ ط وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ (الشوریٰ: ۱۴)	اور یہ لوگ محض باہمی ضد م ضدا کے باعث متفرق ہوئے بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی، ایک مدتِ معین کے لیے تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور جو لوگ ان کے بعد کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے الجھن میں ڈال دینے والے شک میں مبتلا ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا ط وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۴۶)

مخالفین سے بے پروائی کا اعلان

یہ ان لوگوں سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ فرمایا کہ نہ کسی کی نیکی سے خدا کو کوئی نفع پہنچنے والا ہے اور نہ کسی کی بدی سے اس کا کوئی نقصان ہے۔ جو نیکی کرے گا اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہو گا اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ جس کے جو اعمال ہوں گے اسی کے ثمرات و نتائج وہ اس کے سامنے رکھ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو راہِ راست دکھانے کی یہ سرگرمی جو ہے اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ لوگوں کی ہدایت کے بغیر خدا کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ ساری بھاگ دوڑ لوگوں ہی کی بھلائی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ خدا کی پکڑ میں آئیں درآنحالیکہ ان پر اچھی طرح حجت تمام نہ ہوئی ہو۔ سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۵ میں بھی یہ مضمون بالکل اسی سیاق و سباق میں آیا ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ہم دوسرے محل میں کر چکے ہیں کہ جب مبالغہ پر نفی آئے تو اس سے

مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے اس وجہ سے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ کے معنی ہوں گے: اور تیرا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ۔۔۔ آیات: ۴۷-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو عذاب یا قیامت سے اس بنا پر تحنیت تھے کہ ان کو اس کا وقت تعین کے ساتھ نہیں بتایا جا رہا ہے۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی حقیقت کا انکار محض اس بنیاد پر کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ اس کے ظہور کا وقت بتایا نہیں جا سکتا۔ کتنی پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں جن کے ظہور کا وقت اگرچہ کسی کو نہیں معلوم لیکن کوئی عاقل اس کا انکار نہیں کرتا۔

اس کے بعد عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے حال پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے تھڑدلے پن کا حال یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل سے ان کو توبہ و اصلاح کے لیے جو مہلت دی ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض ان پر دھونس جمائی گئی ہے اور عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں حالانکہ اگر ابھی ذرا خدا کی کسی گرفت میں آ جائیں تو اس سے نجات کے لیے لمبی لمبی دعائیں کرتے نہیں تھکیں گے۔

آخر میں قرآن کی تکذیب کے ہولناک انجام سے ڈرایا اور آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اس کی صداقت کی جو دلیلیں بیان ہوئی ہیں اگر وہ ان کے لیے کافی نہیں ہیں تو عنقریب اس کی وہ آفاقی و انفسی نشانیاں ظاہر ہوں گی جن کے انکار کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے گا ۔۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۷-۵۴

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ ﴿٤٧﴾ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُم مِّن مَّحِيصٍ ﴿٤٨﴾ لَّا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ ﴿٤٩﴾ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا

مِنۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ هٰذَا لِىۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآٮِٕمَةً ۙ وَّلَٮِٕنۡ رُّجِعۡتُ اِلٰى رَبِّىۡۤ اِنَّ لِىۡ عِنۡدَهٗ لَـلۡحُسۡنٰى‌ ۚ فَلَـنُنَبِّئَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا وَلَــنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ ﴿۵۱﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرۡتُمۡ بِهٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ هُوَ فِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ‌ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ‌ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ مُّحِيۡطٌ ﴿۵۴﴾ ع ۱

ترجمۂ آیات ۴۷ - ۵۴

اور قیامت کے علم کا معاملہ صرف اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اور کوئی میوہ اپنے غلاف سے باہر نہیں نکلتا اور نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اسی کے علم سے۔ اور جس دن ان کو پکارے گا کہ میرے شریک کہاں ہیں تو کہیں گے کہ ہم نے تجھ سے عرض کر دیا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا گواہ نہیں رہا۔ اور جن کو وہ پہلے پکارتے رہے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے اور وہ جان لیں گے کہ اب ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہا۔ ۴۷ - ۴۸

اور انسان بھلائی کی دعا سے نہیں تھکتا اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھا دیتے ہیں

اس تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہوتی ہے تو کہتا ہے یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں قیامت کے ہونے کا گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو میرے لیے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔ پس ہم ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ان کے اعمال سے ضرور آگاہ کریں گے اور ان کو ایک سخت عذاب کا مزا لازماً چکھائیں گے۔ ۴۹-۵۰

اور جب ہم انسان پر اپنا فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔ ۵۱

ان سے کہو، بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ٹھہرے گا جو ایک نہایت دور رس مخالفت میں جا پڑا! ۵۲

ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔ اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی نہیں ہے! آگاہ، کہ یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں شک میں ہیں! آگاہ، کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے! ۵۳-۵۴

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَاتٍ مِنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ (۴۷)

قیامت کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قیامت کے انذار کے جواب میں استہزاء کے طور پر یہ سوال کرتے کہ مَتٰی ھُوَ، وہ کب نمودار ہوگی؟ اگر اس کو آنا ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی؟ آخر یہ جہاز چلا تو کہاں رک گیا، وہ ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا؟ اس قبیل کے مذاق اڑانے والوں کو قرآن میں جگہ جگہ یہ جواب دیا گیا ہے کہ قیامت کا آنا تو ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات اور اس کے خالق

کی صفات کا یہ ایک بدیہی تقاضا ہے۔ آفاق و انفس اور عقل و فطرت اس کے گواہ ہیں۔ اس وجہ سے وہ آئے گی تو ضرور۔ رہا یہ سوال کہ وہ کب آئے گی تو اس کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے، وہی جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ اس راز سے اس کے سوا کوئی دوسرا واقف نہیں ہے۔

وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ۔ اور صرف یہی ایک راز ایسا نہیں ہے جس سے خدا کے سوا کوئی اور واقف نہ ہو بلکہ اور بھی کتنی پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم سے ہے۔ انسان کا علم ان کے باب میں نہایت محدود ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حقیقت ہونے سے کوئی عاقل انکار نہیں کرتا۔ گندم کا ایک خوشہ نمودار ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پکنے کی نوبت آئے گی یا نہیں اور آئے گی تو اس میں کتنے دانے ناقص نکلیں گے، کتنے صحیح، کتنے ضائع جائیں گے، کتنے محفوظ رہیں گے، ان کے پکنے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کیا ہے اور ان میں سے کتنے دانے کسان کے نصیب کے ہیں جو اس کے کھتے تک پہنچیں گے اور کتنے چرند و پرند کی نذر ہو جائیں گے۔ ان ساری باتوں کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس وجہ سے اگر انسان پر قیامت کے ظہور کا وقت واضح نہیں ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ قیامت تو بہت بڑی چیز ہے، انسان کا حال تو یہ ہے کہ اس کو اپنے سامنے کی روزمرہ مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کی واقفیت بھی بہت تھوڑی ہی ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى۔ ایک عورت حاملہ ہوتی ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہ لڑکی جنے گی یا لڑکا، ناقص جنے گی یا سالم، مردہ جنے گی یا زندہ اور جنے گی تو کس دن اور کس وقت جنے گی! ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ اگر ایک ایسی عامۃ الورود چیز سے متعلق انسان کا علم اتنا محدود ہے تو اس کو قیامت کے ظہور کا صحیح وقت نہ معلوم ہو سکے یا نہ بتایا گیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! ہاں اگر وہ یہ دعویٰ کر سکتا کہ بقیہ ساری چیزوں کا علم تو اس کو حاصل ہے، صرف یہی ایک چیز اس کے علم سے باہر رہ گئی ہے تب اس کے لیے یہ جائز ہو سکتا تھا کہ اس کی بنا پر وہ کسی شک یا انکار میں مبتلا ہو۔ یہی مضمون دوسرے مقام میں یوں بیان ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (لقمان ۳۱: ۳۴)	قیامت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور رحموں کے اندر جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کسی جان کو بھی یہ پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گی اور کسی کو بھی یہ خبر نہیں کہ وہ کس سرزمین پر مرے گا۔ علیم و خبیر صرف اللہ ہی ہے۔

قیامت کے دن مشرکین شرک سے تبرّا کریں گے

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ۔ یعنی اگر قیامت سے پہلے پرائی

ان لوگوں کو اپنے مزعومہ شرکاء کے بل پر ہے تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن جب اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے گا کہ جن کو تم نے میرا شریک گمان کر رکھا تھا ان کو بلاؤ، وہ میری پکڑ سے تم کو چھڑائیں، تو یہ جواب دیں گے کہ ہم نے عرض کر دیا کہ اب ہم میں سے کوئی بھی اس اعتراف کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تیرا شریک ہے۔ یہ مضمون سابق سورہ — سورۂ مومن — میں بھی گزر چکا ہے۔

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (المومن: ۷۳-۷۴)	پھر ان سے کہا جائے گا کہ وہ کہاں ہیں جن کو تم اللہ کے مقابل میں شریک گردانتے تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ وہ تو سب ہم سے کھوئے گئے بلکہ ہم اس سے پہلے کوئی چیز پوجتے ہی نہیں تھے۔ اس طرح اللہ کافروں کو حواس باختہ کر دے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے جن مزعومہ شرکیوں پر ان لوگوں کو ناز ہے ان کی عقیدت کا نشہ پہلی ہی پکار پر ہرن ہو جائے گا۔

بعض اہل تاویل نے 'اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ' کو ان کے مزعومہ شرکاء کا قول مانا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ مشرکوں سے یہ مطالبہ کرے گا کہ تمھارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم نے میرا شریک گمان کیا تو جن ملائکہ یا انبیاء یا صالحین کی انھوں نے پرستش کی ہوگی وہ سبقت کر کے اپنی صفائی پیش کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بات کا گواہ بننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی تیرا شریک ہے۔ یہ تاویل غالباً مندرجہ ذیل آیت کی روشنی میں اختیار کی گئی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَاۗءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)	اور جس دن اللہ ان کو اور جن کو یہ اللہ کے سوا پوجتے رہے ہیں، اکٹھا کرے گا پس ان سے پوچھے گا کہ کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا یہ خود گمراہ ہوئے؟ وہ جواب دیں گے تو پاک ہے، ہمیں یہ حق حاصل نہیں تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو کارساز بناتے۔ بلکہ ہوا یہ کہ تو نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ تیری یاددہانی یہ فراموش کر بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے۔

پہلی تاویل اختیار کرنے کی صورت میں لفظ 'اٰذَنّٰكَ' اظہارِ برأت کے مفہوم میں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور تجھ سے امیدوار ہیں کہ تو ہم پر رحم فرمائے گا۔

دوسری تاویل لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے جواب میں تو وہ بات کہیں گے جو سورۂ فرقان کی محولہ بالا آیت میں مذکور ہے لیکن جب ان کی عبادت کے مدعیوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوگا کہ تم اپنے مزعومہ شرکا کو بلاؤ تو وہ یہ جان کر کہ وہ بلائے جا رہے ہیں اپنے اس قول کا حوالہ دے دیں گے جو وہ پہلے کہہ چکے ہوں گے اور جو الفرقان کی آیت میں مذکور ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيصٍ (۴۸)

عابد اپنے اپنے معبودوں سے اظہار براءت کریں گے یا معبود اپنے عابدوں سے۔ دونوں ہی صورتوں میں مشرکوں کی نامرادی یقینی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے جن کے اعتماد پر آخرت کو نظرانداز رکھا وہ سب ہوا ہو جائیں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا کہ اب خدا کے عذاب سے ان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔

لفظ 'ظن' پر اس کے محل میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ ان مواقع میں یہ یقین کے مفہوم میں آتا ہے جہاں مقصود مستقبل کی کسی ایسی حقیقت کا بیان ہو جو اگرچہ نادیدہ ہو لیکن متکلم کے نزدیک وہ یقینی ہو۔ مثلاً إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ (الحاقۃ: ۲۰) (مجھے یہ یقین رہا کہ مجھے بہرحال اپنے روزِ حساب سے دوچار ہونا ہے)۔

لَا يَسْأَمُ الْإِنسَانُ مِن دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِن مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ (۴۹)

انسان کی ایک عجیب کمزوری

لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن اس سے یہاں مراد وہی منکرین و مستعجلین ہیں جو قیامت کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے کہ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! ان کو خطاب کر کے یا ان کا حوالہ دے کر کہنے کے بجائے بات بصیغۂ عام کہہ دی گئی ہے تاکہ ان سے بیزاری اور کراہت کا اظہار بھی ہو جائے اور بات ایک کلیہ کی حیثیت بھی حاصل کر لے۔

فرمایا کہ یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اگر اس کو نعمت و رفاہیت حاصل ہو جائے تو ہمارا شکرگزار ہونے کے بجائے ہمیں چیلنج کرتا اور عذاب کا مطالبہ کرتا ہے اور اگر ذرا ہماری پکڑ میں آ جائے تو اس سے چھوٹنے کے لیے لمبی لمبی دعائیں مانگتا اور یہ عہد کرتا ہے کہ اگر اس کو اس گرفت سے نجات مل گئی تو وہ ہمیشہ کے لیے ہمارا شکرگزار اور فرمانبردار بندہ بن جائے گا لیکن یہ محض اس کا فریب ہوتا ہے۔ جب ہم اس کو اس مصیبت سے نجات دے دیتے ہیں تو وہ پھر انہی خرمستیوں میں گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے مبتلا رہ چکا ہوتا ہے۔ اور اگر ہم اس مصیبت سے نجات نہ دیں یا مصیبت دراز ہو جائے تو بجائے اس کے کہ اللہ کے فیصلہ پر راضی اور صابر رہے بالکل دل شکستہ و بے حوصلہ اور خدا سے مایوس ہو جاتا ہے۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس طرح کے لوگ اپنی دنیاوی کامیابیوں اور ترقیوں کے لیے دعا کرنے میں بڑے سرگرم ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک دعائے خیر سے مراد یہی دنیوی ترقیوں کی دعا ہے لیکن یہ بات عام تجربہ و مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس طرح کے لوگ جب تک ان کا سفینہ رواں دواں

رہے کبھی خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنے حوصلوں ہی میں مگن اور اپنے ارمانوں ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔ البتہ جب کشتی کسی بھنور میں پھنستی ہے تب انھیں خدا یاد آتا ہے اور اس وقت بڑی لمبی لمبی دعائیں خود بھی کرتے اور دوسروں سے بھی کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اگر کشتی بھنور سے باہر آگئی تو اس کے باہر آتے ہی ان کو خدا پھر بھول جاتا ہے اور اس چیز کو اپنی تدبیر و حکمت یا اپنی بلند اقبالی کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں اور اگر مصیبت ذرا دراز ہو گئی تو پھر بالکل مایوس ہو کر ڈگ ڈال دیتے ہیں۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ لقمان میں ہے:

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝ (لقمان: ۳۲)	اور جب ان کو سائبانوں کی طرح موجیں ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں اسی کی خالص اطاعت کا عہد کرتے ہوئے۔ پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں (اور زیادہ بدعہدی کرنے والے نکلتے ہیں) اور ہماری آیات کا انکار وہی کرتے ہیں جو بالکل عہد شکن اور ناشکرے ہوتے ہیں۔

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (یونس: ۱۲)	اور جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے یا بیٹھے یا کھڑے۔ پس جونہی ہم نے اس کا دکھ دور کر دیا وہ اس طرح چل دیتا ہے گویا کبھی اپنے کسی دکھ کے ازالہ کے لیے ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔

یہی مضمون اسی سورۂ یونس میں بدیں الفاظ بھی وارد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ	اور وہی اللہ ہے جو تم کو خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو سازگار ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ اس سے مگن ہوتے ہیں، آجاتی ہے کسی سمت سے تند ہوا اور ان پر موجیں اٹھنے لگتی ہیں ہر جانب سے۔ اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اب وہ ہلاک ہوئے تو اللہ کو پکارتے ہیں اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم تیرے شکر گزار

هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ	بن کے رہیں گے۔ تو جب ان کو نجات دے
اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ	دی تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی
بِغَيْرِ الْحَقِّ ۝ (یونس : ۲۲-۲۳)	حق کے۔

ان نظائر کی روشنی میں میرے نزدیک آیتِ زیرِ بحث کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے انسان جب کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تب تو دعائے خیر سے نہیں تھکتے چنانچہ آگے آیت ۵۱ میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے: وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (اور جب اس کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے)۔

'وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ'۔ یعنی مصیبت کے پہلے مرحلے میں تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ دعائیں نتیجہ خیز نہیں ہو رہی ہیں تو خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر بالکل دل شکستہ اور بے حوصلہ ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اس قماش کے لوگ نعمت میں تو خدا کو بھولے رہتے ہیں، صرف مصیبت میں اس کو یاد کرتے ہیں اور مصیبت میں بھی خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ جب مصیبت دور ہو جائے تو اس کو پھر بھول جاتے ہیں اور اگر دور ہوتی نظر نہ آئے تو خدا سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں کفر و ناشکری کی ہیں۔ صحیح مومنانہ کردار یہ ہے کہ آدمی نعمت و رفاہیت کی حالت میں اپنے پروردگار کا شکر گزار رہے اور جب کوئی آزمائش پیش آ جائے تو صبر کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار رہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نہ نعمت میں اکڑنے والا اور فخر کرنے والا بنے اور نہ مصیبت میں تھڑدلا، پست ہمت اور مایوس بلکہ اللہ کے فیصلہ پر راضی و مطمئن رہے۔ یہی ایمان و توکل کی اصلی شان ہے اور ایسے ہی بندے نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی اور راضیۃ مرضیۃ کا مقام پاتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِىْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّىْٓ اِنَّ لِىْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۵۰)

ایک اور کمزوری

یعنی جس مصیبت سے چھوٹنے کے لیے لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے اگر وہ دور نہیں ہوتی تب تو، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ہے، خدا سے مایوس ہو جاتا ہے اور اگر اس کی مصیبت دور کر کے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے نوازتا ہے تو اس کا شکر گزار ہونے کے بجائے، اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہی تھا۔ میں اسی عزت و شرف کے ساتھ پیدا ہوا ہوں اور اسی کے اندر جیوں گا۔ مجھے نہ اس سے کوئی محروم کر سکتا اور نہ اس کے لیے مجھے کسی کے شکر گزار ہونے

کی ضرورت ہے۔ رہی قیامت، جس سے بعض لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں تو اوّل تو مجھے اس کے ہونے کا گمان نہیں اور بالفرض ہوئی اور مجھے اپنے رب کے پاس جانا ہی پڑا تو وہاں بھی میرا درجہ و مرتبہ محفوظ رہے گا اور میرا انجام نہایت شاندار ہوگا اس لیے کہ میری دنیا شاندار ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس طرح کے لوگ زبان سے یہ باتیں کہیں (اگرچہ بہتیرے نہایت بے باکی سے یہ کہتے بھی ہیں) بلکہ ذہن کے اندر ان خیالات کا پایا جانا کافی ہے۔ قرآن میں آدمی کی ذہنیت کی تعبیر بھی 'قول' سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ آدمی کا رویّہ اس کے باطن کی سب سے زیادہ صحیح غمازی کرتا ہے۔

خیالی جنت میں بسنے والوں کو تنبیہ

'فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ...... الاٰیۃ' یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس قسم کی جنت الحمقاء میں زندگی گزار رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ احمق لوگ یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کو عیش و آرام حاصل ہے اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) ان کو سب کچھ حاصل ہوگا تو وہ یاد رکھیں کہ آخرت لازمی ہے اور اس میں ہم ان کافروں کو ان کے اعمال سے آگاہ کریں گے۔ "ان کے اعمال سے آگاہ کریں گے" سے مقصود اس کا لازم ہے جس کی وضاحت 'وَلَنُذِیْقَنَّھُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ' سے ہوگئی۔ یعنی ان کو ایک عذاب شدید کا مزا چکھائیں گے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰبِجَانِبِہٖ ۚ وَاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ (۵۱)

'نَاٰبِجَانِبِہٖ' سے وہی مضمون ادا کیا گیا ہے جو دوسرے مقامات میں 'تَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ' یا 'ثَانِیَ عِطْفِہٖ' وغیرہ محاورات سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ غرور و استکبار سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کی تعبیر ہے۔ 'جانب' کے معنی پہلو کے ہیں۔ آدمی جب کسی سے غرور کے ساتھ منہ موڑتا ہے تو مونڈھے جھٹک کر اپنا پہلو بدلتا اور وہاں سے چل دیتا ہے۔ اسی حالت کو یہاں 'نَاٰبِجَانِبِہٖ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تنگ ظرفوں کے کردار کا ایک خاص پہلو

اوپر کی آیات میں اس قبیل کے لوگوں کے کردار کا ایک پہلو پیش کیا گیا ہے۔ اب ان کے اسی کردار کا دوسرا پہلو دکھایا جا رہا ہے کہ ان سفلہ لوگوں (اشارہ قریش اور اہل طائف کے فراعنہ ہی کی طرف ہے) کا حال یہ ہے کہ جب ہم ان پر اپنا انعام کرتے ہیں تو یہ ہم سے اعراض کرتے اور غرور سے اکڑتے ہیں اور اگر ذرا ہماری گرفت میں آجائیں تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اس طنطنہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ذرا میں بہک جانے والے اور ذرا ہی میں بلبلا اٹھنے والے ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ثُمَّ کَفَرْتُمْ بِہٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ ھُوَ فِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ (۵۲)

مکذبین قرآن سے ایک سوال

یہ ان مکذبین سے علیٰ سبیل التنزل ایک سوال فرمایا کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو قرآن کا انکار کر رہے ہو تو اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تب کہاں جاؤ گے! اس صورت میں ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو ایسی دور رس مخاصمت میں مبتلا ہو کر اپنی ہلاکت کی اس منزل کو پہنچ جائیں جہاں سے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے!

قرآن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت

یہ قرآن پر پوری سنجیدگی اور پوری اہمیت کے ساتھ غور کر کے اس کے باب میں کوئی فیصلہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ آگاہ کر رہا ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ سہل انگاری سے نظر انداز کر دی جائے یا ہنسی مسخری میں اڑا دی جائے بلکہ بڑے ہی قوی دلائل کی شہادت کے ساتھ یہ بڑے ہی ہولناک انجام کی خبر ہے اس وجہ سے جو لوگ نہایت ڈھٹائی سے اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ کم از کم اس کے دعوے کی صحت کے امکان کے پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر وہ اس کی صحت کا امکان محسوس کرتے ہیں (اور کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس کے امکان سے انکار نہیں کر سکتا) تو دانشمندی کا تقاضا اور عاقبت بینی کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اس قرآن پر سو بار غور کریں اور جو فیصلہ بھی کریں اس کے نتائج پر دور تک سوچ کر کریں۔ اگر وہ اس کو اختیار کریں گے تو کوئی چیز کھوئیں گے نہیں بلکہ پائیں گے اور سب کچھ پائیں گے اور اگر محض ضد اور مخاصمت کے جنون میں مبتلا ہو کر اس کا انکار کر دیں گے تو یہ مخاصمت ان کو اتنی دور لے جا کر پھینکے گی جہاں سے پھر لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا ـــــ مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ پر اس کی حقیقی اہمیت سامنے رکھ کے غور کرو۔ اگر ضد، انانیت، حسد اور مخاصمت کو اس میں دخیل ہونے دیا گیا تو یہ کشمکش نہایت تباہ کن انجام پر منتہی ہوگی۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳)

قرآن کی صداقت کے آثار آفاق وانفس میں

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مکذبین قرآن کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کو، اس کے دلائل کی بنیاد پر، ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کی تصدیق کے لیے ہماری نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہیں تو عنقریب وہ وقت بھی آ رہا ہے جب مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، اس کی حقانیت کی ایسی نشانیاں ظاہر ہوں گی کہ یہ لوگ پکار اٹھیں گے کہ بے شک قرآن بالکل حق ہے۔

'آیات' سے مراد غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کے وہ آثار و شواہد ہیں جن کی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے۔ یہ پیشین گوئی اس سورہ میں بھی پیچھے تاریخی دلائل کی روشنی میں گزر چکی ہے۔ ابتداءً تو قریش کے لیڈروں نے ان باتوں کو تعلّی پر محمول کر کے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب مدینہ میں اور خود مکہ کے اندر اور اس کے

اطراف میں یہاں تک کہ خود قریش کے اچھے لوگوں کے اندر بھی اسلام جڑ پکڑنے لگا تب ان کو اور ان کے پشت پناہوں کو کچھ تنبہ ہوا۔ بالآخر ہجرت کے بعد غلبۂ اسلام کے ایسے واقعات پیش آئے کہ قریش تو درکنار روم و فارس کے لیے بھی اسلام کے مقابل میں ٹکنا ناممکن ہوگیا۔ یہ مضمون سورۂ نمل کی آیت ۹۳ میں بھی ہے 'سَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ فَتَعۡرِفُوۡنَہَا' (اور وہ اس کی نشانیاں تم کو دکھائے گا پس تم ان کو پہچان جاؤ گے)۔

'اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ' یعنی غلبۂ حق کی جو بشارت تمھیں دی جا رہی ہے اگرچہ مستقبل سے متعلق ہے لیکن تمھارا رب ماضی، حاضر اور مستقبل کی ہر چیز سے واقف ہے اس وجہ سے مطمئن رہو کہ ان میں سے ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

اَلَاۤ اِنَّہُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّہِمۡ ؕ اَلَاۤ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ (۵۴)

یہ آخر میں ان معاندین کی اصل علّتِ فساد سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں مشتبہ ہیں۔ ان کے اس اشتباہ نے انھیں زندگی کے معاملات میں ناعاقبت اندیش اور حق کی مخالفت میں دلیر بنا دیا ہے۔ انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ وہ جو کچھ چاہے گا اور جب چاہے گا، کر ڈالے گا۔ نہ کوئی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتا اور نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا۔

بتوفیقِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

رحمان آباد
۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء
۱۸۔ شوال ۱۳۹۵ھ

تدبّرِ قرآن

۴۲

الشّوریٰ

۱۔ سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

اس سورہ کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے۔ اسی کے تحت قیامت سے بھی ڈرایا گیا ہے اس لیے کہ توحید کی اصلی اہمیت اسی وقت سامنے آتی ہے جب اس بات پر ایمان ہو کہ انصاف کا ایک دن لازماً آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص کو سابقہ اللہ واحد و قہار ہی سے پیش آئے گا، کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کی پکڑ سے کسی کو بچا سکے یا اس کے اذن کے بغیر اس کے سامنے زبان ہلا سکے۔

استدلال کی بنیاد اس میں دعوتِ انبیاء کی تاریخ پر ہے کہ آدمؑ و نوحؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاء نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور ان کو بھی اللہ نے اسی طرح وحی کے ذریعہ سے تعلیم دی جس طرح یہ قرآن وحی کیا جا رہا ہے۔ مختلف حلقوں نے دین کے معاملہ میں جو اختلاف کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے رسولوں نے الگ الگ دینوں کی تعلیم دی بلکہ اس کی وجہ صرف باہمی عداوت و رقابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے باوجود مختلف گروہوں نے اپنی ضد اور اپنی برتری قائم رکھنے کے زعم میں حق سے اختلاف کیا اور اس طرح لوگ مختلف گروہوں اور حلقوں میں بٹتے گئے۔ یہ قرآن اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے ایک میزانِ حق بن کر نازل ہوا ہے۔ اگر لوگ اس میزان کے فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے تو اب قیامت کی میزانِ عدل لوگوں کا فیصلہ کرے گی۔

ورمکے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکی دور کے آخر میں، ہجرت سے متصل زمانے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کو اس میں جو خطاب ہے اس کی نوعیت وداعی خطاب کی ہے، گویا ان سے متعلق پیغمبرؐ کی جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہوگئی، اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اگر انھوں نے یہ ذمہ داری اب بھی محسوس نہ کی تو اس کے نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اسی طرح مسلمانوں سے متعلق اس میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اب وہ ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جس میں ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی کی شکل میں اپنے فرائض ادا کرنے ہیں جس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بار بار یہ تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری ذمہ داری لوگوں کو واضح طور پر حق پہنچا دینے کی تھی وہ تم نے پوری کر دی۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اسی ضمن میں بعض اعتراضات کے جواب بھی دیے گئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مخالفین کی طرف سے کیے گئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دین توحید کی وحی اللہ نے تم پر کی ہے اسی دین کی وحی اس نے تم سے پہلے آنے والے رسولوں پر بھی کی اور وحی کا طریقہ بھی وہی ہے جو اس سے پہلے اختیار کیا گیا۔ اللہ کی ذات بہت بلند اور عظیم ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آسمان اس کی خشیت سے پھٹا جا رہا ہے اور فرشتے برابر اس کی تسبیح اور اہل زمین کے لیے استغفار میں سرگرم ہیں جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ ان کے ایمان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اللہ نے جو عربی قرآن تم پر اتارا ہے اس کے ذریعہ سے اہل مکہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دو جس دن وہ سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر ایمان لانے والوں کو جنت میں اور کفر کرنے والوں کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہدایت وہی پائیں گے جو اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۱۱-۲۰) آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، ان کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اولاد اور رزق خدا ہی بخشتا ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی دین توحید کی تعلیم تمام نبیوں نے دی اور اسی پر قائم رہنے اور اس میں اختلاف نہ پیدا کرنے کی انھوں نے برابر تلقین کی۔ جن لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا انھوں نے خدا کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد محض باہمی عناد اور تعصب کے سبب سے پیدا کیا۔ اگر اللہ نے اس جھگڑے کے فیصلہ کے لیے ایک وقت نہ مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا فیصلہ فوراً کر دیا جاتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اسی دینِ انبیاء کی دعوت دو اور اسی پر جمے رہو اور لوگوں کو آگاہ کر دو کہ اللہ نے جو کتاب میزانِ عدل بنا کر اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ اسی میزانِ عدل کے ذریعہ سے تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔ جو لوگ اس کے بعد بھی تم سے جھگڑیں ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ انھیں متنبہ کر دو کہ قیامت کو بہت دور نہ سمجھیں۔ اللہ نے جو مہلت بخشی ہے اس سے فائدہ اٹھا لیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ نہایت مہربان بھی ہے اور نہایت منتقم و قہار بھی۔ اگر وہ لوگوں کو، ان کے طغیان و فساد کے باوجود، مہلت دیتا ہے تو اپنی سنت کے مطابق دیتا ہے۔ اس مہلت کے بعد وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

(۲۱-۲۶) اگر انھوں نے کچھ شرکاء ایجاد کیے ہیں جنھوں نے اللہ کے رسولوں کے لائے ہوئے دین سے کوئی الگ دین ان کے لیے ایجاد کیا ہے تو یہ دین اور ان کے یہ شرکاء قیامت کے دن کچھ بھی ان کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن مشرکین اپنے انجام پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے ہوگی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں تمہاری ہدایت کے لیے جو اتنا فکرمند ہوں تو اس لیے نہیں کہ میں تم سے کسی صلہ کا طالب ہوں بلکہ یہ محض حق قرابت ہے جو تمہارے لیے مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ گے

تو اس کا صلہ تم خود پاؤ گے۔ اگر یہ لوگ تمہاری وحی کو افترا بتلاتے ہیں تو تمہارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ چشمۂ فیض تمہارے اندر خدا نے جاری کیا ہے، اگر وہ چاہے تو ابھی اس کو بند کر دے، پھر تم کسی طرح بھی اس کو جاری نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں دیکھنے کی چیز اس کے اثرات اور اس کی برکات ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کو سربلند کر رہا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بھی کہیں اس کی پروا نہ کرو۔ جن کے اندر صلاحیت ہے وہ اس کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے۔

(۲۷-۲۹) اگر یہ لوگ اپنی دنیوی برتری کو اپنے برحق ہونے کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں تو ان کو بتا دو کہ آخرت کی نعمتوں کے مقابل میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شیطان کے فتنوں سے بچانا چاہا اس وجہ سے دنیا کے طالبوں کو بھی اتنا ہی دیتا ہے جتنا اس کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے ورنہ وہ ان کو پوری ڈھیل دے دیتا کہ وہ اس دنیا میں سے جتنا چاہیں اپنے دامن بھر لیں ـــ اللہ کی ڈھیل سے کسی کو غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہے لوگوں کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ لوگوں کی ناشکری اور ان کے طغیان کے باوجود ان سے درگزر کرتا ہے۔ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں جو تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں اگر کوئی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو انہی کے اندر دیکھ سکتا ہے کہ انسان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اگر خدا حفاظت نہ کرے تو انسان کے تمام وسائل اس کی حفاظت سے قاصر ہیں۔ کافروں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ عارضی و فانی ہے۔ خدا کے ہاں ابدی بادشاہی ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو ایمان لائیں گے اور خدا پر بھروسہ رکھیں گے۔

(۳۷-۴۳) اہل ایمان کی حقیقی صفات کا بیان اور ان کو چند خاص ہدایات جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات میں ان کی رہنمائی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس دور میں کفار کی تعدیاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور مسلمان بھی ایک جماعت اور تنظیم کی شکل اختیار کر رہے تھے اس وجہ سے ان کو ضروری ہدایات سے آگاہ کر دیا گیا تاکہ اس نازک دور میں ان کا کوئی قدم غلط نہ اٹھ جائے۔

(۴۴-۵۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے مخالفین کو تنبیہ ہے۔ اس کے بعد ان کو دعوت ہے کہ اب بھی موقع ہے کہ پیغمبر کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر یہ کبھی واپس آنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر ہے کہ اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں سن رہے ہیں تو ان کا پیچھا چھوڑو، تمہارے اوپر جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی، ان کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ انسان کی تنگ ظرفی کا حال یہی ہے کہ اگر اللہ اس کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے تو اتراتا اور اکڑتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی مصیبت پیش آ جائے تو مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے مزعومہ شریکوں پر بڑا ناز ہے لیکن خدا کا کوئی شریک نہیں

ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے غرور کے سبب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خدا ان سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے بات کرتا ہے صرف وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے اور اس کے خاص طریقے ہیں۔ اسی طرح کی وحی اس نے تم پر بھی کی ہے اور یہ تم پر اور تمھارے واسطہ سے لوگوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان کی تفصیلات اور اس کے مطالبات سے۔

سُوْرَةُ الشُّوْرٰی (۴۲)

مَکِّیَّۃٌ ———— اٰیات : ۵۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱ - ۱۰

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ کَذٰلِکَ یُوْحِیْٓ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۙ اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۳﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۴﴾ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِھِنَّ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیْظٌ عَلَیْھِمْ ۫ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ ﴿۶﴾ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ﴿۷﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ھُوَ الْوَلِیُّ وَھُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ز وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۹﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ

ع ۱ / ۲

مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ إِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ ⑩

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۰

یہ حٰمٓ ۔ عٓسٓقٓ ہے۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم وحی کرتا ہے تمہاری طرف اور اسی طرح وہ وحی کرتا رہا ہے ان کی طرف جو تم سے پہلے گزرے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بڑی ہی بلند اور عظیم ہستی ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ آگاہ کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اللہ ان پر نگرانی رکھے ہوئے ہے اور تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کیے گئے ہو۔ ۱ - ۶

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف ایک عربی قرآن وحی کیا ہے تاکہ تم اہل مکہ اور اس کے گرد و پیش والوں کو آگاہ کر دو اور اس دن سے ڈرا دو جو سب کے اکٹھے کرنے کا دن ہوگا جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس دن ایک گروہ جنت میں داخل ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں۔ ۷

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ داخل کرتا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے اور جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ کیا ان لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یاد رکھیں کہ کارساز اللہ ہی ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس کسی چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا ہے تو اس کا فیصلہ اللہ کے

حوالہ ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ (۱-۲)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی دو سورتوں کا نام بھی 'حٰمٓ' ہی ہے۔ یہاں اس پر 'عٓسٓقٓ' کا اضافہ ہے۔ ناموں کا اشتراک عمود کی وحدت پر دلیل ہے اور یہ اضافہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سورہ میں کچھ خاص مطالب بھی ہیں جو پچھلی دونوں سورتوں میں نہیں ہیں چنانچہ مطالب کے تجزیہ پر ایک نظر ڈال کر ان خاص مطالب کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳)

تمام نبیوں کی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور طریقۂ تعلیم بھی ایک ہی رہا ہے

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ ان مطالب کی طرف ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ان مطالب کا ایک اجمالی تصور اس سورہ کے نام نے دے دیا ہے اس وجہ سے 'كَذٰلِكَ' کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ بالکل موزوں ہے یعنی اس نام سے موسوم سورہ میں جو باتیں وحی کی جا رہی ہیں یہ جس طرح تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اسی طرح تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی وحی کی جا چکی ہیں۔ اداے مطلب میں بتقاضائے بلاغت ایجاز ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ جس طرح اللہ تم پر وحی کر رہا ہے اور اسی طرح اس نے ان نبیوں پر بھی وحی کی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؛ اس قسم کے ایجاز کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

'كَذٰلِكَ' وحدتِ مدّعا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور طریقۂ وحی کی یکسانی کی طرف بھی یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کو تعلیم بھی انہی باتوں کی دی جن کی تعلیم تم کو دی جا رہی ہے اور اس تعلیم کے لیے طریقہ بھی وہی اختیار فرمایا جو تمہارے لیے اختیار فرمایا اس وجہ سے کسی پہلو سے بھی قرآن میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لوگوں کے لیے باعثِ وحشت ہو۔ اگر یہ اس سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے۔

وحدتِ مدّعا کی طرف اشارہ

وحدتِ مدّعا کی طرف آگے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى	تمہارے لیے اس نے اسی دین کو مقرر کیا جس کی تعلیم
بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ	نوح کو دی اور اسی کی وحی ہم نے تم کو کی اور جس کی تلقین

اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ ...... (۱۳)

ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی کی کہ اللہ کے دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ برپا کرو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس اسلام اور جس دینِ توحید کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اسی کی دعوت پر تمام انبیاء علیہم السلام مامور ہوئے لیکن مشرکین نے جو دینِ شرک ایجاد کیا اس کی عصبیت کے جوش میں اس دینِ حق کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی قسم کی عصبیت کے جنون میں اہلِ کتاب بھی مبتلا ہو گئے۔

طریقہ کی یکسانی کی طرف اشارہ

طریقہ کی یکسانی کی طرف آگے اس سورہ میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۗئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا (۵۱-۵۲)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے یا بھیجے اپنا کوئی فرشتہ پس وہ وحی کردے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ بے شک وہ بڑا ہی بلند اور حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ایک روح کی اپنے امر میں سے۔ تم نہ کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ آج جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر خدا پیغمبر سے کلام کرتا ہے تو ان سے بھی کلام کرے یا وہ اس طرح نمودار ہو کہ وہ اس کو دیکھیں اور اس کا کلام سنیں، یہ محض ان کی خودسری اور بددماغی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح نہ کسی سے بات کرتا اور نہ اس طرح جلوہ نمائی کرنا اس کی شان ہے، بلکہ ہمیشہ سے اس کا طریقہ یہ رہا کہ اس نے اپنے جن بندوں کو نبوت کے کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ان سے وحی کے ذریعہ سے بات کی اور اس وحی کا ایک خاص ضابطہ ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین پر اتمام حجت

اس بات کے کہنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی ہے اور مخالفین پر اتمام حجت بھی۔ ظاہر ہے کہ جب آپ اسی دینِ حق کی دعوت دے رہے ہیں جس کی دعوت تمام نبیوں اور رسولوں نے دی تو آپ کوئی ایسی بات نہیں پیش کر رہے ہیں جس سے لوگ وحشت زدہ ہوں۔ جو لوگ اس سے وحشت زدہ ہیں وہ تمام نبیوں کی دعوت کے مخالف اور تعصب و عناد میں مبتلا ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر آپ

لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے یا اس کو کلام کرتے دوسروں کو سنا نہیں سکتے تو یہ چیز بھی آپ کی نبوت کا کوئی نقص نہیں۔ آپ اللہ کی وحی پیش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس سے بھی بات کرتا ہے وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کسی کو بھی نہیں نوازتا۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے 'عزیز و حکیم' کا حوالہ یہاں تسلی کے مضمون سے بھی تعلق رکھتا ہے اور تہدید کے مضمون سے بھی۔ جب اللہ تعالیٰ عزیز ہے تو وہ گردن کشوں کو جب چاہے دبا سکتا ہے۔ اگر وہ فوراً نہیں دباتا تو وہ اپنی حکمت کے تحت ان کو مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ربِّ عزیز و حکیم پر بھروسا رکھنا اور ان لوگوں کا معاملہ اسی کے حوالہ کرنا چاہیے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۴)

صفت 'عزیز' کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ 'عزیز' کی وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نہ کسی چیز میں کسی کا ساجھا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے حیطۂ اقتدار و اختیار سے باہر ہے۔ وہ بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہستی ہے، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہمسر ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو مہلت دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو گئے اور اگر اس نے کسی کو عزت و شوکت بخشی ہے تو اس کو اتنا مغرور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کو دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ کر بیٹھے۔ اللہ کی بارگاہ بہت بلند اور اس کی ہستی بڑی عظیم ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۵)

'علی و عظیم' کی وضاحت

یہ خدائے 'علی و عظیم' کے علو اور اس کی عظمت کا بیان ہے کہ اس کی عظمت کے بوجھ سے آسمانوں کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر سے پھٹ پڑیں گے اور ملائکہ کا حال، بایں ہمہ قربت، یہ ہے کہ اس کی خشیت کے سبب سے وہ ہر وقت اس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہتے اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ یعنی نادانوں نے تو فرشتوں کو خدائی میں شریک بنا رکھا ہے اور یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں ان کو وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو بڑے بڑے مرتبے دلوائیں گے اور خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس کی خشیت سے لرزاں و ترساں اور مصروفِ تسبیح و تحمید ہیں۔

'تسبیح' اور 'حمد' کے فرق پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ 'تسبیح' میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' میں اثبات کا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو تمام خلافِ شان باتوں سے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شرک ہے، پاک اور تمام اعلیٰ صفات سے، جن میں سب سے مقدم توحید ہے، متصف ٹھہراتے ہیں۔

'وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ' میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ مومن میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَ مَنۡ حَوۡلَہٗ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ...... (۷)

جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے، اس پر ایمان رکھتے اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

ملائکہ کا استغفار اہلِ زمین کے لیے

اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ اہلِ زمین میں سے ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو اہلِ ایمان ہیں۔ چونکہ یہ بات واضح تھی اس وجہ سے آیت زیرِ بحث میں یہ حذف کر دی گئی ہے۔ ملائکہ کا یہی استغفار ان کی شفاعت ہے جو وہ اپنے رب کی بارگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے کر رہے ہیں۔ اس سے مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہو گئی۔

'اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ' یہ مشرکین کو ایک برمحل تنبیہ ہے کہ کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا اللہ ہی ہے۔ اگر یہ چیز فرشتوں کے اختیار میں ہوتی تو وہ اس تذلل کے ساتھ لوگوں کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے کیوں درخواست کرتے ؟

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ (۶)

مشرکین کو نہایت سخت وعید

یہ مشرکین کو نہایت سخت انداز میں وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اور تمام تنبیہ و تذکیر کے باوجود اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، اللہ ان کی کڑی نگرانی کر رہا ہے کہ جونہی وہ اپنی مہلت پوری کر لیں ان کو اپنے قہر و غضب کے پنجہ میں گرفتار کر لے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ خدا نے تم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی ہے کہ لازماً تم ان کو ایمان کی راہ پر لگا ہی دو۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغِ حق کی تھی وہ تم نے کر دی اور جب تک تمہارے رب کا حکم ہے، کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش انہی سے ہونی ہے تم سے نہیں ہونی ہے۔ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ...... (۴۸)

پس اگر یہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے، تمہارے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔

وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا وَ تُنۡذِرَ یَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَ فَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ (۷)

اس 'کَذٰلِکَ' کا اشارہ آیت ۱ کے مضمون کی طرف ہے کہ جس طرح ہم نے تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو اپنی وحی سے سرفراز کیا اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی یہ قرآن بزبان عربی اتارا ہے تاکہ

تم عرب کی مرکزی بستی اور اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو آگاہ کر دو۔

قرآن کے ساتھ 'عربی' کی صفت بطور امتنان اور اتمامِ حجت ہے، جیسا کہ 'حٰمٓ السجدۃ' کی آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے کہ اہلِ عرب کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے کہ ان کے لیے اللہ کے دین کی پوری وضاحت نہیں کی گئی۔

'اُمَّ القرٰی' میں اتمامِ حجت کا پہلو

'اُمَّ الْقُرٰی' سے مراد مکّہ ہے اس لیے کہ 'اُمَّ الْقُرٰی' مرکزی بستی کو کہتے ہیں اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت مکّہ ہی کو حاصل تھی۔ یہاں مکّہ کے بجائے 'اُمُّ الْقُرٰی' کے لفظ میں بھی اتمامِ حجت کا پہلو ہے۔ اگر ایک پیغام مرکزی بستی کے لوگوں کو پہنچا دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے لوگوں کو ان کے سر پر چڑھ کر للکار دیا گیا ہے۔ اگر 'اُمُّ الْقُرٰی' کے بجائے عرب کے کسی گوشے سے یہ دعوت اٹھتی تو باتیں بنانے والے یہ بات بنا سکتے تھے کہ آخر ہمارے اکابر و سادات اور ہمارے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر قرآن نے سب سے پہلے عوام کے طبقہ کو کیوں مخاطب کیا، اس کے حق و باطل کے اصلی پرکھنے والے تو مکّہ کے سادات ہو سکتے تھے!

'ومن حولھا' سے کیا مراد ہے؟

'وَمَنْ حَوْلَهَا' سے بعض لوگوں نے تمام عالم کو مراد لیا ہے۔ ان کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی ہے، اس وجہ سے صرف اطرافِ مکّہ یا ملکِ عرب ہی کے شہر مراد نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا مراد ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ خاتم النبیّین ہیں، اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی، لیکن 'مَنْ حَوْلَهَا' کی یہ تاویل الفاظ کے حدود سے اوّل تو صریح تجاوز ہے پھر اصل مقصد کے لیے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ آپ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں۔ ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔ آپ کی بعثتِ خاص اہلِ مکہ اور اہلِ عرب کی طرف ہوئی اور ان پر آپ نے براہِ راست حجت قائم فرمائی۔ رہی آپ کی بعثتِ عام تو وہ تمام عالم کی طرف ہے اور اہلِ عالم پر دینِ حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری قرآن نے بھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، قیامت تک کے لیے ملتِ مسلمہ پر ڈالی ہے اور اس ذمہ داری ہی کی بنا پر اس امت کو اللہ تعالیٰ نے 'شُهَدَاءُ اللهِ فِي الْاَرْضِ' کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ یہ اس امت کا فریضۂ منصبی ہے کہ اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح اس امت کے لوگوں پر دی اسی طرح یہ برابر دوسروں کے سامنے یہ گواہی دیتی رہے۔ اسی فریضہ کے تقاضے سے اس امت کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ ایک گروہ اس میں ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ اس وقت بھی حق پر قائم رہے گا جب دنیا کی رگ رگ میں باطل کا زہر سرایت کر جائے گا۔[1]

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب 'دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار' میں کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو دلائل کی تفصیل مطلوب ہو اس کی مراجعت کریں۔

عدالتِ عام سے انذار

'وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ' انذارِ عام کے بعد یہ انذارِ خاص کا ذکر ہے کہ ان لوگوں کو خاص طور پر 'یَوْمَ الجمع' سے ڈرا دو۔ 'یوم الجمع' سے اشارہ ظاہر ہے کہ روزِ قیامت کی طرف ہے۔ روزِ قیامت کو 'یوم الجمع' سے تعبیر کرنے میں اس بات کی آگاہی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ بلا استثنا سب کو اکٹھا کرے گا۔ عابدوں کو بھی اور معبودوں کو بھی، لیڈروں کو بھی، ان کے پیرؤوں کو بھی، انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو بھی؛ کفّار اور ان کے حمایتیوں کو بھی۔ اور ان سب کی موجودگی میں، بھری عدالت میں، فیصلہ فرمائے گا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں کس کا رول کیا رہا ہے؟ کس نے اس میں اختلاف برپا کیا اور فساد ڈالا اور کس نے اس کی وحدت و پاکیزگی قائم رکھنے کی کوشش کی۔ کون انعام کا مستحق ہے اور کون سزا کا؟

'فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ' یہ اس کھلی عدالت کے فیصلہ کا بیان ہے کہ اس دن ایک گروہ یعنی اہلِ ایمان کا گروہ لازماً جنت میں جائے گا اور دوسرا گروہ یعنی اہلِ کفر کا گروہ لازماً دوزخ میں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۸)

ایک شبہ کا جواب

اب یہ ایک شبہ کا جواب دیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا تو اس نے یہ کیوں نہیں پسند فرمایا کہ سب اسی دین پر رہتے؟ اس نے یہ موقع کیوں دیا کہ لوگ اس میں اختلاف برپا کریں اور اس اختلاف کا نتیجہ بالآخر یہ نکلے کہ ایک گروہ تو جنت کا حقدار ٹھہرے اور دوسرا دوزخ کا سزاوار قرار پائے؟

اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں پسند فرمایا کہ وہ لوگوں کو اپنی ہدایت قبول کرنے پر مجبور کرے بلکہ اس نے چاہا کہ لوگوں کو اختیار دے کر ان کے سامنے اپنی ہدایت رکھے کہ لوگ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر، اپنی آزادئ رائے کے ساتھ، ہدایت کو اختیار کریں اور اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے سزاوار بنیں۔ 'يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ' میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جس مشیت کا ذکر فرمایا ہے وہ اس کی رحمت اور اس کے عدل کے تحت ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جن کے لیے اس کا عدل مقتضی ہو کہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہوں ان کو وہ اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اس مضمون کو اس کے بعد 'وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ' فرما کر واضح بھی کر دیا کہ جو لوگ ظالم یعنی کافر و مشرک ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا، نہ کوئی مددگار۔ یعنی نہ ان کے مزعومہ اولیاء ان کے کام آنے والے بنیں گے اور نہ ان کی کوئی جمعیت و جماعت ہوگی جو ان کی کوئی مدد کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف وہ لوگ محروم ہوں گے جو ظالم و مشرک ہوں گے اور ایسا اس لیے ہوگا کہ یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اس کی مشیت اس کے عدل پر مبنی ہے اور کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی مشیت کو بدل سکے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور اس کتاب میں بار بار اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ ہم مزید وضاحت کے لیے یہاں بھی چند آیات کا حوالہ دیے دیتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (یونس: ۹۹-۱۰۰)

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جو بھی ہیں سب ایمان پر ہوتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن بن جائیں اور کوئی جان بھی ایمان نہیں لا سکتی مگر اللہ کے اذن سے اور اللہ ان لوگوں پر گندگی لاد دیتا ہے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے اور اس کی مشیت ان لوگوں کو ایمان کی توفیق بخشتی ہے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے ان کی عقل ایسی گندگی کے ڈھیر کے نیچے دب جاتی ہے کہ ان کو ایمان و ہدایت کی روشنی نظر نہیں آتی۔

یہی مضمون سورۂ سجدہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا (السجدۃ: ۱۳)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اس کی ہدایت دے دیتے۔

یعنی اگر ہم لوگوں کو ایمان پر مجبور کرنا چاہتے تو سب کو مومن بنا دیتے لیکن ہم نے لوگوں کو اختیار دے کر آزمایا ہے کہ کون ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے، کون کفر کی۔ پس جو کفر کی راہ اختیار کریں گے ہم ان سب کو جہنم میں بھر دیں گے اور ان لوگوں کو جنت میں داخل کریں گے جو ایمان لائیں گے۔

یہی بات نہایت وضاحت سے سورۂ دہر میں اس طرح ارشاد ہوئی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝ۗ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (الدھر: ۲۹-۳۱)

یہ قرآن تو بس ایک یاددہانی ہے تو جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ بھی چاہے بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ رہے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تو ان کے لیے اللہ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہو۔ یہ قرآن لوگوں پر زبردستی لادنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف ایک یاددہانی ہے

تو اس کے ذریعہ سے لوگوں کو یاددہانی کرو۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ اگر تم لوگ ان کے ایمان کے خواہشمند ہو تو تمھاری خواہش سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو اور اللہ کی مشیت اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ وہ اپنی رحمت میں انہی کو داخل کرتا ہے جن کو چاہتا ہے اور وہ انہی کو چاہتا ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن کر چلتے ہیں تو ایسے ظالموں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹)

سوال یہاں اظہارِ تعجب اور انکار کے مفہوم میں ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے نہ کوئی کارساز ہوگا، نہ مددگار۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یہ محض ان کی لاالفضولی ہے۔ کارساز صرف اللہ ہی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہی ہے جو مردوں کو زندہ کرے گا اور ہر ایک کی پیشی اس کے حضور میں ہونی ہے تو کارساز کوئی دوسرا کیسے بن جائے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس کے ہوتے کسی کارساز کی ضرورت کیا رہی اور اس کے آگے کسی بڑے سے بڑے کارساز کی کارسازی کیا کارگر ہو سکتی ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۱۰)

ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ جو اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے

اوپر آیت ۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی ضد اور مکابرت سے آپ پریشان نہ ہوں۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ نے جو سنت مقرر کر رکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ اللہ کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ اسی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ فرما دیا۔ چونکہ یہ بات اوپر والی آیت ہی کی تعمیل میں تھی اس وجہ سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نئی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی بلکہ کہنے کی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلا دی گئی۔ فرمایا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی جس بات میں بھی تم نے اختلاف کیا، خواہ وہ توحید ہو یا آخرت، میری ذمہ داری اس میں صرف حق پہنچا دینے کی تھی سو وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔ اب اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہ فیصلہ فرمائے گا کہ میں نے حق پہنچانے میں کوتاہی کی یا تم نے حق کو پہچان کر اس کو جھٹلایا! وہی اللہ میرا رب ہے اس وجہ سے میں نے اس پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ وہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرمائے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۱۱-۲۰

پہلے اسی توحید کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رزق اور اولاد سب اسی کا عطیہ ہیں۔ اور اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ واحد کی مشیت اور اس کے ارادہ کے سوا کوئی اور ارادہ اس کے اندر دخیل نہیں ہے۔

اس کے بعد پہلی آیت کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور اس میں اختلاف برپا کرنے سے لوگوں کو روکا لیکن ان کی امتوں نے خدا کی طرف سے واضح علم آجانے کے باوجود اس میں اختلاف پیدا کیا اور اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے محروم کرلیا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ انبیاء کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنی اس دعوت پر جمے رہو۔ جو لوگ تمہاری مخالفت کر رہے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اس نے تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے، میزانِ عدل بنا کر، اتاری ہے۔ اگر تم اس کے فیصلہ کو قبول نہیں کرو گے تو قیامت کی میزان تمہارا فیصلہ کرے گی اور قیامت شدنی ہے۔ اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل نہ سمجھو۔ اللہ حق کے دشمنوں کو بھی دنیا کی نعمتیں دیتا ہے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات: ۱۱-۲۰

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ

يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾ وَمَا
تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿١٤﴾
فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ
اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ
رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٥﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ
فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿١٦﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيْبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿١٨﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ
ع ۲ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿١٩﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ
الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿٢٠﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۲۰

وہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے

جوڑے پیدا کیے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس مزرعہ کے اندر وہ تمھاری تخم ریزی کرتا ہے۔ اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔ اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔ وہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۱-۱۲

اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کیجیو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف رہنمائی ان کی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۳

اور یہ لوگ صحیح علم آ چکنے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے باعث متفرق ہوئے اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات ایک مدتِ معین کے لیے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان فوراً فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ اس کے باب میں ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ ۱۴

پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمھارے درمیان فیصلہ کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا بھی رب ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔

ہمارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ ۱۵

اور جو لوگ اللہ کے باب میں حجّت کر رہے ہیں بعد اس کے کہ اس کو مانا جا چکا ہے، ان کی حجّت ان کے رب کے آگے بالکل لپپا ہے اور ان پر غضب اور ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ ۱۶

اللہ ہی ہے جس نے اتاری کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اور میزان اتاری اور کیا پتہ شاید قیامت بھی قریب ہی آ لگی ہو! اس کے لیے جلدی وہ لوگ مچائے ہوئے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ترساں ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ شدنی ہے۔ آگاہ کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۷-۱۸

اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ رزق بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ نہایت زور آور اور غالب ہے اور جو آخرت کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کی کھیتی میں افزونی دیتے ہیں (اور دنیا میں سے بھی اس کا حصّہ دیتے ہیں) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کو اس میں سے کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصّہ نہیں۔ ۱۹-۲۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ج يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ط لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کی یکتائی کی دلیل

اوپر آیت ۱۰ میں یہ جو فرمایا ہے۔ 'ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ' اس کی یہ مزید وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اور تمام انسانوں اور دوسری مخلوقات کو وجود میں لانے والا وہی ہے۔ دوسرا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی ذات یا صفات میں اس کا مثیل ہو سکے تو کوئی اور کس طرح حقدار ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کا شریک ٹھہرایا اور مولیٰ و مرجع بنایا جائے!

'یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ' میں ضمیر مجرور کا مرجع الفاظ کے اندر نہیں ہے بلکہ اس مفہوم کے اندر ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے اندر ان کی جنس سے جوڑے پیدا کیے ہیں تو اس طرح گویا انسانوں اور چوپایوں کی تخلیق کے لیے ان کے اپنے نوعی نظام کے اندر ہی ایک فارم یا مزرعہ بنا دیا ہے جس میں وہ ان کی برابر تخم ریزی کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کتاب میں اس کی بعض نہایت واضح مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ' اوپر والے ٹکڑے میں خالقِ آسمان و زمین کی جس قدرت و حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین جیسی عظیم چیزیں پیدا کیں، جس نے انسانوں اور چوپایوں کی نسل چلانے کے لیے یہ حیرت انگیز نظام قائم فرمایا آخر دوسرا کون ایسا ہو سکتا ہے جس کو اس کا مثل قرار دیا جا سکے؟ کوئی چیز بھی نہ اس کے مثل ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں بالکل یکتا ہے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جب آسمانوں کا خالق وہ ہے تو ان سے جو کچھ اترتا ہے اس کا اتارنے والا بھی وہی ہے، جب زمین کا بنانے والا وہ ہے تو اس سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے اس کا برآمد کرنے والا بھی لازماً وہی ہے۔ جب عورت اور مرد، نر اور ناری کا خالق وہ ہے تو جو خلق ان سے وجود میں آتی ہے ان کا وجود میں لانے والا بھی وہی ہوا مطلب یہ نکلا کہ جب آسمانوں اور زمین اور عورت و مرد کا خالق خدا کے سوا کسی دوسرے کو نہیں قرار دیا جا سکتا تو ان کے باہمی تفاعل سے وجود میں آنے والی چیزوں کو کس طرح کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟ کون ہے جس نے ان کاموں میں سے کوئی ایک بھی کیا ہو یا کر سکے جو خدا نے کیے ہیں کہ اس کو اس کا ہم پایہ بنا دیا جائے؟

'وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ' یہ اس سبق سے نکلا ہوا آگے کا سبق ہے کہ جس طرح اس کائنات کے شواہد سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ کوئی اس کا مثیل نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی اس سے نکلتی ہے کہ حقیقی سمیع و علیم وہی ہے۔ ایک سمیع و علیم خالق ہی اتنی وسیع کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے اور وہی اس کو برقرار بھی رکھ سکتا ہے — تو جب اس کی قدرت بھی بے مثال اور اس کا علم بھی محیطِ کل تو سب اسی کی بندگی کریں اور اسی سے اپنی ضرورتیں مانگیں۔ وہ سب کی باتیں سنتا اور جانتا ہے۔ اس سے

مانگنے کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۲)

جو خالق ہے وہی مالک بھی ہے

جب اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہی ان کا مالک بھی ہو۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کو پیدا تو کرے لیکن پیدا کرنے کے بعد ان کے خزانوں کی کنجیاں دوسروں کو پکڑا دے! اسی کے حکم سے بارش ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے زمین اپنے خزانے اگلتی ہے اور وہی ہے جو اپنے علم اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشادگی دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے۔ نہ رزق کے پیدا کرنے میں کسی دیوی دیوتا کا کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تقسیم میں کسی کو دخل ہے۔ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں اس وجہ سے شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے بندوں کو اسی سے امید بھی رکھنی چاہیے اور اسی سے ڈرنا بھی چاہیے اور اگر کسی کے رزق میں تنگی ہو تو اس بدگمانی میں اس کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ خدا کو اس کی خبر نہیں ہے یا اس نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے بلکہ یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے خدا کے علم سے ہو رہا ہے اور اسی میں حکمت ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۱۳)

یہی دین تمام نبیوں کا دین ہے

سورہ کی تمہید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ جو فرمایا ہے کہ تمہیں اسی دین حق کی وحی کی جا رہی ہے جس کی وحی تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو کی گئی، یہ اسی مضمون کی وضاحت قریش اور اہل عرب کو مخاطب کر کے کی جا رہی ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے وہی دین پسند فرمایا ہے جو اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کی جا رہی ہے۔ اسی دین کی تلقین ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السلام) کو بھی کی گئی تھی۔ یہ کوئی ایسا دین نہیں ہے جو تمہارے لیے انوکھا اور اجنبی ہو بلکہ شروع سے لے کر اس آخری نبیؐ تک سب کا دین یہی رہا ہے اور یہی اللہ کا حقیقی دین ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا حوالہ یہاں اس طرح دیا ہے کہ پہلے ابتدائی اور آخری کڑی یعنی حضرت نوحؑ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر بیچ کے انبیاء میں سے تین جلیل القدر نبیوں ــــ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ــــ کا نام خاص طور پر لیا۔ اس اہتمام خاص کے ساتھ ان کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ انہی تین نبیوں کی پیروی کے مدعی اس وقت قرآن کے سامنے تھے۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ

بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اس طرح گویا نبیوں کی پوری تاریخ کی طرف بھی اجمالی اشارہ ہوگیا اور قابل ذکر امتیں بھی سامنے آگئیں۔

اس دین سے متعلق امتوں کو ہدایت

'اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ' یہ اس دین کا بھی بیان ہے جس کی تلقین ان نبیوں کو کی گئی اور اس ہدایت کا بھی جو اس دین سے متعلق ان نبیوں کے واسطہ سے ان کے پیرووں کو کی گئی۔ 'الدِّیْنَ' پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح 'الکتاب' پر ہے۔ جس طرح 'الکتاب' کے معنی اللہ کی کتاب کے ہیں اسی طرح 'الدین' کے معنی اللہ کے دین کے ہیں۔ اللہ کا دین شروع سے اسلام ہے، جیساکہ ارشاد ہے، 'اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ' (اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)۔ اس دین کی بنیاد خالص اور کامل توحید پر ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی دیا اور یہی دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل فرمایا۔ اس کے عقائد اور اس کی اساسات شروع سے آخر تک بالکل ایک ہیں۔ فرق اگر ہوا ہے تو جزئیات شریعت میں ہوا ہے جس کو قرآن نے 'شرعۃ ومنہاج' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس دین سے متعلق امتوں کو یہ ہدایت بھی فرمائی گئی تھی کہ اس کو قائم رکھنا اور اس میں اختلاف اور تفرق نہ برپا کرنا۔ یہ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح فرمایا ہے کہ 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا' (آل عمران: ۱۰۳) (سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑو اور متفرق نہ ہو)۔ قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں، جو کرنے کی ہیں وہ دیانتداری اور راستبازی کے ساتھ کی جائیں۔ نیز لوگوں کی برابر نگرانی کی جائے کہ وہ اس سے غافل یا منحرف نہ ہونے پائیں۔ اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہل بدعت اس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کرسکیں۔

'لَا تَتَفَرَّقُوْا' کا مطلب یہ ہے کہ یہی دین حبل اللہ ہے اس وجہ سے سب کا فرض ہے کہ سب مل کر اس کو تھامیں۔ ایسا نہ ہو کہ جس کے ہاتھ میں جو رسی آجائے اسی کو وہ حبل اللہ سمجھ بیٹھے اور اس رسی کو چھوڑ دے۔ اگر اس حبل اللہ سے تعلق منقطع ہوا تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ پھر کوئی چیز بھی لوگوں کی شیرازہ بندی نہ کر سکے گی۔

وہ خاص چیز جس سے مشرکین کو چڑ تھی

'کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ' مشرکین سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے اللہ نے دین تو وہی اتارا جو تمام انبیاء کا دین ہے اور اسی دین کی تعلیم ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی دی ہے لیکن وہ چیز ان پر شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔

---

[۱] حضرات انبیاء کی اصل تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے لیکن قرآن نے بالعموم حضرت نوحؑ ہی سے آغاز فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے کی تاریخ بالکل پردۂ خفا میں ہے۔

'مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ' اگرچہ باعتبارِ الفاظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد توحید ہے۔ قرآن میں اس بات کی جگہ جگہ تصریح ہے کہ مشرکین کو سب سے زیادہ چڑ قرآن کی دعوتِ توحید ہی سے تھی۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

'اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ' یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے معاملہ میں صبر کرو۔ تم ان کے ایمان کے کتنے ہی چاہنے والے بنو لیکن ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ کا چاہنا اس کی حکمت اور اس کی سنت کے تحت ہے۔ وہ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کی کرتا ہے جو خود بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ توفیقِ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ 'يَجْتَبِيْ' کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۴)

امتوں کو ملامت

یہ ان امتوں کو ملامت ہے کہ انھوں نے علمِ الٰہی کی روشنی پانے کے بعد محض اپنی باہمی ضد م ضد کے باعث آپس میں اختلاف کیا اور گمراہی میں مبتلا ہوئیں۔ اگر رات کی تاریکی میں کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کو ایک حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص پورے دن کی روشنی میں، محض اپنی ضد کے سبب سے، ٹھوکر کھاتا ہے وہ اپنی اس حماقت کا خود ذمہ دار ہے۔ اس 'تفرق' کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہ اشارہ غالباً یہاں کافی ہوگا کہ یہود کے علماء اور فقہاء میں بالکل اسی طرح کے اختلافات برپا ہوئے جس طرح کے اختلافات ہمارے ہاں برپا ہوئے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس امت کے پاس قرآن محفوظ ہے اس لیے رفعِ اختلاف کی کسوٹی موجود ہے لیکن یہود نے تورات بھی ضائع کر دی اس وجہ سے ان کے اختلاف کے رفع ہونے کی کوئی شکل باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت سے جو امت ظہور میں آئی اس کے اور یہود کے درمیان شروع ہی سے ایک چپقلش برپا رہی اور اس میں اصلی دخل علمائے یہود کے عناد کو تھا۔ وہ محض ضد اور حسد کے باعث ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد میں خود نصاریٰ کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور یہ بال نے ان کو تورات اور انجیل دونوں کی روشنی سے محروم کر دیا۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کی روشنی دکھانی چاہی تو یہود اور نصاریٰ اور قریش تینوں نے مل کر اس روشنی کو گل کرنے کی جو سعیِ نامراد کی اس کی پوری تفصیل قرآن میں آپ پڑھ رہے ہیں۔ یہود کو قرآن سے اس بنا پر عناد تھا کہ مذہبی پیشوائی بنی اسماعیل کو منتقل نہ ہونے پائے اور قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو پرخاش تھی اس کے وجوہ خود ان سورتوں سے واضح ہیں۔ اسی صورتِ حال کو قرآن نے 'وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس امت نے بھی تفرق اور اختلاف کی راہ اختیار کی ہے محض اپنی شامتِ اعمال اور باہمی عناد کے سبب سے اختیار کی ہے۔ جہاں تک اللہ اور اس کے رسول کا تعلق ہے ان کی طرف سے برابر لوگوں کو صراطِ مستقیم ہی کی رہنمائی کی گئی۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ '۔ یہ ان امتوں کو زجر و توبیخ بھی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی کہ چونکہ تمہارے رب کی طرف سے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اتمامِ حجت کے لیے ہر امت کو ایک خاص مدت تک مہلت دی جائے گی اس وجہ سے ان کو مہلت دی جا رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بلا تاخیر ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

'وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ '۔ اس ٹکڑے کا تعلق اوپر والے جملے 'وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ' سے ہے۔ بیچ کا جملہ محض بطور جملہ معترضہ اور بغرضِ تنبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد ان ملتوں نے آپس میں جو اختلاف برپا کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں جو لوگ کتاب یعنی تورات کے وارث ہوئے وہ اس تورات کی طرف سے الجھن میں ڈال دینے والے شکوک میں مبتلا ہو گئے۔ یہ مضمون بعینہٖ سابق سورہ میں بھی بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ' (حٰم السجدۃ: ۴۵) (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کا جھگڑا چکا دیا جاتا، اور بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑ گئے ہیں) لفظ 'مریب' کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔ 'الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ ' سے مراد یہود ہی کے اخلاف ہیں جو اپنے اگلوں کے بعد تورات کے وارث ہوئے۔ چونکہ تورات ان کو بالکل متناقض شکل میں ملی اس وجہ سے ان کا اس کی طرف سے شکوک میں مبتلا ہو جانا ایک امرِ فطری تھا اور یہ چیز مقتضی تھی کہ وہ اس اختلاف کو رفع کرنے والی کتاب — قرآن — کی دل سے قدر کرتے لیکن انھوں نے محض ضد اور حسد کے سبب سے اس کی مخالفت کی۔ عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے قرآن کو مراد لیا ہے لیکن اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۱۵)

نبیؐ کو استقامت کی تاکید

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ حق کی دعوت دو جو تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تمھارے یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم ان کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی

طرح جس طرح تمھیں ہدایت ہوئی ہے اس پر جمے رہو۔

'وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ' یہ اس استقامت کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی اپنی خواہشوں کو دین بنانے کے لیے انھوں نے اللہ کے دین میں جو بدعتیں گھسائی ہیں ان کی پیروی نہ کرو۔ 'اهواء' سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، بدعات ہیں۔ اس لیے کہ بدعات تمام تر خواہشوں ہی سے وجود میں آتی ہیں۔

'وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ' یعنی ان لوگوں کو، جو تم سے اپنی ایجاد کردہ بدعات کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، بتا دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں؟

'وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمُ' یعنی میں تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کرنے نہیں بلکہ تمھارے درمیان انصاف کرنے آیا ہوں۔ تم نے اللہ کے دین میں جو جھگڑے پیدا کر دیے ہیں، مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس جھگڑے کا فیصلہ کر کے بتاؤں کہ اس میں کیا حق ہے اور کیا باطل؟ سو تم مجھ سے اپنی بدعات کی پیروی کی توقع نہ رکھو بلکہ اگر توفیق ہے تو مجھ سے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تم میں سے کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور کتنا باطل اور اللہ کا اصلی اور بے آمیز دین کیا ہے؟

'اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ ... الاٰیۃ' یہ تنبیہ و تحذیر ہے کہ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اسی کے آگے ہماری بھی پیشی ہونی ہے اور اسی کے حضور میں تمھاری پیشی بھی ہو گی۔ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمھارا مولیٰ و مرجع کوئی اور ہو گا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہوں گے اور تم اپنے اعمال کے۔ اگر ہم نے تمھیں حق پہنچا دیا تو ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے، اب خدا کے سامنے تمھاری ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے بلکہ خود تمھارے اوپر ہے۔ اس کے نیک و بد کو تم خود بھگتو گے۔ سورۂ یونس میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے: 'وَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلۡ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَـكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ۚ اَنۡـتُمۡ بَرِيۡٓــــُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ' (یونس: ۴۱) (اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم بری ہو میرے عمل سے اور میں بری ہوں تمھارے اعمال سے)۔

'لَا حُجَّةَ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ' یعنی اتنی ردّ و قدح اور اتنی توضیح و تفصیل کے بعد بھی اگر بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اب ہمارے اور تمھارے درمیان مزید طولِ کلام کی ضرورت نہیں رہی۔ اب معاملہ اللہ کے حوالہ ہے ــــ وہ ہم سب کو اکٹھا کر کے فیصلہ کرے گا اور یاد رکھو کہ سب کا ٹھکانا اسی کی طرف ہے۔

وَالَّذِيۡنَ يُحَآجُّوۡنَ فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِيۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ (۱۶)

'مُحَاجَّۃ' کے معنی مجادلہ اور کٹ حجتی کرنے کے ہیں اور 'فِی اللہ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فی توحید اللہ' اس لیے کہ جھگڑا جن سے بھی تھا اللہ کے باب میں نہیں بلکہ اس کی توحید ہی کے باب میں تھا۔ اہل کتاب تو درکنار مشرکین عرب بھی خدا کے منکر نہیں تھے۔ لیکن خدا کو شرک کے ساتھ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی توحید کے ساتھ اس پر ایمان لایا جائے۔ اگر کوئی توحید کے معاملہ میں جھگڑتا ہے تو وہ گویا خدا ہی کے باب میں جھگڑتا ہے اور اسی کی نفی کر رہا ہے۔

'مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ' کا مفہوم کم و بیش وہی ہے جو 'مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ' کا ہے یعنی یہ جھگڑا خدا کو ماننے کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں کی تعلیم ایک ہی رہی ہے، سب نے توحید ہی کی دعوت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش، یہود اور نصاریٰ سب کے اصل اسلاف اللہ تعالیٰ کی توحید کو مان چکے ہیں۔ اب اس ماننے کے بعد اگر خدا کی توحید میں ان امتوں کی طرف سے یہ جھگڑے اٹھائے جا رہے ہیں تو یہ حجت نہیں بلکہ کٹ حجتی ہے اور یہ کٹ حجتی خدا کے آگے کام آنے والی نہیں بلکہ یہ پسپا ہو کر رہے گی۔

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ط وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۱۷)

قرآن میزان ہے

'الکتٰب' سے مراد قرآن اور 'المیزان' اسی کا بیان ہے۔ فرمایا کہ امتوں کے باہمی اختلاف کو رفع کرنے اور حق و باطل کو ممیز کر دینے کے لیے اللہ نے قرآن اتارا ہے جو درحقیقت ایک میزانِ عدل ہے۔ اوپر آیت ۱۵ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ 'وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ' (اور یہ بتا دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں) یہ وہی بات دوسرے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کام پر مامور فرمایا کہ ملتوں کے درمیان اللہ کے دین کے بارے میں جو اختلاف ہے آپ اس کا فیصلہ کریں تو ضروری ہوا کہ آپ کو ایک ایسی کتاب بالحق عطا ہو جو میزانِ عدل کا کام دے اور آپ اس پر پرکھ کر بتا سکیں کہ کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ قرآن کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کا ایک نام 'مُھَیْمِن' بھی ہے جس کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یہی مضمون سورۂ حدید میں بھی آیا ہے۔ "وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ..." (۲۵) (اور ہم نے ان رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری کہ لوگ ٹھیک نقطۂ عدل پر استوار رہیں)۔

'وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ' یہ فقرہ یہاں نہایت ہی جامع اور نہایت ہی بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس میزانِ عدل کے فیصلہ کے مطابق اپنے حق و باطل میں امتیاز

اور اپنے اختلافات کو رفع کر لیں گے ورنہ قیامت تو بہرحال فیصلہ کر کے رہے گی اور اس کے فیصلہ سے کسی کے لیے بھی فرار کی گنجائش نہیں ہوگی اور قیامت کو بہت دور نہ سمجھو، کیا عجب کہ وہ بھی اب قریب آ لگی ہو۔ جو لوگ قرآن کی میزانِ عدل سے گریز کر رہے ہیں آخر قیامت کی میزان سے وہ کہاں بھاگیں گے!

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ (۱۸)

یعنی یہ لوگ قیامت کو محض ایک خیالی ڈراوا سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے بلکہ ڈھیٹ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی؟ فرمایا کہ جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ محض ایک مذاق ہے۔ مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کی ہولناکی کو سمجھتے اور اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

'إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ'۔ یہ ان لوگوں کی محرومی پر اظہارِ حسرت ہے جو قیامت جیسی واضح حقیقت کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب ان کے کھلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کا انجام موجود ہوگا جس سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہوگا۔

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ (۱۹)

نافرمانوں کو ڈھیل دینے کی حکمت

یہ سبب بیان فرمایا ہے اس بات کا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور شریروں کو اتنی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ دلیر ہو کر عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچاتے اور اس کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ وہ رحمت کرنے میں سبقت کرتا ہے، عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ نافرمانوں کی نافرمانی کے باوجود ان کو رزق دیتا رہتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں اور اپنے رب کی ابدی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

'وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ'۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا نہایت ہی قوی و عزیز ہے۔ کسی کی تاب نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے بچ سکے تو جب کوئی اس کی گرفت سے باہر ہے اور نہ باہر ہو سکتا تو وہ جلدی کیوں کرے! جلدی کی ضرورت اسے پیش آتی ہے جس کو اندیشہ ہو کہ شکار اس کے قابو سے باہر نکل جائے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (۲۰)

یہ اسی سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رزق و فضل سے انھی کو نوازے جو اس کی بندگی کرنے والے ہوں بلکہ نیکو کاروں اور بدکاروں دونوں کو وہ روزی دیتا ہے

البتہ جو لوگ آخرت کی کھیتی کرتے ہیں اللہ ان کی آخرت کی کھیتی میں بھی برکت دیتا ہے اور اس دنیا کے رزق و فضل میں سے بھی جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں، آخرت کی پروا انھیں نہیں ہوتی تو اللہ ان کو بھی اتنا دے دیتا ہے جتنا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

'نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ' کے بعد 'نُؤْتِهٖ مِنَ الدُّنْیَا' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ تقابل اس حذف پر دلیل ہے اس لیے کہ دوسرے ٹکڑے میں 'نُؤْتِهٖ مِنْهَا' کے الفاظ موجود ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۸-۲۰)

جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کو اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جو چاہتے ہیں اور جن کے لیے چاہتے ہیں۔ پھر ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے اور جو آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور اس کے شایانِ شان جدوجہد کرتے ہیں اور وہ مومن بھی ہیں تو درحقیقت وہ ہیں جن کی سعی مشکور و مقبول ہوگی۔ تیرے رب کی بخشش سے ہم اُن کی بھی مدد کرتے ہیں اور اِن کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کا دروازہ کسی پر بھی بند نہیں ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــ آیات: ۲۱-۳۶

اوپر کے پیرے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دینِ توحید کی تعلیم دی ہے جس کی تعلیم یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دے رہے ہیں۔ اب آگے یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ان مشرکین کے مزعوم شرکاء نے ان کے لیے کوئی الگ دین ایجاد کیا ہے تو یہ دین خدا کے ہاں کام آنے والا نہیں ہے۔ جزائے اعمال کے دن یہ لوگ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر کے اس دن کے لیے کچھ کمائی کر لیں گے۔

اس کے بعد مخالفین کے تین اعتراضوں کے علی الترتیب جواب دیے ہیں۔

ایک اس اعتراض کا کہ اس جوش و گرمی کے ساتھ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو دعوت دے رہے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہماری بہبود ان کو عزیز ہے بلکہ اس میں سراسر ان کی اپنی غرض پوشیدہ ہے۔

دوسرے اس کا کہ جو کلام یہ پیش کر رہے ہیں یہ ہے تو تمام تر ان کا اپنا من گھڑت لیکن اپنا رعب جمانے کے لیے یہ اس کو خدا سے منسوب کر رہے ہیں۔

تیسرے اس کا کہ اگر ہم اپنی گمراہی پر سزا کے مستحق ہیں تو ہمارے حالات ان کے اور ان کے ساتھیوں کے حالات سے بہتر کیوں ہیں اور جس عذاب سے یہ ہم کو ڈرا رہے ہیں وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۱-۲۶

أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢١﴾ تَرَى الظَّٰلِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۗ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ ۖ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٢٢﴾ ذَٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ ۗ قُل لَّا أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۗ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٢٣﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَٰتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٢٤﴾ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّـَٔاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿٢٥﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۚ وَالْكَٰفِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ښ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰي ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمۂ آیات ۲۱-۳۶

کیا ان کے کچھ شریک خدا ہیں جنھوں نے ان کے لیے وہ دین ٹھہرایا ہے جس کا اذن اللہ نے نہیں دیا! اور اگر فیصلہ کی مدت طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور بے شک ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ تم ظالموں کو اس دن دیکھو گے کہ وہ اپنی کمائی کے وبال سے لرزاں ہوں گے اور وہ ان پر پڑ کے رہے گا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ بہشتوں کے باغیچوں میں ہوں گے۔

ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ سب سے بڑا فضل درحقیقت یہی ہے۔ یہ چیز ہے جس کی بشارت اللہ اپنے ان بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔ کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب تو ہوں نہیں بس قرابت کا حق ہے جو ادا کر رہا ہوں اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو ہم اس کے لیے اس میں بھلائی کی افزونی کریں گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑی قدرافزائی کرنے والا ہے۔ ۲۱-۲۳

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے! تو اللہ اگر چاہے تو تمھارے دل پر بند لگا دے اور اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹاتا اور حق کو مستحکم کرتا ہے۔ بے شک وہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۲۴-۲۵

اور قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور وہ ان کو اپنے فضل میں سے مزید عطا فرمائے گا، رہے یہ کافر تو ان کے لیے ایک سخت عذاب ہے۔ ۲۶

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو کھول دیتا تو وہ زمین میں ادھم مچا دیتے بلکہ وہ ایک اندازے کے ساتھ اتارتا ہے جو چاہتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کو دیکھنے والا ہے اور وہی ہے جو اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی حقیقی کارساز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۷-۲۸

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کیا جانا اور جو اس نے ان کے درمیان جانور پھیلائے ہیں۔ اور وہ ان کے جمع کرنے پر بھی، جب وہ ان کو جمع کرنا چاہے گا قادر ہے۔ ۲۹

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تمھاری کرتوتوں ہی کی بدولت پہنچتی ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے اور تم نہ زمین میں خدا کے قابو سے نکل سکتے (اور نہ آسمان میں) اور اللہ کے مقابل میں تمھارا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ ۳۰-۳۱

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہیں سمندروں میں چلنے والے، پہاڑوں کے مانند، جہاز اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے پس وہ سمندر کی سطح پر ٹھہرے ہی رہ جائیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے۔ یا ان کو تباہ کر دے ان کے اعمال کی پاداش میں اور بہتوں سے درگزر فرمائے اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات میں کٹ حجتی کر رہے ہیں کہ ان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۳۲-۳۵

پس جو کچھ بھی تمھیں ملا ہے وہ دنیوی زندگی کی متاع حقیر ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر اور پائدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۳۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۱)

'اَمْ' یہاں استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین، جو اس نے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بھیجا، وہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا تو یہ نیا دین کہاں سے آدھمکا! [یہ دین شرک کہاں سے آنکلا!]

ان کے کچھ شرکاء ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایک ایسا دین گھڑ دیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ یعنی اللہ کی منظوری کے بدون تو کوئی دین اللہ کا دین نہیں ہو سکتا تو یہ دین کہاں سے آیا؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں تو اللہ کا تو کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ محض ان کا وہم ہے۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ'۔ یہ مضمون اوپر آیت ۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ ان کو دھمکی ہے کہ اگر اللہ نے ان کے فیصلہ کے لیے ایک وقت نہ مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا قصہ اسی دنیا میں ابھی پاک کر دیا جاتا۔ پس ان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے اس سے مغرور نہ ہوں بلکہ اللہ کے شکر گزار ہوں کہ وہ ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔ اگر انھوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ اس طرح کے ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ 'ظالمین' سے مراد یہاں یہی مشرکین ہیں جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو چھوڑ کر ایک نیا دینِ شرک ایجاد کیا اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۲۲)

آخرت میں آدمی کو اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا

یعنی آج تو یہ مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء کے بل پر آخرت سے بےفکر بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اگر آخرت ہوئی تو ان کے شرکاء ان کی مدد کریں گے، انھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب قیامت آ جائے گی اور یہ دیکھیں گے کہ یہاں کوئی کسی کا شریک و شفیع نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا واسطہ اس کے اعمال سے پڑنے والا ہے تو وہ اپنے اعمال کے وبال سے لرزاں ہوں گے لیکن ان کا یہ لرزاں و ترساں ہونا بالکل بے سود ہو گا۔ ان کے اعمال کا وبال لازماً ان کے سر پڑے گا اور کسی تدبیر سے بھی وہ اس کو دفع نہ کر سکیں گے۔

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......' البتہ جنھوں نے دیویوں دیوتاؤں پر اعتماد کرنے کے بجائے ایمان و عملِ صالح کی زندگی گزاری ہو گی وہ جنتوں کے باغیچوں میں براجمان ہوں گے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے۔

'رَوْضٰتُ الْجَنّٰتِ' میں 'رَوْضٰت' سے مراد وہ ضمنی باغیچے اور لان ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وسیع جنت میں اہلِ جنت کی تفریح اور سیر کے لیے بنے ہوں گے۔ 'روضات' بھی ایک سے زیادہ ہوں گے اور جنتیں بھی ایک سے زیادہ ہوں گی اس وجہ سے دونوں جمع کی صورت میں آئے ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ'۔ اس ٹکڑے کا صحیح زور سمجھنے کے لیے اوپر آیت ۲۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں فرمایا ہے کہ اس دنیا کے طالب اپنی خزف ریزوں کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں جو ان کے آگے ڈال دیے گئے ہیں حالانکہ اصلی فضل، جس کا لوگوں کو طالب ہونا چاہیے، یہ ہے جو اللہ قیامت کے دن اپنے با ایمان

بندوں پر فرمائے گا۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳)

یہ اس فضلِ عظیم کی عظمت واضح فرمائی ہے کہ اللہ اپنے باایمان بندوں کو ایک ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہا ہے تو وہ اس کے لیے جدوجہد کریں اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑیں جو اسی دنیا کے خزف ریزوں پر ریجھے ہوئے ہیں۔

'قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى' یہاں استثنار میرے نزدیک منقطع اور قُربیٰ مصدر کے مفہوم میں ہے جس طرح 'زُلفیٰ' اور 'بُشریٰ' وغیرہ اس وزن کے دوسرے الفاظ ہیں۔

قریش کے لیڈروں کو آگاہی

مطلب یہ ہے کہ قریش کے ان برخود غلط لیڈروں کو آگاہ کر دو کہ تمھاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود، میں اس طرح جو اپنے رات دن تمھارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔ جس کے لیے خدا کی طرف سے اس فضلِ عظیم کی بشارت ہے جس کا او پر ذکر ہوا وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہو گا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اس وجہ سے ہیں کہ میں اس حقِ قربت و قرابت سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں جو تمھارے اور میرے مابین ہے۔ تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو اس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں اس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں اس میں سب سے پہلے تمھیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔

حضرات انبیاء کی ایک صفت

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں سے کیا اور جب تک ان سے وہ مایوس نہیں ہو گئے ہیں اس وقت تک انھوں نے دوسروں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اسی سنت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اوّل اوّل یہ ہدایت ہوئی کہ 'وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ' (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) (تم اپنے قریبی خاندان والوں کو آگاہ کرو)۔ آپ کے یہ قریبی قریش تھے جن کو پورے عرب کی دینی و سیاسی پیشوائی حاصل تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ان کو انذار کیا اور ان کی تمام تعدّیوں کے باوجود اس وقت تک آپ اس کام میں لگے رہے جب تک انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا بالآخر جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپ کے قتل و اخراج کے مشورے ہونے لگے تب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کو ہجرت فرمائی۔

استاذ امام کا نقطۂ نظر

استاذ امامؒ اس آیت کو ذرا مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس استثناء کو استدراک کے مفہوم میں لیتے ہیں اور اس آیت کی تاویل سورۂ سبا کی آیت ۴۷ 'قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ

اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے) کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ میں جو تمہیں صلۂ رحم، ادائے حقوق اور انفاق کی دعوت دیتا ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ یہ میں کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر کر رہا ہوں بلکہ یہ تمہاری ہی دنیا اور آخرت کی بہبود کے لیے ہے۔ یہ مال تمہارے اغنیاء سے لے کر تمہارے ہی غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اس طرح میں تمہیں مودّت فی القربیٰ کی راہ دکھا رہا ہوں۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ زکوٰۃ سے اپنے اور اپنے اقرباء کے لیے کسی قسم کا استفادہ جائز نہیں رکھا تھا تاکہ اس طرح کی بدگمانی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ان دونوں تاویلوں میں زیادہ بُعد نہیں ہے اس لیے کہ انقطاع اور استدراک دونوں ایک ہی نوع کی چیز ہے۔ تاہم دونوں میں کچھ فرق ہے۔ مجھے اگرچہ اپنی تاویل پر زیادہ اطمینان ہے تاہم میں مولاناؒ کی تاویل کو غلط نہیں کہتا۔

مؤلف کا نقطۂ نظر

میرے نزدیک آیت کی صحیح تاویل یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر تو نہیں مانگتا، بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اس کی بنا پر میرے ساتھ حسنِ معاشرت کا برتاؤ رکھو۔ اس تاویل میں جو ضعف ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ حسنِ معاشرت کا سوال بھی ایک اجر ہی کا سوال ہے اور سورۂ شعراء میں تمام انبیاء — نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام — کی زبان سے بالاتفاق منقول ہے کہ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (میں تم سے اس چیز پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے) کسی نبی نے بھی اپنی دعوت کے صلہ میں اپنی قوم سے اپنے ساتھ حسنِ معاشرت کی اپیل نہیں کی اس لیے کہ سارا جھگڑا تو دعوت ہی کی بنا پر تھا تو جب نبی کے لیے اس میں کوئی مداہنت برتنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی تو مخالفوں سے حسنِ معاشرت کی اپیل کرنے کے کیا معنی! قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو عناد تھا وہ محض آپ کی دعوت کی بنا پر تھا۔ وہ آپ کی ہر خواہش پوری کرنے اور آپ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوتِ توحید سے باز آجائیں لیکن آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔ اس کے بعد جب قریش کا رویّہ مزید سخت ہوا تو آپ نے ان سے حسنِ معاشرت کی درخواست کرنے کے بجائے ان کو صاف الفاظ میں آگاہ کر دیا کہ تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو، مجھے اگر اُحد کے برابر بھی سونا دے دیا جائے جب بھی میں اپنی دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں۔

بعض گمراہ فرقوں نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ میں اس دعوت پر تم سے بس یہ اجر مانگتا ہوں کہ میرے اقرباء کے ساتھ محبت کرو۔ یہ تاویل آیت کے الفاظ، دوسرے نصوص اور عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن

صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جن لوگوں نے یہ تاویل کی ہے انھیں شاید یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ یہ آیت مکی دور کی ہے جب آپ کے خاص اقربا میں اکثر آپ کے جانی دشمن تھے، ان کے لیے لوگوں سے محبت کی اپیل کرنے کے کیا معنی!

قریش کو ایک تنبیہ

وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی بتا دو کہ تمھاری نیکی اور پرہیزگاری سے اللہ کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تم نے اس کی بندگی نہ کی تو اس کی خدائی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے گا بلکہ اس میں سراسر تمھارا ہی نفع ہے اس لیے کہ تم جو چھوٹی بڑی نیکی بھی کرو گے اس میں اللہ افزونی اور بڑھوتری دے گا اور اس کا صلہ تم ایک ابدی بادشاہی کی شکل میں پاؤ گے۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور لوگوں کی نیکیوں کی بڑی قدر افزائی فرمانے والا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ اس کی پرورش کر کے اس کو بڑھائے گا اور ایک اجر عظیم کی صورت میں اس کو اپنے بندے کو عطا فرمائے گا۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ ؕ وَیَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲۴)

ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار

یعنی اگر اس میزانِ عدل (قرآن) کے خلاف انھوں نے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ یہ ہے تو تمھاری ایجاد لیکن محض لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے تم نے اس کو جھوٹ موٹ اللہ سے نسبت دے رکھی ہے تو تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کرتی ہے کہ نہ تم نے اپنی خواہش سے یہ چیز پائی ہے اور نہ اپنی خواہش سے اس کو پا سکتے ہو بلکہ خدا ہی نے اس چشمۂ فیض کو تمھارے اندر جاری کیا ہے اور وہ جب بھی چاہے اس کو روک سکتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں یوں گزر چکا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ	اور اگر ہم چاہیں تو اس کو سلب کر لیں جو ہم نے
بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ	تمھاری طرف وحی کی ہے۔ پھر تم کسی کو ہمارے
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا	مقابل میں، اس کو واپس دلانے کے لیے وکیل نہ
وَكِیْلًا ۙ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ	بنا سکو۔ یہ محض تمھارے رب کا، تمھارے اوپر
اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا	ایک فضل ہے بے شک اس کا فضل تمھارے اوپر
(بنی اسرآءیل: ۸۶-۸۷)	بہت بڑا ہے۔

وَیَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ۔ 'واو' حالیہ ہے اور 'یَمْحُ' کا عطف 'یَخْتِمْ' پر نہیں ہے بلکہ یہ الگ جملہ ہے۔ یہ دراصل 'یَمْحُوْ' ہے لیکن مصاحف کے رسم الخط میں اس طرح کی 'واو' بعض جگہ ساقط کر دی گئی ہے، مثلاً 'یَدْعُ الْاِنْسَانُ'، 'یا سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ' وغیرہ۔

مذکورہ حقیقت کا ایک اور پہلو

یہ اسی اوپر والی بات کا دوسرا پہلو ہے کہ جو لوگ اس قرآن کو افترا قرار دیتے ہیں کیا وہ اس کے

اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کا اثبات کر رہا ہے۔ افترا ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹائے اور حق کو اجاگر کرے بلکہ اس کا کام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات سیدنا مسیحؑ سے ان لوگوں کے جواب میں منقول ہوئی ہے جو آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ بدروحوں کو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے نکالتے ہیں۔ آپ نے ان معترضین کو یہ جواب دیا کہ اگر میں نے شیطانوں کو شیطان ہی کی مدد سے نکالا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شیطان خود ہی اپنا دشمن بن گیا۔ یہی بات یہاں ارشاد ہوئی کہ اگر یہ کلام افترار اور اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے تو اس کا اثر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی صورت میں نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس نکلتا تھا۔ دنیا میں کس مفتری نے اس طرح کا فیض بخش اور ارواح و قلوب کو متوثر کرنے والا کلام پیش کیا ہے جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے!

مخالفین کو تنبیہ

اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ یہ ان کو تنبیہ ہے جو قرآن کو افترار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مفتری قرار دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ فتنہ اٹھایا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ قرآن افترا ہے اور نہ اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے۔ ان کو قرآن کی جلالت کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کا بھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن حق ہے اور اس کا پیش کرنے والا ایک بے داغ کردار کا انسان ہے لیکن چونکہ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے اپنے دل کی آواز کے بالکل خلاف اس طرح کی باتیں گھڑتے اور پھیلاتے تھے۔ ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ خدا تمھارے دلوں کے بھیدوں سے اچھی طرح واقف ہے کہ تمھارے دلوں کے اندر کیا ہے اور زبانوں سے تم کیا کہہ رہے ہو!

وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۲۵)

توبہ و اصلاح کی ترغیب

یہ ان لوگوں کو توبہ اور اصلاح کی ترغیب ہے کہ اب بھی موقع باقی ہے کہ تم چاہو تو توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو خدا کے غضب سے بچا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربان اور اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ جو تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اپنا کوئی جرم بھی اس سے چھپا نہ سکو گے۔

وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ وَالْکٰفِرُوْنَ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (۲۶)

یہ اہلِ ایمان کی روش اور ان کے انجام کو ان کے سامنے رکھا ہے کہ جس طرح انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق پائی اور اس کے صلہ میں ان پر دنیا و آخرت میں مزید افضال ہوں گے اسی طرح یہ لوگ بھی

چاہیں تو ان افضال کے سزاوار بن سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ کفار کے لیے خدا کے ہاں سخت عذاب ہے۔ 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' یہاں میرے نزدیک مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کے محل میں ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ط وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (الانعام: ۳۶) (قبول تو وہی کریں گے جو بات گوشِ دل سے سنتے ہیں۔ رہے مردہ دل تو اللہ ان کو اٹھائے گا ......)۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ (۲۷)

ایک مغالطہ کی اصلاح

یعنی یہ لوگ اگر اپنی دنیا کی دولت اور ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے بیٹھے ہیں اور اسی غرّے میں پیغمبرؐ اور اس کے غریب ساتھیوں کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو یہ محض ان کی خود فریبی ہے۔ دنیا کی دولت و ثروت کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ یہ چیز محض امتحان کے لیے ہے اور اللہ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق کافر و مومن دونوں کو یہ دیتا اور دونوں کا امتحان کرتا ہے۔ یہ چیز تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے حالات و مصالح سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے اس کو تنگ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور اس طرح ان کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو اس کے دروازے سب کے لیے نہایت کشادہ کر دیتا کہ لوگ جتنا چاہیں اس میں سے سمیٹ لیں لیکن یہ چیز ان لوگوں کے لیے بہت بڑا فتنہ بن جاتی، لوگ اس کے نشہ میں سرکشی و بغاوت کے راستہ پر چل پڑتے۔ اس فتنہ سے لوگوں کو بچانے کے لیے اللہ نے یہ معاملہ تمام تر اپنے اختیار ہی میں رکھا ہے، وہی اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق جتنا رزق چاہتا ہے اتارتا ہے۔ اگر کسی کو اس نے زیادہ دیا ہے تو وہ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ یا اس کا اور اس کے آباء و اجداد کا حق ہے بلکہ اس رب کا شکر گزار رہے جس کے اختیار میں بخشنا بھی ہے اور بخش کر چھین لینا بھی۔

یہ مضمون آگے والی سورہ ــــ زخرف ــــ میں جو اس کی توام سورہ ہے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بستیوں ــ مکہ یا
عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ	طائف ــــ کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں اتارا
عَظِیْمٍ ہ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ	گیا! کیا تیرے رب کے فضل کے تقسیم کرنے والے یہ
رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ	ہیں! دنیا میں ان کی معیشت کی تقسیم ہم نے کی ہے
مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	اور ان کے درجے ایک دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ	ان میں سے ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے اور

دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ	تیرے رب کا فضل ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو
وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝	وہ جمع کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ
وَلَوْلَآ أَنْ يَّكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً	سب ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو ہم ان لوگوں
لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ	کے گھروں کی چھتیں، جو خدائے رحمان کا کفر کرتے ہیں،
لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ	چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی، جن پر وہ چڑھتے۔
وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ۝ وَلِبُيُوتِهِمْ	اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی
أَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔونَ ۝	جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے اور یہ چیزیں سونے
وَزُخْرُفًا ۗ وَإِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا	کی بھی بنا دیتے۔ یہ دنیوی زندگی کی چند روزہ متاع
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ	ہے اور آخرت کی کامرانی تیرے رب کے پاس
رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۱-۳۵)	متقیوں کے لیے ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۔ ۲۸

اوپر کی بات پر دلیل

یہ دلیل ہے اس بات کی جو اوپر ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ ہی اپنے اندازے کے مطابق بندوں کے لیے رزق اتارتا ہے، نہ بندوں کو اس معاملے میں کچھ اختیار ہے نہ ان کے مزعومہ شرکا کو۔ فرمایا کہ اللہ ہی اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ بارش کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ معاش کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ اور 'مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا' سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان تمام لوگوں کو جن کو اپنی تدبیر، اپنے استحقاق، اپنے وسائل و ذرائع اور اپنے شرکا و شفعاء پر ناز ہے، اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ آسمان کے بند دریچوں کو کھولنا اس کے خالق کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی یہ شان اسی لیے وقتاً فوقتاً دکھاتا رہتا ہے کہ کوئی اس غرّے میں نہ مبتلا ہو کہ رزق و فضل کسی کی میراث ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

'وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ' - یہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آئے دن کا یہ مشاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ حمید، یعنی ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد و شکر کاموں کا منبع ہے۔ اس حیاتِ چند روزہ میں وہ ان لوگوں کو بھی اپنے رزق سے محروم نہیں کرتا جو اسی کے رزق پر پلتے اور اسی کو چیلنج کرتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ (۲۹)

ایک اور مغالطے کی اصلاح

یعنی کسی کو یہ مغالطہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو عذاب و قیامت سے جو ڈرایا جا رہا ہے یہ محض دھمکی ہے۔ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے۔ یہ وہی دلیل ہے جو دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہوئی ہے ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمھارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ یا اس آسمان کا جس کو بلند کیا)۔

لفظ 'دَآبَّةٌ' زمین کی جاندار چیزوں کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آسمانوں میں بھی اس طرح کی کوئی مخلوق پائی جاتی ہے جس پر 'دَآبَّةٌ' کا اطلاق ہو سکے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہاں 'وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ' میں مثنیٰ کی ضمیر کیوں استعمال ہوئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح اس فضا کے لیے بھی آتا ہے جس میں پرندے پرواز کرتے ہیں۔

اس آیت میں 'بَثَّ' اور 'جمع' کا تقابل بھی نہایت بلیغ اور قیامت کی ایک نہایت دلنشین دلیل ہے 'بثّ' کے معنی چھینٹنے، بکھیرنے اور پھیلانے کے ہیں اور 'جمع' کے معنی اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جس نے زمین اور فضا میں یہ تمام جاندار پھیلائے ہیں وہ ان کو جب چاہے گا جمع کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب وہ بکھیرنے پر قادر ہوا تو ان کو سمیٹنے سے کیوں قاصر رہے گا۔ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے وہ ضائع کرنے کے لیے تخم نہیں بکھیرتا بلکہ وہ اس کا حاصل ایک دن جمع بھی کرتا ہے اور اس میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۳۰-۳۱)

شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے

یہ اسی اوپر والے شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ خدا کے قانونِ مجازات کا تجربہ تو تم اپنی روزمرّہ زندگی میں بھی کر سکتے ہو۔ اس دنیا میں تمھیں جو دکھ بھی پہنچتے ہیں وہ تمھارے اعمال ہی کے نتیجے میں پہنچتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تمھاری بہت سی بداعمالیوں سے درگزر بھی فرماتا ہے۔ یہ دکھ جو تمھیں پہنچتے ہیں تمھاری تنبیہ و تذکیر کے لیے پہنچتے ہیں تاکہ تم اس دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں لاابالیانہ زندگی نہ گزارو بلکہ ان تنبیہی واقعات سے یہ سبق حاصل کرو کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور وہ ایک دن تم کو جمع کر کے تم سے ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اگر آج وہ تمھیں ڈھیل دے رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو تمھارے خیر و شر سے کوئی تعلق نہیں یا تمھارے شر ہی کو اس نے خیر کا درجہ دے دیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کامل جزاء و سزا کے لیے ایک خاص یوم الفصل مقرر کر رکھا ہے جو لازماً آ کے رہے گا۔

'يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ' میں لفظ 'عفو' درگزر کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال جگہ جگہ ہوا ہے۔

وَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ۔ یعنی یہ بھی تم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنی کوئی آفت زمین میں نازل کرتا ہے تو تم اس کے قابو سے باہر نہیں نکل پاتے اور نہ تمہارا کوئی کارساز و مددگار تمہاری بگڑی بناتے یا تمہاری حمایت و مدافعت کے لیے اٹھتا ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسی طرح آسمان میں بھی قیامت کے دن، تم کو خدا کی پکڑ سے نہ کوئی شریک و شفیع بچا سکے گا اور نہ کوئی حامی و مددگار۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ خطاب کفار سے ہے جن کو اس دنیا میں جو تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں ان کے اعمال کی پاداش ہی میں پہنچتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اس وجہ سے وہ ایک ایسا روز جزا ضرور لائے گا جس میں ان کے ان جرائم کی بھی وہ سزا دے گا جن سے اس دنیا میں وہ درگزر کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق انبیاء اور صدیقین و صالحین سے نہیں ہے۔ ان کو جو مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر نہیں بلکہ ابتلاء کے طور پر پیش آتے ہیں، جن سے مقصود ان کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور یہ امتحان ان کے مدارج کی بلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ۙ اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ۫ وَّ یَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ (۳۲-۳۵)

دنیا کی کامیابی پر مغروروں کے لیے ایک تمثیل

یہ ان لوگوں کے سامنے ایک مثال پیش کی ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں پر مگن ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو کشتی کے سفر کی مانند سمجھو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کے مانند بھاری بھاری جہازات سمندر کے سینہ پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر خدا کی قدرت پر نہیں ہوتی وہ جب جہاز کو رواں دواں دیکھتے ہیں تو مگن ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کو کوئی خطرہ بھلا کہاں سے اور کس طرح پیش آسکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو روک دے اور یہ جہازات اپنے مسافروں سمیت سطح سمندر پر ہی پڑے رہ جائیں یا ان کو ان کے مسافروں سمیت ان کی جگہ ہی پر غرق کر دے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بنے۔ اس تمثیل میں اگرچہ پیش نظر بادبانی جہازات ہیں اس لیے کہ اس وقت تک بادبانی جہازات ہی وجود میں آئے تھے لیکن ٹھیک ٹھیک یہی تمثیل آج کے ترقی یافتہ جہازوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ آج سائنس کی ترقیوں نے انسان کو اسٹیم، بجلی اور ایٹم کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے جس سے اس کی طاقت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے لیکن آج بھی ہم آئے دن بڑے بڑے بحری جہازوں کے متعلق اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ بتاشہ کی طرح پانی میں بیٹھ جاتے ہیں، یا ان کی ساری مشینری اس طرح معطل ہو جاتی ہے کہ ایک لاشہ بے جان کی طرح ان کو دوسرے جہازات گھسیٹ کر ساحل پر پہنچاتے ہیں۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ' یہ اس سبق کی طرف اشارہ ہے جو اس تمثیل میں مضمر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں جو صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ زندگی کے حالات و واقعات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ناسازگار حالات پیش آئیں تو اس کو مایوس و دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے رب کے بھروسے پر صبر کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے خدا کے حکم ہی سے پیش آتا ہے اور خدا کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی کو سازگار حالات میسر آئیں تو اس کو اترانے اور فخر کرنے والا نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے رب کا برابر شکرگزار رہنا چاہیے اس لیے کہ بندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کو نعمت مغرور اور مصیبت مایوس بناتی ہے وہ کبھی ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوتے۔ آگے اسی سورہ میں اس طرح کے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَۃً فَرِحَ بِہَا ج وَاِنْ تُصِبْہُمْ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْہِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ' (۴۸) (اور جب ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں تو وہ اس پر اتراتا ہے اور اگر اس کو اس کے اعمال کی پاداش میں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو ناشکرا بن جاتا ہے)۔

'اَوْ یُوْبِقْہُنَّ بِمَا کَسَبُوْا وَیَعْفُ عَنْ کَثِیْرٍ' اس کا عطف اوپر والے جملے 'اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ الرِّیْحَ' پر ہے۔ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ ... الاٰیۃ' والا فقرہ بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، اس تمثیل کے مقصد کی طرف توجہ دلانے کے لیے آ گیا ہے۔ جملہ معترضہ کے بعد بات پوری کر دی گئی کہ جس طرح وہ قادر ہے کہ ہوا کو روک کر جہازوں کو سطح سمندر ہی پر ساکن کر دے اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کو ان کے مسافروں کے اعمال کی پاداش میں غرق کر دے اور چاہے تو ان میں سے بہتوں کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور وہ بھنور سے نکل کر بخیریت ساحل پر پہنچ جائیں۔ ان تینوں میں سے ہر بات اس کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اس دنیا میں کسی کے لیے اپنی کسی کامیابی پر مغرور ہونا جائز نہیں ہے بلکہ کامیابی حاصل ہو تو اپنے رب کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ اور کوئی افتاد پیش آئے تو اس کو اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ سمجھ کر صبر کرنا چاہیے اور اللہ سے خیر کی امید رکھنی چاہیے۔

'وَیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا ط مَا لَہُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ' یہاں 'یَعْلَمَ' حالت نصب میں ہے اس وجہ سے اس کا معطوف علیہ محذوف ماننا پڑے گا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں، مثلاً 'وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ' (الجاثیۃ: ۲۲) (اور آسمانوں اور زمین کو اس نے غایت کے ساتھ پیدا کیا (تاکہ وہ ایک روزِ عدل لائے)

حذف کی ایک مثال

اور تاکہ ہر جان کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے) اسی اصول پر یہاں کوئی مناسب تعلیل محذوف ماننی پڑے گی۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ تاکہ اللہ ان سے انتقام لے اور تاکہ آیاتِ الٰہی میں کٹ حجتی کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کے لیے خدا سے بھاگ سکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ ہم ایک نظیر سورۂ یونس سے پیش کرتے ہیں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم ۖ مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (یونس: ۲۲-۲۳)	وہی ہے جو تم کو سفر کراتا ہے خشکی اور تری میں۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ سازگار ہواؤں سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں، آپڑتی ہے ان پر بادِ تند اور اٹھنے لگتی ہیں ان پر موجیں ہر جانب سے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے۔ اس وقت وہ اللہ کو پکارتے ہیں، اسی کی خالص اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن کے رہیں گے۔ پس جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ پھر زمین میں بلاکسی حق کے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی کا وبال تمھارے ہی اوپر پڑنے والا ہے۔ اس دنیا کی چند روزہ متاع سے فائدہ اٹھالو۔ پھر ہم تم کو بتائیں گے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۳۶)

خلاصۂ بحث

یہ آخر میں اوپر والی بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دنیا کی جو نعمتیں تمھیں ملی ہیں، اترانے اور فخر کرنے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اس حیاتِ چند روزہ کی متاع ہیں۔ ایک دن بالآخر یہ زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کا یہ سروسامان بھی۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور ابدی ہے جو ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس کے چاہنے والے بنو۔ اس دنیا کی متاعِ حقیر کے پیچھے کیوں اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔

یہاں 'وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ' کے الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں ان کے لیے اس راہ میں اصلی زادِ راہ توکّل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں ان کو خدا کے بھروسہ اور آخرت کے صلہ کے اعتماد پر طلاق دے سکے اس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات: ۳۷-۴۳

آگے کی آیات میں مذکورہ بالا اجر کے مستحقین کی کچھ اور صفتیں بیان فرمائی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان اس دور میں قریش کے مغروروں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کے مظالم سے تنگ آکر اپنے گھر در چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے، وہی اس کے اصلی حق دار ہیں۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، ہجرت کے بالکل قریب نازل ہوئی ہے اس وجہ سے ان صفات کے بیان کا انداز کچھ اس طرح کا ہے جس میں مسلمانوں کے لیے فتح باب کی بشارت بھی ہے اور آگے کے مراحل میں ان کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق بعض ضروری ہدایات بھی۔ گویا ہجرت سے پہلے ہی ان کو یہ بتا دیا گیا کہ اب تک وہ منتشر افراد کی صورت میں تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی میں منظّم کرنے کی شکل پیدا کر رہا ہے۔ اب تک وہ مظلوم تھے لیکن اب وقت آرہا ہے کہ وہ اپنی مدافعت کی قوت بھی حاصل کریں گے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مجاز بھی ہوں گے ___ ان پیش آنے والے حالات میں ان کو کیا رویّہ اختیار کرنا ہے اس کی طرف ان آیتوں میں رہنمائی کی گئی ہے لیکن اس رہنمائی کا انداز امر و حکم کا نہیں بلکہ ایمان اور توکّل کے لازمی مقتضیات کے بیان کا ہے ___ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۷-۴۳

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٠ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝٤١ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٤٢ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝٤٣ ع ۴

ترجمۂ آیات ۳۷-۴۳

اور وہ بچتے ہیں بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے اور جب غصہ ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور وہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی اور نماز کا اہتمام کیا اور ان کا نظام شوریٰ پر ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۷-۳۸

اور وہ کہ جو انتقام لیتے ہیں اس وقت جب ان پر تعدی ہوتی ہے اور کسی برائی کا بدلہ اس کے برابر کے عمل سے ہے۔ پس جس نے درگزر کی اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیا تو ان کے اوپر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۳۹-۴۲

اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔ ۴۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۳۷)

برائیوں کے تین عنوان

یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو خدا کی نعمتیں پا کر ظلم، بے حیائی اور بغی و طغیان میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ حق تلفی، بے حیائی اور غصہ و انتقام کی قسم کے تمام بڑے جرائم سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ اس اسلوبِ بیان میں مخالف گروہ پر جو تعریض ہے وہ وضاحت کی محتاج نہیں ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تمام برائیوں کو تین عنوانوں کے تحت سمیٹ دیا گیا ہے: اثم، فحشاء اور غضب ۔

اثم سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی، ناانصافی اور ظلم کی نوعیت کی ہوں۔ 'فحشاء' سے وہ برائیاں مراد ہیں جو شہوات اور خواہشاتِ نفس کی راہ سے ابھری ہیں۔ غضب، انانیت، خودسری اور استکبار سے وجود میں آتا ہے اور طغیان و فساد اور بغی و جبر کو جنم دیتا ہے۔

یہاں ان برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خیر و شر کے دو متضاد داعیات کی کشمکش کے اندر امتحان میں ڈالا گیا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اس سے یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ اگر یہ بوجھ اس پر ڈالا جاتا تو یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چاہا ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی چھوٹی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔

دوسری یہ کہ چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے اس کا ضمیر اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے خائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے صادر ہوگی بھی تو سہواً ہی ہوگی، عمداً نہیں ہوگی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں ان کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔

'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک غصہ کے آنے کا تعلق ہے وہ تو ان کو آتا ہے اس لیے کہ غصہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزتِ نفس کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس غصہ سے بے قابو ہو کر اپنی عقل سے دست بردار اور خدا کے حدود سے متجاوز ہو جائیں بلکہ وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں جن کی حرکتیں اگرچہ غصہ دلانے والی ہوتی ہیں لیکن مختلف وجوہ سے وہ مستحق ہوتے ہیں کہ ان سے درگزر کی جائے۔ اس میں درپردہ مسلمانوں کو اس بات کی تلقین بھی ہے کہ ہر چند تمہارے دشمنوں کا رویہ نہایت اشتعال انگیز ہے لیکن ابھی یہی بہتر ہے کہ ان سے درگزر کرو

یہاں تک کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ آگے کی آیات میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔ یہاں ضمیر 'ھُمْ'، کے اظہار سے جملہ میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ اگرچہ یہ کام ہے نہایت کٹھن لیکن مستحقِ آفرین ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۸)

وہ صفات جن سے مذکورہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں

یہ ان صفات کا بیان ہے جن سے ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ انھوں نے اپنے رب کی اس دعوت پر لبیک کہی ہے جو اس کے رسول کے واسطہ سے ان کو پہنچی ہے۔ قریش کے متکبرین کی طرح انھوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی اسی خوبی کی طرف اوپر آیت ۲۶ میں اشارہ فرمایا ہے۔ 'وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' (اور اس کو قبول کر رہے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ ان کے لیے اپنے فضل میں افزونی فرمائے گا)۔

ایمان کا اولین مظہر نماز ہے

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ'۔ یہ اس قبول کرنے یا بالفاظِ دیگر ان کے ایمان کے اوّلین مظہر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ دین کی اس حقیقت کا اظہار اس کتاب میں ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر نماز ہے۔ یہی اس کا اوّلین مظہر بھی ہے اور پھر اسی سے دوسری نیکیاں ظہور میں بھی آتی اور اسی سے پروان بھی چڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے جس نے نماز کا اہتمام نہیں کیا اس نے گویا ایمان کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایمان کا مدعی ہے تو اس کا یہ دعویٰ محض خود فریبی ہے۔

یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ 'اَقَامُوا الصَّلٰوةَ' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ یعنی وہ نماز پڑھتے بھی ہیں اور یہ اہتمام بھی کرتے ہیں کہ دوسرے بھی نماز پڑھیں۔ یہی نماز اور اہتمامِ نماز ان کی جماعتی زندگی کی خصوصیت اور اس دنیا میں ان کا اصلی امتیاز ہے۔ یہی نماز ان کو سکھاتی ہے کہ ان کو دنیا میں اپنے رب کی بندگی اور اس کے دین کی اقامت کے لیے کس طرح بنیانِ مرصوص بن کر زندگی گزارنی ہے اور یہی نماز اس فحشاء اور منکر سے ان کو روکتی ہے جن سے اجتناب کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے: 'اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ' (نماز بے حیائی اور ناروا باتوں سے روکتی ہے) ـــــ اس میں بھی قریش کے لیڈروں پر تعریض ہے کہ نماز تو انھوں نے برباد کر دی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے اس گھر کے وارث ہونے کے مدعی ہیں جو نماز اور اہتمامِ نماز کے ایک مرکز کی حیثیت سے تعمیر ہوا تھا۔

اجتماعی معاملات کا نظام شورائی ہے

'وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' ـــــ 'شُوْرٰى' مصدر ہے 'فُتْيَا' کے وزن پر اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے

کے ہیں۔ لفظ 'امر' عربی میں ہمارے لفظ 'معاملہ' کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل اور سیاق و سباق سے کرتے ہیں۔ یہاں قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی نظم کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا جماعتی اور سیاسی نظم خود سری، انانیت، خاندانی برتری، نسبی غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔ اس میں قریش کے نظم سیاسی و اجتماعی پر جو تعریض ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے اس لیے کہ ان کا نظمِ اجتماعی تمام تر خاندانی اور نسبی امتیاز پر قائم تھا۔ اسلام کی مخالفت کا ایک بڑا سبب ان کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ اس دعوت کے فروغ پانے کی صورت میں اپنے اس جاہلی نظام کی موت سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ بشارت دے دی کہ ان کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی کی تشکیل میں منظّم ہونے کا وقت آگیا اور یہ نظمِ اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہوگا، دوسری طرف درپردہ قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہی کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آرہا ہے جو تمہارے اس فاسد نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔

شوریٰ کی اہمیت کا ایک خاص پہلو

یہاں شورائی نظام کی خصوصیات اور اس کے اصول و مبادی پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب ـــــ اسلامی ریاست ـــــ کی ایک مستقل فصل میں کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ البتہ ایک سوال یہاں قابلِ غور ہے کہ قرآن کا معروف اسلوبِ بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں 'شوریٰ' کا ذکر آگیا ہے۔ آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

اسلام کا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کیا گیا

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظمِ اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی تشکیل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم و تقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدودِ الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون و چرا اطاعت کرنی ہے، اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابقِ شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا

کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحبِ علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔

نماز اور ہمارے سیاسی نظام کا یہ تعلق ہے جس کے سبب سے قرآن نے ٹھیک اس وقت جب مسلمان ایک ہیئتِ اجتماعی کی تشکل اختیار کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی شوریٰ کی طرف فرمائی اور اس شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کر کے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرما دی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہوگی، کس طرح کے لوگ اس کی رکنیت کے لیے موزوں ہوں گے، جماعت اور خلقِ خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسئولیت کس کے آگے ہوگی۔

شوریٰ کی اہمیت اور نماز کے ساتھ اس کے تعلق کا یہی پہلو تھا کہ عہدِ رسالت اور خلفائے راشدین کے دور میں اس کا انعقاد مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق تو سیرت کی کتابوں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ شوریٰ کے انعقاد کا اعلان 'الصلوٰۃ جامعۃ' کے الفاظ سے کراتے تھے۔ یعنی اہلِ شوریٰ نماز کے لیے جمع ہوں۔ جب اہلِ شوریٰ مسجد میں جمع ہو جاتے تو وہ دو رکعت نماز ادا کرتے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دوسرے اہلِ شوریٰ بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔ نماز اور دعا کے بعد حضرت عمرؓ مسئلہ زیرِ بحث پیش کرتے اور اہلِ شوریٰ اس پر اپنی رایوں کا اظہار کرتے اور خلیفہ کی رہنمائی میں کسی متفق علیہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے حصول کے پہلو سے بھی نہایت بابرکت ہے اور اسلام کے نظمِ سیاسی کی اصل روح کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں شورائی نظام کی جگہ نظام بھی دوسرے اختیار کر لیے اور مسجدوں سے بھی ان کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو گئے اور ان کی باگ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب پارلیمنٹوں کے ایوانوں میں جو دھینگا مشتی ہوتی ہے اس کی مثال بازاروں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'۔ نماز کے ساتھ انفاق یا زکوٰۃ کے تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ایک مسنون تو یہ ہے کہ اس کی نماز پڑھی جائے

اور اس کا دوسرا ستون یہ ہے کہ اس کے بخشے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ پہلی چیز بندے کا تعلق اس کے خالق سے استوار کرتی ہے۔ دوسری چیز خلق سے اس کو جوڑتی ہے۔ اور انہی دونوں اساسات پر تمام شریعت قائم ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۳۹)

اوپر آیت ۳۷ میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ 'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ' یہ اسی پر ایک قسم کا استدراک ہے کہ اول تو وہ مخالفوں کی غصہ دلانے والی باتوں سے درگزر کرتے ہیں اور اگر کوئی جوابی کارروائی کرتے بھی ہیں تو اس وقت جب ان پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی تعدی کے دفاع اور اس کے انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور اس حق سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر بات کو کسی اقدام کا بہانہ بنالیں بلکہ وہ بدلہ لیتے ہیں تو کسی 'بغی' کا لیتے ہیں۔ 'بغی' مخالف کی کسی کھلی ہوئی تعدی، سرکشی اور زیادتی کو کہتے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (۴۰)

انتقام میں توازن

پھر یہ کہ بدلہ لیتے بھی ہیں تو یہ نہیں کرتے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں۔ بلکہ وہ اس معاملے میں بھی پورا توازن قائم رکھتے ہیں۔ جواب میں صرف اتنی ہی کارروائی کرتے ہیں جو برائی کے ہم وزن ہو۔

کوئی انتقامی کارروائی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ قصاص ہے لیکن یہاں اس کو 'سَیِّئَۃٌ' کے لفظ سے عربی زبان کے اس اسلوب کے مطابق تعبیر کیا گیا ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ بعض اوقات الفاظ مجانست کے اصول پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً 'دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا' ظاہر ہے کہ اس میں 'کَمَا دَانُوْا' بالکل 'کَمَا فَعَلُوْا' کے معنی میں ہے لیکن محض ہم آہنگی کے پہلو سے 'کَمَا فَعَلُوْا' کی جگہ 'کَمَا دَانُوْا' استعمال ہوا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی کے خلاف انتقامی کارروائی میں بھی کسی ایسے فعل کا ارتکاب جائز نہیں ہے جو شریعت میں بہر شکل ممنوع ہے۔

انفرادی معاملات میں پسندیدہ روش اصلاح کی ہے

'فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ' یعنی ہر چند اس بات کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ اس پر تعدی کی گئی ہے تو وہ تعدی کے بقدر انتقام لے لے لیکن اس سے اعلیٰ رویہ ان لوگوں کا ہے جو درگزر کریں اور معاملہ کو اصلاح کی راہ سے طے کرنے کی کوشش کریں۔ اصلاح کی راہ اختیار کرنے میں اگرچہ جذبات کی قربانی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا اجر بہت بڑا ہے جس کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام انفرادی واقعات میں زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو اصلاح ہی

کا طریقہ ہے۔ خواہ دونوں فریق خود باہم گر اصلاح و تلافی کی کوشش کریں یا دوسروں کو اس کا ذریعہ بنائیں یا دوسرے از خود بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دیں۔

انتقام صرف بقدرِ تعدی جائز ہے

'اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ'، یہ ایک جامع تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی پر تعدّی کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض اور اگر کوئی کسی کی تعدّی کا جواب اس سے بڑھ کر تعدی سے دینے کی کوشش کرے تو وہ بھی مبغوض۔ پسندیدہ روش اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ تعدی کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اگر یہ نہیں تو بقدرِ تعدی اس کا انتقام لے لیا جائے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۱-۴۲)

'بَعْدَ ظُلْمِهٖ' میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے جس طرح سورۂ روم کی آیت 'وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ' (۳) میں ہے۔

ان لوگوں کے شبہ کا جواب جو انتقام کو دینداری کے خلاف سمجھتے ہیں

یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے۔ اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

'بِغَيْرِ الْحَقِّ'، یعنی زمین کا خالق اور مالک تو خدا ہے، ان کا کوئی دخل نہ اس کی تخلیق میں ہے نہ تدبیر میں؛ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ کوئی ان کے آگے سر اٹھا کے نہ چلے۔ فرمایا کہ اصل مجرم یہ لوگ ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اگر ان کے جواب میں مظلوموں کو بھی کوئی اقدام کرنا پڑے تو اس کی مسئولیت ان مظلوموں پر نہیں بلکہ ان ظالموں ہی پر ہے جنھوں نے اس کی طرح ڈالی۔ سورۂ مائدہ کی آیت 'اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ' (۲۹) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۳)

خلاصۂ بحث

یہ آیت یہاں خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اگرچہ تعدّی کے بقدر انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ یہی ہے کہ لوگ صبر اور درگزر سے کام لیں۔

دوسری یہ کہ یہ درگزر صرف وہی لوگ کر سکیں گے جن کے اندر صبر کی خصلت ہوگی۔ جن کے اندر یہ صفت نہیں ہے وہ یہ بازی نہیں کھیل سکیں گے۔ اس وجہ سے لوگوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کردار عزیمت کا کردار ہے۔ جو لوگ یہ کردار اپنے اندر پیدا کریں گے وہ ارباب عزیمت میں ہیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان باتوں کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی ان حالات کے مقابلہ کے لیے کی گئی ہے جن سے وہ قریش کے ہاتھوں قرب ہجرت کے زمانے میں دوچار تھے اس وقت تک مسلمان نہ تو ایک منظم سیاسی طاقت بنے تھے اور نہ ابھی قریش پر دین کی حجت ہی پوری طرح تمام ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد جب مسلمان ایک منظم طاقت بن گئے اور قریش پر حجت تمام ہوگئی تو مسلمانوں کو من حیث الجماعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب مسلمان ان سے کلیتہً اپنے تمام روابط منقطع کرلیں اور اس وقت تک ان سے جنگ جاری رکھیں جب تک یہ اسلام کے آگے سپر نہ ڈال دیں۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۴۴-۵۰

آگے کی آیات کا تعلق اوپر آیت ۳۶ کے مضمون سے ہے۔ وہاں سلسلۂ کلام اس بات تک پہنچا تھا کہ یہ مخالفین جس زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں یہ تو چند روزہ ہے، اصلی دولتِ جاودان ان اہلِ ایمان کے لیے ہے جو اس دنیا کی چند روزہ زندگی کی جگہ آخرت کی کامرانیوں کے لیے بازی کھیل رہے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں اہلِ ایمان کا کردار بیان ہوا تاکہ کلام مطابق حال ہو جائے اور اس وقت کے مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ بشارت انہی کے لیے ہے۔ اور ان کے مخالفوں پر بھی واضح ہو جائے کہ آج جو لوگ ان کے ہاتھوں مظلوم ہیں اب ان کے لیے فتح باب کا وقت قریب ہے۔

اس کے بعد اوپر کے سلسلۂ مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تسلی دی کہ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان لوگوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب پانی سر سے گزر جائے گا۔ پھر آخری تنبیہ کے طور پر مخالفین کو یاد دہانی کی کہ اب بھی موقع ہے اگر سنبھلنا ہے تو سنبھل جاؤ۔ یہ وقت نکل گیا تو پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی ان کے اصل سببِ غرور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح فرمائی۔ جس کو آج کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کی عنایت سے ملتا ہے

لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو خدا ہی سے بغاوت کا ذریعہ بنا لیتا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۰

اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو اس کے بعد اس کا کوئی کارساز نہیں بن سکتا اور

تم ان ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو کہیں گے، ہے کوئی راہ دنیا میں پھر واپس جانے کی! اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ دوزخ کے سامنے اس طرح لائے جائیں گے کہ وہ ذلت سے جھکے ہوئے، کن انکھیوں سے دیکھتے ہوں گے، اور اہل ایمان کہیں گے کہ حقیقی خاسر وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کو خسارے میں ڈالا! آگاہ کہ یہ ظالمین ایک دائمی عذاب میں پڑیں گے! اور وہاں ان کے اولیاء میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا جو خدا کے مقابل میں ان کی کوئی مدد کر سکے۔ اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو پھر اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے! ۴۴-۴۶

اور اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہو قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آدھمکے جو ٹالا نہ جا سکے گا۔ اس دن تمھارے لیے نہ کوئی پناہ ہوگی اور نہ تم کسی چیز کو رد کر سکو گے۔ ۴۷

اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیا ہے۔ تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اور انسان کو جب ہم اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں تو اس پر اترانے لگتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی افتاد پیش آجائے تو وہ ناشکرا بن جاتا ہے۔ ۴۸

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں ملا کر ان کو بخشتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا

ہے۔ وہی علم رکھنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۹-۵۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۴)

پیغمبر صلعم کی تسلی کے لیے سنتِ الٰہی کا حوالہ

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر فرمائی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ ان کی ضلالت پسندی کے سبب سے گمراہی کی راہ پر ڈال دیتا ہے وہ خدا کی توفیق بخشی سے محروم ہو جاتے ہیں اور جو خدا کی توفیق و دست گیری سے محروم ہو جائیں کوئی دوسرا ان کا کارساز نہیں بن سکتا۔ اب تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن جن پر خدا کی مار ہے وہ ہدایت کی راہ اختیار کرنے والے نہیں بنیں گے۔

'وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ ...... الاٰيَة'۔ 'ظَالِمِيْنَ' سے مراد یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ ان کے لیے اس صفت کے استعمال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ گمراہ کیے جانے کے مستحق اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، اس کی ہدایت کی قدر نہیں کی بلکہ آنکھیں بند کر کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ یہ محروم القسمت لوگ آج تو اپنی روش پر بہت نازاں ہیں لیکن جب خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا دنیا کی طرف پلٹنے کی کوئی راہ اب بھی باقی ہے کہ وہاں جا کر وہ کچھ نیکی کی کمائی کریں کہ اس عذاب سے چھوٹ سکیں۔

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۵)

عربیت کا ایک اسلوب

'يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا' میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ چونکہ اس سے مراد دوزخ یا نارِ جہنم ہے اس وجہ سے ضمیر علیٰ سبیل التاویل مؤنث آئی۔ اس طرح گویا لفظ 'عذاب' کے اجمال کی وضاحت ہو گئی۔ عربی زبان میں یہ اسلوب بہت معروف ہے۔

فرمایا کہ آج تو یہ لوگ اپنی کامیاب زندگی کے غرّے میں اس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن جس دن یہ اس میں داخل کرنے کے لیے لے جائے جائیں گے تو ذلت سے اپنے سر نہوڑائے ہوئے

کن انکھیوں سے اس کو دیکھ رہے ہوں گے۔ کوئی مجرم جب تقتل کی طرف لے جایا جاتا ہے تو اس کے اندر مقتل اور جلاد کی تلوار کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا لیکن وہ کن انکھیوں سے دیکھتا ہے کہ کیا پیش آنے والا ہے۔

حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے

'وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ..... الآیۃ' فرمایا کہ وہاں ان کی ذلت و خواری اور تباہی کو دیکھ کر اہل ایمان پکار اٹھیں گے کہ بے شک حقیقی نامراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا اور ساتھ ہی اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو بھی اپنے دباؤ یا بدآموزی سے برگشتہ کر کے اس خسارے میں مبتلا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ناعاقبت اندیش لوگ تو اپنی کامیاب دنیوی زندگی کے غرّے میں ہم کو دنیا میں خسارے میں سمجھتے رہے لیکن وہ کوئی خسارہ نہیں تھا۔ حقیقی خسارہ یہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے جس میں یہ بدقسمت لوگ مبتلا ہوئے ہیں۔

'اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں حقیقی خسارہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے۔ فرمایا کہ آگاہ ہو کر سن لو! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ ایک ابدی عذاب میں گرفتار ہوں گے جو کسی طرح ٹالا نہ جا سکے گا ——— مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو دکھ ہو یا سکھ بہرحال وہ عارضی ہے لیکن آخرت کا عذاب ابدی ہے اس وجہ سے حقیقی خسارہ ان لوگوں کا خسارہ ہے جو آخرت کے خسارہ سے دوچار ہوئے۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۶)

'مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ' یہاں 'اللہ کے مقابل میں' کے مفہوم میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب یہ لوگ اللہ کے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے تو اپنے جن شرکاء اور حمایتیوں پر ان کو بڑا ناز ہے ان میں سے کوئی بھی اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آسکے گا۔

'وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ سَبِیْلٍ' وہی مضمون جو اوپر آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے، الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ، پھر آگیا ہے کہ، ان کی شامتِ اعمال کے سبب سے، اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا اور جن کو اللہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے ان کو کہیں بھی راہ نہیں ملتی، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ (۴۷)

'مِنَ اللّٰہِ'، کا تعلق میرے نزدیک 'اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ' سے ہے اور 'لَا مَرَدَّ لَہٗ'، 'یَوْمٌ' کی صفت ہے۔

دعوت بطور زجر و تنبیہ

یہ دعوت بطور زجر و تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اب بھی وقت باقی ہے کہ اپنے رب کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ ورنہ یاد رکھو کہ جب تمہارے رب کی طرف سے وہ دن آ جائے گا جو اٹل ہے تو اس وقت تمہارا اس کو قبول کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہو گا۔ اس دن نہ تمہارے لیے کوئی پناہ ہو گی اور نہ اس دن تم کسی چیز کو رد کر سکو گے۔ جو کچھ تمہارا سامنے آئے گا بے چون وچرا اس کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا۔ 'نَكِيْرٍ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'انکار' کیا ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم کسی ناگوار چیز کو احساسِ غیرت کے ساتھ رد یا دفع کرنا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنسَانَ كَفُورٌ (۴۸)

یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اگر یہ لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں تو فبہا، نہیں قبول کرتے تو تم ان کی مطلق پروا نہ کرو۔ ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں مامور کیا ہے کہ تم لازماً ان کو یہ دعوت قبول ہی کرا دو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف دعوت لوگوں تک پہنچا دینے کی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون پیچھے آیت ۶ میں بھی گزر چکا ہے۔

اصل سبب اعراض کی طرف اشارہ

'وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ ...... الآیۃ' یہ ان لوگوں کے سبب اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ تنگ ظرف اور ناشکرے لوگ ہیں۔ اس طرح کے انسانوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب ہم ان کو اپنی رحمت و نعمت سے نوازتے ہیں تو یہ ہمارے شکر گزار ہونے کے بجائے اتراتے اور اکڑتے ہیں اور اگر ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو ذرا کوئی اُفتاد پیش آ جائے تو مایوس بے صبر اور ناشکرے بن جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ یہ کبھی صحیح راہ اختیار کریں گے۔ آج نعمت و رفاہیت حاصل ہے تو اس کا غرور ان کے لیے حجاب بن گیا ہے اور اگر ذرا ہم ان کو اس عذاب کا مزہ چکھا دیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو مایوس ہو جائیں گے۔

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ﴿﴾ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ۖ وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيمًا ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (۴۹ - ۵۰)

تنگ ظرفی کا باعث صحیح عقیدے سے محرومی ہے

یہ اس عقیدے کا بیان ہے جس سے محروم ہونے کے باعث ان لوگوں کے اندر یہ تنگ ظرفی اور ناشکری پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو کچھ چاہتا ہے بخشتا ہے

تو اس حالت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ نعمت پر اپنے رب کے شکر گزار ہوتے اور کوئی مصیبت پیش آتی تو اس پر صبر کرتے۔

'یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ' کے بعد 'یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنٰثًا .... الآیۃ' عام کے بعد خاص کا ذکر ہے کہ یہ خدا ہی ہے جو جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہی دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے بے اولاد ہی رکھتا ہے۔ وہی علم اور قدرت رکھنے والا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اپنے علم و قدرت کے مطابق کرتا ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے بندوں کا فرض یہ ہے کہ تمام معاملات میں خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔ نہ کبھی مغرور ہوں، نہ کبھی مایوس اور نہ کبھی اس کے سوا کسی اور سے لو لگائیں۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ___ آیات: ۵۱-۵۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور یہ خاتمہ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ پوری سورہ سے بحیثیت مجموعی بھی تعلق رکھتا ہے اور اوپر کے پیرے سے بھی اس کا نہایت واضح ربط ہے۔ قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہم کرتے آرہے ہیں کہ سورہ جس مضمون سے شروع ہوتی ہے بالعموم اسی مضمون کے کسی پہلو کی وضاحت پر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی دیکھ لیجیے، اس کا آغاز 'كَذٰلِكَ یُوْحِیْٓ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ .... الآیۃ' سے ہوا تھا۔ یعنی یہ قرآن اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی اس سے پہلے اللہ تعالیٰ دوسرے نبیوں اور رسولوں پر نازل فرما چکا ہے۔ پھر مقصداً اور ذریعۂ دونوں کی یکسانی کی وضاحت فرمائی اور خاتمہ اس مضمون پر کیا جس سے آغاز فرمایا تھا۔ چنانچہ خاتمہ میں بھی تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمہید میں آئے ہیں۔ فرمایا ہے 'وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا .... الآیۃ' یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ پوری سورہ از اوّل تا آخر ایک وحدت ہے۔

اوپر کے پیرے سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اس کا خاتمہ مخالفین کے سبب اعراض کے بیان پر ہوا ہے۔ ان کے اعراض کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ کہتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ ان پر اپنا کلام نازل کرتا ہے تو آخر وہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا؟ ان کے اس اعتراض کا جواب ان آیات میں دیا اور آیات کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ جواب نہایت جامع و مانع اور مسکت ہے ___ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۳

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

ع ۵/۱۰

ترجمۂ آیات ۵۱-۵۳

اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ بڑا ہی عالی مقام، بڑا ہی حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔ اس اللہ کے راستہ کی طرف جس کا ہی وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ آگاہ! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ

وَرَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (۵۱)

آنحضرت صلعم کے مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب

یہ جواب ہے مخالفین کے اس اعتراض یا مطالبہ کا جو قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے نقل ہوا ہے کہ 'لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰهُ' اگر اللہ ان سے (پیغمبرؐ سے) بات کرتا ہے، جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں، تو آخر وہ ہم سے رُو در رُو ہو کر بات کیوں نہیں کرتا ؟ آخر ان کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ان کو تو وہ اپنے شرفِ خطاب سے نوازتا ہے اور ہم کو لائقِ التفات نہیں سمجھتا حالانکہ ہم عزت و وجاہت میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں!

اس کے جواب میں فرمایا کہ کسی انسان کا یہ درجہ و مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُو در رُو ہو کر بات کرے۔ وہ بات کرتا ہے تو وحی کے ذریعہ سے بات کرتا ہے، یا پردے کی آڑ سے بات کرتا ہے یا اپنا کوئی قاصد یعنی فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اس کے اذن سے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے کسی بندے کی طرف، جس کو وہ اپنے خطاب و کلام کے لیے منتخب فرماتا ہے، وحی کر دیتا ہے۔

'وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا سے بالمشافہ کلام میں جو چیز مانع ہے وہ درحقیقت انسان کا اپنا ضُعف اور اس کی اپنی نااہلیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی مقام، ایسی باعظمت، اور ایسے انوار و تجلّیات کا مظہر ہے کہ کوئی بشر اس سے رُو در رُو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت قرآن میں مذکور ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تو ان کو جواب ملا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجلّی کی تاب پہاڑ بھی نہیں لا سکتے تو تم اس کا تحمّل کس طرح کر سکو گے۔

'اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اگر کسی سے خطاب کرتا ہے تو تین طریقوں سے خطاب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مختلف شکلیں

ایک طریقہ 'وحی' کا ہے۔ 'وحی' سے مراد دل میں بات ڈال دینے کے ہیں۔ اسی کو احادیث میں 'القاء فی الروع' یا 'نفث فی الروع' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القاء فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ چیز مجرد فکر یا خیال کی شکل میں نہیں بلکہ کلام کی شکل میں نازل ہوتی ہے جس کو نبی سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے اور اس کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے۔

'اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ' دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کی اوٹ سے بات کرتا ہے۔ یعنی نبی اللہ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھتا نہیں۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام و خطاب ہے۔ تورات اور قرآن دونوں میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کی لیکن اس کو دیکھا نہیں اور قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی نبی سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل ہوا۔

'اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ' تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی رسول یعنی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے پیغمبر کے دل پر القاء کر دیتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ	کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے وہ اس بات کو یاد
فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ	رکھے کہ جبریل نے اس قرآن کو تمہارے دل پر اللہ کے
بِاِذْنِ اللّٰہِ (۹۷)	حکم سے اتارا ہے۔

یہی بات سورۂ نحل میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ	کہہ دو اس قرآن کو روح القدس نے تیرے رب کی
رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (النحل: ۱۰۲)	طرف سے اتارا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب کے تین طریقے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے، جو اوپر مذکور ہوئے، اس اعتبار سے ایک مخصوص نوعیت کے حامل ہیں کہ ان میں کلام بلا واسطہ نبی پر نازل ہوتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اور نبی کے درمیان جبریل امینؑ کا واسطہ نہیں ہوتا اور تیسرے میں جبریل امینؑ واسطہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے ـــــ پہلا اور تیسرا ـــــ معروف طریقے ہیں۔ دوسرا طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخصوصات میں سے ہے۔ کسی اور نبی کے متعلق، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز مذکور نہیں ہے۔ اگر الاقدم فالاقدم کے اصول کو سامنے رکھیے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ پہلے طریقہ کو مرتبہ کے لحاظ سے اوّلیت حاصل ہے۔

یہاں صرف تین طریقے مذکور ہوئے ہیں اس لیے کہ جس سوال کو پیش نظر رکھ کر یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کا جواب انہی تین صورتوں کے ذکر کا مقتضی تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین طریقوں کے علاوہ دو اور طریقے بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنے بعض ارادوں سے آگاہ فرماتا ہے۔

ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ بشری شکل میں متمثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ

کا پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے ان واقعات میں موجود ہے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوئے ہیں۔

دوسرا طریقہ رؤیا کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہوتا ہے وہ رؤیا میں امر فرما دیتا یا مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم رؤیا میں ہوا۔ غزوۂ بدر سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے واقعات رؤیا میں مشاہدہ کرائے گئے۔ ایک نہایت اہم رؤیا کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب اور ایما و اشارہ کے پانچ طریقے ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست کلام کے سوا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخصوصات میں سے ہے، ان میں سے ہر طریقہ سے مشرف ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی یہ شرف صرف ایک آدھ بار ہی حاصل ہوا باقی تورات اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی دوسرے صحیفے ہیں۔

'اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ' یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک اس کی عظمت، رفعت اور بالا تری کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری اس کی حکمت اور اس حکمت کے لوازم ——— رحمت، عدل اور ہدایتِ خلق ——— کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی بلند و بالا ہے کہ نہ اس کو کسی سے کلام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ درجہ و مرتبہ رکھتا ہے کہ اس سے ہم کلام ہو سکے لیکن اس عظمت و رفعت کے ساتھ وہ حکیم، عادل اور رحیم بھی ہے اس وجہ سے وہ خلق کی رہنمائی اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ان کو اپنے خطاب و کلام سے بھی نوازتا ہے اور اس کے لیے اس نے وہ طریقے اختیار فرمائے جو اوپر مذکور ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خدا ان میں سے ہر ایک سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو اس قسم کے لوگ نہ خدا کی عظمت سے آگاہ ہیں، نہ اپنی بے حقیقتی سے!! ایسے احمق لوگ اپنی اس رعونت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۵۲-۵۳)

وحی کی تعبیر روح سے

یہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اسی معروف طریقۂ وحی کے مطابق ہم نے تمہاری طرف بھی ایک رُوح اتاری ہے۔ 'رُوح' سے مراد وحی ہے۔ 'وحی کو روح' سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ تمہارے لیے بھی حقیقی زندگی کا ذریعہ ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کو

اپنا لیں۔ تمام آسمانی صحیفوں میں اللہ کے کلام و الہام کے لیے یہ تعبیر موجود ہے اس لیے کہ بندوں کو حقیقی زندگی، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے، روٹی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِّنْ اَمْرِنَا' اس روح کی صفت کے طور پر، دفع دخل مقدر کے لیے آیا ہے۔ یعنی روح اللہ تعالیٰ کے امور غیب میں سے ہے۔ اس کی حقیقت و ماہیت اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ رسول جانتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت و کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے نہ تو ہر شخص کو اس کی کیفیت معلوم کرنے کے درپے ہونا چاہیے اور نہ اس بنیاد پر کسی عاقل کو اس کا انکار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اندر اس قسم کی کوئی چیز محسوس نہیں کرتا۔ جو شخص دردِ جگر کی لذت سے آشنا نہیں ہے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دردِ جگر کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (بنی اسرآئیل : ۸۵)	اور یہ لوگ تم سے روح (وحی) کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان کو بتا دو کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔

یہ چیز یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنی قوموں کے سامنے اس امر کا اظہار فرمایا کہ ان کے اوپر ان کے رب کی جانب سے ایک روح نازل ہوتی ہے تو نادانوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ یہ روح کیا چیز ہے؟ آخر اس طرح کی کوئی چیز ہم اپنے اندر کیوں نہیں محسوس کرتے؟ اسی سوال کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے اور اسی جواب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'رُوْحًا' کے ساتھ 'مِّنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو تو اس کو اثنائے کلام ہی میں جواب مل جائے۔

اس 'امر' کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس پر ان شاء اللہ ہم سورۂ دخان کی آیات ۴ - ۵ کے تحت اور سورۂ قدر میں بحث کریں گے۔

'مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا' - یہ اس روح کا فیضان بیان ہوا ہے کہ یہ اسی کی حیات بخشی ہے کہ تم پہلے کتاب و ایمان سے ناآشنا تھے، لیکن اس وحی کے نور سے اللہ نے تمہارے سینہ کو اس طرح جگمگا دیا کہ تم اس خلق کے اندر ایک چلتے پھرتے منارۂ نور بن گئے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس نور سے راہ یاب کر رہا ہے۔ 'جن کو چاہتا ہے'، یعنی جن کے اندر اس نور سے اکتساب کی صلاحیت پاتا ہے۔ اللہ ان کو اس سے بہرہ ور فرماتا ہے اس لیے کہ اللہ کا ہر چاہنا

اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جس طرح منصبِ نبوت کا اہل ہر شخص نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہی کو منتخب فرماتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں اسی طرح اس نور کے حامل بھی وہی ہوتے ہیں جن کے اندر اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گویا اس میں ان لوگوں کا جواب بھی ہے جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) ہمارے اندر سے نبوّت اور اپنے کلام و خطاب کے لیے کیوں منتخب فرمایا، ہمارے اوپر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی ہے کہ تم جو روشنی دکھا رہے ہو اس سے ہر شخص بہرہ یاب نہیں ہو سکتا، اس سے بہرہ یاب وہی ہوں گے جو اس کے اہل ٹھہریں گے، جو اس کے اہل نہیں ہیں ان کو یہ روشنی راہ دکھانے کے بجائے خیرہ کر کے چھوڑ دے گی۔

کتاب اور ایمان میں نسبت قالب اور روح کی ہے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کتاب اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو نسبت قالب اور روح میں ہے۔ کتاب، تمام تر ایمان کا مظہر اور بروز ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب درحقیقت ایمان کے مقتضیات کا بیان ہے اس وجہ سے دونوں میں جسم و جان کا رابطہ ہے۔ جہاں تک کتاب، کا تعلق ہے اس سے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ناآشنا تھے اس لیے کہ آپ امّی تھے لیکن ایمان سے ناآشنائی کی جو نفی کی گئی ہے یہ اس کی تفصیلات اور مقتضیات کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آپ ایمان کے تمام لوازم و مقتضیات سے ناآشنا تھے ورنہ حضرات انبیاء علیہم السلام تو وحی سے پہلے بھی اپنی فطرتِ سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس وجہ سے اجمالی ایمان ان کے اندر موجود ہوتا ہے جو وحی کی روشنی سے جگمگا کر آفتاب کی طرح ایک عالم کو منوّر کر دیتا ہے۔ فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی میں نسبت چونکہ ذرّہ اور آفتاب کی ہے اس وجہ سے اس کے مقابل میں اس کی نفی کی گئی ہے لیکن ہے وہ اسی آفتابِ تاباں کا ایک ذرّہ اور وہی لوگ نورِ نبوّت سے اکتساب بھی کرتے ہیں جو اس ذرّہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیتے ہیں وہ نبی کے انوار سے محروم ہی رہتے ہیں۔

استاذ امامؒ یہاں ایمان سے حکمت مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان، قول عمل اور حال تینوں کا مجموعہ ہے اور یہی حقیقت حکمت کی بھی ہے اس وجہ سے یہ جو فرمایا کہ تم کتاب اور ایمان سے ناآشنا تھے تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ تم کتاب اور حکمت سے ناآشنا تھے۔ گویا ایمان کے لفظ سے یہاں حکمت کی تفسیر فرما دی گئی۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ..... الآیۃ۔ یہ اس نور کی برکت خلق کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نور سے تم کو جو فیض یاب کیا تو تم جو ایک امّی تھے اب

لوگوں کی رہنمائی اس اللہ کی سیدھی راہ کی طرف کر رہے ہو جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ لوگوں کو اگر عاقبت کی فلاح مطلوب ہے تو چاہیے کہ تمھاری رہنمائی کی قدر کریں۔

'اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ'۔ یہ آخر میں لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جس خدا کا سب کچھ ہے اسی کی طرف سارے معاملات لوٹیں گے بھی۔ اس وجہ سے اس کے آگے پیشی اور جواب دہی کے لیے تیار رہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

رحمان آباد

۱۲ - دسمبر ۱۹۷۵ء

۸ - ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ

تدبرِ قرآن

۴۳

الزّخرف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ، سابق سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ گروپ کی دوسری سورتوں کی طرح اس کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے اور اس توحید ہی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس میں قیامت کا بھی ذکر ہوا ہے۔ خاص طور پر ملائکہ کی الوہیت اور ان کی شفاعت کے تصوّر کا ابطال اس میں تفصیل سے ہے اور قریش کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ وہ جس دینِ شرک کے پیرو ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔

سابق سورہ میں قرآن کی عظمت ایک خاص پہلو سے نمایاں کی گئی تھی اس میں اس کے بعض دوسرے پہلو نمایاں کر کے قریش کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر محض دولتِ دنیا کے غرور میں تم نے اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی تو یاد رکھو کہ پیغمبر کے اوپر ذمہ داری صرف اس حق کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس کی تکذیب کے نتائج کی ذمہ داری خود تمھارے اوپر ہوگی۔

قرآن پر نفسِ وحی کے پہلو سے مخالفین کے جو اعتراضات تھے اور جن کو وہ اس کی تکذیب کا بہانہ بنا رہے تھے ان کے جواب پچھلی سورہ میں دیے گئے ہیں، اس سورہ میں انبیائے سابقین کی دعوت کے ساتھ اس کی ہم آہنگی واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دینِ توحید کی دعوت یہ قرآن دے رہا ہے اسی کی دعوت تمام انبیاء نے دی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنے لیے اسی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۸) قرآن کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے قومِ عرب پر جو احسان فرمایا اور اس کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت کا جو سامان کیا اس کا حوالہ اور اس بات کی یاد دہانی کہ اگر انھوں نے بھی اپنے رسول کی تکذیب کی وہی روش اختیار کی جو ان سے پہلے کی قوموں نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ دوچار ہوئیں اور یاد رکھیں کہ قوّت و شوکت کے اعتبار سے وہ ان سے کہیں

بڑھ چڑھ کر ہیں۔

(۹ - ۱۵) مخالفین کے اس اعتراف کا حوالہ کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود انھوں نے خدا کے بندوں میں سے اس کے شریک بنا رکھے ہیں حالانکہ اس کائنات میں قدرت، ربوبیت اور حکمت کے جو آثار و شواہد ہر قدم پر موجود ہیں وہ خدا کی توحید اور قیامت پر گواہ ہیں۔

(۱۶ - ۲۵) ملائکہ کی الوہیت کے تصوّر کا ابطال دو مختلف پہلوؤں سے۔

ایک اس پہلو سے کہ یہ لوگ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں مانتے ہیں درآنحالیکہ خود اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ ایک چیز کو اپنے لیے پسند نہ کرنا اور اس کو خدا کی طرف منسوب کرنا صریح حماقت اور ربّ عزیز و جلیل کی اہانت ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ ملائکہ کو شریک خدا قرار دینے کی واحد دلیل ان کے پاس یہ ہے کہ ان کے باپ دادا ان کو شریک خدا مانتے رہے ہیں۔ حالانکہ کسی طریقہ کی صحت و صداقت کی یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ طریقہ ان کو اپنے باپ دادا سے ملا ہے۔ یا تو وہ اللہ کی کسی کتاب کی سند پیش کریں یا عقل و فطرت سے کوئی دلیل لائیں ورنہ اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جنھوں نے اس قسم کے لاطائل بہانوں کی آڑ لے کر اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۲۶ - ۲۸) تاریخ کی روشنی میں مشرکین کے اس دعوے کی تردید کہ یہ دینِ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے۔ ان کے اصل جدّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو) کا یادگار کلمہ کہہ کر اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکّہ میں بسایا۔ ان کا یہ اعلانِ ہجرت ایک مقدّس روایت کی حیثیت سے ان کی ذرّیت میں باقی رہا تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ یہ شرک ان کے باپ دادا کی وراثت ہے!

(۲۹ - ۴۵) مکذبین کی سرکشی کے اصل سبب کا بیان کہ یہ اپنی جہالت کے حق میں جو دلیلیں گھڑنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ محض سخن سازی ہے۔ اصل چیز جو ان کے لیے فتنہ بنی ہوئی ہے وہ ان کی دنیوی رفاہیت ہے حالانکہ خدا کی میزان میں اس رفاہیت کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور یہ اس سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ شیطان نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے اور یہ پٹی ان کی اس وقت کھلے گی جب اس کا کھلنا اور نہ کھلنا دونوں ہی بے سود ہو گا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ ہم ان کا انجام یا تو تمھاری زندگی ہی میں دکھا دیں گے یا تمھارے بعد یہ اس سے دوچار ہوں گے۔ تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو وہ دینِ حق ہی ہے، تمام انبیاء کی شہادت اسی کے حق میں ہے۔

(۴۶ - ۶۵) حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں — حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ —

کی دعوت کا حوالہ کہ انھوں نے بھی بعینہٖ اسی دینِ توحید کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی رسالت کے حق میں، فرعون اور اس کے اعیان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھائیں لیکن وہ کسی نشانی سے بھی قائل نہ ہوئے۔ ان کی تکذیب کا سبب بعینہٖ یہی تھا جو قریش کے ان فراعنہ کی تکذیب کا ہے۔ بالآخر وہ کیفرِ کردار کو پہنچے، وہی انجام ان لوگوں کا بھی ہونا ہے۔

اسی توحید کی دعوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دی۔ ان کا نام سنتے ہی قریش کے جھگڑالو تم سے مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان سے بہتر تو ہمارے ہی معبود ہیں گویا ان جاہلوں کے نزدیک قرآن ان کا ذکرِ خیر اس لیے کر رہا ہے کہ لوگ نصاریٰ کی طرح ان کو ابن اللہ مانیں حالانکہ قرآن ان کو ابن اللہ کی حیثیت سے نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ ان کی دعوت اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور وہی تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو) کی دعوت تھی۔ ان کی اس دعوتِ حق میں اختلافات تو بعد والوں نے پیدا کیے ہیں اور وہ عنقریب اس کا انجام دیکھیں گے۔

(۶۶ - ۸۹) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس دعوتِ حق پر ایمان لائیں گے۔ پھر ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اس کی تکذیب کریں گے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان ضدی لوگوں سے اعراض کرو۔ یہ خود اپنا انجام دیکھ لیں گے اور جن ہستیوں کی جس شفاعت کے بل پر یہ اکڑ رہے ہیں اس کی حقیقت ان کے سامنے آجائے گی۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ عمود کے ساتھ اس کے ہر جزو کا کیسا گہرا تعلق اور شروع سے لے کر آخر تک یہ پوری سورہ کس طرح مربوط ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں وبیدہ التوفیق۔

سُورَةُ الزُّخْرُفِ (۴۳)

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۸۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱ - ۲۵

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴿۵﴾ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۷﴾ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۹﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ

سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا
لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ ع ۱/۵
بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ
وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ
هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ
شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ
مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ
اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ
قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ
نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا
عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا
وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۲/۱۰/۸

ترجمۂ آیات ۱-۲۵

یہ ختم ہے۔ شاہد ہے یہ واضح کتاب۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا

ہے تاکہ تم سمجھو۔ اور بے شک یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے نہایت بلند اور پُر حکمت۔ ۱-۴

کیا ہم تمھاری تذکیر سے اس لیے صرفِ نظر کر لیں کہ تم حدود سے تجاوز کر جانے والے لوگ ہو! اور ہم نے اگلوں میں کتنے ہی نبی بھیجے اور جو نبی بھی ان کے پاس آتا تو وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے۔ تو ہم نے ان سے زیادہ زور آوروں کو ہلاک کر چھوڑا اور اگلوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ۵-۸

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔ ۹

جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمھارے لیے راستے رکھے کہ تم راہ پاؤ۔ اور جس نے آسمان سے پانی اتارا ایک اندازہ کے ساتھ۔ پس ہم نے اس سے حیاتِ تازہ بخش دی ایک مردہ زمین کو۔ اسی طرح تم بھی قبروں سے نکالے جاؤ گے! اور جس نے تمام گوناگوں قسم کی چیزیں پیدا کیں اور تمھارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو پھر تم اپنے رب کی نعمت کو، جب کہ تم ان پر بیٹھو، یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہماری خدمت میں لگا دیا اور ہم تو ان کو قابو میں کر لینے والے نہیں تھے! اور بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں! ۱۰-۱۴

اور ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے اس کا ایک جزء ٹھہرایا۔ بے شک انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے! کیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے اپنے لیے بیٹیاں

پسند کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا! اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی بشارت دی جاتی ہے جس کو وہ خدا کی صفت بیان کرتا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے کہ کیا وہ پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مفاخرت میں بے زبان ہے! ۱۵-۱۸

اور انھوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمان کے بندے ہیں، بیٹیوں کا درجہ دے رکھا ہے۔ کیا یہ ان کی ولادت کے وقت موجود تھے! ان کی یہ گواہی نوٹ رہے گی اور ان سے اس کی پرسش ہوگی! ۱۹

اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کو پوجنے والے نہ بنتے۔ ان کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی سند پکڑتے ہیں! بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے نقشِ قدم پر راہ یاب ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا، کیا اگر میں اس سے زیادہ ہدایت بخش طریقہ لے کر تمھارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے! انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو! تو ہم نے ان سے انتقام لیا تو دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا! ۲۰-۲۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

پہلی سورتوں کی طرح اس کا قرآنی نام بھی 'حٰمٓ' ہی ہے۔ سورتوں کے ناموں کا اشتراک' ہم اشارہ کر چکے ہیں، ان کے مطالب کے اشتراک پر دلیل ہے۔ چنانچہ تمام 'حَوامِیم' جو آپ پڑھتے آرہے ہیں، ایک ہی قدرِ مشترک کی حامل ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو اسلوبِ بیان، نہجِ استدلال اور اجمال و تفصیل کا ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

قرآن اپنے ہر دعوے پر خود حجت ہے

یہ قرآن کی قسم کھائی ہے اور اس کی صفت یہاں 'مُبِیْن' وارد ہوئی ہے جس کے معنی ہیں واضح کر دینے والی کتاب، یعنی اپنے ہر دعوے پر یہ خود حجت ہے، کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کے لیے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں وہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ خود اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

یہاں مُقسم علیہ محذوف ہے۔ جہاں قرینہ بالکل واضح اور قسم خود مقسم علیہ کو واضح کر رہی ہو، وہاں مقسم علیہ کو حذف کر دیتے ہیں اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ 'قٓ' میں بھی اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ یہاں لفظ 'مُبِیْن' نے خود مُقسم علیہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے اس وجہ سے اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گویا آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳)

قرآن کے مبین ہونے کا ایک خاص پہلو

یہ قرآن کے 'مُبِیْن' ہونے کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن کی صورت میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔ یہ مضمون اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں بھی مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا عربی میں اتارا جانا اہلِ عرب پر ایک عظیم احسان بھی تھا اور ایک فیصلہ کن اتمامِ حجت بھی۔ احسان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ خدا نے اپنی آخری اور کامل ہدایت ان کی زبان میں اتاری کہ وہ بلا واسطۂ غیر اس سے کسبِ فیض کر سکیں، دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کا اتھیں رہینِ احسان نہ ہونا پڑے بلکہ دوسرے ان کے ممنونِ احسان بنیں۔ اتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے ان کی اپنی زبان میں اپنی ہدایت نازل کر کے ان کا ہر عذر ختم کر دیا ہے اب وہ عند اللہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ مخاطب عربی اور کلام عجمی!

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴)

قرآن کی عالی نسبی

اس قرآن کی عظمت واضح فرمائی کہ یہ کوئی ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے بلکہ نہایت ہی عالی نسب

اور عالی مقام چیز ہے۔ اس کی عالی نسبی کی وضاحت یوں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو اُمُّ الکتٰب یعنی لوحِ محفوظ ہے یہ اس میں ہے اور اسی میں سے یہ تمھاری ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کو جنّات کا القاء، کاہنوں کی کہانت، شاعروں کی شاعری اور خطیبوں کی لفّاظی گمان کر کے، اس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرے بلکہ یہ روشنی اس منبعِ نور سے نازل ہوئی ہے جس کے نور ہی سے آسمان و زمین میں روشنی ہے اور جو تمام علم کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ بد قسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس کی قدر نہ پہچانیں!

قرآن کی عالی مقامی

اس کی عالی مقامی کا اظہار یوں فرمایا کہ 'لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ' یہ قرآن بجائے خود نہایت برتر اور پر حکمت ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی سورہ میں بعینہٖ یہی صفت آیت ۵۱ میں اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہے اور وحی و قرآن کے بیان ہی کے سلسلہ میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر کلام متکلم کی صفات و خصوصیات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ 'عَلِیٌّ' و 'حکیم' ہے اس وجہ سے اس کا کلام بھی 'علیّ' و 'حکیم' ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جن کے اندر جوہر شناسی کی صلاحیّت ہو گی وہ اس کلام کی قدر کریں گے رہے بلید و بد ذوق لوگ تو نہ وہ اس کے اہل ہیں نہ وہ اس کی قدر کریں گے۔

اس کی عالی مقامی کے ذکر سے مخالفین کو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلا دی گئی کہ یہ آسمانوں اور زمین کے خالق کا اتارا ہوا کلام ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو تمھیں اپنے کو محروم کرو گے، خدا یا اس کے کلام کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ ان کی عظمت اور برتری اپنی ذاتی ہے جو دوسروں کے ردّ و قبول سے بالکل بے نیاز ہے۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (۵)

تمھاری ناقدری کے باوجود تم پر اتمامِ حجت ضروری ہے

یعنی ہر چند تم ہو تو ناشکرے اور ناقدرے کہ اس کلام بلند و برتر کی توہین و تکذیب کر رہے ہو اور شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر جو ظلم تم نے ڈھائے ہیں ان کی اصلاح پر تمھاری طبیعتیں آمادہ نہیں ہو رہی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ دیا جاتا یا اب چھوڑ دیا جائے، تمھاری بیماریوں اور ان کے مہلک نتائج سے تم کو اچھی طرح آگاہ نہ کیا جائے۔ تمھاری یہ حالت اغماض کے بجائے اس بات کی متقضی ہے کہ تمھارا علاج کیا جائے چنانچہ اللہ نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے اپنی کتاب اتاری۔ تم اس کی قدر کرو یا نہ کرو، لیکن یہ تذکیر اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تم پر اللہ کی حجت تمام نہ ہو جائے تاکہ جس کو زندگی کی راہ اختیار کرنی ہو وہ پوری بصیرت کے ساتھ زندگی کی راہ اختیار کر لے اور جس کو ہلاکت کی راہ پر جانا ہو وہ اتمامِ حجت کے بعد اس راہ پر جائے۔ تمھاری یہ تذکیر و تنبیہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے مطابق ہو رہی ہے۔ تم کتنی ہی نفرت و رعونت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دو لیکن اب یہ اپنے

آخری تاریخ تک پہنچ کے رہے گی۔

'صَفْحًا' میرے نزدیک مفعول لہٗ کے مفہوم میں ہے اور اس کے معنی چشم پوشی کے ہیں۔ ضرب عنہ الشئ کے معنی ہوں گے، اس سے اس چیز کو ہٹا دیا۔ 'اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ' ان کی اصل بیماری کا بیان ہے اور 'مسرفین' یہاں 'اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے، اور اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم کفر و شرک کی آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے ہو تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنا جامِ شفا ہٹائے رکھتا۔ دوا کے اصل مستحق تو مریض ہی ہوتے ہیں، خواہ وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ اگر اس کی قدر کروگے تو اپنا بھلا کروگے، اگر نہ کروگے تو اپنی ہی موت کو دعوت دوگے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ (۶-۸)

مذکورہ بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے

یہ اوپر کی بات کی تائید ماضی کی تاریخ سے پیش کی گئی ہے اور خطاب بغرضِ تسلی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ فرمایا کہ جو سلوک آج تمھارے مخالفین تمھارے ساتھ کر رہے ہیں یہی سلوک اس سے پہلے دوسرے نبیوں کے ساتھ ان کی قومیں کر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے بھی کتنے رسول اسی مقصدِ تذکیر و اصلاح کے لیے بھیجے لیکن ہر قوم نے اپنے رسول کا مذاق اڑایا اور اس کی نصیحتوں کی تحقیر کی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا اور وہ قومیں کچھ کمزور نہ تھیں بلکہ وہ اپنی قوت و شوکت میں ان سے (قریش سے) کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ کے عذاب نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ 'وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ' اور تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور ان قوموں کی طرف ہے جن کی تباہی کی تفصیلات پچھلی سورتوں میں بھی بیان ہو چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی آرہی ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۹)

مشرکین کے تضادِ فکر کی وضاحت

یہ قریش کے کفر و شرک اور ان کی اس ضد و مکابرت کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں 'اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ' کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ یہ بیان آگے دور تک جائے گا۔ فرمایا کہ یوں تو اپنے دینِ شرک کی حمایت میں تم سے لڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہیں جس کی طرف ان کا جوشِ مخالفت ان کو متوجہ ہونے نہیں دے رہا ہے۔ اگر تم ان سے سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو اس کا جواب لازماً وہ یہی دیں گے کہ ان کا خالق خدائے عزیز و علیم ہے لیکن دوسری طرف

ان کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا (اور انھوں نے اللہ کے بندوں میں سے اس کے شریک اور کفو و ہمسر بنا رکھے ہیں) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب جیسا کہ پچھلی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، آسمان و زمین اور دوسری تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی چہیتی اور اس کی ذات و صفات میں شریک ہیں اس وجہ سے ان کی عبادت خدا کے تقرب کا ذریعہ اور مال و اولاد کی فراوانی کا وسیلہ ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۰)

یہ آیت اور بعد کی تین آیات مشرکین کے جواب کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ جو شخص اس کائنات کی خلقت پر تدبر کی نگاہ ڈالے گا وہ اس میں خالق کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کے ایسے آثار پائے گا کہ لازماً وہ اس کی توحید کا بھی اقرار کرے گا اور ایک روزِ جزا و سزا کا بھی۔ مقصد اس تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ مشرکین کا یہ اعتراف کہ آسمان و زمین کا خالق خدائے عزیز و علیم ہی ہے، اگر اپنی صحیح سمت میں آگے بڑھے تو اس کے تضمنات یہ بھی ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ لیکن مشرکین پہلا قدم صحیح اٹھا کر پھر غلط سمت میں مڑ جاتے ہیں جس سے وہ اپنے مانے ہوئے عقیدہ کو باطل اور پائی ہوئی راہ کو گم کر دیتے ہیں۔

چار آیتیں بطور تضمین

فرمایا کہ وہی خدائے عزیز و علیم جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے (اور جس کا خالق ہونا تم کو بھی تسلیم ہے) اسی نے تمھاری بود و باش کے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا۔ اس گہوارہ بنانے کی مزید وضاحت قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح فرمائی ہے کہ اس نے اپنی عظیم قدرت و حکمت سے اس میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں کہ وہ تمھارے سمیت کسی طرف کو لڑھک نہ پڑے۔ پھر اس میں تمھارے لیے راستے رکھے ہیں یعنی زمین کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے پہاڑ گاڑے تو اس طرح نہیں کہ وہ ہر طرف سے تمھاری راہ روک کر کھڑے ہو جائیں بلکہ خشکی اور تری دونوں کے اندر ان پہاڑوں کے درمیان سے تمھارے لیے راستے بھی رکھے ہیں کہ تمھارے قافلے اور تمھارے جہازات ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کر سکیں۔

خدا کے خالق ہونے کے تضمنات

'لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ' کا ٹکڑا یہاں نہایت معنی خیز اور بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں پہاڑوں کی فلک بوس دیواروں کے درمیان تمھارے لیے جو راستے رکھے ہیں وہ اس لیے رکھے ہیں کہ تم ان ناقابلِ عبور دیواروں کے اندر محبوس و محصور ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان سے باہر نکلنے کے لیے بھی راہیں کھلی رہیں۔ دوسرا نہایت لطیف اشارہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ تم اپنے رب کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اپنے حال پر اس کی ان بے پایاں عنایات پر غور کرو اور اس نتیجہ

ایک معنی خیز ٹکڑا

تک پہنچو کہ جس پروردگار نے تمہارے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے وہی تمہاری شکر گزاری اور عبادت و اطاعت کا اصل سزاوار ہے اور اگر تم نے اس کے اس حق کو نہ پہچانا تو ایک دن لازماً ایسا آئے گا جس میں تم کو اس ناسپاسی کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کا کرشمۂ ربوبیت

اور اسی خدائے عزیز و علیم کا یہ کرشمۂ ربوبیت بھی ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا ایک خاص اندازے کے ساتھ۔ پانی کا ایک خاص اندازے کے ساتھ اترنا اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ یہ محض ابر و ہوا کے تصرف سے نہیں بلکہ ایک عزیز و علیم کی تقدیر سے اترتا ہے جو اپنی حکمت کے تحت صرف اتنا ہی پانی اتارتا ہے جس کا زمین تحمل کر سکتی ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی نکلی کہ آسمان و زمین دونوں کے اندر ایک ہی خدائے عزیز و علیم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ آسمان اور زمین میں ایسا توافق ہوتا کہ آسمان سے پانی اترتا اور زمین اس سے اپنی صلاحیتیں اجاگر کرتی۔ مزید برآں اس سے یہ بات بھی نکلی کہ وہ عزیز و علیم ہستی نہایت کریم و بندہ پرور ہے کہ ایک خاص اندازے کے ساتھ ہی پانی اتارتی ہے۔ اسی اندازے کے ساتھ زمین کی تمام برکتیں وابستہ ہیں۔ اگر اس میں کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ زمین پانی کی کمی سے بھی تباہ ہو سکتی ہے اور اس کی زیادتی سے بھی۔

بارش کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

'فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ'۔ یہ بارش کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو چونکہ اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت کو آشکارا کرنے والا ہے اس وجہ سے اس کا ذکر متکلم کے صیغے سے فرمایا جو اہتمام خاص پر دلیل ہے۔ فرمایا کہ دیکھتے ہو کہ اسی پانی سے ہم ایک مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں اور وہ لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح ایک دن تم بھی مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد اس زمین سے اٹھا کھڑے کیے جاؤ گے۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۙ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۱۲-۱۴)

بعض اور آثارِ قدرت کی طرف اشارہ

اسی خدائے عزیز و علیم کی پروردگاری کے بعض اور آثار کا ذکر کر کے ان کے مقتضیات کی طرف توجہ دلائی جن کا احساس ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے جو ان سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔

فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے دوسری نوع بنوع چیزیں پیدا کی ہیں۔ لفظ اَزْوَاج یہاں گوناگون اور نوع بنوع چیزوں کے مفہوم میں ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ قرآن مجید اور عربی ادب میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ 'مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ' کے الفاظ سے بھی قرآن میں یہی مفہوم ادا فرمایا گیا ہے۔ اشیاء اور انواع کی گوناگونی اور ان کا جوڑے جوڑے ہونا اس کائنات میں اسی لیے ہے کہ انسان کو اس کائنات کے خالق کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی یاددہانی ہوتی رہے۔ جوڑوں کے اندر جو توافق پایا جاتا ہے اس سے قرآن نے توحید پر جو دلیل قائم فرمائی ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ'۔ یہ عام کے بعد دو خاص چیزوں کا ذکر فرما دیا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے کشتیاں اور ایسے چوپائے پیدا کیے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں خشکی اور تری کی یہی سواریاں معروف تھیں اس وجہ سے انہی کا ذکر ہوا۔ اب سائنس کی برکت سے ان سواریوں کی فہرست گو بہت طویل ہو گئی ہے لیکن وہ سب انہی کے تحت ہیں اس لیے کہ جس سائنس کی مدد سے انسان ان کا موجد بنا ہے وہ خدا ہی کی ودیعت کردہ ہے۔

نعمتوں کا حق

'لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ...... الآیۃ'۔ یہ ان نعمتوں کا حق بیان ہو رہا ہے کہ خدا نے یہ سواریاں تمھیں اس لیے دی ہیں کہ تم ان سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کے بخشنے والے کا حق پہچانو اور جب تم ان کی پیٹھوں پر بیٹھو تو اپنے رب کے اس فضل کو یاد کرو کہ اس نے بغیر کسی استحقاق کے یہ نعمتیں تم کو بخشی ہیں اس وجہ سے تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر اپنے غرور کا مظاہرہ کرو بلکہ اس وقت تمھیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری مقصد برآری کے لیے ان کو ہمارے قابو میں کر دیا ہے ورنہ ہم تو ان کو قابو میں کرنے والے نہیں بن سکتے تھے۔

'لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ' میں لفظ 'ظُهُورٌ' اگرچہ کشتیوں کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے، اس کی واضح مناسبت گھوڑوں یا سواری کے دوسرے جانوروں ہی کے ساتھ ہے، لیکن یہاں یہ لفظ علیٰ سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ مقصود یہی کہنا ہے کہ کشتی پر سوار ہو یا گھوڑے پر اس وقت غرور سے اکڑنے کے بجائے اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرو لیکن خاص طور پر گھوڑوں کے ذکر کے ساتھ یہ تنبیہ اس لیے فرمائی کہ گھوڑے کا سوار عام پیدل چلنے والوں کے سامنے سے گزرتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر اپنے تفوّق کا احساس (خاص طور پر جب کہ وہ تنک ظرف بھی ہو) زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتا ہے یہاں تک کہ گھوڑے

کی طرح خود اس کی گردن بھی اکڑ جاتی ہے۔ یہی چیز اس زمانے میں موٹروں نے کہیں زیادہ بڑھا دی ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جو موٹریں بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھیں۔ ان کی رعونت ان کی ہر ادا سے نمایاں ہوتی ہے اور اس قدر بد نما طریقے سے نمایاں ہوتی ہے کہ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہی ہیں یا کوئی اور مخلوق!

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ۔ 'سُبْحٰنَ' اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کا کلمہ ہے یعنی وہ ہر قسم کے شرک اور ہر چھوٹے بڑے عیب سے پاک ہے۔ یہ تنزیہہ آدمی کے اندر خدا ہی کے لیے تفویض و تعلیم کا جذبہ ابھارتی ہے اور یہی جذبہ انسان کو غرور و استکبار اور طغیان و فساد سے بچاتا اور اس کے اندر شکر و سپاس کی نیاز مندی و فروتنی پیدا کرتا ہے۔

'اِقْرَانٌ' کے معنی اپنے حریف پر غلبہ پانے اور اس کو مطیع کر لینے کے ہیں۔ یعنی اس وقت انسان کو پوری نیاز مندی کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ اللہ ہی کی شان اور اسی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس مرکب کو ہمارا مطیع و فرماں بردار بنا دیا ہے ورنہ ہم تو اس کو قابو میں کر لینے والے نہیں بن سکتے تھے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اعتراف ایک حقیقتِ نفس الامری کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں جو چیزیں بھی ہماری خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر ہی سے لگی ہوئی ہیں۔ یہ تسخیر نہ ہو تو مجرد ہماری تدبیر کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی کمند نہیں ڈال سکتی۔ اونٹ جیسے بڑے جانور کی ناک میں آپ نکیل ڈال دیتے ہیں اور گھوڑے کے منہ میں لگام لگا دیتے ہیں۔ یہی کام اگر آپ جنگل کے درندوں کے ساتھ کرنا چاہیں تو ہزار خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی آپ شیر پر سواری نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی ہے کہ اس نے ہماری خدمت کے لیے مختلف قسم کے جانور پیدا کیے اور ہمیں یہ صلاحیت بخشی کہ ہم ان کو مسخر کر کے اپنے مختلف مقاصد میں استعمال کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بھاپ، بجلی اور ایٹم پر انسان کو جو تصرف حاصل ہوا ہے وہ بھی خدا ہی کی تسخیر سے حاصل ہوا ہے۔ ان فتوحات نے انسان کو بہت مغرور بنا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اب کون و مکان کا مالک سمجھنے لگا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو انسان کی قید سے آزاد کر کے رحمت کے بجائے عذاب بنا دے۔

یہاں جو دعا تلقین کی گئی ہے اس کا ظاہری تعلق تو اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی سواریوں ہی سے ہے لیکن یہی دعا اس زمانے کی دوسری ترقی یافتہ سواریوں کے لیے بھی موزوں ہے، مثلاً موٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ البتہ بحری سواریوں کے لیے موزوں تر دعا 'بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا' والی دعا ہے جو حضرت نوحؑ سے منقول ہے۔

ایک بلیغ فقرہ

وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ۔ اوپر جس طرح آیت ۱۰ میں لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ کے الفاظ نہایت معنی خیز گزرے ہیں اسی طرح یہاں یہ الفاظ بھی نہایت بلیغ، حقیقت افروز اور فلسفۂ دین کی ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ یعنی انسان کو کسی سواری پر بیٹھتے ہوئے صرف اتنی سی بات یاد نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم فلاں شہر سے فلاں شہر کو جانے والے ہیں بلکہ اس حقیقت کا بھی تذکر کرنا چاہیے کہ ایک دن ہمیں لازماً اپنے رب کی طرف لوٹنا اور اس کے آگے پیش ہونا ہے۔ اس تذکر کا محرک یہ ہے کہ ہر نعمت خدا کی پروردگاری کی شہادت ہے اور پروردگاری اس بات کو مستلزم ہے کہ پروردگار ایک دن سب کو جمع کر کے ان سے پرسش کرے کہ انھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر ان کو انعام دے جنھوں نے ان کو صحیح استعمال کیا ہو اور ان سے انتقام لے جنھوں نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا۔ یہ مسئولیت اور جزاء و سزا اس ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بے معنی اور یہ دنیا کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت سے دوسری اعلیٰ حقیقت کی طرف گریز کی ایک نہایت خوب صورت مثال ہے جس کے متعدد شواہد اس کتاب میں پیچھے گزر چکے ہیں۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ (۱۵)

مشرکین کے فکری تضادات پر تبصرہ

اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت ۹ (وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ ..... الآیۃ) سے ہے۔ وہاں اس کے بعد تضمین کی آیتیں آگئی تھیں اس وجہ سے ان تضادات پر کوئی تبصرہ نہیں ہوا تھا جو اعتراف کرنے والوں نے اپنے اندر جمع کر لیے تھے۔ اب یہ ان تضادات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ایک طرف تو ان لوگوں کا اقرار یہ ہے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، دوسری طرف انھوں نے خدا کے بندوں ہی سے کچھ کو خدا کا جزء یعنی شریکِ ذات بنا رکھا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا خالق ہے تو ہر چیز اسی کی مخلوق ہوئی، پھر کوئی چیز اس کا جزء کیسے ہو سکتی ہے! کسی چیز کے اس کا جزء ہونے کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ اس کی ذات کے اندر سے وجود میں آئی ہو اور پھر اس کا لازمی اقتضاء یہ بھی ہے کہ وہ اس کی کفو اور ہمسر بھی ہو۔ اس بات کے ماننے کے بعد خدا کی یکتائی اور بے ہمگی کہاں باقی رہی! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں میں کچھ تو وہ تھے جن کو وہ صرف خدا کی صفات یا اس کے حقوق میں شریک مانتے تھے اور کچھ ایسے تھے جن کو وہ اس کی ذات میں بھی شریک تصوّر کرتے تھے۔ مثلاً ملائکہ کے متعلق ان کا تصوّر یہ تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کی بڑی چہیتی ہیں، ان کی پرستش شفاعت اور نجات کا ذریعہ ہوگی۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعم کی تردید کی ہے کہ خدا کے سوا جو بھی ہیں سب اس کی

مخلوق ہیں، کسی چیز کو بھی اس کے جزو ہونے کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یہ انسان کا انتہائی ناشکراپن ہے کہ اس کو سب کچھ حاصل تو ہوتا ہے خدا سے لیکن وہ دوسروں کو دیوی دیوتا بنا کر ان کے گن گاتا اور ان کی پرستش کرتا ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کی زد اس عقیدہ وحدت الوجود پر بھی پڑتی ہے جس کے اصل موجد تو ہندو فلسفی ہیں لیکن ہمارے صوفیوں کے ایک گروہ نے اسلام میں بھی اس کو لا گھسایا ہے۔ اس عقیدے کے بموجب تمام کائنات اور اس کی ہر چیز خدا کے جزو کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ تو جب مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کا جزو بنانا شرک ٹھہرا تو ساری کائنات کو خدا کا جزو بنا دینا توحید کس طرح بن جائے گا۔

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُم بِالْبَنِينَ ۝ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ (۱۶-۱۷)

مشرکین کے عقیدے کا بھونڈا پن اخلاقی پہلو سے

'اَمْ' استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں جو قرار دیتے تھے، ان کے اس عقیدے پر ایک دوسرے پہلو سے نکیر فرمائی۔ اوپر والی آیت میں ان کے جزوِ خدا ہونے کی تردید تھی۔ اس آیت میں ایک نفسیاتی پہلو سے ان کے اس عقیدے کے بھونڈے پن کو واضح فرمایا کہ صرف یہی ستم نہیں ہے کہ خدا کی مخلوقات کو اس کا ایک جزو بنائے دے رہے ہیں بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بیٹیوں کو اپنے لیے تو ایک نہایت نفرت کی چیز سمجھتے ہیں لیکن خدا کی طرف ان کو منسوب کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ جب خدا ہی سب کچھ پیدا کرتا ہے تو اس نے اپنے لیے بیٹیاں کیوں پسند کیں جب کہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو غم سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ برابر گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس عقیدہ کے گھڑنے میں صرف یہی نہیں کہ عقل سے انھوں نے کوئی کام نہیں لیا بلکہ یہ اس احساسِ شرافت کی بھی بالکل نفی ہے جو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا تو کم از کم وہ اتنا انصاف تو کرتے کہ خدا کی طرف وہ چیز نہ منسوب کرتے جس سے وہ خود اس درجہ بیزار و نفور ہیں۔ یہ عقیدہ ایجاد کر کے انھوں نے صرف عقل ہی کی تذلیل نہیں کی ہے بلکہ احساسِ عدل سے اپنی بے مائگی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (۱۸)

عورتوں کے متعلق عربوں کا احساس

یہ ان کے اس احساس کی تعبیر ہے جو لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر ان کے دل میں پیدا ہوتا اور ان

کی گھٹن کا باعث ہوتا ہے۔ فرمایا کہ وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا وہ وجود میں آئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مفاخرت کے مقابلوں میں بالکل بے زبان ہے۔

لفظ 'خِصَام' یہاں مبارزت اور مفاخرت دونوں معنوں پر مشتمل ہے اور عرب جاہلیت ان دونوں ہی چیزوں کے رسیا تھے۔ ان کے ہاں آئے دن جنگیں بھی برپا ہوتی رہتیں اور مفاخرت کے مقابلے بھی ہوتے رہتے جن میں ہر قبیلہ کے خطیب اور شاعر اپنے اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے میں دادِ خطابت و شاعری دیتے۔ ظاہر ہے کہ عورت ان دونوں ہی میدانوں میں فروتر تھی، نہ وہ زرہ بکتر اور شمشیر و سناں کی مخلوق تھی اور نہ خطابت و شاعری کی، اس وجہ سے اہل عرب کی نگاہوں میں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی اور یہ بات کچھ اہل عرب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس زمانے میں بھی عورت کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ نمائش کی مجالس ہی میں ہوئی ہے۔ مبارزت اور مفاخرت کے اعتبار سے تو آج بھی وہ وہیں ہے جہاں عرب جاہلیت کے دور میں تھی۔ یہ امر یہاں اچھی طرح ملحوظ رہے کہ عورت پر یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان اہلِ عرب کی طرف سے ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ عام طور پر مفسرین نے یہ خیال کیا کہ یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یہ غلط فہمی لوگوں کو کلام کے سیاق پر نہ غور کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ (۱۹)

اس واہمہ کی تردید ایک اور پہلو سے

ان کے اس واہمہ پر ایک اور پہلو سے بھی ضرب لگائی۔ فرمایا کہ انھوں نے فرشتوں کو جو عورتیں بنا کر رکھ دیا ہے تو آخر ان کے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا تو یہ اس وقت موجود تھے! اس کے بعد نہایت سخت الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ ان کا یہ دعوےٰ نوٹ رہے گا اور ایک دن ان سے اس کی پرسش ہونی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ پوری بحث سورۂ صافات کی تفسیر میں بھی گزر چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ؕ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ؕ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۲)

اپنی حماقت کی تائید میں ان کی ایک شرعی دلیل اور اس کی تردید

اپنی اس حماقت کی تائید و تصویب میں مشرکین جو شرعی دلیل پیش کرتے یہ اس کا حوالہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان کو پوجنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کو ان کی عبادت پسند ہے،

اگر یہ چیز اس کو پسند نہ ہوتی تو اس کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا اور ہم ان کی عبادت نہ کر پاتے۔ جواب میں فرمایا کہ یہ محض ان کی اٹکل پچو باتیں ہیں۔ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے۔ خدا کی پسند یا ناپسند کے جاننے کا یہ ذریعہ نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی برائی کے کرنے کی ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر چور، ہر زانی، ہر بدمعاش اپنی چوری اور بدمعاشی کے جواز بلکہ استحسان کی تائید میں پیش کر سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اپنی مشیّت کے زور سے اس کو روک دیتا لیکن جب اس نے اس کو نہیں روکا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کی مرضی سے کیا اور ہمارا یہ فعل اس کو پسند ہے۔

'اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ'۔ فرمایا کہ خدا کی پسند اور ناپسند کے جاننے کا قابلِ وثوق ذریعہ اس کی کتابیں اور اس کے نبیوں کی تعلیمات ہیں تو کیا اس قرآن سے پہلے ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کو وہ سند میں پیش کر سکتے ہوں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو آخر وہ کس سند پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو خدا کی تائید حاصل ہے؟

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۲)

مشرکین کا روایتی دلیل اور اس کی تردید

اوپر مشرکین کی کلامی دلیل کی تردید فرمائی ہے۔ اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکینِ عرب کو بھی بالکل اسی طرح کا دھوکا پیش آیا جس طرح کا دھوکا ہمارے ہاں مجبرہ کو پیش آیا۔ اب یہ ان کی روایتی دلیل کا حوالہ ہے جس پر ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا اور چونکہ اس کی بنیاد تقلیدِ آبا پر ہے جس کا تعلق عقل کے بجائے مجرد جذبات سے ہے اس وجہ سے ہر دور کے اشرار نے اس ہتھیار سے فائدہ اٹھایا اور عوام کے جذبات بھڑکا کر مصلحین کی مساعیِ اصلاح کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے۔

'اُمَّةٌ' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، کسی قوم کے مجموعی طریقہ اور مسلک کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی اس حماقت کی تائید میں یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک صحیح مسلک اور ایک اعلیٰ طریقہ پر پایا ہے اور ہم چونکہ انہی کے مسلک پر ہیں اس وجہ سے بالکل ہدایت کی راہ پر ہیں۔ انہی کے نقشِ قدم کی پیروی ہماری ہدایت کی ضامن ہوگی۔ اگر ہم اس سے ذرا منحرف ہوئے تو ہم ہدایت کی راہ سے بھٹک جائیں گے اس وجہ سے جو لوگ ہمیں اس راہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہماری تباہی کے درپے ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ لفظ 'اُمَّۃٌ' کی تنکیر اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۳-۲۴)

ہر دور کے مکذبین کا طریقہ ایک ہی رہا ہے

فرمایا کہ یہ لوگ جس طرح اپنے دین کے معاملے میں اندھے مقلد ہیں اسی طرح اپنی دلیل میں بھی پچھلے انبیاء کے مکذبین کے مقلد ہیں۔ تم سے پہلے جو منذر بھی کسی بستی میں ہم نے بھیجا اس کے انذار اور اس کی دعوتِ اصلاح کا جواب قوم کے متکبرین نے یہی دیا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک خاص طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی پر جمے رہیں گے۔ رسول نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ اگر میں تمھارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر طریقہ تمھارے پاس لے کر آیا ہوں جب بھی تم اپنے باپ دادا کے طریقہ ہی پر جمے رہو گے! اس کے جواب میں انھوں نے جھلا کر کہا کہ ہم تو اس سارے ہی کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو!

'اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ' سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ جواب انھوں نے جھلا کر اور آپے سے باہر ہو کر دیا۔ اس لیے کہ جواب اصل سوال سے کئی قدم آگے ہے۔ رسول کا سوال تو صرف یہ تھا کہ اگر میرا طریقہ، جس کی میں دعوت دے رہا ہوں تمھارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر ہوا تو کیا اس صورت میں بھی تم اپنی اسی ہٹ پر قائم رہو گے۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ ہم تمھاری ہر بات کے منکر ہیں۔ یعنی مسئلہ 'اَهْدٰی' اور 'غیر اھدٰی' کے امتیاز کا نہیں ہے بلکہ ہم تمھاری کوئی بات کھڑے سننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کسی شے کے 'اھدٰی' اور 'غیر اھدٰی' میں امتیاز کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے بشرطیکہ انسان کے پاس گوشِ حقیقت نیوش ہو۔ وہ مغرور، ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہو۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵)

مطلب یہ ہے کہ جب قوموں کی ضد اور مکابرت اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے رسولوں کی بات سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا تب اللہ تعالیٰ نے ان سے کفرانِ نعمت کا انتقام لیا، پھر دیکھو کہ رسولوں کے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا!!

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۲۶-۵۰

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت اور شرک سے ان کے اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس سے مقصود

کی حقیقت کا اظہار ہے کہ قریش کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ جس دینِ شرک کی وہ پیروی کر رہے ہیں یہ ان کو ان کے آباء و اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے اصل جدِ امجد تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھوں نے شرک ہی کی بنا پر اپنی قوم کو چھوڑا اور ان کی اس ہجرت اور اعلانِ براءت کی آیت آج تک ان کی ذریت کی دونوں شاخوں میں موجود ہے۔ پھر قریش کس طرح یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے طریقہ پر چل رہے ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد قریش کی سرکشی کے اصل اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تم اپنی دعوتِ حق پر جمے رہو۔ انبیاء کا اصل راستہ یہی ہے جس کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ابھی تمھارے اور تمھارے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کر دے لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ ایک خاص حد تک وہ حق کے دشمنوں کو بھی مہلت دیتا ہے ــــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶ - ۵۰

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖۤ اِنَّنِىۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ فَاِنَّهٗ سَيَهۡدِيۡنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِىۡ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ بَلۡ مَتَّعۡتُ هٰٓؤُلَاۤءِ وَاٰبَآءَهُمۡ حَتّٰى جَآءَهُمُ الۡحَـقُّ وَرَسُوۡلٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَـقُّ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمۡ يَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ‌ ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَـتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا ؕ وَرَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَـعَلۡنَا لِمَنۡ يَّكۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُيُوۡتِهِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ

عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا
يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ
ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ
اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ
بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ
الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾
فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ
الَّذِىْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ
بِالَّذِىْٓ اُوْحِىَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ
لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ
اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

ترجمۂ آیات ۲۶-۴۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کو تم پوجتے ہو۔ میں صرف اسی کو پوجتا ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ پس بے شک وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔ اور اس کو اس نے ایک پائدار روایت

کی حیثیت سے چھوڑا اپنے اخلاف میں تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۲۶-۲۸

بلکہ یوں ہوا ہے کہ میں نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور ایک واضح کر دینے والا رسول آیا اور جب ان کے پاس حق آ گیا، انھوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔ ۲۹-۳۰

اور انھوں نے اعتراض اٹھایا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کے فضل کو یہی تقسیم کرتے ہیں! دنیا کی زندگی میں ان کی معیشت کا سامان تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ وہ باہم دگر ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۳۱-۳۲

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے جن پر وہ چڑھتے۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ اور ان کے تخت بھی چاندی کے جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے۔ اور یہ چیزیں سونے کی بھی کر دیتے۔ اور یہ چیزیں تو بس دنیا کی زندگی کی متاع ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔ ۳۳-۳۵

اور جو خدا کے ذکر سے اعراض کر لیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ ان کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ ہمارے پاس آئے گا تو

کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق کے دونوں کناروں کی دوری ہوتی! پس کیا ہی بُرا ساتھی ہو گا! اور جب کہ تم نے اپنے اوپر ظلم ڈھائے تو یہ چیز آج تم کو ذرا بھی نافع نہیں ہو گی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔ ۳۶-۳۹

پس کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اور ان کو جو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں! پس یا تو یہ ہو گا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ان سے بدلہ لیں گے یا تم کو دکھا دیں گے وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے سو ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ پس اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو جو تمھارے اوپر وحی کی گئی ہے۔ بے شک تم ایک سیدھی راہ پر ہو۔ اور یہ تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے یاددہانی ہے اور عنقریب تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ اور پوچھو ان سے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا دوسرے معبود ٹھہرائے جن کی عبادت کی جائے! ۴۰-۴۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۲۶)

حضرت ابراہیمؑ کے اعلانِ براءت کی یاددہانی

'بَرَآءٌ'، مصدر ہے جو صفت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مصدر جب صفت کے مفہوم میں استعمال ہو تو اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جیسے 'زید عدل' اس وجہ سے 'اِنَّنِيْ بَرَآءٌ' کے معنی ہوں گے 'میں تم سے یک قلم بری ہوں، میرے اور تمھارے درمیان اب کوئی رابطہ باقی نہیں رہا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جس کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے ہو چکا ہے اور مقصود اس حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قریش پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ اپنے شرک کی حمایت میں اپنے آباء و اجداد کا حوالہ جو دیتے ہیں تو آخر اپنے

اصل جدِّ امجد کو کیوں بھول جاتے ہیں جنھوں نے شرک سے بیزاری ہی کی بنا پر اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑا اور اپنی ذرّیت کو اس وادیِ غیرِ ذی زرع میں بسایا! مطلب یہ ہے کہ ان کو اگر اپنے اجداد کے دین پر ناز ہی ہے تو سب سے زیادہ مایۂ ناز تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کی برکت سے ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں ملیں تو آخر ان کو چھوڑ کر انھوں نے ان جاہلوں کی تقلید کیوں اختیار کی جنھوں نے ان کو اصل بزرگِ خاندان کے دین سے ہٹا کر شرک کے جوہڑ میں گرایا۔

یہ اعلان برارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ کے سامنے کیا، جیسا کہ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ کے الفاظ سے واضح ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ سوچیں تو ان کے جدّ امجد نے ان کے لیے روایت تقلیدِ آبا میں شرک پرستی کی نہیں بلکہ مبتلائے شرک باپ دادا سے بیزاری کی چھوڑی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (۲۷)

میرے نزدیک یہ استثنا مِمَّا تَعْبُدُوْنَ سے ہے۔ جس طرح مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے لیکن اس کے شریک ٹھہرا کر، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اس اعلان سے قوم پر یہ واضح فرمایا کہ اللہ کے سوا، دوسرے دیوی دیوتا جو تم نے بنا رکھے ہیں، وہ تو بالکل بے حقیقت ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں کرتا ہوں اور کروں گا اس لیے کہ وہ میرا خالق و فاطر ہے اس وجہ سے بندگی کا حق دار ہے۔

فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ کا تعلق ان کے اعلانِ براءت سے ہے یعنی میں اپنے باپ اور اپنی قوم کو چھوڑنے کا جو اعلان کر رہا ہوں تو یہ اعلان ہے تو نہایت کٹھن۔ میں اس کی مشکلات سے واقف ہوں لیکن اپنے جس رب کی خاطر میں یہ بازی کھیل رہا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ تمام مشکلات میں میری رہنمائی فرمائے گا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۸)

ضمیر منصوب کا مرجع وہی اعلانِ براءت و ہجرت ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ اس نوع کی ضمیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً سے مراد پائدار اور باقی رہنے والی روایت (TRADITION) ہے۔ اس اعلان براءت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے قول و عمل اور اپنی تعلیم و تذکیر سے اپنے اس اعلان براءت و ہجرت کو اپنی ذرّیت میں ایک مستحکم روایت کی حیثیت دے دی۔ اسلاف، اخلاف کو یہ روایت کی روایت اخلاف میں باقی رہی

منتقل کرتے اور اس کو زندہ رکھنے کی برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے۔ ذرّیّتِ ابراہیمؑ کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل میں اس کا چرچا ان کے صحیفوں اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے انبیاء کی تعلیم و تذکیر سے قائم رہا۔ دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل میں چونکہ انبیاء نہیں مبعوث ہوئے اس وجہ سے اس کا چرچا کچھ مدت بعد کمزور پڑ گیا تاہم اس کے اندر بھی ایک گروہ برابر ان لوگوں کا باقی رہا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیفی کے پیرو، ان کی دعوتِ توحید کے حامل اور ان کی شرک بیزاری کی روایات کے امین رہے۔

'لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ' یعنی یہ روایت انھوں نے اپنی ذرّیّت میں اس لیے چھوڑی کہ ان کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتی رہے۔ جب کبھی شیطان ان کو بھٹکانے لگے یا وہ بھٹک جائیں تو اس نشان کو دیکھ کر پھر صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ سکیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۹-۳۰)

مخالفت کی اصل علت

'حق' سے مراد قرآن مجید ہے اور 'اٰبَآءَهُمْ' کے بعد 'فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ' کے الفاظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہیں۔ سورۂ حدید آیت ۱۶ میں بالکل اسی سیاق میں مذکورہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ نیز سورۂ انبیاء آیت ۴۴ میں یہی مضمون اس طرح آیا ہے: 'بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ' (بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی)۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو محض ان کی سخن سازی ہے کہ قرآن کی مخالفت وہ اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس کی دعوت ان کے دینِ آباء کے خلاف ہے بلکہ اس مخالفت کی اصل علت یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا اور اس رفاہیت پر ایک طویل مدت گزر گئی ہے جس کے سبب سے ان کے دلوں پر قساوت چھا گئی ہے۔ اب جو ان کے پاس قرآن اور حقائق کو روشن کر دینے والا رسول آیا تو یہ دعوت و تعلیم ان کے دلوں پر شاق گزر رہی ہے وہ اس کے قبول کرنے میں اپنے دنیوی مفادات کے لیے خطرہ تصوّر کرتے ہیں اس وجہ سے اپنے عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کو سحر قرار دیتے ہیں۔

قرآن کو سحر کہنے کی اصل علت

قرآن کو قریش جو سحر کہتے تو اس کا ایک خاص پہلو تھا جس پر ہم دوسرے مقام میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ کوئی حقیقت اگر صحیح الفاظ میں سامنے آئے تو لازماً وہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن چونکہ سراسر حقیقت ہے، جیسا کہ لفظ 'حق' سے واضح ہے اور اس کا اسلوب بیان بھی معجزانہ ہے اس وجہ سے وہ قدرتی طور پر ان لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتا جو مفاد پرست نہیں تھے اور جن کو قریش کے

لیڈروں کی طرح یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اس کے ظہور سے ان کی سیادت کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن کے اثر سے بچائے رکھنے کے لیے قریش کے لیڈر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ قرآن ایک لغو اور بے معنی کتاب ہے۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے عوام خود ان کو بے وقوف ٹھہراتے کہ یہ سورج پر خاک ڈالنے کی کوشش ہے۔ البتہ وہ عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ قرآن میں جو بلاغت و جزالت ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے نازل ہوا ہے، جیسا کہ اس کے پیش کرنے والوں کا دعویٰ ہے، بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے جس میں ہمارے شاعروں اور خطیبوں کی طرح اس کو پیش کرنے والا بھی ماہر ہے۔ گویا ان کی کوشش یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں پر یہ اثر پڑنے نہ پائے کہ قرآن خدائی وحی ہے بلکہ لوگ اس کو اسی درجے میں رکھیں جس درجے میں اپنے بڑے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کو رکھتے ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱)

عوام فریبی کے لیے ایک اور شغلہ

قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے عوام کو برگشتہ کرنے کے لیے یہ بات بھی قریش کے لیڈر کہتے کہ اگر یہ کتاب خدا کی نازل کی ہوئی ہے تو آخر یہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں نازل کی گئی! 'مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ' سے مراد مکہ اور طائف ہیں اس لیے کہ یہی دو بستیاں عرب کے سادات و اشراف کا مرکز تھیں۔ پشتہا پشت سے عرب کی سیادت و قیادت انہی لوگوں کو حاصل رہی تھی اس وجہ سے سادہ لوح عوام کو یہ بات آسانی سے باور کرائی جا سکتی تھی کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کو اگر لوگوں کی رہنمائی کے لیے کوئی چیز اتارنی ہی ہوتی تو وہ انہی دونوں بستیوں میں سے کسی رئیس ابن رئیس پر اتارتا، ان کو چھوڑ کر، وہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کیوں کرتا جو ایک غریب ابنِ غریب ہے اور جس کی بات سننے کے لیے امراء مشکل ہی سے تیار ہو سکتے ہیں۔

معترضین کو جواب

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

یہ ان فراعنہ کی رعونت کا جواب ہے کہ ان کی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا اجارہ دار وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ انہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس نعمت سے جس کو چاہیں نوازیں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ حالانکہ اس دنیا میں بھی ان کو جو وسائلِ معیشت حاصل ہوئے ہیں، خدا ہی کی تقسیم سے حاصل ہوئے ہیں۔ انھوں نے خود نہیں حاصل کیے ہیں۔ اگر یہ خود حاصل کر لینے والے ہوتے تو ان اغنیاء کے درمیان درجات و مراتب کا تفاوت کیوں ہوتا؟ اپنے اختیار میں معاملہ ہوتے ہوئے کوئی خود اس بات پر کیوں راضی ہوتا کہ وہ کسی پہلو سے دوسرے سے فروتر ہو کر رہے۔ اپنی خواہش کے خلاف یہ فرقِ مراتب اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ تقسیم کا معاملہ ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے جو اپنی صوابدید اور حکمت

کے مطابق جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔

'لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا'۔ 'اِتَّخَذَ فُلَانٌ فُلَانًا سُخْرِيًّا' کے معنی ہیں فلاں نے فلاں کو اپنے کام یا اپنی خدمت میں لگا یا۔

تفاوتِ درجات کی حکمت

یہ حکمت بیان فرمائی اس بات کی کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ذہنی اور مادی دونوں ہی اعتبار سے درجات و مراتب کا تفاوت کیوں رکھا ہے؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس وجہ سے کیا ہے کہ لوگ باہم دگر تعاون کی زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کو اپنے کام میں لگا سکیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اس وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح کا رکھا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسروں کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی دوسروں سے مستغنی نہیں اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ معاشرہ میں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی افادیت نہ ہو۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ خالقِ کائنات نے ہر شخص کو ایک ہی درجے کی صلاحیت، ایک ہی طرح کے ذوق، ایک ہی مرتبہ کی ذہانت اور ایک ہی حیثیت کے وسائل و ذرائع کے ساتھ نہیں پیدا کیا بلکہ ان اعتبارات سے لوگوں کے درمیان بڑا تفاوت رکھا ہے۔ یہ تفاوت معاشرہ کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ اس میں ایک طرف متبحر عالم، نامور مصنف، یکتائے روزگار محقق، شہرۂ آفاق مدبر اور طاقتور حکمران بھی پیدا ہوتے ہیں، دوسری طرف کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، گٹھڑیاں ڈھونے والے قلی، حاضر خدمت رہنے والے خادم، گلیاں اور نالیاں صاف کرنے والے مہتر بھی اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے طبقات معاشرہ کی تشکیل کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ ان سب کی خدمت کی نوعیت الگ الگ ہے مگر ان میں سے کوئی عنصر بھی نہ حقیر ہے اور نہ ان میں سے کسی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشرہ کی مشین جاری رکھنے کے لیے اس مشین کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کی دیکھ بھال بھی، اس کی افادیت کی نسبت سے ضروری ہے۔

دنیا کو درجات و مراتب کے اس فرق کے ساتھ پیدا کر کے اللہ تعالیٰ امتحان کر رہا ہے کہ جو لوگ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہتر وسائل کے امین بنائے گئے ہیں وہ اپنے وسائل اور اپنی صلاحیتیں کس طرح استعمال کر رہے ہیں؟ ان کو پا کر وہ غرور، خودسری، تغلب اور خالقِ کائنات کی نافرمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں یا اس کے شکرگزار و فرمانبردار اور اس کی خلق کے غمگسار رہیں؟ اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی دیکھ رہا ہے جو فروتر اور کمتر وسائل کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے فرائض کو پہچاننے والے اور اپنے خالق سے ڈرنے والے، اپنی خودی اور خودداری

کی حفاظت کرنے والے ہیں یا اپنے فرائض چھوڑ کر اس خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ انھیں ان لوگوں کو نیچا دکھانا چاہیے جو ان کے حاکم اور افسر بنے ہوئے ہیں۔

اگر ان میں سے پہلی صورت وجود میں آتی ہے تو اعلیٰ اور ادنیٰ کے صالح تعاون سے صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اجزاء بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ اس دنیا میں بھی عزت پاتے ہیں اور آخرت میں بھی ہر ایک اپنی اپنی خدمات اور اپنے حسن نیت کے مطابق صلہ پائے گا۔ اگر دوسری شکل ہوتی ہے تو معاشرہ کا نظام بالتدریج مائل بہ فساد ہونا شروع ہوتا ہے اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے تمام بڑے اور چھوٹے عناصر اپنی اپنی شرارت یا غفلت کے مطابق خدا کے عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

اس زمانہ میں جو لوگ اس خبط میں مبتلا ہیں کہ وہ دنیا سے طبقات کے وجود کو مٹا کے رہیں گے وہ اس ارادے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ لوگوں کو ذہنی، مزاجی، طبعی اور عملی صلاحیتوں کے اعتبار سے مساوی درجہ کا بنانے میں کامیاب نہ ہو جائیں اور یہ چیز محال ہے۔ جن قوموں نے اس خبط میں مبتلا ہو کر خون کے دریا بہا دیے ان کا حال بھی یہ ہے کہ وہاں بڑے سے بڑے فراعنہ بھی موجود ہیں اور ان فراعنہ کے بوٹوں پر پالش کرنے والے اور گلیوں میں جھاڑو دینے والے بھی موجود ہیں۔ اور اگر وہ اس محال کو ممکن بنانے میں کامیاب ہو گئے یعنی انھوں نے پوری قوم کو صلاحیتوں اور ذہنی و مادی قوتوں کے اعتبار سے ایک درجہ پر کر دیا تو اسی دن باہمی تعاون کی بنیاد ختم ہو جائے گی اور قوم میں انارکی پھیل جائے گی۔ جب ہر شخص لینن اور سٹالن بننے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لے گا تو آخر وہ لینن یا ماؤ کی کار چلانے والا ڈرائیور یا ان کے جوتوں پر پالش کرنے والا خدمت گار بننے پر کیوں قانع ہو گا! پھر تو ہر شخص خدا وندی بننے کی کوشش کرے گا اور ان نئے خداؤں کی کشمکش میں اس دنیا کا جو حشر ہو گا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے!!

وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ۙ وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ (۳۳-۳۴)

حذف کا ایک اسلوب

یہاں 'مِنْ فِضَّةٍ' کے الفاظ جس طرح 'سُقُفًا' کے بعد آئے ہیں اسی طرح 'مَعَارِجَ'، 'اَبْوَابًا' اور 'سُرُرًا' کے بعد بھی آنے چاہئیں لیکن فصیح عربی کے معروف اسلوب کے مطابق وہ حذف کر دیے گئے اس لیے کہ قرینہ خود ان کو واضح کر رہا ہے۔

متاعِ دنیا کی بے حقیقتی

اب یہ اس متاعِ دنیا کی بے حقیقتی واضح فرمائی جا رہی ہے جس کے غرور نے کفار کو اس خبط میں مبتلا کیا کہ وہ سمجھنے لگ گئے کہ جب اس دنیا کی ساری شوکت و عظمت ہم کو حاصل ہوئی تو یہ کس

طرح ممکن ہے کہ خدا کوئی کتاب اتارنی ہوتی تو اس کے لیے وہ ہمارے سوا کسی اور کو تلاش کرتا!

فرمایا کہ دنیا کے جس سروسامان پر ان کو یہ ناز ہے اس کی حقیقت خدا کی نگاہوں میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان پر چڑھنے کے زینے اور ان کے کواڑ اور ان کے ٹیک لگانے کے تخت سب چاندی کے کر دیتا لیکن اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ یہ آزمائش لوگوں کے لیے بہت سخت ہو جاتی۔ عام لوگ جب دیکھتے کہ خدا کے کفر کرنے والوں کو یہ کچھ حاصل ہے تو لوگ اندھے ہو کر کفر ہی کی راہ اختیار کر لیتے۔ کوئی بڑا ہی نصیبہ ور ہوتا تو وہ اپنے ایمان کو اس فتنہ سے بچا پاتا۔ خلق کو اس آزمائش سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اہل ایمان اور اہل کفر دونوں ہی کو حصہ دیا ہے البتہ آخرت میں اہل کفر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بات جو فرمائی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑتے، ایک کلیہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عمومیت و اکثریت کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دنیا صرف کافروں ہی کو ملتی تو اس دنیا میں بہت تھوڑے لوگ نکلتے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے تاہم نکلتے ضرور، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہوتی۔ انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ شدید سے شدید امتحان میں بھی ان کے اندر سے ایسے جوہر قابل نکل آتے ہیں جو آگ کے سمندر سے گزر جاتے ہیں لیکن اپنے رب کو نہیں چھوڑتے۔

وَزُخْرُفًا ۚ وَإِن كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ (۳۵)

'زخرف' 'زُخْرُف' کے معنی زینت کے بھی آتے ہیں اور سونے کے بھی جو زینت کا ذریعہ ہوتا ہے۔

کا اعراب تالیفِ کلام کے اعتبار سے اس کو مِنْ فِضَّةٍ کے محل پر عطف بھی کر سکتے ہیں اور فعل بھی محذوف مان سکتے ہیں یعنی لَجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَٰنِ زُخْرُفًا۔ مدعا میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہو گا۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو مذکورہ ساری چیزیں ان کے لیے سونے کی بھی بنا دیں یا ان کے لیے سونے کے ڈھیر اکٹھے کر دیں۔

'لَمَّا' کی تحقیق 'لَمَّا' یہاں 'اِلَّا' کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس 'ل' کی جگہ پر ہے جو 'اِن' مخففہ اور 'اِن' نافیہ کے درمیان بطور علامت فرق کے آیا کرتا ہے۔ بعض جگہ اس 'ل' کو اشباع یعنی کلام کے صوتی خلا کو بھرنے کے لیے 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ مثلاً سورۂ طارق میں ہے اِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴) (بے شک ہر جان پر ایک نگران ہے) اصلاً تو یہ اِن كُلُّ نَفْسٍ لَعَلَيْهَا

حَافِظٌ ہے۔ لیکن فقرے میں ایک قسم کا صوتی خلا رہ جاتا تھا اس وجہ سے آہنگ کو ٹھیک کرنے کے لیے اہل زبان کے معروف استعمال کے مطابق، اس کو نُمّا کر دیا۔ حروف میں اس قسم کے اضافہ کی مثالیں عربی میں بہت ہیں لیکن یہاں ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں، جن پر یہ لوگ ریجھے ہوئے ہیں، بس اس حیاتِ چند روزہ کی متاع ہیں۔ اصل غیر فانی نعمتیں تو آخرت میں ملنے والی ہیں اور آخرت تمام تر تیرے رب کے پاس صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو رب سے ڈرنے والے ہیں۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۳۶)

اصل حقیقت

یعنی ان کے یہ سارے شبہات و اعتراضات تو محض بناوٹی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی یاد سے بالکل اعراض کر لیا ہے اور سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد سے منہ موڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو ان کا دن رات کا ساتھی بن جاتا ہے پھر وہ اس وقت تک ان کی جان نہیں چھوڑتا جب تک ان کو جہنم کا فرزند نہ بنا لے۔

'عشا عن الشیء' کے معنی کسی چیز سے اعراض کرنے کے آتے ہیں۔ انسان کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک خدا کی یاد سے آباد رہتا ہے اس وقت تک تو شیطان کو اس میں راہ نہیں ملتی لیکن جب انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ شیطان اس کے دل پر قبضہ جما لیتا ہے اور جب وہ قبضہ جما لیتا ہے تو پھر اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ بہتر سے بہتر تذکیر و موعظت بھی جو اس کے سامنے آتی ہے شیطان اس کے خلاف شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اس کو اس سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے دل اپنے رب کی یاد سے آباد رکھتے ہیں شیطان کو ان کے اندر گھسنے کی راہ نہیں ملتی اور اگر کبھی کسی غفلت کے سبب سے اس کو دراندازی کا کوئی موقع مل بھی جائے تو اس کو وہاں ٹکنے کی جگہ نہیں ملتی بلکہ بندہ کے متنبہ ہوتے ہی شیطان کو وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۷)

زبان کا ایک استعمال

اوپر والی آیت میں حرف 'مَنْ'، چونکہ مبہم ہے، واحد اور جمع دونوں ہی کے لیے آسکتا ہے، نیز لفظ 'شیطان' بھی عام ہے، اس سے شیاطین جن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور شیاطین انس بھی، اس وجہ سے آیت زیر بحث میں ضمیریں جمع آئیں۔ یہاں حال ایک پورے گروہ کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح شیطان کے پیچھے چڑھ جاتے ہیں ان کا حشر یہ ہوتا ہے کہ شیاطین تو ان کو سیدھی راہ سے روک دیتے ہیں لیکن ان کے پھندوں میں پھنسے ہوئے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں ضمیروں کا انتشار بھی قابلِ توجہ ہے۔ 'اِنَّھُمْ' کی ضمیر کا مرجع تو شیاطین ہیں اور 'یَحْسَبُوْنَ' کے فاعل وہ لوگ ہیں جو شیاطین کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔ لیکن جہاں کلام کا مفہوم واضح ہو وہاں ضمیروں میں اس قسم کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ یوسف کی مندرجہ ذیل آیت میں گزر چکی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو
وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا	جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں
جَآءَھُمْ نَصْرُنَا ۙ	کہ ان کو جھوٹ موٹ عذاب کا ڈراوا سنایا گیا تھا تو رسول
(یوسف: ۱۱۰)	کے پاس ہماری مدد آجاتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ (۳۸)

یعنی اس دنیا میں تو اس قسم کے ساتھیوں میں خوب گاڑھی چھنتی ہے لیکن جب آخرت میں ہمارے آگے پیشی ہوگی اور اس دوستی کا انجام سامنے آئے گا تو جس نے کسی شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنی عاقبت برباد کی ہوگی وہ اپنے ساتھی پر لعنت بھیجے گا اور کہے گا کاش میرے اور تیرے درمیان مشرقین کی دوری ہوتی!!

'فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ' یہ اس بُرے ساتھی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارِ نفرت و لعنت ہے کہ کیا ہی بُرا ساتھی ثابت ہوا وہ جس نے بالآخر اپنے ساتھی کو اس کھڈ میں لا گرایا۔

زبان کا ایک اسلوب

'مشرقین' کا مفہوم عام طور پر مفسرین نے مشرق اور مغرب لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ عربی میں بعض مرتبہ تثنیہ کسی شے کے دونوں کناروں کی وسعت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح جمع بھی کسی شے کے اطراف و اکناف کی وسعت کے اظہار کے لیے آتی ہے۔ قرآن میں 'مغربین و مشرقین' اور 'مشارق و مغارب' وغیرہ الفاظ اسی پہلو سے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کی وضاحت دوسرے محل میں ہو چکی ہے۔

وَلَنْ یَّنْفَعَکُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ (۳۹)

'اِذْ ظَّلَمْتُمْ' یعنی اذ ظلمتم انفسکم فی الحیٰوۃ الدنیا۔

جب گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے ساتھیوں میں یہ جوتی پیزار ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بتایا جائے گا کہ جب دنیا میں تم ایک دوسرے کے تابع اور متبوع بن کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھا چکے اور تمھیں اس کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو اب ایک دوسرے پر لعنت کے ڈونگرے برسا کر کیا تسلی حاصل کرو گے! یہ چیز تم میں سے کسی کو بری کرنے والی نہیں بنے گی۔ اب تو بہرحال دونوں ہی کو یہ عذاب بھگتنا ہے تو اس کو بھگتو۔ اس لعن طعن کا موقع دنیا میں تھا لیکن وہاں تم ایک دوسرے

کے جاں نثار اور وفادار بنے رہے۔ جو وقت گزر چکا اب وہ ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِی الْعُمْیَ وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۴۰)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہاری تذکیر و موعظت کارگر ہو سکتی ہے تو ان لوگوں پر ہو سکتی ہے جن کے اندر دیکھنے سننے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زندہ ہے۔ ان لوگوں کو آخر تم کس طرح سنا سکتے ہو جن کے کان بہرے ہوں اور جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں!

'وَمَنْ كَانَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'، یعنی کسی کی گمراہی اگر کسی حقیقت کے خفا یا اس کی کم علمی و بے خبری کے سبب سے ہو تو اس کے ازالہ کی تدبیر کی جا سکتی ہے لیکن جو شخص بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو، جس کا گمراہی ہونا خود اس پر بھی واضح ہو، اس کو ہدایت دینا کس کے امکان میں ہے۔

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۙ اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ (۴۱-۴۲)

یہ بھی اسی تسلی کے سلسلہ کی بات ہے۔ فرمایا کہ ان ظالموں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اب یا تو یہ ہوگا کہ ہم تم کو اٹھا لیں گے اس کے بعد ان سے انتقام لیں گے یا جس عذاب کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں وہ تمھارے ہوتے ہوئے آ جائے گا اور تم بھی ان کا انجام دیکھ لوگے۔ ہم ان کو عذاب دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔ یہ مضمون یونس آیت ۴۶ اور الرعد آیت ۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ان آیات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۳)

یعنی ان لوگوں کی اس ژاژ خائی اور مخالفت کے علی الرغم تم اس دعوتِ توحید اور اس کتاب عزیز پر جمے رہو جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے، سیدھی راہ پر تمہی ہو۔ 'صراط مستقیم' سے اشارہ یہاں خاص طور پر توحید کی اس دعوت کی طرف ہے جو اس سورہ میں اوپر دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے مخالفین کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے وہ ایک بے بنیاد دعوے کے علمبردار ہیں اور تم ایک مضبوط بنیاد پر ہو۔ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ مخالفوں کے قدم بہت جلد اکھڑ جائیں گے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (۴۴)

رسول اور قوم دونوں کی ذمہ داری

یعنی یہ قرآن جو تمھاری طرف وحی کیا گیا ہے تمھارے لیے بھی یاد دہانی ہے اور تمھاری قوم کے لیے بھی یاد دہانی ہے اور ایک دن تم سب سے پرسش ہونی ہے۔ تم سے یہ پرسش ہوگی کہ تم پر جو وحی کی گئی وہ تم نے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک، بے کم و کاست پہنچا دی یا نہیں اور قوم کی طرف سے تم کو کیا جواب ملا؟ قوم سے یہ پرسش ہونی ہے کہ کیا تمھارے پاس کوئی نذیر نہیں آیا کہ تم نے اپنی یہ شامت بلائی۔ سورۂ اعراف میں اس بات کا یوں ذکر ہوا ہے۔

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۙ‏ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ‏ ۝ (الاعراف: ۶-۷)

پس لازماً ہم ان لوگوں سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے، پھر ہم ان کو پوری سرگزشت، پورے علم کی روشنی میں سنائیں گے، ہم کہیں غائب نہیں رہے ہیں۔

رسولوں اور ان کی قوموں سے سوال جواب کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

رسولوں پر بلاغ کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے، ان سے اس کے متعلق پرسش ہونی ہے اور ان کی قوموں سے یہ پرسش ہوگی کہ اللہ کی اتنی بڑی نعمت جو رسول کی بعثت کی شکل میں، ان کو ملی اس کی انھوں نے کیا قدر کی۔ پھر جس انعام و اکرام کے حقدار رسول اور ان کے ساتھی ٹھہریں گے وہ ان کو ملے گا اور جس نقمت و عذاب کے سزاوار ان کے مکذبین قرار پائیں گے وہ ان کے حصہ میں آئے گا۔ اس میں رسولؐ اور صحابۂ رسولؐ کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو جانے والا نہیں ہے بلکہ ایک دن یہ سارا مقدمہ خدا کی عدالت میں بھی پیش ہوگا اور وہاں معلوم ہوگا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔

وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ (۴۵)

یہ مشرکین کے اس دعوے کی تردید ہے کہ جن کو وہ پوجتے ہیں ان کی عبادت کا حکم خدا نے دیا ہے۔ فرمایا کہ خدا کے امر و نہی کے معلوم کرنے کا ذریعہ اس کے رسول ہیں تو جو رسول تم سے پہلے آئے ہیں ان سے معلوم کرو کہ خدا نے اپنے سوا کچھ دوسرے معبود بھی عبادت کے حق دار ٹھہرائے ہیں؟

'وَسۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا' ایک بلیغ اسلوب کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'رُسُل' سے مراد ان کے صحیفے اور ان کی تعلیمات ہیں جو ان کی دعوت کے ترجمان ہیں۔ کلام کا یہ اسلوب پچھلے صحیفوں میں اکثر استعمال ہوا ہے اور اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ___ آیات: ۴۶-۵۶

آگے بالاجمال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے مقصود ایک تو اس انتقام الٰہی کی تاریخی شہادت پیش کرنا ہے جس کا ذکر اوپر آیات ۴۱-۴۲ میں ہوا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد اس کی قوم کا فیصلہ لازماً ہو جاتا ہے، خواہ رسول کی زندگی ہی میں ہو یا اس کی ہجرت یا موت کے بعد۔ اللہ کا یہ انتقام اس کی ایک مقررہ سنت ہے جس کی گرفت سے کوئی قوم بھی نہیں بچی۔ فرعون جیسا جبار بھی جب اس کی زد میں آیا ہے تو وہ بھی اپنی تمام افواج سمیت غرق

کر دیا گیا۔ اس کی قوت و صولت اس کے کچھ کام نہ آئی۔

دوسرے یہ اس حقیقت کی مثال ہے جو آیت ۴۰ میں بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں برباد اور جان بوجھ کر گمراہی کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو کسی نشانی سے بھی ہدایت نہیں حاصل ہوتی۔ وہ بڑے سے بڑے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں صرف خدا کے فیصلۂ عذاب ہی سے کھلتی ہیں۔

تیسرے اس میں اس حقیقت کی بھی شہادت ہے جو آیت ۴۵ میں مذکور ہوئی ہے کہ اللہ نے جتنے رسول بھی بھیجے سب وہی دعوتِ توحید لے کر آئے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ کسی رسول نے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کی عبادت کی دعوت نہیں دی ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے

آیات ۴۶-۵۶

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا٘ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ۬ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٥﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿٥٦﴾

ترجمۂ آیات ۴۶-۵۶

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان کے پاس بھیجا تو اس نے ان کو دعوت دی کہ میں تمھارے پاس عالم کے خداوند کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ ان نشانیوں کا مذاق اڑاتے۔ اور ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے اور ہم نے ان کو عذاب میں بھی پکڑا تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۴۶-۴۸

اور انھوں نے درخواست کی کہ اے ساحر، اپنے رب سے اس عہد کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اب ہم ضرور ہدایت پانے والے بن کے رہیں گے۔ تو جب ہم ان سے عذاب ٹال دیتے تو وہ اپنا عہد توڑ دیتے۔ ۴۹-۵۰

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی۔ اے میری قوم کے لوگو! کیا مجھے مصر کی بادشاہی حاصل نہیں ہے! اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں! تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں! تو کیا یہ بہتر ہوا یا میں بہتر ہوں اس سے جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھول کر کہہ بھی نہیں سکتا ہے! تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے لیے اوپر سے سونے کے کنگن اتارے گئے ہوتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھے ہوئے آتے! پس اس طرح اس نے اپنی قوم کو بیوقوف بنا لیا اور انھوں نے اس کی بات مان لی۔ یہ لوگ نافرمان قسم کے لوگ تھے۔ تو جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا اور ان کو ماضی کی ایک داستان

اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ عبرت بنا دیا۔ ۵۱-۵۶

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۶)

'آیات' سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن سے مسلح کر کے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا، یعنی عصا اور ید بیضاء وغیرہ۔

'مَلَاءٌ' سے مراد قوم فرعون کے وہ اعیان و اکابر ہیں جو اس کے دربار میں باریاب ہوتے۔ ان الفاظ کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

'فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کو دی۔ یہاں اس کی وضاحت نہیں ہے، صرف اجمالی اشارہ ہے لیکن دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ انھوں نے فرعون اور اس کے درباریوں کو آگاہ کیا کہ وہ ان کے انذار کے لیے خدا کی طرف سے رسول ہو کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف سے نشانیاں بھی دی ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانے دیا جائے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ (۴۷)

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ محذوف ہے کہ جب فرعون اور اس کے اعیان نے سنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خداوند عالم کے رسول ہونے کے مدعی ہیں اور وہ اس دعوے کی تصدیق کی کچھ نشانیاں بھی اپنے پاس رکھتے ہیں تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ جو نشانیاں وہ لے کر آئے ہیں، دکھائیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نشانیاں دکھائیں لیکن ان کو ماننے کے بجائے انھوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ بھلا یہ کیا نشانیاں ہیں، یہ تو ساحری کے کرتب ہیں اور ہمارے پاس بھی ایسے جادوگر ہیں جو ان سے بڑے کرتب دکھا سکتے ہیں۔

وَمَا نُرِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۴۸)

'نُرِیْهِمْ' سے پہلے فعل ناقص، زبان کے معروف قاعدے کے مطابق، محذوف ہے۔ یعنی ہم ان کو ایک سے ایک بڑھ کر نشانیاں دکھاتے رہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے

تنبیہی نشانیاں

ہیں۔ یہ ان نشانیوں کی طرف اشارہ ہے جو پہلی نشانیوں کی تکذیب کے بعد تنبیہی عذاب کے طور پر نازل ہوئیں تاکہ فرعونیوں کو خدا کی پکڑ کا کچھ اندازہ ہو اور وہ توبہ کی طرف مائل ہوں۔ یہ نشانیاں مختلف عذابوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئیں اور قدرتی طور پر ہر نشانی اپنی ماسبق سے زیادہ عبرت انگیز شکل میں نمایاں ہوئی۔ لیکن ان کے دلوں پر ایسی قساوت چھا چکی تھی کہ کوئی نشانی بھی کارگر نہ ہو سکی یہاں تک کہ وہ فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ گئے۔

وَقَالُوا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ○ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۴۹-۵۰)

جب وہ کسی عذاب کی گرفت میں آتے تو بھاگے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے اور نہایت لجاجت سے درخواست کرتے کہ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ اس عذاب کو دور فرمائے، اگر یہ عذاب دور ہو گیا تو ہم صحیح راہ پر آ جائیں گے اور آپ کی بات ضرور ہی مان لیں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ ان سے عذاب دور کر دیتا تو وہ عہد توڑ کر اپنی ضد پر اڑ جاتے۔

ان تنبیہی عذابوں کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیات ۱۳۲-۱۳۵ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم تورات کی روشنی میں ہر بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ آیات ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو تدبر قرآن میں ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ	تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں
وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ	اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا	انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے اور جب آتی ان
قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ○ وَلَمَّا وَقَعَ	پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰ تم اپنے
عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ	رب سے، اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تم سے
لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ	کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے ہم سے یہ
لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ	آفت دور کر دی تو ہم تمھاری بات ضرور مان لیں گے اور
لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○	تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے تو جب ہم ان سے
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ	دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ بہرحال
بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (الاعراف ۱۳۳-۱۳۵)	پہنچنے والے ہی ہوتے تو وہ دفعۃً عہد توڑ دیتے۔

مصریوں کے نزدیک ساحروں کا درجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو 'يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ' سے مخاطب کرنا کسی تحقیر یا سوءِ ادب پر مبنی نہیں ہے۔ مصر میں اس وقت ساحروں کو سوسائٹی میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی سوسائٹی میں علما اور صوفیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ اے ساحر! ہمارے لیے دعا کیجیے، تعظیم کا خطاب ہے۔

'بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ' کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ یعنی چونکہ آپ کے رب نے آپ کی دعا کی قبولیت کا آپ سے وعدہ کر رکھا ہے، اس وعدہ کے واسطہ سے آپ دعا کریں گے تو وہ ضرور ہی قبول ہوگی۔

'کَمَا بَیَانُ کُلَّمَا' کے مفہوم میں ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف میں ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد 'اذا' کا استعمال جو مفاجات کے لیے آتا ہے، بالکل موزوں ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱)

فرعون نے اپنی قوم میں پکارا، یعنی اپنی قوم میں منادی کرائی۔

حضرت رسالتؐ کے مقابل میں فرعون کا دعوائے برتری

اوپر آیات ۳۱-۳۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں قریش کے لیڈروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ 'لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ' (اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے اترا ہے تو مکہ یا طائف کے سرداروں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتار اگیا) ٹھیک اسی طرح فرعون نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و معجزات سے قوم کی عقیدت اس کے ساتھ متزلزل ہو رہی ہے تو اس نے یہ منادی کرائی کہ ملک مصر کی بادشاہی اور اس کی بہتی ہوئی نہریں تو میرے قبضہ میں ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کسی کو رسول بنانے والا ہوتا تو میرے سوا کسی اور کو رسول بناتا۔

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ڏ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۵۲)

اس آیت میں کلام کا ایک حصہ حذف ہے۔ پچھلی سورتوں میں متعدد مثالیں اس قسم کے استفہامیہ جملوں میں حذف کی گزر چکی ہیں۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جب مصر کی بادشاہی، اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں ہیں تو یہ شخص بہتر ٹھہرا جو ایک غلام قوم کا فرد ہے اور اپنی بات کھول کر بیان بھی نہیں کر سکتا یا میں بہتر ہوں جو اس پورے ملک اور اس کی تمام دولت و ثروت کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہوں! مطلب یہ کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو آخر اس شخص میں ایسی کیا بات تھی کہ خدا نے اس کو رسول بنایا۔

'مَهِيْنٌ' سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک غلام قوم کے فرد ہیں اور 'لَا يَكَادُ يُبِيْنُ' سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ بیانیہ کی کمزوری کی طرف اشارہ ہے۔ 'وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ' کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لکنت وغیرہ کی قسم کا کوئی عارضہ تو نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے گمان کیا ہے، البتہ وہ کوئی زبان آور خطیب نہیں تھے اور اس دور میں کسی شخص کو پبلک میں نمایاں ہونے کے لیے ساحری، شاعری اور خطابت میں سے کسی نہ کسی ایک چیز میں ممتاز ہونا ضروری تھا۔ فرعون نے ان کی اس کمزوری کا بھی طعنہ دیا کہ ایک طرف

تو یہ ایک غلام قوم کا فرد، دوسری طرف خطابت پر قادر نہیں تو میرے مقابل میں ایک ایسا شخص سیادت کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے؟

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (۵۳)

یعنی اس کے زعم کے مطابق اگر کوئی خدا ہے اور اس نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو ہونا یہ تھا کہ آسمان سے اس کی زینت کے لیے کنگن اتارے جاتے اور فرشتے پرے بنا بنا کر اس کے جلو میں چلتے لیکن یہ مدعی تو ہے خدا کے رسول ہونے کا اور اس کی کس مپرسی کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ غور کرو کہ کوئی خدا کا رسول ہو گا تو وہ اس حال میں کیوں آئے گا!

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس عہد میں عام طور پر سلاطین، بالخصوص مصر اور ایران کے سلاطین، اظہار شان و شوکت کے لیے سونے کے کنگن پہنتے تھے اور فوجی دستوں کے جلو میں نکلنا تو جس طرح آج شکوہ خسروی کے اظہار کے لیے ضروری ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی اس کا اہتمام تھا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۵۴)

'اِسْتَخَفَّ'، ضد ہے 'اِسْتَثْقَلَ' کا۔ 'اِسْتِثْقَالٌ' کے معنی کسی چیز کو بھاری بھرکم، وزن دار اور گراں سمجھنے کے ہیں اس وجہ سے 'استخفاف' کے معنی کسی کو بے وزن، بے حقیقت اور بے حیثیت سمجھنے کے ہوں گے۔ 'اِسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ' کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے اپنی قوم کو بالکل سادہ لوح پا کر اس کو پُرفریب باتوں سے چٹکیوں میں اڑا دیا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس کے چکموں میں آگئی۔

انسان کے اندر وزن ایمان سے پیدا ہوتا ہے

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ'۔ یعنی یہ لوگ خدا کے نافرمان اور اس کے ایمان سے محروم تھے اس وجہ سے بالکل بے وزن اور بے حقیقت تھے۔ اس طرح کے لوگ بڑی آسانی سے شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور شیاطین ان کی ناکوں میں نکیل ڈال کر جدھر چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں۔ انسان کے اندر وزن اللہ تعالیٰ کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ پاسنگ اس کے پلڑے میں نہ ہو تو اس کی حیثیت خس و خاشاک کی ہے۔ ہوا کا معمولی جھونکا بھی اس کو اڑا لے جاتا ہے۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۵۵)

'اٰسَفَهٗ' کے معنی ہیں 'اَغْضَبَهٗ' یعنی اس کو غضبناک کر دیا۔ فرمایا کہ جب انھوں نے اپنی ان حرکتوں سے ہمیں غصہ دلایا تو بالآخر ہم نے بھی ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کا تعاقب اپنی تمام عسکری طاقت اور اپنے جملہ اعیان و امراء کے ساتھ کیا تھا اس وجہ سے اس عذاب نے اس کی پوری جمعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۵۶)

'سَلَف' کے اصل معنی گزرنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ گزرے ہوئے لوگوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ 'سلف' اچھے بھی ہو سکتے ہیں، برے بھی۔ یہاں یہ برے معنوں میں ہے یعنی ہم نے ان کو اس طرح مٹایا کہ وہ ایک داستانِ ماضی اور ایک افسانۂ پارینہ بن کے رہ گئے۔ یہی حقیقت بعض مقامات میں 'جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ' کے الفاظ سے بھی واضح فرمائی گئی ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اگر تم نے بھی انہی کی روش اختیار کی تو انھیں کی طرح تمھارا نام بھی حاضر کی لوح سے مٹا دیا جائے گا، صرف ماضی کی ایک داستان بن کر رہ جاؤ گے۔

قریش کو تنبیہ

'وَمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ'۔ 'مَثَل' کے معنی مثال اور نمونہ کے ہیں۔ 'مثال' بھی اچھی اور بری دونوں ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ برے مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کے معنی نمونۂ عبرت کے ہیں یعنی ہم نے ان کو دوسروں کے لیے ایک مثالِ عبرت بنا دیا کہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں کہ خدا سے اکڑنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۵۷ - ۶۵ کا مضمون

جس مقصد سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اسی مقصد کی تائید کے لیے آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا بھی ایک حصہ اجمالاً بیان ہوا ہے کہ انھوں نے بھی اللہ کی توحید ہی کی دعوت دی لیکن ان کی پیروی کے مدعی مبتدعین نے ان کی صریح تعلیمات کے خلاف بدعتیں ایجاد کر کے ان کو ابن اللہ بنا کر رکھ دیا۔

اس سرگزشت کا آغاز اس تمہید سے فرمایا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا جاتا ہے تو قریش کے جھگڑالو لوگ یہ فتنہ اٹھاتے ہیں کہ یہ شخص عیسیٰؑ کی تعریف کرتا ہے، حالانکہ عیسیٰؑ سے اچھے تو ہمارے ہی معبود ہیں کہ وہ فرشتے اور خدا کی بیٹیاں ہیں جب کہ عیسیٰ (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بیوقوف پیروؤں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ قرآن جو ان کا ذکرِ خیر کرتا ہے تو گویا عیسائیوں کی طرح ان کو ابن اللہ تسلیم کر کے ان کی بندگی کی دعوت دیتا ہے حالانکہ قرآن ان کا ذکر اللہ کے ایک بندے اور اس کے ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ انھوں نے بھی اسی توحید کی دعوت دی جس کی دعوت تمام انبیاء لے کر آئے لیکن یہ شریر اور مناظرہ باز لوگ سیدھی سادی باتوں کو بھی فتنہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۷-۶۵

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَاۗءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾

ترجمۂ آیات ۵۷-۶۵

اور جب ابنِ مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمہاری قوم کے لوگ اس پر چیخنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ! یہ بات وہ محض کج بحثی کے لیے اٹھاتے ہیں بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ وہ تو بس ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے اپنا فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو ایک مثال بنایا اور اگر ہم چاہیں تو تمہارے اندر سے فرشتے بنا دیں جو زمین میں خلافت کریں۔ ۵۷-۶۰

اور بے شک وہ قیامت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے تو اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے اور شیطان تم کو اس سے روکنے نہ پائے۔

بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۶۱-۶۲

اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تم پر واضح کر دوں بعض وہ باتیں جن میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے تو ان کے اندر سے پارٹیوں نے اختلاف برپا کیے۔ پس ہلاکی ہو ان لوگوں کے لیے جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا، ایک دردناک دن کے عذاب کی۔ ۶۳-۶۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝ وَقَالُوا ءَأَٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۷-۵۸)

قریش کے شریروں کی ایک فتنہ انگیزی

یعنی جب تمھاری قوم کے سامنے انبیاء کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اسی دین توحید کے داعی بن کر آئے جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی تو تمھاری قوم کے جھگڑالو مجرد ان کے نام کے ذکر ہی کو فتنہ بنا لیتے اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے بتوں کو تو برا کہتا ہے لیکن مسیح کی تعریف کرتا ہے۔ حالانکہ ہمارے معبود فرشتے ہیں اور مسیح بہرحال مریم کے بیٹے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن حضرت عیسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو گویا ایک معبود کی حیثیت سے کرتا ہے اور یہ ایک سازش ہے اس غرض کے لیے کہ ہمارے ذہنوں سے ہمارے آبائی دیوتاؤں کی عقیدت ختم کر کے ان کی جگہ مسیح کی الوہیت کا عقیدہ راسخ کیا جائے۔

مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ۔ فرمایا کہ یہ شُغلہ انھوں نے محض بحث جدال کے لیے چھوڑا ہے ورنہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن حضرت مسیحؑ کا ذکر کرتا ہے تو معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ کے ایک بندے اور ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے کہ دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح انھوں نے بھی خلق کو توحید ہی کی تعلیم دی۔ یہ سب جانتے ہوئے انھوں نے محض

اس لیے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ قرآن اور نبی کی مخالفت کے لیے کوئی بہانہ ان کو ملے اور وہ لوگوں کو بھڑکا سکیں کہ یہ شخص ہمارے آبائی دین کو مٹا کر ہمارے اوپر مسیحیت کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو، یہ شاخسانہ انھوں نے اتفاق سے نہیں کھڑا کیا ہے بلکہ فتنہ پردازی و شر انگیزی ان کے قومی مزاج کی خصوصیت بن چکی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قریش کے جھگڑالو لیڈروں نے اسی طرح کا فتنہ اسم 'رحمان' کی آڑ لے کر اٹھانے کی کوشش کی تھی جس کی وضاحت ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ..... (۱۱۰) کے تحت کر چکے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم 'رحمان' سے قریش ناواقف نہیں تھے لیکن اس کا غالب استعمال چونکہ اہل کتاب، بالخصوص نصاریٰ کے ہاں تھا، اس وجہ سے انھوں نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ یہ شخص دوسروں کے عقائد و نظریات ہمارے اوپر مسلط کرنا چاہتا ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے دلیل یہ دی کہ جو صحیفہ یہ شخص پیش کر رہا ہے اس میں لفظ 'رحمان' کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح کی باتوں کی آڑ لے کر مشرکین یہ بھی کہتے تھے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس شخص کو سکھاتے ہیں اور مقصود اس سازش کا ہمارے دین اور ہماری روایات کو مٹانا ہے۔

بدگمانی کی فضا میں اس طرح کے شگوفے بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ عوام کے ذہن بالکل خام ہوتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس طرح کی باتیں قبول کر لیتے ہیں اور جب قبول کر لیتے ہیں تو ان کو ذہنوں سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔

'صَدَّ مِنَ الشَّیْءِ' کے معنی ہوتے ہیں 'کسی شے سے بیزار ہو کر چیخ اٹھنا'۔ کسی بات سے خوش ہو کر شور و غل کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف نہیں ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۵۹)

حضرت عیسیٰ کی اصل حیثیت

یعنی قرآن ان کی مثال جو پیش کر رہا ہے تو ایک معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ وہ اللہ کے ایک بندے تھے جن پر اس نے اپنا خاص فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کے لیے ان کو ایک نمونہ بنایا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ زندگی کی مثال یہ ہے۔ خاص فضل سے اشارہ ان خصوصیات کی طرف ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل سے ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کُن' سے پیدا کیا، تائید روح القدس سے ان کو نوازا، ابھی وہ گہوارے ہی میں تھے کہ نہایت دانائی و حکمت کی باتیں کرنے لگے، پھر اللہ نے ان کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا۔ انھوں نے لوگوں کو حکمت کی تعلیم دی۔ نہایت حیرت انگیز معجزے دکھائے اور یہود کی کوئی سازش ان کے خلاف اللہ تعالیٰ نے کامیاب نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ یہود اپنے

جس کارنامے پر بہت نازاں ہیں کہ انھوں نے آنجنابؑ کو سولی پر چڑھایا، قرآن نے اس کی بھی تردید کر دی کہ اس سازش میں بھی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

بنی اسرائیل کے لیے مثال

وَمَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آں جنابؑ کو بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ اور مثال بنایا کہ اس پاکیزہ مثال کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے تمام کج پیچ درست کر لیں۔ یوں تو ہر رسول اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ایک خدائی کسوٹی ہوتا ہے اور اس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں قوم کی نجات مضمر ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص نوع کی ولادت اور نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ بنی اسرائیل جو اپنے انبیاء کی تمام تعلیمات بھلا کر بالکل اندھے بہرے بن گئے تھے آنکھیں کھولیں لیکن وہ ایسے قسیُّ القلب نکلے کہ اس مثال سے بھی انھوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (۶۰)

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

اوپر مشرکین کا قول نقل ہوا ہے کہ ءَاٰلِهَتُنَا خَیْرٌ اَمْ هُوَ (ہمارے معبود اچھے ہوئے یا وہ؟) یہ اسی پر استدراک ہے کہ تم نے اگر مجرد اس بنیاد پر فرشتوں کو معبود بنایا ہے کہ ان کی خلقت ایک اعلیٰ عنصر (نور) سے ہوئی ہے تو یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کو معبود بنا دینے کی دلیل بن سکے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ وہ جس طرح فرشتوں کو نور سے بنا سکتا ہے اسی طرح چاہے تو وہ خود تمھارے اندر سے فرشتوں کی صفات کے لوگ پیدا کر دے اور وہ زمین میں خلافت کا وہ فرض انجام دیں جو انسانوں کو سپرد ہوا ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ مجرد کسی کا نور یا نار سے پیدا ہونا یا کسی کا بن باپ کے وجود میں آنا اس کے خدا یا شریکِ خدا ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ساری باتیں ہیں اس وجہ سے مستحقِ عبادت وہی ہے جو اس ساری کائنات کا خالق ہے۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ وَلَا یَصُدَّنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۶۱-۶۲)

حضرت عیسیٰؑ کے نشانِ قیامت ہونے کے بعض پہلو

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جھگڑنے والوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ حضرت عیسیٰؑ کو جس حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ معبود یا ابن اللہ ہیں بلکہ وہ توحید کے داعی اور قیامت کا علم یعنی اس کی ایک قاطع حجت ہیں تو قیامت کے باب میں شک میں نہ پڑو اور مناظرہ بازی میں الجھنے اور الجھانے کے بجائے میری پیروی کرو۔ ہدایت اور فلاح کی سیدھی راہ یہی ہے۔

حضرت عیسٰیؑ کے قیامت کی بہت بڑی حجت ہونے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام ضابطہ کے خلاف ان کو بن باپ کے مجرد اپنے کلمۂ 'کن' سے پیدا کیا۔ مشرکین عرب کو قیامت کے باب میں سب سے بڑا شبہ یہی تھا کہ مرکھپ جانے کے بعد آخر لوگ قیامت کو کس طرح از سر نو پیدا ہو جائیں گے؟ قرآن نے ان کے اس شبہے کا ازالہ جگہ جگہ اس طرح فرمایا ہے کہ مرنے اور جینے میں اصلی دخل ظاہری اسباب کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کو ہے۔ یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دیکھ لو، پیدائش کا عام ضابطہ تو یہ ہے کہ اولاد، باپ اور ماں دونوں کے ازدواجی تعلق سے پیدا ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰیؑ کو بن باپ کے صرف ماں سے پیدا کر دیا۔ اسی طرح وہ جب چاہے گا لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اس میں ذرا بھی زحمت پیش نہیں آئے گی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں جو معجزے ظاہر ہوئے ان میں احیائے موتٰی کے معجزے بھی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے اور مٹی سے پرندوں کی مانند مورتیں بنا کر ان میں بھی پھونک مار کر زندگی پیدا کر دیتے۔ ان کے اس قسم کے معجزات کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے اور قرآن میں بھی ان کا حوالہ ہے۔ یہ معجزات اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں اس لیے ظاہر فرمائے کہ یہود قیامت کے باب میں جس بے یقینی میں مبتلا ہو گئے تھے اور جس کے سبب سے وہ بالکل دنیا کے کتے بن کر رہ گئے تھے، اس سے نکلیں اور از سر نو ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کریں۔

تیسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے آسمان کی بادشاہی اور ابدی زندگی کی منادی جس شان سے کی ہے یہ بس انہی کا حصہ ہے۔ آدمی اگر انجیلوں میں ان کے وہ مواعظ پڑھے جن میں انھوں نے آخرت کی تذکیر فرمائی ہے تو آخرت کے خوف اور شوق دونوں سے دل لبریز ہو جاتا ہے بشرطیکہ دل پر یہود کی طرح سیاہی نہ چھا گئی ہو۔

آنحضرت صلعم کی زبان سے قریش کو تنبیہ

'فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوۡنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ'۔ یعنی اس قیامت کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو اور میری پیروی کرو۔ میں جس توحید کی دعوت دے رہا ہوں اور جس روز جزا و سزا سے آگاہ کر رہا ہوں یہی زندگی کی صحیح اور سیدھی راہ ہے اس وجہ سے تمھاری فلاح میری پیروی ہی میں ہے۔ اس آیت میں لفظ 'اتَّبِعُوۡنِ' (میری پیروی کرو) اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کو کہلائی گئی ہے۔ اگر بات براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہوتی تو لفظ 'اتَّبِعُوۡنِ' موزوں نہ ہوتا۔ قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اپنی مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے لیکن کہیں بھی یہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی گئی ہے تو آیت سے پہلے 'قُلْ' یا اس مفہوم کا کوئی اور لفظ آنا تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اثنائے کلام میں کوئی بات حضرت جبریلؑ کی زبان سے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یا کسی اور قائل کی زبان سے کہلا دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس طرح کی کوئی تشریح نہیں ہے کہ قائل کون ہے۔ صرف قرینہ قائل کو معین کرتا ہے۔ یہاں لفظ 'اِتَّبِعُوْنِ' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس کے قائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں اس وجہ سے اس کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ' یہ اس تنبیہ کا حصہ ہے کہ اس امر کو کبھی نہ بھولو کہ شیطان اس صراط مستقیم کا کھلا ہوا دشمن ہے جس کی طرف میں بلا رہا ہوں۔ وہ صاف صاف اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج دے چکا ہے کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (الاعراف: ۱۶) (میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان کی گھات میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا) مطلب یہ ہے کہ میری اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم ایک ایسے دشمن سے مار کھا گئے جس کی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ہے تو یہ تمھاری بدبختی کی انتہا ہو گی۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۶۳)

حضرت عیسیٰ کی بعثت کا مقصد

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقصد بعثت اور ان کی دعوت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت واضح نشانیوں کے ساتھ آئے اور بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمھارے پاس کوئی نیا دین نہیں بلکہ وہی دین لے کر آیا ہوں جس کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی۔ البتہ حکمتِ دین، جس سے تم نے اپنے کو محروم کر لیا ہے وہ لے کر آیا ہوں تاکہ تم میں ایمانی زندگی پیدا ہو اور تاکہ بعض ان اختلافات میں امر حق واضح کر دوں جن میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔ قرینہ دلیل ہے کہ 'وَلِاُبَيِّنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے داعی نہیں تھے بلکہ وہ تورات ہی کے مصدق تھے البتہ انھوں نے حکمت یعنی روح دین اور مغز دین سے بنی اسرائیل کو آشنا کرنا چاہا لیکن انھوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی۔ بلکہ اپنی اس ظاہر پرستی میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین تو ان کے اندر سے غائب ہو گیا البتہ کچھ رسوم رہ گئے جن کو ادا کر کے وہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے دین کے تمام حقوق سے وہ سبکدوش ہو گئے۔

اختلافات کو رفع کرنے والی چیز حکمت ہے

اگر دین کی حکمت غائب ہو جائے، صرف رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ دین کے اندر طرح طرح کے اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دور کرنا ناممکن ہو جاتا

ہے۔ یہود بھی حکمتِ دین سے محروم ہو جانے کے بعد اسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے تعلیم حکمت کے ذریعہ سے ان کے ان مذہبی اختلافات کو دور کرنا چاہا لیکن یہود نے اس حکمت کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اختلافات برابر بڑھتے ہی رہے یہاں تک کہ وہ اپنے اس انجام کو پہنچ گئے جو ان کی ان ناقدریوں کا لازمی نتیجہ تھا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۶۴)

حضرت عیسٰیؑ کی اصل دعوت توحید ہے

بعینہٖ یہی مضمون صرف ایک لفظ کے معمولی فرق کے ساتھ آلِ عمران آیت ۵۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اصل دعوت بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے بھی دوسرے تمام نبیوں اور رسولوں کی طرح توحید ہی کی دعوت دی، اپنی یا کسی اور کی بندگی کی دعوت نہیں دی۔ آلِ عمران کی محولہ بالا آیت کے تحت ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ انجیلوں میں جو یہ آتا ہے کہ 'میرا باپ اور تمھارا باپ'، اسی کی تعبیر قرآن نے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو جس معنی میں اپنا باپ کہتے ہیں اسی معنی میں دوسروں کا باپ بھی کہتے تھے اور تنہا اسی کو سزاوارِ عبادت سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت بھی آلِ عمران کی تفسیر میں واضح ہو چکی ہے کہ لفظ 'اب' عبرانی میں 'باپ' کے معنی میں بھی آتا ہے اور 'رب' کے معنی میں بھی اور مشترک الفاظ کی طرح اس کا مفہوم موقع و محل سے معین ہوتا ہے۔

'هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ'۔ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے۔ اگر کسی اور کو خدا کا شریک بنا دیا جائے تو یہ سیدھی راہ کج یا مسدود ہو جاتی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۶۵)

عیسائیوں کے باہمی اختلافات

یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام نے دعوت تو نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں توحید کی دی لیکن ان کی امت کے اندر سے مختلف گروہوں نے مختلف مذہب اختیار کر لیے۔ ان اختلافات کی نوعیت اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد شمعون کے پیروؤں کے سوا دوسرے تمام فرقوں نے تثلیث اور کفارہ وغیرہ کے طریقے ایجاد کر کے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم توحید کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ موجودہ مسیحیت تمام تر پال (Paul) کی بدعات کا مجموعہ ہے اور ان بدعات کی تعبیر میں بھی مختلف گروہ ہو گئے ہیں۔

'فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ'۔ اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب کی بلا کی ہے!

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۶۶-۸۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے تو ایمان لانے والوں کے حسنِ انجام اور کفر کرنے والوں کے سوء انجام کی وضاحت فرمائی ہے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے ان لوگوں سے اعراض کا حکم دیا ہے جو اللہ کی ہدایت کا مذاق اڑاتے اور اپنے انجام سے بے فکر رہے۔ آخر میں توحید کی پھر یاددہانی کر دی ہے کہ جو لوگ شفاعتِ باطل کے بل پر آخرت سے بےخوف ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس دن ہر ایک کو سابقہ اللہ واحد ہی سے پیش آئے گا اور کسی کی سفارش کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں بنے گی ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۶-۸۹

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا

فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ
نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ قُلْ اِنْ
كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖۗ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ
يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾
وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ
الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۵﴾
وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ
شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ
خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ
هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

وقف لازم ع ۲۲ ۱۳

ترجمۂ آیات ۶۶ - ۸۹

یہ لوگ تو بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ دھمکے اور انھیں اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے بجز خدا ترسوں کے۔ ۶۶ - ۶۷

اے میرے بندو، اب تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔ جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر اور فرماں بردار رہے۔ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھارے

ہم عقیدہ، تم شاد کیے جاؤ گے۔ ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور سونے کے پیالے پیش کیے جائیں گے اور ان میں وہ چیزیں ہوں گی جو دل کو پسند اور آنکھوں کے لیے لذت بخش ہوں گی۔ اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے اپنے اعمال کے صلے میں۔ اور تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہوں گے جن میں سے تم کھاؤ گے۔ ۶۸-۷۳

بے شک مجرمین ہمیشہ عذاب دوزخ میں رہیں گے۔ وہ ان کے لیے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے۔ اور یہ ہم نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک! اب تمھارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ جواب دے گا کہ تمھیں اسی حال میں رہنا ہے۔ ۷۴-۷۷

اور ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے لیکن تمھاری اکثریت حق سے بیزار رہی۔ کیا انھوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ کیا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سن رہے ہیں؟ ہاں، ہم سن رہے ہیں اور ہمارے فرستادے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔ ۷۸-۸۰

کہہ دو کہ اگر خدائے رحمان کے کوئی اولاد ہو تو سب سے پہلا اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں گا۔ آسمانوں اور زمین کا خداوند، عرش کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دو یہ بوالفضولی اور ہنسی مسخری کر لیں یہاں تک کہ وہ اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۸۱-۸۳

اور وہی اکیلا آسمانوں میں بھی خداوند ہے اور وہی زمین میں بھی خداوند ہے اور وہی حقیقی حکیم و علیم ہے اور بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس کے اختیار میں آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کی بادشاہی ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور جن کو یہ اس کے علاوہ پکارتے ہیں وہ سفارش پر اختیار نہیں رکھیں گے مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے بھی ہوں گے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے تو پھر کہاں بھٹک جاتے ہیں! اور حق کی گواہی دینے والوں کا قول یہ ہوگا کہ اے رب! یہ لوگ خود ایمان لانے والے نہ بنے۔ تو تم ان کو نظر انداز کرو اور کہو، اچھا میرا سلام لو۔ پس یہ عنقریب خود جان لیں گے۔ ۸۴-۸۹

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۶۶)

اوپر کے دلائل بیان کرنے کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات جو نہیں سن رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں تمہاری تذکیر و موعظت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کا رویہ شاہد ہے کہ یہ لوگ متنبہ ہونے اور آخرت کے لیے کچھ کمائی کرنے کے بجائے چاہتے ہیں کہ قیامت ان کے اوپر اس طرح اچانک آ دھمکے کہ اس کی ان کو خبر بھی نہ ہو۔ اگر یہ یہی چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اللہ نے تو یہ چاہا تھا کہ اس ہولناک دن کے آنے سے پہلے پہلے یہ اس کے لیے کچھ کمائی کر لیتے لیکن یہ اس کا استقبال اچانک ہی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے فکرمند ہونا بے سود ہے۔ اپنی اس بے فکری کا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (۶۷)

روز قیامت کی نفسی نفسی

یعنی اس دنیا میں تو ان کو اپنے دوستوں، مددگاروں، اپنی قوم و قبیلہ اور اپنے شرکاء و شفعاء پر بھروسا ہے اور اسی بھروسے نے انھیں آخرت سے بالکل نچنت کر رکھا ہے لیکن آگے جو دن

آنے والا ہے اس دن کوئی قریبی سے قریبی رشتہ دار اور عزیز سے عزیز دوست بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا بلکہ یہ سارے دوست آخرت میں باہمدگر دشمن بن جائیں گے کہ ان کی یہ باہمی دوستی ہی ان کے لیے اس ابدی تباہی کا موجب ہوئی۔ اگر یہ ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملانے والے نہ ہوتے بلکہ اپنے خیر و شر پر آزادی و سنجیدگی سے غور کرتے تو نبی اور اس کے ساتھیوں کے کلمۂ خیر کی برکت سے محروم نہ رہتے۔ اس دن ہر شخص اپنی اس محرومی پر سر پیٹے گا اور اپنے ساتھی کو ملامت کرے گا لیکن یہ سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔ پیچھے آیات ۳۶-۳۹ میں یہ مضمون نہایت عمدہ اسلوب سے بیان ہو چکا ہے۔

'اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ' یعنی خدا کے باایمان اور متقی بندے اس انجامِ بد سے محفوظ رہیں گے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو حق و عدل کی نصیحت کی اور اسی پر خود بھی عامل رہے اس وجہ سے قیامت کے دن وہ اپنی کامیابی پر شادماں ہوں گے اور اپنے ساتھیوں کا سلام و تحیت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ (۶۸-۷۰)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے متقی بندوں کو مبارکباد

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان متقی بندوں کو مبارک باد دی جائے گی کہ اے میرے بندو! اب تم خوف اور حزن کے دارالابتلاء سے نکل کر اس ابدی بادشاہی میں داخل ہو گئے جس میں نہ تم کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ تم کسی حزن میں مبتلا ہو گے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ 'خوف'، مستقبل کے خطرات کا ہوتا ہے اور 'حزن'، حاضر و ماضی کی ناکامیوں اور صدمات کا۔ جنت ایسی جگہ ہے جہاں اہل ایمان ان دونوں ہی چیزوں سے محفوظ ہوں گے اس وجہ سے جنت کی تعبیر کے لیے یہ ایک نہایت جامع اسلوب ہے۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ' یہ متقی بندوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں جن کی بنا پر وہ اس اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے ـــــ ان صفات کے بیان سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرما دیا کہ اس مقامِ بلند کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جو آج ہماری آیات پر ایمان لائے اور صدقِ دل سے ہمارے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں لیکن خلوصِ دل سے اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں وہ اس بشارت کے اہل نہیں ہیں۔

'اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ'۔ 'حبر' کے معنی خوش اور شاد کرنے کے ہیں۔

لفظ 'ازواج' کی تحقیق

لفظ 'اَزْوَاج'، قرآن مجید میں بیویوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور بعض دوسرے معنوں میں

بھی۔ مثلاً نوع بنوع اور گوناگوں کے معنی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (۵۳) (اور اس نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس سے اگائیں مختلف نباتات کی نوع بنوع قسمیں)۔

اسی طرح یہ ہم مسلک و ہم مشرب جماعتوں کے مفہوم میں بھی قرآن میں آیا ہے۔ مثلاً

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ .... (الحجر: ۸۸)	اور تم اپنی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہ اٹھاؤ جن سے ہم نے ان کی بعض جماعتوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے۔
اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (الصّٰفّٰت: ۲۲)	جمع کرو ان لوگوں کو جنھوں نے شرک کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان چیزوں کو جن کی یہ عبادت کرتے رہے ہیں۔
وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (الواقعۃ: ۷)	اور اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم ہوگے۔

ان نظائر کی روشنی میں ہمارا خیال یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں بھی لفظ 'ازواج' ہم مسلک و ہم عقیدہ جماعتوں کے مفہوم میں آیا ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اسی مفہوم کا لحاظ رکھا ہے۔ اگرچہ مدارج ایمان و عمل کے اعتبار سے مختلف ہوں گے لیکن اللہ کے تمام باایمان بندے جنت کی نعمتوں سے محظوظ و مسرور ہوں گے۔ اوپر کفار کے ہم مشربوں اور ان کے دوستوں کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال بیان ہوا کہ وہ مسرور و شادکام کیے جائیں گے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۷۱)

'صِحَاف' کے معنی 'طشتریوں' کے ہیں، 'اکواب' کے معنی 'پیالوں' کے۔ لفظ 'ذھب' جس طرح 'صحاف' کے ساتھ آیا ہے اسی طرح 'اکواب' کے ساتھ بھی ہے لیکن تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف فرما دیا ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی غلمانِ جنت ان کی تواضع و ضیافت کے لیے ان کے سامنے سونے کی طشتریاں اور جام لیے ہوئے ہر وقت گردش میں ہوں گے۔

'وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ'۔ ان طشتریوں اور پیالوں میں کھانے اور پینے کی وہ چیزیں ہوں گی جو دل پسند بھی ہوں گی اور باصرہ نواز بھی۔ بعض چیزیں ذائقہ کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں لیکن دیکھنے میں اچھی نہیں لگتیں۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کی ضیافت ایسی

نعمتوں سے فرمائے گا جو کام و دہن کے لیے بھی لذت بخش ہوں گی اور نگاہوں کے لیے بھی۔

وَاَنۡتُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ۔ اوپر کی بات غائب کے اسلوب میں فرمائی گئی ہے اور یہ حاضر کے اسلوب میں۔ اسلوب کی یہ تبدیلی التفات خاص کی دلیل ہے۔ یعنی خاص اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کو بشارت دے گا کہ اطمینان رکھو، یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہوا ہے یہ کوئی وقتی عزت افزائی نہیں ہے بلکہ اب تم اسی جنت میں ہمیشہ رہو گے۔ کسی بڑی سے بڑی نعمت کے متعلق بھی اگر یہ اندیشہ ہو کہ یہ وقتی اور عارضی ہے تو یہ چیز سارے عیش کو مکدر کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ اطمینان دلا دے گا کہ اب بے غل و غش اس جنت سے فائدہ اٹھاؤ۔ اب کوئی تمھیں اس سے محروم نہیں کر سکتا۔

وَتِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۷۲)

جنت مجرد انعام کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ملے گی

اوپر والی بشارت سے بھی بڑی بشارت اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو یہ دے گا کہ یہ جنت تمھارے اعمال کے صلہ میں تم کو عطا ہوئی ہے۔ یعنی یہ محض تم پر انعام نہیں بلکہ یہ تمھارا حق بھی ہے۔ اگر کوئی عزت افزائی بلا استحقاق ہو تو دل کو اس سے سچی خوشی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے اس وجہ سے اس نے جنت کو مجرد فضل و احسان کے بجائے اہلِ جنت کا حق اور ان کی ان محنتوں کا ثمرہ قرار دیا ہے جو حق کی راہ میں انھوں نے دنیا کے اندر جھیلی ہیں۔

لَكُمۡ فِیۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِیۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ (۷۳)

اوپر آیت ۷۱ میں اہلِ جنت کے ماکولات و مشروبات کا ذکر تھا۔ یہ ان کے تفکہات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی لطف اندوزی کے لیے بے شمار قسم کے میوے ہوں گے ان میں سے جس میوے سے چاہیں گے لطف اٹھائیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہو گا کہ اس ذخیرے میں کوئی کمی ہو جائے گی۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ (۷۴)

اہلِ دوزخ کے لیے ابد کا اسیری

متقی بندوں کے انجام کے ذکر کے بعد اب مجرموں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ ہمیش دوزخ کے عذاب ہی میں رہیں گے۔ اس سے ان کو کبھی رہائی نہیں نصیب ہو گی۔

لَا یُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِیۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ (۷۵)

یہ عذاب ان پر اس طرح مسلط ہو گا کہ اس سے نجات پانا تو درکنار کبھی عارضی اور وقتی طور پر بھی نہ وہ ٹالا جائے گا اور نہ اس میں کوئی تخفیف ہی ہو گی۔ وَهُمۡ فِیۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ، وہ اس میں بالکل مایوس ہوں گے۔ آخری درجے میں یہ موہوم امید بھی کبھی سہارا بن جاتی ہے کہ شاید اس عذاب سے کبھی رہائی حاصل ہو جائے یا کبھی اس میں کوئی تخفیف ہی ہو جائے لیکن ان بدبختوں کے لیے اس طرح کا کوئی موہوم سہارا بھی نہ ہو گا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۷۶)

یعنی اس صورتِ حال سے ان کو جو سابقہ پیش آئے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ اس کے اسباب انھوں نے خود فراہم کیے اس وجہ سے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ان کی ہدایت کے لیے جو اہتمام ضروری تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی بلکہ ساری زندگی اپنی خواہشوں کی غلامی میں گزاری جس کے نتیجہ میں اس انجام سے دوچار ہوئے۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (۷۷)

اہلِ دوزخ کی فریاد جہنم کے داروغہ سے اور اس کا جواب

آیت ۷۵ میں ان کی جس ابدی مایوسی کا ذکر ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ وہ دوزخ کے جیلر سے کہیں گے کہ اے مالک! اگر ہمارے لیے کسی رحم کی گنجائش نہیں رہی تو اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کرو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ فوراً جواب دے گا کہ تمھارا خاتمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ تمھیں اسی حال میں پڑے رہنا ہے۔ مایوس کے لیے آخری سہارا موت کا سہارا ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اس سہارے سے بھی محروم ہوں گے اور یہ ان کی سب سے بڑی محرومی ہوگی۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (۷۸)

قریش کو تنبیہ

مجرمین کا انجام سنانے کے بعد یہ پھر قریش کو تنبیہ ہے کہ ہم نے قرآن کی شکل میں تمھارے سامنے حق پیش کر دیا ہے لیکن تمھاری اکثریت کا حال یہ ہے کہ حق تمھیں بہت ناگوار ہے۔ اگر یہ ناگوار ہے تو اس کا جو انجام تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کو اچھی طرح سوچ لو۔ اب اس انجام سے تم کو دوچار ہونا پڑا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ظلم نہیں ہوگا بلکہ تم خود اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے ہو گے۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۷۹)

'ابرام' کے معنی کسی امر کو محکم کرنے کے ہیں۔ 'ابرم الحبل' کے معنی ہوں گے رسی کو اچھی طرح مضبوط بٹنا۔ یہاں یہ کسی بات کا قطعی فیصلہ کر لینے کے مفہوم میں آیا ہے۔

قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی

یہ قریش کو فیصلہ کن عذاب کی دھمکی دی ہے اور دھمکی میں شدت پیدا کرنے کے لیے اسلوب اچانک حاضر سے غائب کا اختیار کر لیا ہے گویا وہ لائق خطاب و التفات نہیں رہے۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو لازماً ہم بھی ایک قطعی فیصلہ کر لیں گے۔ یعنی انھوں نے اگر قرآن اور رسول کی تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کے بعد اپنی سنت کے مطابق ہم بھی ان کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ کر لیں گے۔

رسولوں کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہے کہ جب

قوم رسول کے اخراج یا اس کے قتل کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو مزید مہلت نہیں دیتا بلکہ رسول اور اس کے باایمان ساتھیوں کو اپنی امان میں لے لیتا اور قوم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہاں اسی سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ لوگ رسول کی تکذیب کے معاملے میں یکسو ہو گئے ہیں تو اب لازماً یہ سنت الٰہی کی زد میں بھی آ جائیں گے اور کوئی چیز اس سے ان کو بچانے والی نہیں بنے گی۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ قوم جب تک رسول کی دعوت کے باب میں مذبذب رہتی ہے اس وقت تک تو اللہ تعالیٰ اس کو مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ داعی اور دعوت کو ختم کر دینے کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے باب میں خدا کا آخری فیصلہ بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ط بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ (۸۰)

خفیہ سرگوشیوں کی طرف اشارہ

اللہ تعالیٰ یوں تو لوگوں کے ہر راز اور ان کی ہر سرگوشی کو جانتا ہے لیکن سیاق و سباقِ کلام یہاں دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر ان سرگوشیوں کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈر دار الندوہ وغیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا اخراج سے متعلق کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ خدا ان کی سازشوں اور سرگوشیوں سے بے خبر ہے۔ وہ ان کی تمام خفیہ حرکتوں سے اچھی طرح باخبر ہے اور اس کے فرشتے ان کی ایک ایک بات کا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ یہ جس وقت پیغمبر کے باب میں اپنا آخری فیصلہ کر لیں گے خدا کا فیصلہ بھی ان کے باب میں ظہور میں آ جائے گا۔ پھر ان کے تمام منصوبے دھرے رہ جائیں گے اور خدا کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ق فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ ۝ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۸۱-۸۲)

ابتدائے سورہ کے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیصلہ کن بات

یہ آخر میں، ابتدائے سورہ کی اس بحث کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جو فرشتوں کی الوہیت کے ابطال میں گزر چکی ہے، ایک فیصلہ کن بات کا اعلان فرمایا کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ خدا کوئی اولاد بھی رکھتا ہے تو تم سے پہلے اس کی عبادت کے لیے میں خود تیار ہوں لیکن آسمانوں اور زمین اور عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی طرف بغیر کسی دلیل کے منسوب کر رہے ہیں وہی تنہا ان تمام چیزوں کا خالق اور وہی اکیلا اس ساری کائنات کا مالک اور اس کے عرشِ حکومت پر بلا شرکتِ غیرے حکمران ہے۔ نہ وہ کسی بیٹے کا محتاج ہے، نہ کسی بیٹی کا اور نہ کسی معاون اور شریک کا۔

فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا حَتّٰى یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ (۸۳)

یعنی یہ فیصلہ کن چیلنج دے کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جو باتیں یہ چاہیں بنا لیں اور جو ہنسی مسخری کرنی چاہیں کر لیں، یہاں تک کہ وہ دن ان کے سامنے آ جائے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے

اس دن ان پر ساری حقیقت کھل جائے گی کہ جن کو انھوں نے خدا کی اولاد بنا کر پوجا وہ ان کے کچھ کام آنے والے نہیں بنے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (۸۴)

یعنی وہی تنہا آسمانوں کا بھی خداوند ہے اور وہی زمین کا بھی خداوند ہے اور تنہا اسی کا حکم و ارادہ ان دونوں کے اندر کارفرما ہے۔ ان کا باہمی توافق دلیل ہے کہ یہ ایک ہی قادر و قیوم کی مشیت کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اگر ان کے اندر متعدد ارادے کارفرما ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ'۔ وہ حکیم و علیم ہے۔ نہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہوتا اور نہ وہ اپنی معلومات کے لیے کسی کی مدد کا محتاج ہے اس وجہ سے شفاعتِ باطل کا عقیدہ جس کی آڑ میں مشرکین آخرت سے نچنت بیٹھے ہیں، بالکل بے سود ہے۔ یہ عقیدہ اس کی حکمت اور اس کے علم کی نفی ہے۔

وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۵)

'تَبَارَكَ'، میں خدا کی عظمت کا پہلو بھی ہے اور اس کے سراپا خیر و برکت ہونے کا پہلو بھی۔ اس کے باعظمت اور بابرکت ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسی سے ڈرا بھی جائے اور اسی سے امید بھی رکھی جائے۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا بادشاہ ہے اس وجہ سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے سامنے دم مار سکے یا اس کی مشیت میں کوئی دخل اندازی کر سکے۔ ساتھ ہی وہ عظیم رحمت و برکت والا ہے اس وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے لیے اس کی رحمت متقضی ہو گی۔ اس رحمت کے لیے بندے کسی اور کی سفارش کے محتاج نہیں ہیں۔

'وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ'۔ قیامت کی گھڑی کا صحیح علم صرف اسی کے پاس ہے اگر پیغمبر اس کا وقت نہیں بتا سکتے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ آئے گی ہی نہیں۔ اس کا آنا برحق ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ تم کو لوٹنا اسی کی طرف ہے اس کے سوا اس دن کوئی اور مرجع نہیں ہو گا کہ تم اس سے کوئی امید باندھو۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۸۶)

یہ 'وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ' کی وضاحت ہے یعنی مشرکین اس وہم باطل میں مبتلا ہیں کہ ان کے مولیٰ و مرجع ان کے مزعومہ شرکا و شفعاء ہوں گے جو سفارش کر کے ان کو خدا سے چھڑا لیں گے۔ فرمایا کہ جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت پر کوئی اختیار نہیں رکھیں گے۔ اس دن فیصلہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہو گا اور وہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔ 'وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ' (المومن: ۲۰) (اور اللہ بالکل حق کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور جن کو یہ خدا کے سوا

پکارتے ہیں وہ کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں کریں گے)۔

جو گواہی دے گا سچی گواہی دے گا۔

'اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ' یہ استثنائے منقطع ہے۔ یعنی اس دن سفارش کا اختیار تو کسی کو بھی نہیں ہوگا البتہ اللہ تعالیٰ جن کو اجازت مرحمت فرمائے گا وہ حق بات کی گواہی دیں گے اور وہ گواہی اُسی بات کی ہوگی جس کو وہ جانتے ہوں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ خدا کے سامنے سفارش کے لیے صرف وہ لوگ زبان کھولیں گے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی اور اسی کے لیے زبان کھولیں گے جس کے باب میں ان کو اجازت ملے گی۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے 'يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا' (۱۰۹) (اس دن شفاعت کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اس دن جو بھی بات کرے گا اول تو خدا کے اذن کے بعد ہی بات کرے گا۔ پھر وہ وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل ٹھیک ہوگی۔ سورۂ نبا میں ہے۔ 'يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا' (۳۸) (اور جس دن جبریل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے، وہ نہیں بات کریں گے مگر جس کو خدائے رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا)۔ اسی طرح اس بات کی بھی تصریح ہے کہ خدا کے مقرب بندے بھی زبان سے صرف وہی بات نکالیں گے جو ان کے علم میں ہوگی، جو بات ان کے علم سے باہر ہوگی اس کے باب میں وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۷ میں حضرت عیسیٰؑ کا قول گزر چکا ہے کہ 'وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ' (میں ان کے اوپر گواہ رہا جب تک ان کے اندر رہا)۔ یعنی میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اس کو تو ہی جانتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی گواہی صرف اس دور سے متعلق ہوگی جو ان کے سامنے گزرا ہے۔ بعد کے ادوار کے لوگوں کے متعلق وہ کچھ نہیں کہیں گے اس لیے کہ ان کے حالات سے وہ ناواقف ہوں گے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۸۷)

یہ مشرکین کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ وہ اللہ کے مقابل میں دوسروں کو شفاعت کا مجاز سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو اس کا جواب بہر شکل وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے! اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد معلوم نہیں ان کی مت کہاں ماری جاتی ہے کہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کے مزعومہ معبودوں کو خدا کے ہاں تقرب کا وہ مقام حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اور جس کو چاہیں گے اپنی سفارش سے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرا دیں گے۔

وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

'وَقِيْلِهٖ' کا معطوف علیہ

'وَقِيْلِهٖ' کا عطف اوپر والی آیت میں 'بِالْحَقِّ' پر ہے۔ یعنی وہ صرف حق بات کہیں گے

اور ان کی شہادت یہ ہوگی کہ اے رب! ان کے ایمان نہ لانے میں اصلی قصور انہی کا ہے، یہ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بیچ کی آیت محض استدراک کے طور پر بطور جملہ معترضہ آگئی تھی اس وجہ سے معطوف اور معطوف علیہ میں کوئی معنوی بُعد نہیں پیدا ہوا۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ مشرکین قیامت کے دن اپنے جن مزعومہ شرکاء کو اپنی ضلالت کے لیے بطور عذر پیش کریں گے وہ شرکاء ان کے اس الزام کو ان کے منہ پر پھینک ماریں گے۔ مثلاً فرشتوں کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ یہ مشرکین مدعی ہیں کہ وہ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں تو کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟ فرشتے اس سوال کے جواب میں صاف اظہار براءت کریں گے کہ یہ خود اس ضلالت کے ذمہ دار ہیں، ان کی اس گمراہی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ ۝ (سبا: ۴۰-۴۱)	اور اس دن کا خیال کرو جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ تو ہر عیب سے پاک ہے، تو ان کے مقابل میں ہمارا کارساز ہے، بلکہ یہ لوگ تو جنوں کو پوجتے رہے ہیں اور ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھنے والوں کی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادتِ حق ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ (المائدۃ: ۱۱۶)	جب اللہ پوچھے گا، اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں کو یہ حکم دیا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بناؤ؟ وہ جواب دیں گے، تو پاک ہے! میرے لیے کس طرح ممکن تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے اس طرح کی کوئی بات کہی تو تو اس کو جانتا ہی ہوگا۔

یہی حقیقت سورۂ احقاف میں یوں واضح فرمائی گئی ہے۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ	اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کے سوا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى	ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جو ان کو قیامت تک
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ	جواب دینے والی نہیں ہیں اور وہ ان کی بندگی
غٰفِلُوْنَ ○ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا	سے بالکل بے خبر ہیں اور جب لوگ اکٹھے کیے
لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ	جائیں گے تو وہ ان کے دشمن بنیں گے اور ان کی
كٰفِرِيْنَ (الاحقاف : ۵ - ۶)	بندگی کا انکار کریں گے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۸۹)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ یہ لوگ اگر اپنا آخری انجام ہی دیکھنے کے درپے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور ان سے اسی طرح درگزر کرو جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے درگزر کیا۔ 'سَلٰمٌ' یہاں 'وِدَاع' کے مفہوم میں ہے۔ 'فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ' یعنی جس انجام کے یہ منتظر ہیں اس کے ظاہر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ وہ اس کو عنقریب دیکھ لیں گے۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۲۲- اپریل ۱۹۷۶ء

۲۱ - ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۴

الدّخان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

اس سورہ کا قرآنی نام وہی ہے جو سابق سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی اصل مدعا کے اعتبار سے تقریباً وہی ہے جو سابق سورہ کی ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں توحید کے دلائل کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں توحید کے دلائل کے بجائے انذار کا پہلو غالب ہے۔ پوری سورہ پر تدبّر کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں قرآن اور رسالت کا اثبات اس پہلو سے ہے کہ قرآن منکرین کو جس انجام کی خبر دے رہا ہے وہ دنیا میں بھی شدنی ہے اور آخرت میں بھی۔ تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے اور یہی عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف ۔ ۸۹) (ان کو نظر انداز کرو اور کہو میرا سلام لو، پس یہ عنقریب جان لیں گے) اس سورہ میں اسی تہدید کے دلائل و قرائن کی وضاحت ہے۔ گروپ کی آگے کی سورتوں میں یہ مضمون زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ گروپ کے آخر میں جو مدنی سورتیں ہیں ان میں قریش کے عزل اور اہلِ ایمان کی نصرت اور ان کے غلبہ کا بالکل قطعی الفاظ میں اعلان فرما دیا گیا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۶) قرآن کی عظمت و شان اور اس کے اہتمام نزول کی طرف اشارہ کہ یہ مبارک لیلۃ القدر میں اتارا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمام امورِ مصلحت کی تقسیم ہوتی ہے۔ یہ خدائے سمیع و علیم کی رحمت و ربوبیت کے تقاضوں سے ظہور میں آیا ہے جس کے سوا کوئی رب نہیں اور مقصود اس کے اتارنے سے انذار ہے کہ جو لوگ غفلت میں پڑے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں وہ جاگیں اور جو دن آنے والا ہے اس کے لیے تیاری کریں۔ جو لوگ رسول کی صداقت کے لیے یہ شرط ٹھہراتے تھے کہ ان کو عذاب دکھا دیا جائے، ان کو تنبیہ کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد جو ایمان لایا جاتا ہے وہ سودمند نہیں ہوتا۔ اگر عذاب کے آنے میں اس وقت تاخیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عذاب کی دھمکی محض دھمکی ہے۔ اگر اللہ نے یہاں لوگوں کو مہلت دے بھی دی تو اس سے وہ خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں ہو جائیں گے۔ ان کی پکڑ لازماً آخرت میں

ہوگی اور وہ بڑی ہی سخت پکڑ ہوگی۔

(۱۷-۳۳) قریش کی عبرت کے لیے فرعون اور قوم فرعون کے انجام کی مثال۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو انذار کیا لیکن وہ اپنے مال و جاہ کے غرّے میں مبتلا رہے۔ بالآخر اتمام حجّت کی مہلت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا۔ ان کے تمام ملک و مال پر دوسرے لوگ قابض ہوگئے اور بنی اسرائیل، جو ان کی غلامی کے شکنجہ میں سسک رہے تھے، غلامی سے چھوٹ کر دنیا کی ایک عظیم قوم بن گئے۔

(۳۴-۵۷) قریش کے تمرّد کے اصل سبب کا بیان کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے ان کو آخرت کا ڈراوا ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تنبیہ کے لیے جزا و سزا کے عقلی اور تاریخی دلائل کی طرف اجمالی اشارہ اور اس امر کی تفصیل کہ آخرت سے بے پروا ہو کر زندگی گزارنے والوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یکساں نہیں ہوگا بلکہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوگا اور یہ بالکل مبنی بر انصاف ہوگا۔ اہلِ کفر اپنی ناشکریوں کی سزا بھگتیں گے اور اہلِ ایمان اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے اور یہی اصل کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر یہ نادان ریجھے ہوئے ہیں۔

(۵۸-۵۹) خاتمۂ سورہ، جس میں اس احسانِ عظیم کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے جو قرآن کو عربی مبین میں نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش اور اہلِ عرب پر فرمایا۔ واضح رہے کہ قرآن کی عظمت کے بیان ہی سے اس سورہ کا آغاز ہوا تھا اور اسی مضمون پر اس کا خاتمہ بھی ہوا ہے۔ اس میں قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ ان پر اتمامِ حجت کے لیے اللہ نے اس کتاب کو تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے بھیجا ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیں جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقدّر ہے۔ آخری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کے لیے اب اس روزِ بد ہی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ الدُّخَانِ

مَكِّيَّةٌ ———— آیات : ۵۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۶

حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝٣ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝٤ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝٥ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ (وقف لازم) اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝١٠ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١١ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝١٢ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝١٣ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝١٤ ۘ (وقف لازم) اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝١٥ ۘ (وقف لازم) يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝١٦

ترجمۂ آیات ۱-۱۶

یہ حٰم ہے۔ قسم ہے واضح کر دینے والی کتاب کی۔ بے شک اس کو ہم نے

ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے تھے۔ اس رات میں تمام پُرحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے امر سے۔ بے شک ہم رسول بھیجنے والے تھے، خاص تیرے رب کی رحمت سے۔ بے شک سننے جاننے والا وہی ہے۔ اس رب کی رحمت سے جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا خداوند ہے اگر تم یقین کرنے والے بنو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، تمھارا بھی رب اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب۔ ۱-۸

بلکہ وہ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ پس انتظار کرو اس دن کا جس دن آسمان ایک کھلے ہوئے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہوگا۔ وہ دھواں لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے! اے ہمارے رب! ہم سے عذاب دور کر دے، ہم ایمان لانے والے بنے۔ اب ان کے لیے نصیحت پکڑنے کا کہاں موقع باقی رہا! ان کے پاس تو ایک واضح کر دینے والا رسول آچکا تھا تو انھوں نے اس سے منہ موڑا اور کہا کہ یہ تو ایک سکھایا پڑھایا خبطی ہے۔ ہم کچھ وقت کے لیے اس عذاب کو کھول بھی دیں تو تم لوٹ کر وہی کرو گے جو کرتے رہے تھے۔ یاد رکھو جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ اس دن ہم پورا بدلہ لے کر رہیں گے! ۹-۱۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ (۱)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے اور یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ ناموں کا اشتراک مطالب کے اشتراک کی دلیل ہوتا ہے چنانچہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سابق سورہ کی آخری آیت میں قریش کو تکذیبِ رسول کے جس انجام کی دھمکی دی ہے اس سورہ میں اسی دھمکی کی تفصیل ہے۔ آگے کی آیات سے اس کی

پوری وضاحت ہو جائے گی۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

'و' یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ عربی میں قسم کا اصل مقصد کسی دعوے پر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقسم علیہ کیا ہے؟ عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس کا مقسم علیہ بعد والی آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ..... کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ زبان کے قواعد کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں ہے لیکن مجھے اس پر پورا اطمینان نہیں ہے۔ قسم اور مقسم علیہ میں تعلق دلیل اور دعوے کا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کا کتاب مبین ہونا اس بات کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے۔ میرے نزدیک یہاں مقسم علیہ محذوف ہے، قرینہ اور موقع کلام اس محذوف پر دلیل ہے۔ بربنائے قرینہ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی نظیریں بہت ہیں۔ ایک واضح نظیر سورۂ قٓ میں موجود ہے۔ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ... (۱-۲) (یہ سورۂ قٓ ہے، شاہد ہے قرآنِ بزرگ! بلکہ انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک شخص منذر بن کر اٹھا) ظاہر ہے کہ یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ اسی طرح آیت زیرِ بحث میں بھی مقسم علیہ محذوف ہے۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں وہ ساری بات محذوف مانی جا سکتی ہے جس کے لیے موقع کلام مقتضی ہو۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو گویا پوری بات یوں ہوگی کہ یہ واضح کتاب، جو اپنے دعوے پر خود حجت قاطع ہے، اس بات کی شاہد ہے کہ یہ جھٹلانے والوں کو جس انجامِ بد سے ڈرا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے، جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے اس کو خبطی یا دیوانہ نہ سمجھو بلکہ وہ ایک رسول مبین ہے، اس کی دعوت تمام تر حکمت پر مبنی ہے۔ اس کو قبول کرنا باعثِ رحمت اور اس کو رد کرنا باعثِ نقمت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان باتوں کی دلیل ڈھونڈنے کے لیے قرآن سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے کے لیے یہ کتاب خود کافی ہے۔ جو لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (۳)

یہ اس اہتمام خاص کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کے لیے فرمایا۔ مقصود اس اہتمام کے ذکر سے مخاطبوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کو کوئی ہنسی مسخری کی چیز یا کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم اسکیم کا ایک نہایت عظیم حصہ ہے اور اس کے اتارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ مبارک شب منتخب فرمائی جو اس کی طرف سے تمام امورِ حکمت کی تقسیم کے لیے خاص کی ہوئی ہے۔ مقصود اس کے اتارنے سے ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے آباء و اجداد کو انذار

نہیں کیا گیا تھا تاکہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن وہ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو انذار کے بغیر ہی پکڑ لیا گیا۔ اس اہتمام خاص کے بعض اور پہلو بھی ہیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ جن اور سورۂ قدر کی تفسیر میں آئے گی۔

'لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر ہے، چنانچہ سورۂ قدر میں یہ تصریح موجود ہے کہ اسی رات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۱-۵) (ہم نے اس کو اتارا ہے لیلۃ القدر میں۔ اور تم کیا سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا ہے! لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں ملائکہ اور جبریل اترتے ہیں، ہر باب میں اپنے رب کے اذن کے ساتھ۔ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے۔ وہ طلوع فجر تک ہے)۔

یہ لیلۃ القدر لازماً رمضان شریف ہی کی کوئی رات ہو سکتی ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ رمضان ہی کے مہینہ میں قرآن نازل ہوا۔ 'شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ .....' (البقرۃ: ۱۸۵) (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)۔

رہا یہ سوال کہ یہ رمضان کی کون سی رات ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ روایات کی روشنی میں صرف اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرہ کی کوئی رات ہے۔ تعیین کے ساتھ اس کے ظاہر نہ کرنے میں مصلحت الٰہی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بندے اس کی جستجو کریں اور اس طرح ان کے ذوق و شوق اور طلب و تمنا کا امتحان ہو۔ بندوں کی اس طلب و تمنا کے اندر ہی اس لیلۃ القدر کی تمام برکتوں کا راز مضمر ہے۔

ان تصریحات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اس سے شعبان یا کسی اور مہینہ کی کوئی رات مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس رات میں قرآن کے اتارے جانے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن اسی شب میں اتار دیا گیا ہو بلکہ یہ اس کے مبارک آغاز کا پتا دیا گیا ہے۔ جب ایک کام کا آغاز ایک مبارک ساعت میں ہو گیا اور اس کے پورے کیے جانے کا فیصلہ بھی ہو گیا تو گویا وہ کام اسی مبارک ساعت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی دوسرا تبدیل نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس اسلوبِ تعبیر کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں پورے ہونے والے وعدے ماضی کے صیغے سے بیان کیے ہیں۔

'لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ'، کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ خاص خاص دنوں، مہینوں اور اوقات کا مبارک

ہونا ان کی روحانی زرخیزی اور فیض بخشی کے پہلو سے ہے۔ جس طرح ہماری اس مادی دنیا میں موسموں
اور فصلوں کا لحاظ ہے، ہر موسم ہر چیز کی کاشت کے لیے موزوں نہیں ہوتا، اسی طرح روحانی عالم
میں بھی ساعات و اوقات، سالوں اور مہینوں کا اعتبار ہے۔ جو عبادت اللہ تعالیٰ نے جس وقت،
جس دن اور جس مہینہ کے ساتھ وابستہ کر دی ہے اس کی حقیقی برکت اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے
جب وہ اسی وقت یا اسی دن یا اسی مہینہ کی پابندی کے ساتھ کی جائے۔ ورنہ جس طرح بے موسم کی
بوئی ہوئی گندم بے حاصل رہتی ہے اسی طرح بے وقت کی نماز، بے وقت کے روزے اور بے موسم کے
حج کا بھی کچھ حاصل نہیں اور اگر ہے تو بہت تھوڑا۔ ہمارے چوبیس گھنٹوں کے اوقات میں فجر، چاشت،
ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات روحانی اعتبار سے اپنے اندر ایک خاص برکت رکھتے ہیں۔
قرآن اور حدیث میں ان کی یہ برکت واضح فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح ہفتہ کے دنوں میں سے جمعہ کے دن
کو روحانی فیض بخشی کے اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے جو کسی دوسرے دن کو حاصل نہیں ــــ
ــــ سال کے بارہ مہینوں میں سے رمضان یا حج کے مہینوں کو جو شرف خصوصی حاصل ہے
اس میں دوسرے مہینے ان کے شریک و سہیم نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں میں
سے ایک رات اللہ تعالیٰ نے مخصوص کر دی ہے جس میں وہ اپنے ملائکہ مقربین کے ذریعہ سے اس دنیا
میں مامور ملائکہ کو اپنے سال بھر کے پروگرام سے آگاہ فرماتا ہے کہ وہ ہر حکم کو اس کے مقررہ وقت پر
نافذ کریں۔ اسی طرح کی ایک رات میں رب العزت نے قرآن نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں
کو انذار کیا جائے اور اس دنیا کی ہدایت کے لیے ایک آخری رسول کی بعثت کی شکل میں جو رحمت مقدر
تھی وہ ظہور میں آئے۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس قرآن کا نزول نہ کوئی اتفاقی واقعہ
ہے، نہ یہ کوئی بے وقت کی راگنی ہے، نہ یہ بے موسم کا کوئی خود رَو پودا ہے، نہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے؛
بلکہ یہ اس اسکیم کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے پسند فرمائی ہے۔
چنانچہ اس مبارک رات میں اس کو اس نے اتارا ہے جو تمام امورِ حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے۔
پس جن لوگوں کے لیے یہ اتاری گئی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے شایانِ شان اس کی قدر کریں ورنہ
یاد رکھیں کہ جو چیز اللہ نے اس شان و اہتمام کے ساتھ اتاری ہے اس کی ناقدری وہ کبھی معاف نہیں
فرمائے گا۔ یہ کوئی ہوائی چیز نہیں ہے کہ یہ اس کو مذاق میں اڑا دیں اور یہ اڑ جائے۔ اس کی تصدیق
یا تکذیب دونوں ہی چیزیں نہایت اہم نتائج کی حامل ہیں اور یہ نتائج لازماً سامنے آکے رہیں گے۔

ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت

'اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ'۔ یہ قرآن کے مقصد نزول کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات
رہی ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کو ان کی نافرمانیوں پر ہلاک کرنے سے پہلے ان کو تمام خیر و شر سے آگاہ کر

دیا گیا اسی طرح اہلِ عرب کو بھی ان کی نافرمانیوں پر سزا دینے سے پہلے اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تاکہ ان میں سے جو ہدایت قبول کرنا چاہیں وہ ہدایت قبول کرلیں اور جو ہدایت نہ قبول کریں ان کے لیے کوئی عذر نہ باقی رہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کا نزول اور اس رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے ہے اور سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اتمامِ حجت کے بعد کسی قوم کو مہلت نہیں ملا کرتی اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ جو قدم اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک فیصلہ کن مرحلہ اس کے سامنے ہے۔ اس کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے ـــــ ابدی بادشاہی یا ابدی ہلاکت!!

فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ (۴)

مخاطبوں کو ایک تنبیہ

یہ اسی شبِ مبارک کی تعریف ہے کہ اس میں تمام مبنی بر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس آیت کو اگر سورۂ قدر کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کو زمین سے متعلق تمام امور کلیہ سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ ان سے زمین میں مامور ملائکہ کو آگاہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے نقشہ کے مطابق اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

'اَمۡر' کے ساتھ 'حَکِیۡم' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر کسی قوم پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ مخاطبوں کو تنبیہ ہے کہ اس وقت جو مرحلہ تمھارے سامنے ہے اس کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کرو۔ اگر تم نے لاابالیانہ روش اختیار کیے رکھی اور خدا کی ایک مبنی بر حکمت اسکیم کے تقاضے پورے نہ کیے تو اس کے نتائج خود تمھارے حق میں نہایت مہلک ہوں گے۔

اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ (۵)

'اَمۡرًا' کا نصب علیٰ سبیل الاختصاص ہے اور مقصود اس سے اس تقسیم امور کی اہمیت و عظمت کو واضح فرمانا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے خاص امرِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل نہیں ہوتا اس وجہ سے بندوں پر واجب ہے کہ اس کو کائنات کے بادشاہِ حقیقی کے خاص فرمان کی حیثیت سے قبول کریں اور سچے جذبۂ انقیاد کے ساتھ اس کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ اگر انھوں نے اس کو رد کیا، اس کا مذاق اڑایا اور اس کی تکذیب کی تو یاد رکھیں کہ یہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی سے بغاوت ہوگی جس کی سزا بڑی ہی ہولناک ہے۔

انبیاء کی بعثت اور قرآن کا نزول ہماری طرف سے ہوا ہے

'اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ'۔ یہ بالکل 'اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ' کے ہم وزن جملہ ہے جس طرح اوپر والی آیت میں قرآن کے نزول کا مقصد انذار بتایا ہے اسی طرح اس آیت میں یہ حقیقت واضح فرماتی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ بات پہلے سے طے تھی کہ وہ بنی اسماعیل میں ایک رسول مبعوث فرمائے گا جو بنی اسماعیل کے لیے بھی باعثِ رحمت ہو گا اور تمام خلق کے لیے بھی۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام سے منقول ہیں اور جن کا حوالہ ان کے محل میں ہم دے چکے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس رسول کی بعثت اسی اسکیم کے تحت ہوئی ہے اور ٹھیک اس رات میں ہوئی ہے جو اس طرح کے امورِ مہمہ کے ظہور کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔

رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (۶)

آنحضرت صلعم کے رحمت ہونے کی طرف اشارہ

یہ ارسالِ رسول کا مقصد واضح فرمایا اور خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ تمہارے رب نے تم کو اپنی جانب سے ایک عظیم رحمت کے طور پر مبعوث فرمایا ہے۔ اگر لوگوں نے تمہاری قدر نہ کی تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنے ہی کو اللہ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کریں گے۔ آیت ۴ میں رسول کے منذر ہونے کا ذکر تھا، اس آیت میں اس کے رحمت و بشارت ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اور یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جو چیز سب سے بڑی رحمت ہو گی وہ سب سے بڑی نقمت بھی بن سکتی ہے اگر اس کی قدر نہ کی جائے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ انذار کے پہلو کو مقدم رکھا ہے درآنحالیکہ قرآن کے نزول اور رسول کی بعثت سے اصل مقصود خلق پر رحمت ہوتا ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف سورہ کے عمود پر تقریر کرتے ہوئے، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا اصل مزاج انذار ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سمیع و علیم کا لازمی تقاضا

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ: ان صفات کے حوالہ میں ایک پہلو یہ ملحوظ ہے کہ اس کائنات کا رب ایک دانا و بینا ہستی ہے، وہ اپنی خلق کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے دانا و بینا ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ خلق کے حالات پر پوری نظر رکھے۔ لوگوں کو اپنے احکام و اوامر سے آگاہ کرے۔ اگر وہ ان کی تعمیل کریں تو دنیا و آخرت دونوں میں اس کا انعام دے اور اگر سرکشی کریں تو اس کی سزا دے۔ دوسرا یہ کہ اس وقت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے ساتھ قریش کے لیڈر جو کچھ کر رہے ہیں خدائے سمیع و علیم اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے اور جب ہر بات اس کے علم میں ہے اور کوئی چیز بھی اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے تو نبی اور اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ جو کچھ اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا وہ لازماً ظہور میں آئے گا۔ کوئی چیز بھی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔

ان آیات کے مقدرات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سورۂ قصص کی آیات ۴۵-۴۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ (۷)

مخالفین کو ایک سخت وعید

یہ مخالفین کو وعید اور بڑی ہی سخت وعید ہے۔ فرمایا کہ اس انذار و تبشیر کو محض ہوائی بات نہ سمجھو جو محض تم پر دھونس جمانے کے لیے کہی جا رہی ہو بلکہ یہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کے خداوند کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہی ہر چیز کا مالک اور خداوند ہے تو کس کے امکان میں ہے کہ اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ اگر وہ لوگوں کو پکڑنا چاہے تو جب چاہے پکڑلے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو کچھ بخشنا چاہے تو جو چاہے بخش دے کوئی اس کو چھین نہیں سکتا۔

'اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ': یہ مخاطبوں کو ملامت ہے کہ ہے تو یہ حقیقت بالکل بدیہی لیکن کسی چیز کے ماننے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ بالکل واضح اور بدیہی ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اس کے ماننے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر یہ ارادہ کسی کے اندر موجود نہ ہو تو بدیہی سے بدیہی حقیقت کا بھی وہ انکار کر بیٹھتا ہے اور کوئی بڑے سے بڑا منطقی بھی اس کو قائل کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ (۸)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس کی سفارش تمہارے کچھ کام آسکے۔ زندگی اور موت سب اسی کے اختیار میں ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے اور وہی تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب ہے۔ اگر تمہارے آباء و اجداد نے اس کے سوا کسی اور کو پوجا تو یہ ان کی سفاہت و جہالت ہے۔ ان کی تقلید کو اپنے لیے دلیل نہ بناؤ ورنہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ یَّلْعَبُوْنَ (۹)

انکار کی اصل علت

یعنی یہ انذار و تبشیر ہے تو ایک امر واقعہ جس میں کسی ذی ہوش کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ لوگ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام ہیں کہ جب تک اس چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وقت تک ماننے والے نہیں ہیں، اس وجہ سے شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے اور اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ زندگی کے معاملات میں جن لوگوں کی روش لاابالیانہ ہے ان کو قائل کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ لوگ اس وقت قائل ہوں گے جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لیں گے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ۙ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۰-۱۱)

ان کے لیے اس دن کا انتظار کرو جس دن آسمان ہر ایک کو نظر آنے والے دھوئیں کے ساتھ نمودار

ہوگا جو سب پر چھا جائے گا اور وہ زبانِ حال سے اعلان کرے گا کہ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔

یہ اس عذاب کی دھمکی ہے جس کا لوگ مطالبہ کر رہے تھے اور جس کو دیکھے بغیر نبی کے انذار کی تصدیق کے لیے تیار نہیں تھے۔

'دُخَانٍ مُّبِيْنٍ' سے کیا مراد ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'دُخَانٍ مُّبِيْنٍ' سے کیا مراد ہے؟ دخان کے معنی دھوئیں کے ہیں اور اس کے ساتھ 'مبین' کی صفت کا واضح مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دھواں ایسا ہوگا کہ ہر کہ و مہ اور ہر چھوٹے بڑے کو بالکل نمایاں نظر آئے گا۔ کسی کے لیے بھی اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔

مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دھواں ظہورِ قیامت کے وقت ظاہر ہوگا۔ اس کی تائید میں انھوں نے ایک روایت بھی نقل کی ہے لیکن ناقدینِ حدیث نے اس روایت کو قصہ گویوں کی روایت قرار دے کر اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت آیات کے سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ سیاقِ کلام صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ذکر قیامت کا نہیں بلکہ کسی ایسے عذاب کا ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کی قوموں پر آیا ہے، جس کی تفصیلات عاد، ثمود اور قومِ شعیب وغیرہ کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں۔

ایک دوسرے گروہ نے اس سے ایک قحط مراد لیا ہے جو ان کے بیان کے مطابق، ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے نتیجہ میں قریش پر آیا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے اور بھوک سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ آسمان کی طرف لوگ نظر اٹھاتے تو وہ بالکل دھواں ہی دھواں نظر آتا۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے لیکن مجھے اس میں کئی باتیں کھٹکتی ہیں۔

اوّل یہ کہ اپنی پوری قوم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طرح کی بددعا کا ذکر صرف اس تفسیری روایت ہی میں ملتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور شہادت اس کی موجود نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنی قوم کے لیے بددعا فرمائی ہو۔ آپ کی دعا اپنی قوم کے لیے ہمیشہ یہی رہی کہ 'رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ' (اے میرے رب، میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ لوگ جانتے نہیں) سب سے زیادہ نازک موقع ہجرت کا تھا۔ ہجرت کے موقع پر بعض دوسرے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کے لیے بددعا کی بھی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس موقع پر بھی کوئی بددعا کا کلمہ نہیں نکلا۔ آپ نے فرمایا تو بس یہ فرمایا کہ 'اے مکہ' تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن کیا کروں، تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے'۔ مختلف جنگوں کے مواقع پر بھی، جب کہ قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوئی ہیں، آپ نے جو دعائیں کی ہیں وہ تمام تر اہلِ ایمان کے لیے ثباتِ قدم اور حق کے لیے نصرت کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ دشمنوں کے خلاف کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے نکلا ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان

کے دلوں میں اللہ رعب ڈال دے اور ان کے قدموں کو متزلزل کر دے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان مواقع پر بھی کبھی اپنی پوری قوم کے لیے آپ نے بد دعا فرمائی ہو۔

دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد سب سے زیادہ نازک موقع حدیبیہ کا موقع ہے جب قریش کی عصبیّتِ جاہلیت بالکل عریاں ہو کر سامنے آئی اور مسلمانوں کے جذبات ان کے خلاف آخری حد تک مشتعل ہو گئے۔ لیکن اس موقع پر بھی آپؐ نے قریش کے لیے کوئی بد دعا نہیں کی۔ صرف یہی نہیں کہ بد دعا نہیں کی بلکہ مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو دبایا اور ان کو جنگ سے روک دیا اور قرآن نے، جیسا کہ سورۂ فتح میں تفصیل آئے گی، اس جنگ کو روک دینے کی حکمت یہ واضح فرمائی کہ جنگ ہوتی تو اندیشہ تھا کہ اس سے ان لوگوں کو نقصان پہنچتا جو دل سے مسلمان تھے لیکن اپنی مجبوریوں کے باعث ابھی مکہ سے ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ غور کیجیے کہ جب مکہ کے ان مخفی مسلمانوں ہی کے خیال سے مسلمانوں نے اپنی کھینچی ہوئی تلواریں میانوں میں کر لیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کر لیا جو صحابہؓ کے عام جذبات کے خلاف تھا تو انہی اہل مکّہ کے لیے کسی ایسے قحط کی بد دعا آپؐ کیسے کر سکتے تھے جس میں لوگ مردار کھانے تک پر مجبور ہو جائیں؟ اس قسم کا کوئی قحط نمودار ہوتا تو اس کی زد میں مکّہ اور طائف کے سردار ہی تو نہ آتے! اس کا اصلی حملہ تو غربا اور عوام پر ہوتا جن کے اندر ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔

تیسری یہ کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ کسی دعا کی ہدایت کی گئی ہے نہ کسی بد دعا کی، بلکہ صبر کے ساتھ ایک ایسے دن کے انتظار کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس دن آسمان ایک ایسے دھوئیں کے ساتھ نمودار ہو گا جو پوری قوم پر چھا جائے گا اور جو زبانِ حال سے یہ منادی کرے گا کہ یہ وہی دردناک عذاب ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا لیکن لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ گویا اس کی نوعیت ایک وعید کی ہے اور وعید حالات کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ قرآن میں قریش کو بار بار اس طرح کے عذاب سے ڈرایا گیا جس طرح کے عذاب عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ شعیب وغیرہ پر آئے لیکن اس قسم کا کوئی عذاب ان پر نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کی اکثریت ایمان لائی۔ صرف تھوڑے سے اشرار اپنی شرارت پر اڑے رہے جو یا تو اہل ایمان کے ساتھ تصادم میں ختم ہو گئے یا فتح مکّہ کے موقع پر انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔

چوتھی یہ کہ قحط کی تعبیر 'دخان مبین' سے کوئی موزوں تعبیر نہیں ہے۔ قحط کا مضمون عربی شاعری کا ایک پامال مضمون ہے۔ جس زمانے میں شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں ملک میں ایک قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی۔ بعض علاقوں میں حالات نہایت سنگین بھی ہو جاتے۔ عرب شعرا اپنے قصائد میں ان حالات کی نہایت مؤثر تصویریں کھینچتے ہیں اور مختلف استعارات، کنایات اور تشبیہات سے پورے حالات نگاہوں کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی شاعر نے بھی کسی شدید سے شدید

قحط کو بھی 'دخان مبین' سے تعبیر کیا ہو یا اس کے اثر کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب بیان اختیار کیا ہو۔

ان وجوہ سے قحط والی روایت اگر صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق اس آیت سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قحط پڑا ہو، یہ بھی امکان ہے کہ یہ قحط بہت سخت ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی رہی ہے کہ رسولوں کی بعثت کے دور میں ان کی قومیں ایسی آزمائشوں میں ڈالی گئی ہیں جن سے ان کے اندر تنبہ اور انابت پیدا ہو۔ اس سنت کے اشارات قرآن میں موجود ہیں۔ ان تمام امکانات کے باوجود اس آیت کا تعلق کسی ایسے قحط سے نہیں معلوم ہوتا جس کی شدت سے ہر شخص کا یہ حال ہو گیا کہ اس کو آسمان دھوئیں کی شکل میں نظر آنے لگا۔

'دخان مبین' کی تعبیر سے ذہن اگر منتقل ہوتا ہے تو قحط کی طرف نہیں بلکہ 'حاصب' کے عذاب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ عرب کی پچھلی قوموں پر رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں بیشتر یہی عذاب آیا ہے۔ عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ کی جو سرگزشتیں پیچھے گزر چکی ہیں ان میں اس عذاب کی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام اور قرآن سے اس کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ 'دخان مبین' کی تعبیر سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ سیاہ غبار کا ایک ستون سا آسمان کی طرف اٹھتا نظر آتا ہے۔ اس غبار میں جب تک سورج بالکل چھپ نہیں جاتا اس کی شعاعیں بھی اس کے اندر مخلوط ہوتی ہیں جس سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے جس کا دھواں آسمان تک اٹھ رہا ہے۔ پھر جب ہوا کا زور بڑھتا ہے اور یہ طوفان کسی طرف کا رخ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابر سیاہ چھا رہا ہے جو بس برسنے والا ہی ہے۔ پھر یہ ایک ہولناک شکل اختیار کر لیتا ہے اور بستیوں کی بستیوں کو ریت اور کنکر پتھر کی بارش سے ڈھانک دیتا ہے۔

قوم عاد پر جب عذاب آیا تو انھوں نے فضا کے سیاہ غبار کو ابر سیاہ خیال کیا۔ چنانچہ سورۂ احقاف میں ان کا ذکر یوں آیا ہے: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴) (پس جب انھوں نے اس عذاب کو ایک ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ نہیں بلکہ یہ وہی عذاب ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی۔ ایک باد تند، جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے) اسی عذاب کو قوم شعیب کی تباہی کے ذکر میں 'عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ' سے تعبیر فرمایا گیا: 'فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ....' (الشعراء: ۱۸۹) (پس انھوں نے اس کی تکذیب کر دی جس کے نتیجہ میں ان کو یوم ظلہ کے عذاب نے پکڑ لیا) 'ظلۃ' چھتری اور سائبان اور شامیانے وغیرہ کے لیے بھی آتا ہے اور ابر کے لیے بھی۔

'حاصب' کا عذاب اپنے ابتدائی مرحلہ میں اٹھتے ہوئے ابر یا دھوئیں ہی کی شکل میں نظر آتا ہے

اس وجہ سے قرین قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسی عذاب کی دھمکی ہو۔ یہ دھمکی نہایت واضح الفاظ میں قریش کو عاد اور ثمود وغیرہ قوموں کی سرگزشتیں سنا کر دی گئی تھی، ہم نہایت وضاحت کے ساتھ پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ان قوموں کے عذاب کی نوعیت واضح کر چکے ہیں۔ آگے کی سورتوں کی تفسیر میں بھی یہ تفصیلات آئیں گی۔ وہاں ہم استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی اس باب میں ان شاء اللہ پیش کریں گے۔

یہ دھمکی، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ مخالفین اگر رسول کی تکذیب کر دیں گے تو ان پر عذاب آ جائے گا لیکن مشرکین قریش کی اکثریت، جیسا کہ معلوم ہے، آہستہ آہستہ مسلمان ہو گئی اور صلح حدیبیہ کے بعد تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بالتدریج معاندین کا زور بالکل ٹوٹ گیا، یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (النصر: ۲) کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اس کی صداقت کا مشاہدہ ہر شخص نے اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جو دھمکی تکذیب کی شرط کے ساتھ مشروط تھی اس تصدیق کے بعد اس کے ظہور میں آنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہی چنانچہ قریش بحیثیت مجموعی اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ صرف ان کے وہ اشرار مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آئے جو ان پر حملہ آور ہوئے اور جو تلواروں سے بچ رہے انھوں نے فتح مکہ کے بعد گھٹنے ٹیک دیے۔

یَّغْشَی النَّاسَ ط ھٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۱)

یہ اس عذاب کی شدت کی تعبیر ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح چھا لے گا کہ کسی کے لیے بھی اس سے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی۔ ھٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ یہ زبانِ حال یا صورتِ حال کی تعبیر ہے کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ کوئی وقتی جھونکا نہیں ہے جو آیا اور گزر گیا بلکہ قہرِ الٰہی ہے جو سب کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

رَبَّنَا اکْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (۱۲)

مشاہدۂ عذاب کے بعد مغروروں کا حال

یعنی اس وقت تو یہ بہت اکڑ رہے ہیں اور بڑے طنطنہ سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے تو فریاد کریں گے کہ اے رب! اس عذاب سے نجات دے۔ اب ہم ایمان لائے۔

اَنّٰی لَھُمُ الذِّکْرٰی وَقَدْ جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْہُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۱۳-۱۴)

یہ وہ جواب ہے جو ان لوگوں کو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ فرمایا کہ عذاب آ جانے کے بعد قبولِ نصیحت کا کہاں موقع باقی رہے گا! بالخصوص جبکہ ان کے پاس اتمامِ حجت کے لیے

اللہ نے اپنا ایک رسول بھی بھیج دیا تھا جس نے ہر بات کی اچھی طرح وضاحت کر دی تھی لیکن انھوں نے نہایت تکبر کے ساتھ اس سے منہ موڑا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ یہ دوسروں کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے جس کو عذاب و قیامت کا مالیخولیا ہو گیا ہے۔ اب توبہ کا وقت گزر چکا۔ توبہ کا وقت وہ تھا جب رسول توبہ کی منادی کر رہا تھا۔ وہ وقت انھوں نے کھو دیا تو اب وہ ان کے لیے واپس آنے والا نہیں ہے۔

اس قسم کا جواب عذاب کی گرفت میں آجانے والے متکبرین کے لیے جگہ جگہ نقل ہوا ہے۔ بعض متکبرین کو یہ جواب مخاطب کر کے دیا گیا ہے۔ مثلاً فرعون کو خطاب کر کے فرمایا: "آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (یونس: ۹۱) (اب ایمان لائے! اس سے پہلے تو تم نے نافرمانی کی) دوسرے مقام میں ہے: "فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ" (ابراہیم: ۴۴) (تو عذاب کی گرفت میں آجانے کے بعد وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے پکاریں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے، ہم تیری دعوت قبول اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔ اس وقت ان کو جواب ملے گا کہ کیا تم لوگ اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تم کبھی اپنے موقف سے ہٹنے والے نہیں ہو!) آیت زیر بحث میں یہی بات ان سے منہ پھیر کر غائبانہ اسلوب میں فرمائی گئی ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلیاں بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہیں اور اہل ذوق کے لیے یہ چیزیں محتاجِ وضاحت نہیں ہیں۔ خطاب کے اسلوب میں شدت اور غائب کے اسلوب میں اعراض کا مضمون نمایاں ہوتا ہے۔

قرآن اور پیغمبر سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے قریش کا ایک شغلہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کا یہ الزام کہ آپ کو بعض دوسرے لوگ سکھاتے ہیں، اور یہ ان کی غلط سکھائی ہوئی باتیں وحی کے دعوے کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، بعض دوسرے مقامات میں بھی مذکور ہے۔ یہ الزام قریش نے محض ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا جو قرآن کے مواد بحث و استدلال سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگ گئے تھے کہ اس قسم کا پر مغز کلام کوئی 'اُمّی' غیبی رہنمائی کے بغیر، نہیں پیش کر سکتا۔ اس طرح کے لوگوں کو قرآن سے بدگمان کرنے کے لیے قریش نے یہ شغلہ ایجاد کیا کہ یہ کلام کسی وحی و الہام کا ثمرہ نہیں بلکہ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ در پردہ یہ کلام ایجاد کرتے ہیں اور یہ شخص اس کو وحی کے نام سے پیش کرتا ہے۔ مقصود سازش کرنے والوں کا یہ ہے کہ اس راہ سے وہ ہماری قوم میں تفریق پیدا کریں۔ یہ الزام لگاتے ہوئے وہ یہ بھی تاثر دیتے کہ اس سازش میں بعض اہل کتاب اور عجمی بھی شامل ہیں تاکہ اس طرح وہ قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عربوں کے قومی جذبات کو کامیابی کے ساتھ بھڑکا سکیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی اصل وجہ کی طرف اس کے محل میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قریش محسوس کرتے تھے کہ اول تو آپ کے دل پر خوفِ عذابِ آخرت کا ایسا غلبہ ہے کہ آپ اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اسی کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ دوسرے آپ کے لب و لہجہ میں ایسا اذعان و یقین ہے کہ ہر شخص اس سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر یہ شخص اللہ کی طرف سے مامور نہ ہوتا تو اس کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کے غم میں اپنا خواب و خور حرام کر لیتا؟ لوگوں کے اس تاثر کو دور کرنے کے لیے قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جس طرح بعض لوگوں کو بعض چیزوں کا سودا ہو جایا کرتا ہے، وہ اٹھتے بیٹھتے اسی چیز کی رٹ لگائے رہتے ہیں اور ہر جگہ ان کو وہی چیز نظر آتی ہے، اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا سودا ہو گیا ہے۔ ہر گوشے سے اس کو وہی آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک خبط و جنون ہے۔ بھلا عذاب ہم پر کدھر سے اور کیوں آجائے گا!

إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ (۱۵)

جو خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں ان کا کردار یہی ہوتا ہے

یعنی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری اس درخواست پر کہ ہم سے عذاب ٹال دیا جائے ہم ایمان لانے والے بن جائیں گے، کچھ وقت کے لیے عذاب ہٹا دیں لیکن تم پھر اسی راہ پر چلو گے جس پر عذاب سے پہلے چلتے رہے ہو۔ اپنی خواہشوں کے غلاموں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو ناک رگڑ کے توبہ کرتے ہیں لیکن جب آزمائش گزر جاتی ہے تو اس طرح چل دیتے ہیں گویا نہ کوئی بات پیش آئی، نہ انھوں نے کوئی قول و قرار کیا اور نہ آئندہ اب اس طرح کی بات پیش آئے گی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ (۱۶)

یعنی اس دنیا میں پکڑ سے چھوٹ بھی گئے تو یہ چیز وجہ اطمینان نہیں ہونی چاہیے۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے۔ 'بڑی پکڑ' سے مراد قیامت کی پکڑ ہے۔ اس دنیا میں قوموں کی جو گرفت ہوتی ہے وہ قیامت کے مقابل میں بہر حال چھوٹی ہی ہوتی ہے۔ قیامت کی پکڑ ابدی اور دائمی ہوگی اور اس دن تمام مجرموں سے اللہ تعالیٰ پورا پورا انتقام لے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات: ۱۷-۳۳

آگے اس بات کی تاریخی دلیل پیش کی گئی ہے جو اوپر کے پیرے میں بیان فرمائی گئی ہے۔ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا اتنا حصہ بالاجمال سنا دیا گیا ہے جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فرعون نے خدا کے رسول کے ساتھ جو چال چلی تھی وہی چال قریش کے فراعنہ بھی خدا کے رسول کے ساتھ چل رہے ہیں۔ فرعونیوں کو اللہ نے ان کی چالوں کی سزا دی

اور ان کا سارا غرور پامال ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی پکڑ میں آجائیں گے اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷-۳۳

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۣ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰۗـؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۷-۳۳

اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کو آزمایا اور ان کے پاس ایک باعزت رسول آیا۔ اس پیغام کے ساتھ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو، میں تمہارے لیے ایک معتمد رسول ہوں اور یہ کہ تم خدا کے مقابل میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے ایک واضح حجت پیش کرتا ہوں۔ اور میں نے اپنے اور تمہارے خداوند کی پناہ مانگی

اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اور اگر تم میری تصدیق نہیں کرتے تو میری راہ چھوڑو۔ ۱۷-۲۱

پس اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ یہ مجرم ہیں۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، آگاہ رہو کہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج بنیں گے۔ ۲۲-۲۴

انھوں نے کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے اور سامان عیش، جس میں وہ مگن رہتے تھے، چھوڑے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ پس نہ ان پر آسمان نے آنسو بہائے اور نہ زمین ہی نے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہی بنے۔ ۲۵-۲۹

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی۔ یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ بڑا ہی سرکش، حدود سے نکل جانے والا تھا۔ اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر ترجیح دی جان بوجھ کر اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ ۳۰-۳۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (۱۷)

قریش اور قوم فرعون کی مشابہت

قریش اور قوم فرعون کے حالات میں مشابہت کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس طرح کے امتحان میں ہم نے قریش کو ڈالا ہے اسی طرح کے امتحان میں ہم نے اس سے پہلے قوم فرعون کو بھی ڈالا تھا۔ جس طرح ان کو سامان عیش و رفاہیت کی فراوانی حاصل ہوئی اسی طرح ان کو بھی دولت و نعمت کی کثرت عطا ہوئی تھی۔ پھر جس طرح

ان کی طرف ایک معزز رسول انذار اور اتمام حجت کے لیے آیا اسی طرح ان کی طرف بھی ایک باعزت رسول آیا ہے۔ اس مشابہت کے حوالہ سے مقصود ظاہر ہے کہ یہ دکھانا ہے کہ جو انجام ان کا ہوا، وہی انجام لازماً ان کا بھی ہونا ہے اگر انھوں نے بھی انہی کی روش اختیار کی۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کو جو دولت و شوکت حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان کے لیے ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دے کر یہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی یہ نعمتیں پاکر قومیں اس کی شکر گزاری اور بندگی کی راہ پر چلتی ہیں یا سرکشی اور طغیان کی راہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر وہ یہ دوسری راہ اختیار کر لیتی ہیں تو مہلت کی ایک مدت ان کو ملتی ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کا نام و نشان مٹا دیتا ہے۔

عزت و شرف منصب رسالت کا خاصہ ہے

'رَسُوۡلٌ' کے ساتھ 'کَرِیۡمٌ' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول چونکہ بادشاہ کائنات کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کے پاس آتا ہے اس وجہ سے عزت و شرف اس کے اس منصب کا ایک لازمی تقاضا ہے اس کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ امیر ہے یا غریب اور نہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے شاہی خاندان سے ہے یا بنی اسرائیل کے غریب خاندان سے جن کو فرعونی غلام اور ذلیل سمجھتے تھے۔ اس کا اصلی وصف یہ ہے کہ وہ خدا کا سفیر ہے اور جو خدا کا سفیر ہے اس سے معزز خدا کے سوا نہ کوئی اور ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۸﴾

اللہ کے بندوں کو کوئی اپنا بندہ نہیں بنا سکتا

'اَنۡ' سے پہلے حرف جر محذوف ہے یعنی باعزت رسول اس پیغام کے ساتھ ان کے پاس آیا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کرو۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ' (طٰہٰ: ۴۷) کے الفاظ سے نقل ہوئی ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ اس فقرے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مطالبہ کی دلیل بھی سمو دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے بندے ہیں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کو اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے اس وجہ سے ان کو میرے ساتھ جانے دو تاکہ ہم اپنے رب کی بندگی جس طرح کرنی چاہتے ہیں بغیر کسی روک ٹوک کے کر سکیں۔ یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؛ اس تفسیر میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکا ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنی بات واضح ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی بندگی کی پوری آزادی چاہتے تھے۔ فرعون کے لیے یہ حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنائے رکھے۔

ایک مخفی تہدید

'اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ'۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو اطمینان دلایا کہ میں کوئی مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ فی الواقع خدا کا رسول ہوں۔ پوری امانت و دیانت کے ساتھ تم کو وہی پیغام پہنچا رہا ہوں جو خدا نے دے کر مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے یہ بات مجرد اپنی صفائی میں نہیں فرمائی بلکہ اس کے اندر ایک تہدید بھی مخفی ہے کہ اگر مجھے مفتری قرار دے کر میری تکذیب کی گئی تو اس کے نتائج نہایت مہلک ہوں گے۔ جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ ان لوگوں سے ضرور انتقام لے گا۔

وَاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْٓ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱۹)

رسول سے بغاوت خدا سے بغاوت ہے

یہ اسی پیغام کا حصہ ہے کہ مجھے یہ پیغام پہنچانے کی بھی ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کے اس حکم کو سیدھے سیدھے مان لو۔ اگر تم نے سرکشی کی تو یہ سرکشی صرف میرے ہی مقابلہ میں نہیں ہو گی بلکہ براہ اصلاً خدا کے مقابل میں ہو گی اس لیے کہ میری اصل حیثیت یہ ہے کہ میں خدا کا سفیر ہوں۔

'اِنِّیْٓ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ'۔ 'سلطان مبین' سے اشارہ عصا اور ید بیضاء کے معجزات کی طرف ہے۔ یعنی میں سفیر الٰہی ہونے کی اپنے پاس نہایت واضح سند رکھتا ہوں اور وہ میں تمھیں دکھاتا ہوں تاکہ میرے باب میں تمھیں کوئی شک باقی نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک نہایت سرکش اور جبار بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کو ایسے معجزات سے مسلح فرما دیا تھا جو ان کے مخالفوں پر حجت ہو سکیں۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۲۰)

ایک بلیغ دعوت اور مؤثر تنبیہ

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت فرمائی ہے جب ان کے مطالبہ نے تمام قبطیوں میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ اس وقت ان کو قتل کی دھمکی بھی دی گئی اور یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ سرپھری قوم بوکھلا کر آپ کو سنگسار ہی نہ کر دے۔ اس وقت آپ نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم لوگ مجھے سنگسار کرنے کی نیت رکھتے ہو تو میں اپنے کو اس رب کی پناہ میں دیتا ہوں جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے۔ 'وَرَبِّكُمْ' (اور تمھارا بھی رب ہے) کے الفاظ میں ایک مؤثر اپیل بھی ہے، نہایت بلیغ دعوت بھی ہے اور نہایت پُروقار تنبیہ بھی اور ساتھ ہی اس میں یہ طنز بھی مخفی ہے کہ اس خناس کے کہنے میں آ کر جو تمھارا 'رب اعلیٰ' بنا ہوا بیٹھا ہے کوئی ایسی حرکت نہ کر گزرنا جو تمھاری ساری قوم کا بیڑا ہی غرق کر دے۔

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ (۲۱)

یعنی اگر تم لوگ یہ باور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو کہ میں خدا کا سفیر ہوں تو کم از کم مجھے قتل یا سنگسار کرنے کے مجرم نہ بنو بلکہ میری راہ چھوڑ دو۔ میں بنی اسرائیل کو لے کر جہاں جانا چاہتا ہوں چلا جاؤں۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم میری بات باور کرتے اور مجھ پر ایمان لاتے۔ یہ چیز تمھاری دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت کی ضامن ہوتی۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو کم از کم میری راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش نہ کرو۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ (۲۲)

حضرت موسیٰؑ کی فریاد اپنے رب سے

قبطیوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس اپیل اور تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ بدستور اپنی سازشوں اور سرگرمیوں میں لگے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے فریاد کی، 'اے رب، یہ لوگ سننے اور ماننے والے نہیں ہیں بلکہ یہ پکے مجرم ہیں، تو ہی ہے جو ان کے چنگل سے رہائی دلا سکتا ہے۔'

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۲۳)

فریاد کی فوراً شنوائی ہوئی

یہ فریاد بالکل بروقت تھی اس وجہ سے فوراً شنوائی ہوئی۔ قبولیت کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے یہاں کوئی ایسا لفظ لانا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ دعا کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت ہوئی۔ حکم ہوا کہ میرے بندوں کو لے کر یہاں سے راتوں رات نکل جاؤ اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی کہ فرعونیوں کی طرف سے تمہارا تعاقب ہوگا۔ اس انتباہ کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ فرعون نے اگرچہ ان آفتوں سے تنگ آکر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں کے نتیجہ میں مصر پر نازل ہوئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چند دن کے لیے جانے کی اجازت دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری قوم سمیت روانہ ہوئے تو اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اپنی اور اپنے تمام علاقائی سرداروں کی فوجیں لے کر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا کہ ان کو مجبور کر کے پھر واپس لائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پیش آنے والی صورتِ حال سے پہلے سے آگاہ کر دیا تھا تاکہ کوچ و قیام میں کوئی غیر ضروری تاخیر پیش نہ آئے بلکہ وہ مقررہ پروگرام کے مطابق دریا کو عبور کرنے کی کوشش کریں۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۲۴)

حضرت موسیٰؑ کو ہدایت

'رھو' کے معنی ساکن کے ہیں۔ یعنی تم اس ہوا کے رکنے سے پہلے پہلے دریا سے نکل جاؤ جس ہوا کے ذریعہ سے پانی کو قدرت ہٹائے اور تمہارے لیے راستہ صاف کرے گی۔ تمہارے نکلتے ہی دریا پرسکون ہو جائے گا اور ہٹا ہوا پانی پھر اپنی جگہ گھیر لے گا۔ اس دوران میں مصری تمہارے تعاقب میں دریا کے بیچ میں ہوں گے۔ اور پانی ان پر اس طرح چھا جائے گا کہ وہ نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

[illegible] اور سامان عیش [illegible]

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (۲۵-۲۷)

یعنی جن باغوں اور چشموں، کھیتوں اور پرشوکت کوٹھیوں اور عیش کے سامانوں نے ان کو استکبار

میں مبتلا کیا، ان سے محروم ہو کر وہ سمندر کی موجوں کا لقمہ بنے۔ ان کا گمان تھا کہ یہ چیزیں ان کی کامیابی اور ترقی کی دلیل ہیں اور جو لوگ ان کو تباہی سے ڈراتے ہیں وہ بالکل بے خود ہیں۔ لیکن ثابت ہو گیا کہ خدا کے خوف کے بغیر یہ چیزیں تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جب تباہی آتی ہے تو ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی۔

كَذٰلِكَ ۖ وَاَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ (۲۸)

مجرموں کے لیے سنت الٰہی

'کَذٰلِكَ' کے بعد نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِيۡنَ کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ یعنی ہم نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی آئندہ بھی کریں گے۔ 'وَاَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ' اور ان چیزوں کا وارث ہم نے دوسروں کو بنایا۔ 'دوسروں' سے مراد یہاں بنی اسرائیل نہیں ہیں۔ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کا مصر آنا ثابت نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد پڑوس کی وہ قومیں ہوں جن سے فرعونیوں کو برابر اندیشہ رہا کہ مبادا وہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ ملا کر ملک پر قبضہ کر لیں۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ذکور کے قتل کی جو اسکیم چلائی گئی تھی اس کا محرک ان کا یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر بنی اسرائیل کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ ان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

فَمَا بَكَتۡ عَلَيۡهِمُ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ وَمَا كَانُوۡا مُنۡظَرِيۡنَ (۲۹)

یعنی جب تک وہ اقتدار میں رہے اس وقت تک تو سمجھتے رہے کہ وہ ایک عظیم تمدن کے بانی ہیں اور ساری دنیا ہمیشہ ان کی کنونڈی رہے گی لیکن ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین ہی نے دو آنسو بہائے بلکہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا کہ خس کم جہاں پاک!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ایک مظلوم کی موت پر تو آسمان بھی کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور زمین بھی فریاد کرتی ہے۔ تورات میں لکھا ہے کہ خداوند نے فرمایا کہ زمین سے مجھے ہابیل کا خون پکارتا ہے۔ لیکن ظالموں اور نافرمانوں کی بربادی پر آسمان اور زمین سب خوش ہوتے ہیں، خاص طور پر ان نافرمانوں کی تباہی پر جن پر اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی ہو۔

وَلَقَدۡ نَجَّيۡنَا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنَ الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ۙ مِنۡ فِرۡعَوۡنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ (۳۰-۳۱)

'مِنۡ فِرۡعَوۡنَ' بدل ہے 'الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ' سے۔ گویا اللہ نے خود فرعون کو ایک عذاب ذلت سے تعبیر فرمایا۔ فرعون تو حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک خود فرعون نہ صرف ذلیل بلکہ ایک عذاب رسوائی تھا۔

'اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اسے ایک رسوا کن

عذاب سے تعبیر کیا گیا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے کہ وہ نہایت سرکش اور اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر جانے والوں میں سے تھا۔ جو لوگ اللہ کے آگے سرکشی کرتے ہیں وہ مظلوموں کے لیے عذاب اور عنداللہ ذلیل ہوتے ہیں۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۳۲)

جو قوم شریعت کی حامل ہوتی ہے وہی خلق کی رہنمائی کی اہل ہوتی ہے

یعنی فرعون اور اس کی قوم کو تو ہم نے غرق دریا کیا اور بنی اسرائیل کو، جو ان کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہے تھے، اہل عالم کی رہنمائی کے لیے انتخاب کیا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جو قوم خدا کی شریعت کی حامل بنائی جاتی ہے فطری طور پر وہی اہل اور حقدار ہوتی ہے اس بات کی کہ وہ خلق کی رہنمائی کرے۔ اس کا یہ منصب مشروط ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی منصبی ذمہ داری پوری دیانت کے ساتھ ادا کرے۔ اگر وہ یہ ذمہ داری ادا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے یہ منصب چھین کر دوسروں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ ایک خاص دور میں بنی اسرائیل کو یہ منصب حاصل ہوا لیکن جب وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ معزول کر دیے گئے اور ہدایتِ خلق کی ذمہ داری ملتِ مسلمہ کے سپرد ہوئی۔

عروج و زوال تاریخ کا ایک فلسفہ

'عَلٰی عِلْمٍ' کے الفاظ سے تاریخ کے اس فلسفہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کا عزل و نصب اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی کسوٹی پر جانچ کر جس قوم کو اہل پاتا ہے اس کو منتخب کرتا ہے اور جس کو نااہل پاتا ہے اس کو رد کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو معزول ہوئے ہیں وہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنی نالائقی پر سر پیٹیں اور جو اقتدار پر آئے وہ فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے خدا کے شکر گزار رہیں اور اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ اس دنیا کے عروج و زوال کا سارا نقشہ اللہ تعالیٰ مرتب کرتا ہے اور اس کی بنیاد تمام تر قوموں کے اخلاق و کردار پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم بے خطا اور اس کی حکمت بے لاگ ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک اہم تنبیہ

ان آیات کے اندر بنی اسرائیل کے لیے، جو ان آیات کے زمانۂ نزول میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کمر یں کس رہے تھے، نہایت اہم تنبیہ ہے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ہی نکتہ سمجھ گئے ہوتے کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر کیا تھا اور اب اس کے علم ہی کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں رہے تو وہ اس انجامِ بد سے بچ جاتے جو اسلام کی مخالفت کے نتیجہ میں ان کے سامنے آیا۔

وَاٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ (۳۳)

بنی اسرائیل کا امتحان انعامات کے ذریعہ سے

'بَلٰٓؤٌ' کے اصل معنی تو امتحان اور جانچ کے ہیں لیکن امتحان نعمت کے ذریعے سے بھی ہوتا ہے اور مصیبت کے ذریعے سے بھی۔ نعمت کا امتحان شکر کی جانچ کے لیے ہوتا ہے اور مصیبت کا امتحان صبر و رضا کی جانچ کے لیے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ نعمت اور انعام کے مفہوم میں آیا ہے جس طرح الانفال آیت ۱۷

میں 'بَلَآءً' کا لفظ 'حَسَنًا' کی صفت کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اشارہ ان انعامات کی طرف ہے جو سمندر سے پار کراتے ہوئے اور اس کے بعد صحرا کی زندگی میں اور فتح فلسطین اور اس کے بعد کے ادوار میں اللہ تعالیٰ نے گوناگوں شکلوں میں بنی اسرائیل پر فرمائے۔ جن کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۴-۵۷

آگے کی آیات میں قریش کی سرکشی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا تصور نہیں رکھتے اس وجہ سے اپنے حاضر میں مگن اور مستقبل سے نچنت ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے پہلے قانون جزاء و سزا کے عقلی و فطری دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اہل کفر و اہل ایمان دونوں کے انجام کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۴-۵۷

إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ لَيَقُولُونَ ﴿۳۴﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ
بِمُنشَرِينَ ﴿۳۵﴾ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۶﴾ أَهُمْ
خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ
كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ
أَجْمَعِينَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ ﴿۴۱﴾ إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴۲﴾
إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ
يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ
إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ
الْحَمِيمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿۴۹﴾ إِنَّ هَٰذَا

مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾

ع ۳ / ۱۶

ترجمۂ آیات ۳۴-۵۷

یہ لوگ بڑے جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ بس یہ ہماری پہلی موت ہی ہے اور ہم اس کے بعد زندہ نہیں کیے جائیں گے تو لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ ۳۴-۳۶

کیا یہ بہتر حالت میں ہیں یا قوم تبّع کے لوگ اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔ ۳۷

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں۔ ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک غایت کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ بے شک فیصلہ کا دن ان سب کا وقت موعود ہے۔ جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو سکے گی۔ ہاں مگر وہ جن پر اللہ رحم فرمائے۔ بے شک وہی عزیز و رحیم ہے۔ ۳۸-۴۲

زقوم کا درخت گنہگاروں کا کھانا ہوگا، تیل کے تلچھٹ کے مانند پیٹ میں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ اس کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر پر گرم پانی کا عذاب بہاؤ۔ چکھو اس کو، تم بڑے مقتدر اور

با عزت بنے رہے! یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم شک میں پڑے رہے! ۴۲-۵۰

ہاں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں گے وہ مقامِ امن میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں۔ وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ خدا سے ڈرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا! اور ہم ان سے بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں، وہ اس میں طلب کریں گے ہر قسم کے میوے، نہایت چین سے۔ وہ اس میں پہلی موت کے بعد پھر موت سے آشنا نہیں ہوں گے اور اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھا یہ خاص تیرے رب کے فضل سے ہوگا۔ یہی ہے درحقیقت بڑی کامیابی! ۵۱-۵۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ (۳۴-۳۵)

کفار کا زعم

یعنی یہ لوگ بڑے عزم و جزم کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ قیامت وغیرہ کا ڈراوا محض ایک ہوا ہے۔ بس یہی موت، جس سے اس دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے، یہی اوّل موت بھی ہے اور یہی آخری بھی۔ اس کے بعد نہ کوئی موت ہے، نہ کوئی زندگی۔

فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶)

کفار کی واحد بے بنیاد دلیل

اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ اہل ایمان سے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر موت کے بعد زندگی ہے تو تمہاری سچائی ہم اس وقت تسلیم کریں گے جب تم ہمارے وفات پائے ہوئے بزرگوں میں سے کسی کو زندہ کر کے دکھا دو۔ یہی مضمون سورۂ جاثیہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ "وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا ائْتُوا بِاٰبَآئِنَآ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ" (الجاثیۃ: ۲۵) (اور جب ان کو موت کے بعد کی زندگی کے حق میں ہماری روشن دلیلیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو واحد دلیل جو وہ اس کے مقابل میں پیش کرتے ہیں وہ ان کا یہ قول ہوتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھاؤ) قرآن نے اس دلیل کو ان کی واحد دلیل قرار دیا ہے اور اس کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، کوئی تردید اس کی نہیں کی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی واحد دلیل، جس پر ان کو بڑا ناز ہے یہ ہے اس کی لغویت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اَهُمۡ خَيۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ (۳۷)

'قَوۡمُ تُبَّعٍ' سے مراد تبابعہ یمن ہیں جن کی مادی شوکت وعظمت اور ذہنی صلاحیتوں کی عرب میں بڑی شہرت رہی ہے۔ عرب شعراء ان کی عظمت کا چرچا بہت کرتے ہیں۔

قوموں پر جب خدا کا عذاب آتا ہے تو وہ اپنے ہی اسلحہ سے خودکشی کرتی ہیں

قرآن نے قریش کے مذکورہ بالا مطالبہ کے جواب میں ان سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ بتائیں کہ مادی شان وشوکت اور ذہنی وعقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ برتر ہیں یا تبابعہ برتر تھے؟ اگر وہ برتر تھے اور اس برتری کے باوجود خدا نے ان کو تباہ کر دیا، نہ ان کی مادی قوت وصولت ہی خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکی نہ ان کی ذہانت ہی ان کے کچھ کام آئی تو آخر یہ کس بل بوتے پر اس غرّے میں مبتلا ہیں کہ کوئی ان کو ہلا نہیں سکتا؟ جب خدا نے ان سے زیادہ زور آوروں کی گردن توڑ دی تو ان کی گردن کیوں نہیں توڑ سکتا؟ یہی حال ان سے پہلے کی دوسری قوموں کا بھی ہوا۔ عاد و ثمود وغیرہ اور بعض دوسری قومیں ہر اعتبار سے ان سے برتر تھیں لیکن جب انھوں نے خدا سے سرکشی کی تو خدا نے ان کا نام ونشان مٹا دیا تو آخر ان کے لیے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ یہ خدا کے چہیتے بنے رہیں گے اگرچہ سرکشی میں ان سے بھی چار قدم آگے نکل جائیں؟ خدا کی میزان میں وزن قوموں کے اخلاق وکردار کا ہے، ان کی مادی دولت و ثروت اور ان کی شاندار عمارتوں کا نہیں ہے اور نہ ان کے میزائلوں اور ایٹم بموں کا ہے۔ جب قوموں کا کردار فاسد ہو جاتا ہے تو ان کے انہی بموں کو، جو وہ دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے بناتی ہیں خدا انہی کے سروں پر دے مارتا ہے اور وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اسلحہ سے خودکشی پر مجبور ہوتی ہیں۔

دنیا میں قوموں کو سزا ملنا آخرت کے عذاب کی دلیل ہے

دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کی مثالیں موجود ہیں اور اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے تو آخر ایک ایسے روزِ جزاء وسزا کے بارے میں کیوں شک کیا جائے جس میں خالقِ کائنات افراد کو بھی اسی طرح جزا یا سزا دے جس طرح اس نے دنیا میں قوموں کو جزا یا سزا دی ہے۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ ۝ مَا خَلَقۡنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۳۸-۳۹)

آخرت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

اوپر جزاء وسزا کی دلیل تاریخ اور آفاق کے آثار وشواہد سے پیش کی گئی ہے۔ اب یہ خدا کی صفات اور اس کے اخلاقی وعقلی تقاضوں سے اس پر دلیل لائی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے بلکہ ایک برتر غایت اور ایک مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس مقصدِ حق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو اور اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس میں

اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کی ہو اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نافرمانی کی ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا یوں ہی ایک دن تمام ہو جائے، نہ اس کے نیکوں کو کوئی انعام ملے نہ بدوں کو کوئی سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا خالق، نعوذ باللہ، کوئی کھلنڈرا ہے جو آسمانوں پر بیٹھا ہوا ظلم و مظلومی کا تماشہ دیکھ رہا ہے اور جب اس کا جی اس تماشے سے بھر جائے گا تو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا یا یوں ہی یہ تماشہ جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال اس کائنات کے حکیم و رحیم خالق سے متعلق ایک ایسا سوءِ ظن ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثریت اس میں مبتلا ہے اور لوگ اس کے نتائج سے بالکل بے خبر ہیں۔

اس خیال کی گمراہیوں پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۰)

اس کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اس کائنات کے بالحق ہونے کا لازمی نتیجہ مذکور ہوا ہے کہ یہ بات خدا کے علم، عدل اور اس کی حکمت و رحمت کے بالکل منافی ہے کہ یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس دن خدا عدل کی کرسی پر بیٹھے اور ہر ایک کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ جنھوں نے حق و راستی کی زندگی بسر کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ظلم و تعدّی کا ارتکاب کیا ہو وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور وہ دن عدل کامل کے ظہور کا دن ہو کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے۔ چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، شاہ اور گدا سب کا انصاف ہو اور ایسا انصاف ہو کہ نہ کوئی حقیقت مخفی رہ جائے اور نہ کوئی کسی پہلو سے انصاف میں مزاحم ہو سکے۔ یہاں لفظ 'أَجْمَعِينَ' پر خاص طور سے نظر رہے۔

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۱)

لفظ 'مَوْلًى' خاندان اور قبیلہ کے ان افراد کے لیے آتا ہے جن کے ساتھ آدمی کا خون اور نسب کا رشتہ اور جن میں باہم عصبیت کا جذبہ ہو۔ فرمایا کہ وہ دن ایسا نفسی نفسی کا ہو گا کہ کوئی عزیز و قریب کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ 'وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ' اور نہ ان کی کسی اور ہی طرف سے کوئی مدد کی جائے گی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مدد کی نفی ہے جو مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء سے رکھتے تھے۔

إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۲)

اللہ کی رحمت کے حق دار

یعنی اس دن فائز المرامی صرف انہی کا حصہ ہو گی جن پر خدا اپنا فضل فرمائے اور اس کا فضل انہی پر ہو گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ اللہ عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ وہ جن کو پکڑے گا کوئی ان کو چھڑا نہ سکے گا۔ اور جن کو وہ اپنی رحمت کا مستحق پائے گا کوئی ان کو اس کی رحمت سے محروم نہیں

کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ بندوں کو ڈرنا بھی اسی سے چاہیے اور رحمت کی امید بھی اسی سے رکھنی چاہیے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۙ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ ﴿ۖۛ۴۴﴾ کَالۡمُہۡلِ ۚۛ یَغۡلِیۡ فِی الۡبُطُوۡنِ ﴿ۙ۴۵﴾ کَغَلۡیِ الۡحَمِیۡمِ ‎(۴۳-۴۶)

مجرموں کا حشر

اوپر یوم الفصل کا جو ذکر آیا ہے اس کے فیصلوں کے نتیجہ میں گنہگاروں کا جو حشر ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ تھوہر کا درخت گنہگاروں کی غذا بنے گا۔ یہ تھوہر دوزخ کا تھوہر ہے اس وجہ سے اس کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ہم اس دنیا کے تھوہر سے بس اس کا ایک ہلکا سا تصور ہی کر سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت نہیں سمجھ سکتے۔

لفظ 'مُہل' کے مختلف معنی لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ اشتقاق کے پہلو کو سامنے رکھ کر میں نے تیل کے تلچھٹ کے معنی کو ترجیح دی ہے۔ فرمایا کہ یہ تھوہر ان گنہگاروں کے معدہ میں جا کر اس طرح کھولے گا جس طرح تیل کا تلچھٹ کھولتا ہے۔ اور اس طرح جوش مارے گا جس طرح پانی جوش مارتا ہے۔

یعنی اس کا کھولنا حدت، شدت، جلن اور تلخی میں تو نہایت مکروہ اور کڑوے تیل کے تلچھٹ کے مانند ہوگا اور جوش کے اعتبار سے پانی کے کھولنے کے مانند۔ تیل پکتا ہے تو اس میں حدت تو نہایت شدید ہوتی ہے لیکن جوش نہیں ہوتا، پانی پکتا ہے تو اس میں جوش بھی ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ میں کھولنے کی دونوں صفتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

خُذُوۡہُ فَاعۡتِلُوۡہُ اِلٰی سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ ﴿٭ۖ۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِہٖ مِنۡ عَذَابِ الۡحَمِیۡمِ ‎(۴۷-۴۸)

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ و بتقاضائے بلاغت محذوف ہے کہ ان لوگوں کے باب میں بارگاہِ خداوندی سے یہ حکم ہوگا۔ اس کے بجائے اصل حکم کا حوالہ دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے مارڈروں کو ہدایت ہوگی کہ ان کو پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ میں لے جاؤ اور وہاں گرم پانی کے عذاب کے ڈونگرے ان پر برساؤ۔

ذُقۡ ۚۙ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ ہٰذَا مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تَمۡتَرُوۡنَ ‎(۴۹-۵۰)

یہ قول عذاب کی زبانِ حال سے بھی ہو سکتا ہے اور عذاب دینے والوں کی زبانِ قال سے بھی۔ ایک ایک سے یہ کہا جائے گا کہ تم دنیا میں بڑے مقتدر اور عزت والے بنے رہے اور اس گھمنڈ میں تم نے اس دن کی پیشی کو جھٹلایا۔ آج اس کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ﴿ۙ۵۱﴾ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ‎(۵۱-۵۲)

خدا ترسوں کا صلہ

گنہگاروں کے انجام کے بیان کے بعد یہ خدا ترسوں کے انجام کی تصویر ہے کہ وہ ایک مقامِ مامون میں

ہوں گے، نہ وہاں ان کو کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔ وہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے اور اس بات کا ان کو کوئی اندیشہ نہیں ہوگا کہ ان چیزوں کو کوئی ان سے چھین سکے گا یا ان پر کوئی زوال آئے گا یا ان میں سے کسی چیز کے باب میں ان سے کوئی پرسش ہونی ہے۔

يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۵۳)

'سُنْدُس' اور 'اِسْتَبْرَق' ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے۔ لیکن یہ ذکر جنت کے 'سُنْدُس' اور 'اِسْتَبْرَق' کا ہے اس وجہ سے یہ بحث غیر ضروری ہے۔ ان کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

'تقابل' کے معنی یہاں آمنے سامنے بیٹھنے کے ہیں۔ تالیف کلام کے پہلو سے یہاں فعل 'يَجْلِسُوْنَ' یا 'يَتَّكِئُوْنَ' محذوف ماننا پڑے گا۔ یعنی وہ سندس اور استبرق کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے بیٹھنا باہمی اعتماد و محبت کی دلیل ہے چونکہ انھوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو نیک مشورے دیے اور اس کا نہایت مبارک انجام ان کے سامنے ہوگا اس وجہ سے وہ پوری خوشدلی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کے بیٹھیں گے۔ اس کے برعکس کفار اور ان کے لیڈر اس دن ایک دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائیں گے۔

كَذٰلِكَ ۣ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ (۵۴-۵۵)

فرمایا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ہم آہو چشم حوریں ان کی زوجیت میں دے دیں گے۔ عربی ادب میں عورت کے لیے یہ صفت اس کے کمال حسن کی ایک جامع تعبیر ہے۔

'يَدْعُوْنَ فِيْهَا .... الاٰية' ان کے لیے ہر قسم کے میووں کی بہتات ہوگی وہ جو میوے چاہیں گے حاضر باش خدام سے طلب کریں گے۔ نہ ان کو میووں کی کمی کا کوئی اندیشہ ہوگا۔ نہ اس عیش سے محرومی کا کوئی خوف ہوگا اور نہ موت ہی کا کوئی کھٹکا ہوگا۔ ہر اندیشہ سے بےخوف وہ ابدی عیش کا لطف اٹھائیں گے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۵۶-۵۷)

یعنی اس دنیا میں جو موت انھوں نے چکھ لی اس کے بعد پھر وہ موت سے آشنا نہیں ہوں گے۔ ان کی زندگی بھی جاوداں ہوگی اور ان کا عیش بھی۔ موت سے انھوں نے چھٹکارا پایا اور دوزخ سے ان کے رب نے ان کو بچایا۔ یہ خاص فضل ہے جو تیرے رب نے ان پر فرمایا اور یہی درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے نہ کہ وہ جس پر اس دنیا کے پرستار ریجھے ہوئے ہیں اور اس کے عشق میں ایسے کھوئے گئے ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ یہی دنیا کی زندگی بس کل زندگی ہے، اس کے بعد نہ جینا ہے نہ مرنا۔

۶- خاتمۂ سورہ ـــــ آیات: ۵۸-۵۹

یاد ہوگا اس سورہ کا آغاز قرآن کی عظمت کے بیان سے ہوا تھا کہ بڑی ہی عظیم نعمت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو نوازا ہے۔ اگر وہ اس کی قدر کریں گے تو دنیا اور آخرت دونوں میں فوزِ عظیم کے وارث ہوں گے۔ اور اگر گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس کی ناقدری کریں گے تو یاد رکھیں کہ یہ جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی بڑی نقمت بھی بن جائے گا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان کریں گے۔ اس تمہیدی مضمون کے بعد قرآن کے دعاوی کی صداقت کے دلائل مذکور ہوئے۔ اب آخر میں ایک نئے پہلو سے پھر اسی مضمون کی یاددہانی فرما دی گئی جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ گویا سورہ اسی مضمون پر ختم ہوئی جس سے شروع ہوئی تھی۔ اس اسلوب کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اعلیٰ خطیبوں کے خطبات میں بھی اس اسلوب کی نہایت بلیغ مثالیں ملتی ہیں۔ خطیب جس مضمون سے کلام کا آغاز کرتا ہے بالعموم اسی کی یاددہانی پر اس کو ختم کرتا ہے تاکہ آخرت میں سامعین کو اصل بات کی مکرر یاددہانی ہو جائے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿۵۹﴾

آیات ۵۸-۵۹ ۔ ع ۳ ۔ ۱۷ ۔ ۱۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۵۹

پس ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ تو تم بھی انتظار کرو، وہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔ ۵۸-۵۹

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۵۸)

'ف' سابق کے ساتھ مضمون کے اتّصال کو ظاہر کرتا ہے اور اتّصال کا پہلو وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

قرآن کی تیسیر کا مفہوم

'تَیْسِیْر' کے معنی کسی شے کو کسی مقصد کے لیے موزوں، سازگار اور ہر پہلو سے مستحکم و استوار بنانا ہے۔ یسّر الفرس للرکوب کے معنی ہوں گے گھوڑے کو زین، رکاب، لگام اور دوسرے تمام لوازم سے آراستہ کر کے سواری کے لائق بنا دیا۔ اسی طرح 'یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' کے معنی ہوں گے کہ قرآن کو تعلیم و تذکیر کے مقصد کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے نہایت موزوں بنایا ہے، جن

لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قرآن ایک نہایت سہل اور سپاٹ کتاب ہے۔ انھوں نے اس لفظ کی اصل حقیقت نہیں سمجھی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نہایت سہل کتاب بھی ہے لیکن اس کی یہ سہولت اس اعلیٰ مقصد تعلیم و تذکیر کے اعتبار سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی ہے۔ یہ مقصد اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتا ہے اور قرآن چونکہ اس کے تمام پہلوؤں اور ان کے تمام ضروری لوازم کا جامع ہے اس وجہ سے اس کے اندر نہایت دقیق اور مشکل پہلو بھی ہیں اگرچہ ان مشکل پہلوؤں کو دلوں کے اندر اتارنے کے لیے قرآن نے جو طریقے اختیار کیے ہیں ان سے زیادہ دل نشین طریقے اختیار کرنا دوسروں کے امکان میں نہیں ہے۔ تاہم یہ چیزیں بجائے خود نہایت گہرے تدبر کی محتاج ہیں اس لیے کہ ان کا تعلق حکمت سے ہے اور حکمت گہرے تدبر کی مقتضی ہوتی ہے اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی طرف سورۂ مریم کی آیت ۹۷ کے تحت بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں اور خدا نے چاہا تو اس پر مزید روشنی سورۂ قمر کی تفسیر میں ڈالیں گے۔

'بِلِسَانِكَ' سے مراد قریش کی وہ ٹکسالی زبان ہے جو فصیح عربیت کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کی فصاحت و بلاغت کے مظہر اتم تھے۔ یہ قرآن کی تیسیر کے ایک نہایت اہم پہلو کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قریش پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں اتارا ہے جو قریش کی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر اس زبان میں بھی یہ اس کتاب کو نہ سمجھے تو نہ اس کتاب کا قصور ہے اور نہ تمھارا بلکہ یہ خود ان کے دلوں کا فساد ہے جس کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔

'لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ' یہ قرآن کے اس اہتمام خاص کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ 'یاددہانی حاصل کریں' یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کی عقل و فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس کو یاد کریں، جو حقائق آفاق و انفس کے اندر مضمر ہیں ان سے سبق حاصل کریں اور جو تعلیم ان کو سابق نبیوں، خاص کر ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے ملی ہے اس کو یاد کریں۔ قرآن ان ساری باتوں کی نہایت بہترین زبان اور بہترین اسلوب سے یاددہانی کر رہا ہے۔ اس ٹکڑے کے اندر یہ تنبیہ بھی مضمر ہے کہ اگر وہ یہ یاددہانی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر اس انجام کے لیے تیار ہو جائیں جو اس طرح کے سرکش لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے اور جس کی یاددہانی خود ان کے ملک کی یہ پچھلی تاریخ ان کو کر رہی ہے۔

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُونَ (۵۹)

اس آیت میں اوپر والی مضمر تنبیہ واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ منتظر ہیں کہ جس عذاب سے یہ ان کو ڈرا رہی ہے اس کو دیکھ کر ہی اس کو مانیں گے تو تم بھی انہی کی طرح اب اس عذاب ہی کا انتظار کرو۔ اب فیصلہ کا انحصار اسی پر ہے۔ اوپر آیت ۱۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد

۲۲ مئی سنہ ۱۹۷۶ء ۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

٤٥

الجاثیۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ نام، تمہید اور بنیادی مطالب میں سابق سورہ کا مثنیٰ ہے۔ فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا ہے۔ اس میں قریش کو صاف الفاظ میں دھمکی دی گئی ہے کہ توحید اور قیامت کے دلائل سے آسمان و زمین کا ہر گوشہ معمور ہے اور ان کی تفصیل اللہ نے اپنی اس کتاب میں بھی بیان کر دی ہے۔ اگر یہ دلیلیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو دنیا کی کوئی چیز بھی تمہاری سمجھ میں نہیں سکتی۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی تمہارا فیصلہ فرمائے گا۔

مسلمانوں کو اس میں صاف الفاظ میں فتح و غلبہ کی بشارت دی گئی ہے کہ کچھ دنوں صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو۔ اگر استقلال کے ساتھ تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو آخری کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ اس راہ میں جو مصیبتیں بھی تم جھیلو گے وہ رائگاں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا بھرپور صلہ دے گا۔

یہ سورہ اس دور کی سورتوں میں سے ہے جب یہود کھلم کھلا قریش کی پیٹھ ٹھونکنے لگ گئے تھے۔ اس وجہ سے اس میں یہود کو بھی نہایت واضح الفاظ میں ملامت ہے کہ اللہ نے ان کو امامت کے جس منصب پر فائز فرمایا تھا اپنی شامتِ اعمال سے انھوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اب ان کا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ اللہ نے جو روشن شاہراہ تم کو دکھائی ہے اس پر چلو اور ان دین باختوں سے ہوشیار رہو۔ یہ زور لگا رہے ہیں کہ اپنی ایجاد کردہ بدعات میں مبتلا کر کے تمھیں بھی اللہ کی راہ سے اس طرح محروم کر دیں جس طرح وہ خود محروم ہو بیٹھے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) یہ قرآن خدائے عزیز و حکیم نے نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ جس توحید کی یہ دعوت دے رہا ہے اور جس روزِ جزا و سزا سے یہ ڈرا رہا ہے اس کے دلائل آسمان و زمین کے چپہ چپہ میں موجود ہیں۔ انسان کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، بارش کے نزول، زمین میں اس کی برکات کے ظہور اور ہواؤں کی گردش، ہر چیز کے اندر توحید اور معاد کی نہایت واضح نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ لوگ غور کریں اور غور کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئیں ان کو تسلیم کرنے کا ان کے اندر ارادہ پایا جاتا ہو۔ یہی حقائق قرآن پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ واضح باتیں

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو ان کے بعد وہ کون سی بات ہے جس کو یہ سمجھیں اور مانیں گے!

(۷ - ۱۱) شرک کے سرغنوں کو وعید جنھوں نے بالکل جھوٹ موٹ ایک دین گھڑ کے کھڑا کیا اور اب اس کی حمایت میں ایسے اندھے بہرے بن گئے ہیں کہ اللہ کا کلام سننے کے روادار نہیں ہیں۔ اگر اللہ کا کلام ان کو سنایا جاتا ہے تو تکبر کے ساتھ اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ اگر کسی بات کے متعلق انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دلوں پر اثر انداز ہونے والی ہے تو اس کو مذاق بنا لیتے ہیں تاکہ اس طرح اس کو بے وزن کر دیں۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ ان کا یہ استکبار ان کے لیے باعث رسوائی ہوگا اور جب ان کو جہنم سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت نہ ان کا وہ اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو حرام راستوں سے انھوں نے حاصل کیا ہے اور نہ ان کے وہ مزعومہ شرکا ہی ان کی کوئی مدد کر سکیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

(۱۲ - ۱۵) توحید کے بعض دلائل کا بیان ایک نئے اسلوب سے اور مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین کہ وہ مشرکین کی ژاژ خائی کی مطلق پروا نہ کریں بلکہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں۔ اگر مخالفین ان کی بات نہیں مانیں گے تو اپنا ہی بگاڑیں گے، اس سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

(۱۶ - ۲۰) بنی اسرائیل کے حال پر اظہار افسوس کہ اللہ نے ان کو حکومت، نبوت، وسعت رزق سے نوازا اور قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمایا لیکن انھوں نے ان نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا بلکہ باہمی حسد و عداوت کے سبب سے خدا کے دین میں اختلاف برپا کیا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اب اللہ نے بنی اسرائیل سے اپنی شریعت کی امانت واپس لے کر تمھارے حوالہ کی ہے تو تم ان کی گمراہیوں سے بچنا اور اللہ کے دین پر استوار رہنا۔ اس وقت یہود اور مشرکین نے تمھارے خلاف جو گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اس سے ذرا مرعوب نہ ہونا۔ اللہ کی تائید بہرحال ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرنے والے ہیں۔

(۲۱ - ۳۷) قیامت کے باب میں منکرین قیامت کے بعض شبہات کا ازالہ۔ اس دن قیامت کے مکذبین کا جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ آخر میں توحید کے مضمون کا پھر اعادہ۔

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

مَكِّيَّةٌ ——————— آیات: ۳۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۵

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۲)
اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۳) وَفِيْ
خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴) وَ
اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۵) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۶) وَيْلٌ
لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (۷) يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ
مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۸) وَاِذَا
عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ (۹) مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا
شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰)
هٰذَا هُدًى وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ

ع ۱۱/۱۷

مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ
الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ
فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۵

یہ حٰمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔ آسمانوں اور زمین میں ایمان لانے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور اسی طرح خود تمھاری خلقت اور حیوانات کے اندر بھی، جو اس نے زمین میں پھیلا رکھے ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین کرنا چاہیں۔ اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور اس ذریعۂ رزق میں جو اللہ آسمان سے اتارتا ہے، پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مر جانے کے بعد، اور ہواؤں کی گردش میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ ۱ - ۵

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں بالکل حق کے ساتھ سنا رہے ہیں تو اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے! ہلاکی ہے ہر اس لپاٹیے گنہگار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، اس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں، پھر وہ استکبار کے ساتھ اپنی روش پر ضد کرتا ہے گویا اس نے وہ سنی

ہی نہیں۔ تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ اور جب اس کو ہماری آیات میں سے کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ آگے ان کے جہنّم ہے اور جو چیزیں انھوں نے کمائی ہیں وہ ان کے ذرا کام آنے والی نہیں بنیں گی اور نہ وہی ان کے کام آنے والے بنیں گے جو اللہ کے سوا انھوں نے اپنے لیے کارساز بنا رکھے ہیں۔ اور ان کے لیے ایک بڑا عذاب ہوگا۔ یہ اصل ہدایت ہے اور جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا تو ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے کپکپی پیدا کر دینے والی نوعیت کا۔ ۹-۱۱

اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو سازگار بنا دیا تاکہ اس کے حکم سے، اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔ اور اسی نے تمھاری خدمت میں لگا رکھا ہے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۱۲-۱۳

ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا کے بڑے دنوں کے ظہور کے متوقع نہیں ہیں تاکہ اللہ ایک قوم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے جو وہ کرتی رہی ہے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا تو اس کا نفع اسی کے لیے ہے اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۴-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (۱-۲)

اس سورہ کا بھی قرآنی نام 'حٰمٓ' ہی ہے۔ اس نام سے موسوم سورتوں کے مطالب کے اشتراک اور ان کے مزاج کی ہم رنگی پر پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔

سورہ کی تمہید

'تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ ...... الایۃ' سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی قرآن کی عظمت و اہمیت کا حوالہ ہے البتہ اس میں اہمیت کے بیان کا پہلو سابق سورہ سے مختلف ہے۔ لفظ 'تَنْزِیْل' پر ہم اس کے محل میں بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کے اندر تدریج و اہتمام کا مفہوم پایا جاتا ہے اور قرآن کے اتارے جانے کے معاملے میں اللہ نے جو اہتمام خاص ملحوظ رکھا ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام خاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی دو صفتوں ۔ عزیز اور حکیم ۔ کا حوالہ دیا ہے۔ 'عزیز' کے معنی غالب و مقتدر کے ہیں اور 'حکیم' اس کو کہتے ہیں جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہو۔ ان دونوں صفتوں کے اجتماع سے یہاں دو باتیں واضح ہوئیں۔

صفات 'عزیز' و 'حکیم' کے مقتضیات

ایک یہ کہ جس خدا نے یہ کلام اس اہتمام کے ساتھ اتارا ہے وہ کوئی ضعیف و ناتواں اور عاجز و بے بس ہستی نہیں ہے بلکہ تمام کائنات کا اختیار و اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ تمام کائنات کے مالکِ حقیقی کا فرمانِ واجب الاذعان ہے اگر اس کا کما حقہ، احترام نہ کیا گیا تو لوگ، یاد رکھیں کہ جب وہ لوگوں کو پکڑے گا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ بن سکے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ عزیز اور غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اس وجہ سے اس کا ہر قول و فعل حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی حکمت کی شان اس کے اس حکیمانہ کلام سے واضح ہے بشرطیکہ لوگ اس پر غور کریں۔ اس کی حکمت ہی کی ایک شان یہ بھی ہے کہ اگرچہ ناقدرے اور ناشکرے اس کے کلام اور اس کے رسول کی توہین کر رہے ہیں لیکن وہ غالب و مقتدر ہونے کے باوجود ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کو مہلت پر مہلت دیے جا رہا ہے تاکہ جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے وہ اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنا لیں اور جو اپنی صلاحیتیں برباد کر چکے ہیں ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے، حساب کے دن وہ کوئی عذر نہ کر سکیں۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۳)

قرآن کی دعوت مس

یہ قرآن کی دعوت توحید اور اس کے انذارِ قیامت کے حق میں آفاق کے دلائل کی طرف اشارہ ہے تاکہ اس کا حکیمانہ کلام ہونا واضح ہو۔ فرمایا کہ قرآن لوگوں کو جس چیز کی طرف بلا رہا ہے اور جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس کی نشانیاں آسمانوں اور زمین کے چپہ چپہ میں موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں کارآمد اُن

لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لانے والے ہوں۔ جو لوگ ایمان لانے والے نہ ہوں وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں اور روز نئی نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی نئی نشانی دکھا بھی دی جائے تو اس سے بھی وہ قائل نہیں ہوتے بلکہ کسی دوسری نشانی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ اصل چیز انسان کا ارادہ ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقت کی جستجو اور منزل کی طلب ہو تو خالقِ کائنات نے منزلِ مقصود کی نشان دہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ آسمانوں میں بھی جگہ جگہ سگنل اشارے دے رہے ہیں اور زمین بھی قدم قدم پر رستہ دکھا رہی ہے لیکن جو لوگ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے بھٹکنا چاہتے ہیں ان کو نہ آسمان کے سگنل نظر آتے اور نہ زمین کے نشانات۔ وہ ہمیشہ آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں اور اسی آوارہ گردی میں ان کی زندگیاں گزر جاتی ہیں۔

وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴)

انسان کی خلقت کے اندر جو نشانیاں ہیں ان کی طرف اشارہ

آسمانوں اور زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کی خلقت اور اس کی پرورش کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں جو اہتمام فرمایا ہے اس کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اگر اپنی ہی خلقت کے تمام اطوار و مراحل پر غور کرے تو اس پر خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے وہ حقائق واضح ہوں گے کہ اس کے لیے نہ خالق کی توحید میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہے گی نہ امکانِ معاد میں اور نہ جزاء و سزا کے لازمی ہونے میں۔ جس خالق نے انسان کو مٹی سے اور پھر پانی کی ایک بوند سے ایسی اعلیٰ صورت بخش دی اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ جس پروردگار نے انسان کی پیدائش کے بالکل ابتدائی مرحلہ سے لے کر اس کے آخری مرحلہ تک پرورش کا یہ انتظام فرمایا آخر وہ اس کو بالکل غیر مسئول کس طرح چھوڑ دے گا۔ جو انسان اتنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے آخر اس کی صلاحیتوں کے باب میں اس سے پرسش کیوں نہیں ہو گی؟ پھر یہ کہ جس انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے تمام اضداد اور تمام اجزائے مختلفہ کو سازگار بنایا آخر اس کی کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کسی دوسری چیز کو شریک کرے؟

سامانِ پرورش کی نشانیوں کی طرف اشارہ

'وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ' میں اشارہ اس سامانِ ربوبیت کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کی شکل میں انسان کے لیے مہیا فرمایا ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان چوپایوں سے جو گوناگوں فوائد حاصل کر رہا ہے یہ اس کو محض اتفاقی واقعہ کے طور پر نہیں حاصل ہو رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہی فوائد کے لیے ان چیزوں کو وجود بخشا اور ہر اعتبار سے ان کو ان کے فوائد کے لیے موزوں بنایا ہے۔ انسان کو سواری اور باربرداری کا محتاج بنایا تو سواری اور باربرداری کے لیے نہایت موزوں جانور پیدا کیے، اس کو دودھ اور گوشت اور

کھال اور اون کا ضرورتمند بنایا تو ان تمام ضروریات کے لیے الگ الگ نہایت مناسب چوپائے عطا کیے۔ یہ چیز اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اس کائنات کا خالق نہایت مہربان ہے اور اس کی شکر گزاری واجب ہے۔ پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب اس نے انسان کو اس اہتمام کے ساتھ اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو لازم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس دن وہ ان نعمتوں کے متعلق لوگوں سے سوال کرے، جنھوں نے ان کا حق پہچانا ہو ان کو انعام دے اور جو ان کو پا کر خدا کو بھول بیٹھے ہوں ان کو اس کفرانِ نعمت کی سزا دے۔

ایمان لانے کے لیے اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان کا ارادہ پایا جاتا ہو

'لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ' میں فعل 'یُوۡقِنُوۡنَ' ارادۂ فعل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی مذکورہ چیزوں کے اندر توحید و معاد اور جزا و سزا کی دلیلیں تو بے شمار ہیں لیکن مجرد دلیلوں کا وجود اس کے لیے نافع نہیں ہے جس کے اندر دلیلوں کو قبول کرنے کا ارادہ نہ پایا جاتا ہو۔ جو شخص کسی بات کا یقین نہیں کرنا چاہتا وہ بدیہی سے بدیہی حقیقت کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ شکوک ایجاد کر ہی لیتا ہے۔

وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (۵)

'اِخۡتِلَافٌ' کے معنی یہاں یکے بعد دیگرے رات اور دن کی آمد و شد کے ہیں۔ ساتھ ہی یہ لفظ اس اختلافِ مزاج کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ کر رہا ہے جو رات اور دن کے اندر پایا جاتا ہے اور جو اس کائنات کی نشو و نما اور اس کی بہبود و بقا کے لیے ضروری ہے۔ 'مِنۡ رِّزۡقٍ' سے مراد یہاں پانی ہے جو ذریعۂ رزق بنتا ہے۔ گویا مسبّب سبب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کا یہ طریقۂ استعمال عربی بلکہ کم و بیش ہر زبان میں معروف ہے۔

رات اور دن کی آمد و شد کے اشارات

اختلافِ لیل و نہار کی دلیل قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ باوجودیکہ ان دونوں کے اندر نسبت ضدّین کی ہے، ایک خشک ہے دوسرا گرم، ایک پُرسکون ہے دوسرا پُرشور، ایک تاریک ہے دوسرا روشن، تاہم ان کے اندر انسان کی پرورش کے لیے زوجین کی سی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے اور اسی کے حکم سے برابر، پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ، اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری میں سرگرم ہیں۔ اگر یہ الگ الگ خداؤں کی ایجاد ہوتے تو ان کے اندر جو سازگاری پائی جاتی ہے اس کا وجود میں آنا ناممکن تھا اور اگر یہ سازگاری وجود میں نہ آتی تو اس کرۂ زمین کے باشندوں کے لیے زندگی ناممکن ہو جاتی۔

بارش کی نشانیاں

یہی حال بارش کا ہے کہ وہ ہوتی تو آسمان سے ہے لیکن زندگی زمین اور اہلِ زمین کو بخشتی ہے۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔ اگر آسمان کے دیوتا الگ اور زمین کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کے لیے

غذا کا ذخیرہ اتارتے! پھر یہ بات بھی ہر موسم میں، ہر خاص و عام کے مشاہدہ میں آتی ہے کہ زمین بالکل خشک اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی کہ بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی دیکھتے دیکھتے زمین کا ہر گوشہ لہلہا اٹھتا ہے۔ تو جس خدا کی یہ شانیں ہر موسم میں ہم دیکھتے ہیں اگر وہ اس دنیا کے مرکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو کیا یہ کام اس کے لیے مشکل ہو جائے گا!

ہواؤں کی گردش کی نشانیاں

'وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ' یعنی ہواؤں کی گردش میں بھی خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور اس کی نقمت کی نشانیاں موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مُصَرِّف کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے اور وہی اپنی حکمتوں کے تحت ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ ان کو روک دے تو چشم زدن میں ساری دنیا تباہ ہو جائے۔ وہ چاہے تو ایک قوم کے لیے اس کو رحمت بنا دے اور دوسری قوم کے لیے نقمت۔ اسی ہوا کی گردش سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور اسی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کیا۔ آئے دن یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ کسان اپنی فصل کے مستقبل سے نہایت مطمئن ہوتے ہیں لیکن دفعۃً کوئی ایسی ہوا چل جاتی ہے کہ مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ ملاح اپنی کشتیوں کے بادبان کھولے ہوئے اور کسان اپنی گندم صاف کرنے کے آلات لیے ہوئے سازگار ہوا کے انتظار میں چشم براہ ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ سازگار ہوا چلا دے۔ اس زمانے میں سائنس کی بدولت اگرچہ انسان کے اندر یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اس نے ابر و ہوا کو بہت بڑی حد تک اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے تو اس ادعا کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہ باتیں اس بات کی صاف شہادت ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جو اس کائنات کے تمام عناصر پر حکمران ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

'اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'۔ یعنی نشانیاں تو قدم قدم پر توحید اور معاد کی موجود ہیں لیکن یہ نشانیاں نظر ان لوگوں کو آتی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے یا کام لیتے ہیں تو بس اسی حد تک جس حد تک وہ ان کی مادی ضروریات کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹا سکے، وہ لوگ ان نشانیوں کے اصلی جمال کے مشاہدہ سے محروم ہی رہتے ہیں۔

نشانیوں کی طرف اجمالی اشارات کی وجہ

یہاں قرآن نے ان نشانیوں کی طرف اجمالی اشارات کیے ہیں اس وجہ سے ہم بھی اجمالی اشارات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پچھلی سورتوں میں یہ باتیں تفصیل سے گزر چکی ہیں اور ہم بھی ان کی وضاحت پوری تفصیل سے کر چکے ہیں۔

اوپر کی تینوں آیات سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اہل ایمان کے لیے تو اس کائنات کا گوشہ گوشہ

توحید و معاد کی نشانیوں سے معمور ہے نہ ہے دوسرے تو ان سے بھی یہ نشانیاں مخفی نہیں ہیں بشرطیکہ ان کے اندر ماننے اور یقین کرنے کا حوصلہ اور اپنی عقل سے صحیح کام لینے کا داعیہ ہو۔ جو لوگ ایک حقیقت کو، خواہ وہ کتنی ہی واضح ہو، ماننا ہی نہیں چاہتے یا اپنی عقل سے وہ اصل کام لیتے ہی نہیں جس کے لیے وہ فی الحقیقت خلق ہوئی ہے، ایسے لوگوں کے اندھے پن کا کوئی علاج نہیں ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین کو ملامت

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخالفین کو ملامت ہے۔ 'تِلْكَ' کا اشارہ آفاق و انفس کی انہی نشانیوں کی طرف ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ اللہ کی توحید، اس کی قدرت و حکمت اور اس کے روز جزا و سزا کی یہ نشانیاں ہیں جو اس قرآن کے ذریعہ سے ہم تم کو، ان کے صحیح نتائج و لوازم کے ساتھ، پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہ نشانیاں اس قدر واضح ہیں کہ کوئی ذی ہوش ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ انہی کے واقعی نتائج و لوازم کو قرآن تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اگر تمہارے یہ مخالفین ان نشانیوں کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اب ان سے زیادہ عقل اور دل کو مطمئن کرنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر ایمان لائیں گے!

'بالحق' کا مفہوم

'نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ' میں 'بِالْحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں جو ان نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک ان نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے ان پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں اس وجہ سے یا تو ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے جو ان کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں لیکن چونکہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات و ارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پر اناٹومی (ANATOMY) والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات و اثرات اور ہواؤں کے تغیر و تبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں لیکن ان سب کا حال ان کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دوربینوں اور خوردبینوں سے تل کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ ان کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشنگوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم و خشک رہے گا اور اس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں ان کی پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں ان کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سوال پر

غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ ان تصرفات کے پسِ پردہ حقیقی متصرف کون ہے اور اس کے حقوق و فرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات و تغیرات جو ہوتے ہیں یہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اس اصل سوال تک پہنچے، اس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اس کو اس سوال کا کوئی دلنشین حل بتائے تو اس کو قبول اور اس پر عمل کرے۔ قرآن نے ان نشانیوں کے انہی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں اس وجہ سے اس کو نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دو اہم حقیقتیں

اس سے ایک بڑی اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ قرآن کی دعوت جبر یا تحکم پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر آفاق و انفس کے واضح دلائل اور عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہے۔ جو لوگ ان کو نہیں مانتے ان کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مخفی ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف پاتے ہیں اس وجہ سے ان سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں ہو سکتے جو ان کی خواہش کے خلاف ہے اگرچہ وہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر ان کے سامنے آئے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ بدیہی بلکہ ابدہ البدیہیات اللہ اور اس کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ ان کے منکر ہیں وہ کسی بھی حقیقت کو ماننے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کے غلام، اپنے پیٹ اور تن کے پجاری ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ نئی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کریں تو ان کے مطالبات لائق توجہ نہیں ہیں۔ اس طرح کے اندھوں کی آنکھیں کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی نہیں کھول سکتا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۷-۸)

یہ اسی ملامت کے مضمون کی مزید توسیع ہے کہ جن لوگوں نے اس طرح تمام حقائق تلپٹ کر دیے ہیں تاکہ اپنی گنہگارانہ زندگی کے لیے سندِ جواز فراہم کریں ان کے لیے ہلاکی ہے۔

'اَفَّاكٌ' اور 'اَثِيْم'

'اَفَّاكٌ' کے معنی ہیں حقائق کی قلب ماہیت کر دینے والا، یعنی خدا کی نشانیاں اور اس کی آیات تو کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہوں لیکن وہ محض اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی میں اس حقیقت کی بالکل قلب ماہیت کر دے۔ اس کے مصداقِ اول تو قریش کے مشرکین تھے جنھوں نے محض اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی میں دینِ ابراہیم کو مسخ کیا لیکن اس کے عام مصداق میں ہر دور کے وہ محرفینِ دین شامل ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کے احکام میں اپنی خواہشات کے تحت تحریف کے مرتکب ہوئے یا ہو رہے ہیں۔

'اَثِیۡمٍ' کے معنی گنہگار، خاص طور پر حقوق و فرائض کے تلف کرنے والے کے ہیں۔ 'اَفَّاکٍ' کے ساتھ اس صفت کا جوڑ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ حقائق کے قلب ماہیت کی اس سازش کے مرتکب وہی نابکار ہوتے ہیں جو خدا کے حقوق و فرائض کے ادا کرنے سے گریز اور اپنی معصیت کی زندگی پر اصرار کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ ان بدبختوں کے لیے ہلاکی اور تباہی ہے اس لیے کہ اللہ کی آیات ان کو سنائی جا رہی ہیں لیکن یہ نہایت تکبر کے ساتھ ان کو سن کر اس طرح چل دیتے ہیں گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔ یہ اشارہ قریش کے لیڈروں کے اس رویے کی طرف ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں اختیار کرتے۔ اوّل تو یہ لوگ مجلس نبوی میں جانے ہی کو عار خیال کرتے لیکن کبھی پہنچ بھی جاتے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس جا کر ان کو قرآن سناتے تو اس طرح کان جھاڑ کر اٹھ جاتے گویا کوئی بات انھوں نے سنی ہی نہیں۔

'تُتْلٰی عَلَیْہِ' کے الفاظ سے ان کے جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگر دعوت حق کسی کو پہنچی نہ ہو اور وہ اس سے غافل رہ جائے تو اس کے لیے کچھ عذر ہو سکتا ہے لیکن وہ بدبخت خدا کو کیا جواب دے گا جس کے کانوں میں رسول نے خود جا کر اذان دی لیکن وہ بیدار نہ ہوا!

اصرار علی الشرک کا اصل سبب استکبار ہے

'یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا' میں اصرار علی الشرک کے اصل سبب پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کے اصرار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان پر حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اس بات میں اپنی سُبکی سمجھتے ہیں کہ قوم کے سردار اور اعیان و اشراف ہو کر ایک ایسے شخص کی بالاتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں جو دنیوی وجاہت میں ان کا ہم سر نہیں ہے۔

'فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ' یہ اس 'وَیْلٌ' کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا کہ اس طرح کے تمام متکبرین کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ یہ لوگ اگر اپنے غرور کے باعث نجات کی بشارت سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو بند رکھیں، عذاب کی خوش خبری بہرحال ان کو پہنچا دو جو اس طرح کے لوگوں کے لیے لازمی ہے۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا ِۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ؕ (۹)

حق کی مخالفت کا عامیانہ حربہ

اوپر کی آیت میں متکبرین کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو وہ اس وقت اختیار کرتے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ان کو قرآن سنانے کی کوشش فرماتے۔ اب ان کا وہ رویہ بیان ہو رہا ہے جو اس وقت وہ اختیار کرتے جب قرآن کی کوئی بات ان کو کسی اور واسطہ سے پہنچتی۔ فرمایا کہ ان کو ہماری آیات میں سے کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دوسرے ان سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں قریش

کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جو غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتے اور ان سے وہ متاثر بھی ہوتے۔ اس طرح کے لوگ ان آیتوں کو اپنے سرداروں کے علم میں بھی لانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کے باب میں ان کی رائے معلوم کریں۔ ان کے سردار فوراً تاڑ جاتے کہ لوگ ان آیات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر سے لوگوں کو بچانے کے لیے وہ یہ تو کر نہیں سکتے تھے کہ دلیل سے قائل کر دیں کہ قرآن کی بات میں فلاں چیز عقل یا فطرت یا حقیقت کے خلاف ہے۔ واحد تدبیر جو وہ کر سکتے تھے وہ یہی تھی کہ قرآن کی بات کا مذاق اڑائیں تاکہ اس طرح بات ہوا میں اڑ جائے اور کسی پر اس کا کوئی اثر نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی عامیانہ حرکت اگرچہ کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوتی تاہم وقتی طور پر کمزور رائے کے لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حربہ ہر دور کے شیاطین نے حق کے خلاف استعمال کیا ہے۔

سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی ہو

'أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ'۔ ان لوگوں کے اس رویہ کا اصل محرک، جیسا کہ اوپر والی آیت میں مذکور ہوا، استکبار تھا اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ انھوں نے حق کے مقابل میں گھمنڈ کیا اس وجہ سے ان کے لیے آخرت میں رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اگرچہ اللہ کا ہر عذاب پناہ مانگنے کی چیز ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ سخت عذاب وہ ہے جس کے ساتھ رسوائی بھی ہو۔ یہ عذاب متکبرین کے لیے خاص ہے۔

مِّن وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ ۖ وَلَا يُغْنِي عَنْهُم مَّا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰)

'مِن وَرَاءِ' کا مفہوم ہمارے اردو کے ورے اور پرے کی طرح موقع و محل سے معین ہوتا ہے۔ اس کا مطلب آگے بھی ہو سکتا ہے اور پیچھے بھی۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے آگے جہنم ہے جس میں یہ پڑیں گے اور اس میں پڑنے کے بعد نہ ان کا وہ حرام اندوختہ ان کے کچھ کام آئے گا جو ان کے استکبار اور حق سے اعراض کا سبب بنا اور نہ ان کے وہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی کچھ کام آئیں گے جن کو انھوں نے اللہ کے سوا اپنا کارساز بنایا۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ'۔ اور عذاب بھی کوئی ایسا ویسا نہیں ہو گا جو کسی طرح جھیلا جا سکے بلکہ بہت بڑا عذاب ہو گا۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ آج نہیں ہو سکتا۔

هَٰذَا هُدًى ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ (۱۱)

یعنی یہ قرآن اللہ کی نازل کردہ ہدایت ہے۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی ان آیات کا انکار کریں گے یا مذاق اڑائیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہو گا۔

'مِّن رِّجْزٍ' کے الفاظ اس عذاب کی نوعیت واضح کر رہے ہیں۔ 'رجز' اس سزا یا عذاب کو کہتے ہیں جو کپکپی پیدا کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی عذاب نہیں ہو گا بلکہ نہایت دردناک ہو گا جو دلوں کو

لرزا دے گا۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿ۚ﴾ وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (۱۲-۱۳)

دلائل کا سلسلۂ بیان

اوپر کی چار آیتیں توحید اور معاد کے دلائل کے بیچ میں بطور تنبیہ و تذکیر آ گئی تھیں تاکہ قریش کے لیڈروں کو برسرِ موقع تنبیہ ہو جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے دی جائے۔ اب اس آیت میں اصل سلسلۂ کلام کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو اس طرح تمھاری خدمت میں لگا رکھا ہے کہ وہ اپنے سینہ پر تمھاری کشتیوں کو چلاتا ہے۔ 'بِاَمۡرِہٖ' یعنی یہ بات خاص خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو دیکھتے ہو کہ کشتی سے کہیں زیادہ چھوٹی چیزیں سمندر کے اندر ڈالتے ہی ڈوب جاتی ہیں لیکن ہزاروں ٹن کا جہاز اس پر تیرتا ہے۔ یہ اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے کہ لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تو ڈوب جائے لیکن جہاز اپنے اوپر ہزاروں ٹن لوہا لادے ہوئے نہ ڈوبے۔ 'وَلِتَبۡتَغُوۡا' سے پہلے قرینہ دلیل ہے کہ 'لِتَرۡکَبُوۡا' یا 'لِتُسَافِرُوۡا' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ حرفِ عطف اس حذف کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمھارے لیے یہ اہتمام اس لیے فرمایا ہے کہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کرو اور تجارت کی راہ سے اس کے فضل کے طالب بن سکو۔

شاہداتِ ربوبیت کی اصل تعلیم

'وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ' یہ وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ان شاہدات سے ہر اس شخص کو ملتا ہے جس کے ضمیر اور جس کی عقل کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے اپنی پروردگاری کی یہ شانیں اس لیے تم کو دکھائی ہیں کہ تم اس کے شکر گزار بندے بنو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شکر گزاری کا یہ جذبہ ہی خدا کی بندگی کی اصل ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

'وَسَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ' اوپر خاص طور پر سمندر کی تسخیر کا ذکر فرمایا تھا جو انسان کے مشاہدہ میں آنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ زوردار اور بظاہر بالکل ناقابلِ تسخیر بھی ہے اور کم و بیش ہر شخص کو اس کے سفر کا تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اب یہ خاص کے بعد اس کائنات کی عام چیزوں کا حوالہ دیا کہ اسی خدا نے آسمانوں اور زمین کی دوسری چیزوں کو بھی تمھاری منفعت رسانی میں لگا رکھا ہے۔ 'جَمِیۡعًا مِّنۡہُ' یعنی یہ ساری چیزیں اسی کے حکم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تمھاری خدمت انجام دے رہی ہیں۔ 'جَمِیۡعًا' کا تعلق ماسبق سے نہیں بلکہ 'مِّنۡہُ' سے ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہ تم نے مسخر کیا ہے، نہ کسی اور نے مسخر کیا ہے اور نہ یہ چیزیں بطور خود تمھاری چاکری کر رہی ہیں بلکہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے تمھارے رب کی تدبیر سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تنہا وہی ہے جو ان تمام چیزوں کا خالق اور ان پر متصرف ہے۔

'اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ' یعنی غور کرنے والوں کے لیے آفاق کی نشانیوں

ہیں توحید اور معاد کی گوناگوں دلیلیں موجود ہیں۔

— ان کا مسخر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی یہ درجہ نہیں رکھتی کہ اس کو معبود مان کر اس کی پرستش کی جائے بلکہ ہر چیز اپنے وجود سے اس بات کی شاہد ہے کہ اس کی نکیل ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو اپنی مشیت اور حکمت کے تحت استعمال کر رہی ہے۔

آفاق کی نشانیوں میں توحید اور معاد کی دلیلیں

— ان کے اندر تضاد و تخالف کے باوجود اس طرح کی موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ایک مشین کے پرزوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ توافق اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ہی ارادہ ہے جو اس کائنات کے پورے نظام پر حاوی ہے۔

— اس نظام میں ربوبیت، رحمت اور حکمت کی ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں کہ کوئی اندھی بہری قوت اس کو نہیں چلا رہی ہے۔ اس کا علم، اس کی رحمت اور اس کی حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا روزِ جزاء و سزا بھی لائے جس میں وہ ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کی ناقدری کی اور کفر و شرک میں مبتلا ہوئے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ' بالکل بے اختیار ہے یا بالکل بے حس اور کھلنڈرا۔ یہ باتیں اس کی اعلیٰ صفات کے منافی ہیں۔

آخر میں لفظ 'یَتَفَکَّرُوْنَ' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے ان کی کمی نہیں ہے۔ کائنات کا چپہ چپہ ان سے معمور ہے اور قرآن نے بھی ان کی پوری تفصیل کر دی ہے۔ کمی جس چیز کی ہے وہ تفکر کی ہے۔ لوگ اللہ کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے اور یہ غور کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔

دلائل کی کمی نہیں ہے ضرورت تفکر کی ہے

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجْزِیَ قَوْمًاۢ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۴)

'یَغْفِرُوْا' یہاں درگزر اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔

'اَیَّامَ اللّٰہِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کے عدل و انتقام کے وہ تاریخی دن ہیں جن میں اس نے رسولوں کے مکذبین کو صفحۂ ارض سے نیست و نابود کیا ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اس میں ان ایام' کا ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی ان کی تفصیل آئے گی۔ 'لِیَجْزِیَ قَوْمًا' میں 'قوم' سے مراد یہی مخالفین ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ اس لفظ کی تنکیر اظہارِ نفرت و بیزاری کے لیے ہے جس طرح 'اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا' میں لفظ 'قُلُوْبٍ' کی تنکیر ہے جن لوگوں نے اس سے مسلمانوں کو مراد لیا ہے انھوں نے سیاق و سباق کی دلالت اور اسلوب کی بلاغت پر غور نہیں کیا۔

جس طرح اوپر آیت ۹ میں مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی

مسلمانوں کے لیے تسلی

ہے اسی طرح اس آیت میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی اوچھی حرکتوں سے وہ دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ ان کو ابھی نظر انداز کریں۔ ان لوگوں کو چونکہ یہ اندیشہ نہیں ہے کہ جس روزِ بد سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ فی الواقع ظہور میں بھی آنے والا ہے اس وجہ سے یہ دلیر ہوتے جا رہے ہیں لیکن اللہ اس قابلِ نفرت قوم کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہے کہ یہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ یہ اپنے کیے کی بھرپور سزا پائیں۔ سنتِ الٰہی یہی ہے کہ وہ شریروں کو پوری مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۵)

یہ اسی تسلی کے مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ اگر یہ لوگ نیکی کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا نفع انہی کو پہنچے گا اور اگر بدی پر جمے رہ گئے تو اس کا وبال انہی پر آئے گا۔ اس کی کوئی ذمہ داری اہلِ ایمان پر نہیں ہو گی جب کہ انھوں نے حق لوگوں کو پہنچا دیا۔ پھر قیامت کے دن سب کی پیشی خدا کے سامنے ہو گی اور اس دن فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر رہا اور کون باطل پر اور کون کس انجام کا سزاوار ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶ - ۲۳

آگے یہود کے اس رویہ سے بحث ہے جو اسلام دشمنی کے جوش میں، مشرکین کی حمایت میں انھوں نے اختیار کیا۔ اس دور میں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں انھوں نے بھی کھلم کھلا مشرکین کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی۔ ان کو چونکہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت حاصل رہی تھی اس وجہ سے ان کی شہ نے مشرکین کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کا پول کھول دیا جائے تاکہ مسلمانوں کے اندر ان کی مخالفت سے کوئی ہراس نہ پیدا ہو اور مشرکین بھی آگاہ ہو جائیں کہ جن کی شہ پر وہ بہت نازاں ہیں وہ ان سے بھی بڑے خدا کے مجرم ہیں۔ اگر ان کے کہے پر وہ چلے تو بالآخر دونوں کا انجام ایک ہی ہو گا۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے استقلال کے ساتھ اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید فرمائی گئی کہ اب خدا کی اصل شریعت پر تمہی ہو۔ نہ تمھیں یہود کی پروا کرنی ہے نہ مشرکین کی۔ اللہ کی تائید صرف تمھیں اور تمھارے ساتھیوں ہی کو حاصل ہے اور اللہ کی تائید بس ہے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۲۳

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ

وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ
بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٧﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ
مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨﴾
اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩﴾ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ
اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَاۗءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿٢١﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ
لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ اَفَرَءَيْتَ
مَنِ اتَّخَذَ اِلٰــهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ وَّخَتَمَ
عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ
مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٣﴾

ع ٢ ١٨

ترجمۂ آیات ١٦-٢٣

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت سے سرفراز کیا اور ان کو پاکیزہ رزق عطا کیا اور دنیا والوں پر ان کو فضیلت بخشی اور ان کو شریعت الٰہی کے کھلے کھلے احکام دیے۔ تو انھوں نے نہیں اختلاف کیا مگر بعد

اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، محض باہمی ضدّم ضدّا کے سبب سے۔ بیشک تیرا رب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان تمام چیزوں کے بارے میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ پھر ہم نے تم کو اللہ کی ایک واضح شریعت پر قائم کیا تو تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ یہ لوگ خدا کے آگے تمھارے کچھ کام آنے والے نہ بنیں گے اور اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ اپنے ڈرنے والے بندوں کا کارساز ہے۔ ۱۶ - ۱۹

یہ لوگوں کے لیے بصیرت پیدا کرنے والی آیات کا مجموعہ اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔ کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کی زندگی اور موت یکساں ہو جائے گی؟ بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تاکہ بدلہ دیا جائے ہر جان کو اس کے کیے کا اور ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ ۲۰ - ۲۲

کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اس کو جس کو اللہ نے علم رکھتے ہوئے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا! بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہو! کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے! ۲۳

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)

انعامات جو اللہ نے بنی اسرائیل پر کیے لیکن انھوں نے ان کی ناقدری کی

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو عظیم احسانات فرمائے یہ ان کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا اور آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا، یہ دکھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر بڑے بڑے احسانات کیے لیکن یہ قوم ایسی ناہنجار نکلی کہ اس نے ہر احسان کی ناقدری کی یہاں تک کہ خود بھی اللہ کی نعمتوں سے محروم ہوئی اور اپنی ہی طرح دوسروں کو بھی اس سے محروم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔

'اَلْکِتٰبَ' سے مراد ظاہر ہے کہ تورات ہے۔

'حُکْم' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ وہ حکومت مراد ہے جو بنی اسرائیل کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دور میں حاصل ہوئی اور ایک طویل مدت تک قائم رہی۔ کتاب اور حکومت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اللہ کی کتاب اس کے احکام و قوانین کا مجموعہ ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنے احکام و قوانین کا صحیفہ عطا فرماتا ہے اس کو لازماً حکومت بھی دیتا ہے اس لیے کہ احکام و قوانین کی تنفیذ کے لیے حکومت ناگزیر ہے۔ اس حکومت سے قوم اسی وقت محروم ہوتی ہے جب وہ اللہ کے احکام کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتی ہے۔

'نبوۃ' کا مفہوم واضح ہے لیکن یہاں اس کے ذکر کا ایک خاص پہلو ہے وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے اندر نبوت کا ایک ایسا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا جو حضرت مسیح علیہ السلام تک بلا انقطاع جاری رہا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ اس قوم نے جو سلوک کیا اس کے نتیجہ میں یہ قوم ملعون ہوئی پھر حکومت اور نبوت دونوں نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

'وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ' سے رزق و فضل اور نعمت و رفاہیت کی اس فراوانی کی طرف اشارہ ہے جس کا آغاز ارض فلسطین پر ان کے قبضہ کے بعد سے ہوا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

'وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ'۔ یہ فضیلت کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دیے جانے کا لازمی نتیجہ ہے۔ کتابِ الٰہی خلق کے لیے ہدایت کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ روشنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پکڑاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اس قوم کو اپنی خلق کی رہنمائی کے لیے چُن لیا۔ بلا شبہ یہ ایک عظیم فضیلت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ فضیلت مشروط ہے۔ جب تک

کوئی قوم خلق کی رہنمائی کا یہ فرض انجام دیتی ہے اس وقت تک اس کو یہ فضیلت حاصل رہتی ہے۔ جب وہ اس فرض کو ترک کر دیتی ہے اس فضیلت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

وَاٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ (۱۷)

یہود کی رہنمائی کے لیے مزید اہتمام اور ان کی طرف سے اس کی ناقدری

'امر' سے مراد یہاں دین و شریعت ہے۔ فرمایا کہ مزید برآں ہم نے یہ کیا کہ شریعت کے احکام ان کو نہایت واضح، قطعی اور غیر مشتبہ شکل میں دیے تاکہ ان میں کسی اختلاف یا ان سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود انھوں نے اختلاف کیا اور یہ اختلاف اس وجہ سے نہیں کہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود تھی بلکہ علم وحی کی روشنی موجود ہوتے ہوئے انھوں نے محض ضدم ضدا کے باعث یہ اختلاف برپا کیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ اللہ کی روشنی سے محروم ہو بیٹھے۔ اب قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس حد تک حق بجانب تھے۔ اور کس حد تک اس میں محض ان کی ضد، ہٹ دھرمی، بات کی پچ اور حریف کو شکست دینے کی خواہش کو دخل رہا ہے۔

مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ

یہاں ان کے کردار کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کو تسلی دینا ہے کہ آج جو لوگ پنچ بن کر یہ فیصلہ کرنے اٹھے ہیں کہ قریش حق پر ہیں یا مسلمان، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ آپس کے اختلافات اور باہمی عناد و حسد کے سبب سے اللہ کے دین سے محروم ہو چکے ہیں۔ ایسے محروم القسمت لوگ اگر تمھارے حسد میں مبتلا ہو کر تمھاری مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دوسری طرف قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ جو لوگ خود اپنی آنکھوں میں دھول جھونک کر اندھے بن چکے ہیں ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تمھارے لیے سرمۂ بصیرت لے کر آئیں گے۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ جس طرح وہ اللہ کی روشنی گل کر کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں اسی طرح تم بھی، اس روشنی سے محروم، اسی اندھیرے میں بھٹکتے رہو جس میں اب تک بھٹکتے رہے ہو۔

اس آیت سے ایک نہایت اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ دین کی کسی بات کے سمجھنے میں اختلافِ رائے ہونا نہ کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ یہ دین اور اہلِ دین کے لیے کوئی نقصان دہ چیز ہے۔ اہلِ علم میں اس طرح کا اختلاف ہوا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کی محرک اگر باہمی چشمک و رقابت اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے اور پچھاڑنے کی خواہش ہو تو یہ چیز بلاشبہ سارے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسی نوعیت کے اختلاف نے اہلِ کتاب کو اللہ کی روشنی سے محروم کیا اور اسی قسم کے اختلافات نے مسلمانوں کو تباہی میں ڈالا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸)

نبی صلعم کو اللہ کے اصل دین پر جمے رہنے کی تاکید

'شریعۃ' کے معنی صاف راستہ اور واضح طریقہ کے ہیں۔ اور 'مِنَ الْاَمْرِ' جس مفہوم میں اوپر والی آیت میں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں اس آیت میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب ان اہل کتاب نے اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم گم کر دی اور خلق کو صحیح راہ بتانے والا کوئی نہیں رہا تب اللہ نے تم کو اپنی ایک واضح شریعت پر مبعوث فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آج بنی اسرائیل تمھاری دعوت کے خلاف یہ دوسراندازی کرتے پھرتے ہیں کہ ان کے اور ان کی شریعت کے ہوتے کسی نئی کتاب اور نئی شریعت کی کیا ضرورت تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر نہیں ہے۔ اگر ان کی نظر اپنی کرتوتوں پر ہوتی تو وہ جان جاتے کہ تمھاری بعثت دین کے کن تقاضوں اور خلق کی کس ضرورت کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۵۴ میں بھی گزر چکا ہے۔

'فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ 'اَهْوَآءَ' سے مراد، جیسا کہ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آرہے ہیں، بدعات ہیں۔ بدعات کی ایجاد چونکہ اپنی خواہشوں ہی کو دین کی سند دینے کے لیے لوگ کرتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو 'اَهْوَاء' سے تعبیر کرکے ان کے اصل منبع کا پتہ دے دیا کہ وہ دین یا عقل سے نہیں وجود میں آتی ہیں بلکہ ان کو نفس کی خواہشیں جنم دیتی ہیں۔

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید ہے کہ تم کو اللہ نے جو واضح شریعت، تمام بدعات و خرافات سے پاک کرکے دی ہے اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو نہیں جانتے ہیں۔ ان نہیں جاننے والوں میں، مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب شامل ہیں۔ مشرکین عرب تو ظاہر ہے کہ کتاب و شریعت سے بالکل ناآشنا امی تھے۔ وہ دینِ ابراہیمی کے وارث ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن ان کے حصہ میں صرف وہ بدعات آئی تھیں جو ان کے جاہل باپ دادا نے دینِ ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے گھڑ رکھی تھیں۔ انہی کی حمایت میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑتے کہ آپ اپنی دعوت سے ان کے آبائی دین کو مٹا رہے ہیں۔ یہود اور نصاریٰ اگرچہ حاملِ کتاب ہونے کے مدعی تھے لیکن، جیسا کہ اوپر والی آیت میں بیان ہوا ہے، انھوں نے اللہ کے دین میں اتنے اختلافات پیدا کر لیے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو گئی تھی۔ قرآن نے جب اصل حقائق واضح کیے اور وہ ان کی بدعات (اھواء) کے خلاف پڑے تو ان کے اندر بھی آگ لگ گئی کہ اس نئی دعوت سے تو ان کی دینداری کا سارا کاروبار معرضِ خطر میں ہے۔ حالانکہ قرآن کی دعوت سے نہ صرف انبیاء کا اصل دین نکھر کر سامنے آرہا تھا بلکہ اس کی تکمیل بھی ہو رہی تھی لیکن یہود و نصاریٰ چونکہ اصل دین سے بالکل تاریکی میں تھے اس وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کے ساتھی بن کر اسلام کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔

قرآن نے اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی کہ اللہ کی اصل شریعت پر قائم رہو۔ یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اسی پر جمے رہو اور ان لوگوں کی بدعتوں کی پیروی ہرگز نہ کرنا جو اللہ کے اصل دین سے بے خبر ہیں۔

اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خدانخواستہ یہ اندیشہ تھا کہ آپ ان کی بدعات کی طرف مائل ہو جائیں گے بلکہ لوگوں کی بدعات سے یہ بالواسطہ اظہارِ نفرت کا ایک طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مخاطب کرنا پسند نہیں فرمایا اس وجہ سے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے ان بدعات سے احتراز کی تاکید فرما دی۔ یہ اسلوبِ کلام قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (۱۹)

یہ لوگ کتنا ہی زور لگائیں لیکن ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا کے حضور میں تمہارے کچھ کام آنے والے نہیں بن سکیں گے۔ جو ذمہ داری اللہ نے تم پر ڈالی ہے اس کی بابت پرسش تمہی سے ہونی ہے، ان سے نہیں ہونی ہے اس وجہ سے اللہ کا جو حکم ہے اس کی تعمیل کرو۔ یہ لوگ خواہ مخالفت کر کے تمہیں دبانے کی کوشش کریں خواہ ہمدردانہ انداز میں تمہیں کچھ نرم کرنا چاہیں، کسی صورت میں بھی ان کی پروا نہ کرو۔

'وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ'۔ 'ظَالِمِیْنَ' سے مراد یہاں اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں ہی اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ ان ظالموں نے قرآن کی مخالفت کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے لیکن اس سے ذرا بھی ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ اپنے خدا ترس بندوں (یعنی مسلمانوں) کا کارساز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا اہلِ ایمان کا کارساز ہے تو پھر وہ کسی سے کیوں ڈریں یا دبیں۔ وہ اپنے طریقہ پر کام کریں اللہ ہر مشکل میں ان کی مدد فرمائے گا۔ اور جن کی مدد پر اللہ ہو کس کی طاقت ہے کہ ان کو شکست دے سکے!

هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۲۰)

قرآن کی آیات بصیرت بخش ہیں بشرطیکہ لوگ آنکھیں کھولیں

یہ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جس کی مخالفت کے لیے اہل کتاب اور مشرکین نے مذکورہ متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اوپر آیت ۱۱ میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ 'هٰذَا' سے اشارہ قرآن کی طرف بحیثیت مجموعی ہے اور لفظ 'بَصَاۗىِٕرُ'، قرآن کی آیات کو پیش نظر رکھ کر استعمال ہوا ہے جن کا کفار مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت بخش آیات کا مجموعہ ہے۔ اگر لوگ اس کا

مذاق اڑاتے اور ان کی مخالفت کرتے ہیں تو خود اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ اس آیت کے اسلوب بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جہاں تک اس قرآن کی آیات کی بصیرت بخشی کا تعلق ہے وہ سورج کی طرح ہر شخص کے لیے عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے اس کو اتارا ہے لیکن اس سے فیض انہی کو پہنچے گا جو اس سے کسب نور کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں گے۔

وَّهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ۔ فیضِ عام کے بعد یہ اس کے فیضِ خاص کا ذکر ہے کہ جو لوگ اس کے انذار اور اس کی بشارت کا یقین کریں گے ان کے لیے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔ ہم دوسرے محل میں وضاحت کر چکے ہیں کہ ہدایت و رحمت کے الفاظ اس سیاق میں جہاں جہاں استعمال ہوئے ہیں دونوں الگ الگ مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی یقین کرنے والوں کے لیے یہ قرآن دنیا میں ہدایت اور آخرت میں رحمت ثابت ہوگا۔ دنیا میں یہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گا اور آخرت میں یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کے دروازے کھولے گا۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۱)

قیامت کے منکروں کا تصور خدا کے متعلق بالکل باطل ہے

یعنی جو لوگ قرآن کے انذار اور اس کی تبشیر کا مذاق اڑا رہے ہیں ان کا تصور گویا یہ ہے کہ جہان کے خالق کے نزدیک مومن اور کافر، نیک اور بد، صالح اور طالح میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ دونوں کی زندگی اور موت بالکل یکساں ہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا تصور یہ ہے تو یہ نہایت برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ انسان کے اس شعورِ عدل کے بالکل منافی ہے جو انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے۔ کوئی شخص خواہ برائی کی زندگی گزارے یا بھلائی کی لیکن وہ اپنے دل کے اندر نیکی اور نیکی کا احترام ضرور رکھتا ہے۔ جو شخص معاملات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالتا ہے وہ ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہو تا کہ نیک اور بد دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے۔ ہر دور میں انسانوں نے جو قوانین جاری کیے ہیں ان میں یہ اصولِ عدل بنیادی طور پر ملحوظ رہا ہے۔ تو جو اصولِ عدل انسانوں کے اندر اس طرح مسلّم ہے اللہ تعالیٰ کے متعلق کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے عاری ہے؟ اگر نیک و بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ یا تو نعوذ باللہ ظالم اور نامنصف ہے یا نیکی اور بدی کے معاملہ میں بالکل بے حس۔ اور یہ ایسی باتیں ہیں جن کا خدا کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر وہ عادل و منصف ہے تو ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے۔ ان لوگوں کو پورا پورا انعام دے جنھوں نے نیکی اور عدل کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو پوری سزا دے جنھوں نے فسق اور نافرمانی کی زندگی بسر کی۔ ایک ایسے دن کا ظہور اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دنیا آزمائش کے قانون پر چل رہی ہے۔

اس میں نیک و بد دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے کہ خواہ وہ نیکی کی زندگی بسر کریں یا بدی کی، ضروری نہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا دے جو برائی کی زندگی بسر کریں یا ان لوگوں کو صلہ دے جو نیکی کی زندگی گزاریں۔ اس کے لیے اللہ نے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے۔ قرآن اسی دن کی سزا یا اس دن کے انعام سے لوگوں کو آگاہ کرنے یا اس کی بشارت دینے آیا ہے۔ پس جو لوگ اس انذار اور بشارت کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ گویا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق محض ایک کھلنڈرا اور تماشائی ہے جو دنیا کو پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیر اور شر سے اس کو کچھ بحث نہیں۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۲)

ناداں کے زعم کے علی الرغم خالق نے یہ دنیا بالحق پیدا کی ہے

یعنی نادانوں نے تو یہ گمان کر رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک غایت اور نہایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس غایت و نہایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے اور ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ ملے، اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا دن نہ آئے، یہ دنیا اسی طرح چلتی رہے یا چلتے چلتے بس یونہی ایک دن تمام ہو جائے، اس کے بعد نہ کوئی جزا ہو نہ سزا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا بالحق نہیں بلکہ ایک عبث اور باطل کارخانہ اور ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے اور اس کا خالق ایک تماشا پسند ہے جس نے بالکل بے مقصد اتنا بڑا کارخانہ کھڑا کر دیا ہے۔

'بِالْحَقِّ' کے بعد 'لِيَفْصِلَ بَيْنَهُمْ' یا اس کے ہم معنی الفاظ میرے نزدیک محذوف ہیں۔ 'لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ' اسی محذوف پر معطوف ہے۔

'وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ' کی قید سے مقصود یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس دن ہر جان کے ساتھ بالکل بے لاگ انصاف ہو، کسی پہلو سے کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہو۔ اگر اس حق تلفی کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ دنیا پھر بالکل عبث اور باطل ہو کے رہ جاتی ہے۔ یہ قید شرک و شفاعت کے ان باطل تصورات کی نفی کے لیے بڑھائی گئی ہے جن میں مشرکین بھی مبتلا تھے اور اہل کتاب بھی۔ ان تصورات کے ساتھ آخرت کو ماننا یا نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شفعاء و شرکاء اپنی شفاعت اور زور و اثر سے بخشوا ہی لیں گے تو بے لاگ انصاف کہاں رہا! پھر تو ہر ظلم و ناانصافی کے لیے راہ کھل گئی۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳)

ایک برملا اشارہ یہود کی طرف

اوپر کی آیت میں خاص طور پر مشرکین کے غلط تصوّرِ حیات پر ان کو ملامت تھی۔ اس آیت میں ان کی سرپرستی کرنے والے یہود کے بارے میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب کے مدّعی ہوتے ہوئے مشرکین اور ان کے دینِ شرک کی حمایت جو کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بدعملیوں کی پاداش میں اللہ نے ان کے کانوں اور دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پہ پردہ ڈال دیا ہے۔ تو جو خدا کے قانون کی زد میں آچکے ہوں اب کس کے بس میں ہے کہ ان کو راہ راست پر لاسکے۔

'اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ'۔ 'اَفَرَءَیْتَ' کا اسلوب کسی کی حالت پر تعجب یا افسوس کے ساتھ توجہ دلانے کے لیے آتا ہے جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں 'ذرا فلاں کو تو دیکھو' یا 'بھلا تم نے فلاں کو بھی دیکھا!' یہود کی حالت پر تعجب کے ساتھ اس لیے توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب و شریعت سے نوازا لیکن انھوں نے کتاب و شریعت کو تو پیٹھ پیچھے پھینکا اور اپنی خواہشوں اور بدعات کو معبود بنا بیٹھے۔ آدمی جب خواہشوں کا اس طرح فرمانبردار بن جائے کہ خدا کے صریح احکام کی بھی پروا نہ کرے، بلکہ خواہشوں ہی کے اندر اپنے لیے خیر و مصلحت سمجھنے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعتوں ہی کا بندہ ہے۔ یہود کی اس اہوا پرستی کا ذکر تفصیل سے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

'وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ'۔ یعنی ان لوگوں کی محرومی یہ نہیں ہے کہ ان کو علم کی روشنی ملی نہیں بلکہ ان کی اصل بدبختی یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا اس کی قدر کرنے کے بجائے انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات ہی کی پیروی کی۔ اس ضلالت پسندی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ اوپر فرمایا ہے کہ 'وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ....' (۱۷) (اور ہم نے انھیں شریعتِ الٰہی کے نہایت واضح احکام دیے تو انھوں نے علم آجانے کے بعد محض آپس کے عناد کے باعث اختلاف کیا) جو بات یہاں 'مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات آیت زیرِ بحث میں 'عَلٰى عِلْمٍ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگ روشنی پانے کے بعد اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں تو ان سے اب کسی خیر کی امید نہ رکھو۔

'وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً'۔ یعینہٖ یہی مضمون سورۂ بقرہ آیت ۷ میں ان یہود ہی کے بارے میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم ختمِ قلوب کی حقیقت پر وضاحت سے بحث کر چکے ہیں۔ اس صفت کے ساتھ قرآن نے صرف یہود ہی کا ذکر کیا ہے۔

'فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ'۔ 'مِنْ' کے بعد ایک مضاف محذوف

ہے۔ یعنی مَنْ بَعْدِ اَنْ اَضَلَّہُ اللّٰہُ۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دلوں پر سنت الٰہی کے تحت مہر ہوچکی ہو ان کو بھلا کون ہدایت دے سکتا ہے! ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ'۔ یہ مسلمانوں کو نصیحت بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ تمھیں یہ حیرانی کیوں ہے کہ یہ پڑھے لکھے اور کتاب و شریعت کے مدعی لوگ قرآن کے دشمن اور مشرکین کے ساتھی بن کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں! یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو ہدایت بخشتا ہے جو اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے لیے وہ ہدایت ہی ضلالت کا پھندا بن جاتی ہے۔ 'یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا' کے تحت اس حقیقت کی وضاحت ہو چکی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۴-۳۷

آگے منکرین قیامت کے اس احمقانہ مطالبہ پر تبصرہ ہے کہ جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ قیامت کا آنا برحق ہے تو ہمارے بزرگوں کو زندہ کر کے دکھا دو۔ اس مطالبہ کی تردید کرتے ہوئے اس انجام کی تصویر کھینچی ہے جس سے قیامت کے منکرین کو لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ جس دن اس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس دن کوئی شریک و شفیع بھی خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ اس دن فوز عظیم صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو آخرت اور توحید پر ایمان رکھنے والے اور شرک و شفاعت پر اعتماد کرنے کے بجائے عمل صالح کی کمائی کرنے والے ہوں گے ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴-۲۷

وَقَالُوْا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ ۚ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا کَانَ حُجَّتَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یَجْمَعُکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

ع ۳ ۵ ۱۹

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

ع ۴ / ۲۰

ترجمۂ آیات ۲۴-۳۷

اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ یہیں

ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے۔ اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں! اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کا یہ قول ہی ان کی واحد حجت ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لاؤ۔ ان کو بتا دو کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے پھر تم کو مارتا ہے پھر وہ تم کو روزِ قیامت تک، جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، تم کو جمع کرے گا لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۲۴-۲۶

اور اللہ ہی کی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور جس دن قیامت قائم ہو گی اس دن اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے اور تم دیکھو گے ہر گروہ کو دو زانو بیٹھے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا اس کے دفترِ اعمال کی طرف۔ ان کو بتایا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو آج تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے اوپر بالکل ٹھیک گواہی دے گا۔ ہم لکھواتے رہے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۲۷-۲۹

پس جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہی در اصل کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی رہی ہیں تو تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے! اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا

کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ ۳۲-۳۰

اور ان پر ان کے ان کاموں کی برائیاں واضح ہو جائیں گی جو وہ کرتے رہے اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے اور ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں بننے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا اور دنیا کی زندگی نے تم کو دھوکے میں ڈالے رکھا۔ پس آج نہ تو وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ پس اللہ ہی، آسمانوں اور زمین کا خداوند، عالم کا رب، شکر کا سزاوار ہے اور اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۳۷-۳۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۲۴)

منکرینِ قیامت کا معارضہ اور اس کا جواب

پیچھے آیات ۲۱-۲۲ میں قیامت کے اخلاقی، اور انفسی اور آفاقی دلائل کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ اب یہ اس معارضہ کا حوالہ ہے جو ان واضح دلائل کے مقابل میں منکرینِ قیامت پیش کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ان کو قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو بڑی رعونت کے ساتھ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہے۔ اس زندگی کے بعد نہ زندگی ہے نہ موت۔ جو لوگ مرنے کے بعد پھر زندگی اور حساب کتاب کا ڈراوا سناتے ہیں وہ محض ایک ڈھونس جماتے اور ایک وہم میں مبتلا ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

نَمُوْتُ وَنَحْيَا ۔ یعنی ہمارا مرنا اور جینا بس اسی دنیا تک محدود ہے۔ مرجانے کے بعد سارا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۔ اور یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ خدا ہمیں موت دیتا ہے، وہ ہمیں اکٹھا کر رہا ہے، پھر ایک دن وہ ہمارا حساب کتاب کرنے بیٹھے گا اور ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق! بس گردش روزگار ہے جو ہمیں فنا کرتی ہے۔ جس طرح ایک درخت اگتا ہے، اپنی پختگی کو پہنچتا ہے، اور ایک دن سوکھ کر فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی پیدا ہوتے ہیں، پھر گردشِ روزگار کے کسی تھپیڑے سے یا تو بچپن یا جوانی ہی میں فنا ہو جاتے ہیں یا بڑھاپے کو پہنچ کر مر جاتے ہیں۔

وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ان خرافات پر تبصرہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں ہے بلکہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں۔ ان کا جی قیامت کو ماننے کو نہیں چاہتا۔ یہ چیز ان کی آزادی کو مقید اور ان کے عیش کو منغص کرتی ہے اس وجہ سے بالکل بے سوچے سمجھے یہ لا ابالیانہ باتیں کرتے اور ایک ایسی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں جس کی شہادت انسان کی فطرت کے اندر ہے، جس کی گواہی اس کائنات کا پورا نظام دے رہا ہے، جو اس جہان کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت، ربوبیت اور اس کے عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر وہ ظہور میں نہ آئے تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال اور ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عرب میں دہریوں کا بھی ایک گروہ تھا جو خدا اور قیامت وغیرہ کا قطعی منکر تھا۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اشخاص و افراد کی بات اور ہے لیکن بحیثیت گروہ کے اس دور میں کوئی گروہ ایسا موجود نہیں تھا جو خدا اور آخرت کا صریح الفاظ میں منکر یا نرا مادہ پرست ہو۔ اہل عرب منکر نہیں بلکہ مشرک تھے اور اس شرک کے ذریعہ سے انھوں نے خدا کو دنیا کے نظام میں ایک عضوِ معطل بنا کے رکھ دیا تھا۔ آخرت اور حیات بعد الممات کے معاملہ میں بھی وہ قطعی انکار کے نتیجہ تک نہیں پہنچے تھے بلکہ تذبذب کے درجہ میں تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مرنے کے بعد از سرِ نو اٹھنا اول تو بہت مستبعد بات ہے اور اگر اٹھنا ہی پڑا تو ہمارا معاملہ خدا سے نہیں بلکہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہے۔ وہ ہمیں وہاں بھی اونچے سے اونچے درجے دلائیں گے۔ اور اگر خدا نے کوئی گرفت کی تو وہ اپنے زور و اثر سے ہمیں اس کی گرفت سے بچا لیں گے۔

ان کا یہ قول کہ ہمیں گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے انکارِ خدا کے معنی میں نہیں تھا بلکہ اس سے وہ قرآن کے اس فلسفہ تاریخ کی نفی کرنا چاہتے تھے جو قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ قریش کو سنایا

تھا کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ اگر تم بھی انہی کی روش اختیار کرو گے تو انہی کے انجام سے دوچار ہو گے۔ یہ انذار چونکہ بالکل مبنی بر حقیقت تھا اس وجہ سے وہ لوگ اس سے متاثر ہوئے جن کے اندر کچھ عاقبت اندیشی تھی۔ ان کے اندر یہ ڈر پیدا ہوا کہ قرآن کی یہ بات صحیح ہے اور اگر ہم نے بھی عاد، ثمود، اہلِ مدین اور فرعون کی طرح اس دعوتِ حق کو جھٹلایا اور اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح نہ کی تو مبادا اسی طرح کے کسی عذاب کی زد میں آ جائیں جس سے قرآن ڈرا رہا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو اپنی روش پر مطمئن رکھنے کے لیے قریش کے لیڈروں نے یہ فلسفہ تراشا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ پچھلی قومیں اپنے عقائد و اعمال کے فساد اور رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں خدا کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ خدا کو ان باتوں سے کیا تعلق۔ ہم ہلاک ہوتے ہیں تو گردشِ روزگار سے ہلاک ہوتے ہیں۔ ایک شخص پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہو کر ایک دن مر جاتا ہے اور اس کے اس مر جانے کا کوئی تعلق بھی اس کے عقائد و اعمال سے نہیں بلکہ تمام تر گردشِ روزگار سے ہوتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی وجود میں آتی ہیں، ترقی کرتی ہیں، تہذیب و تمدن کی بانی بنتی ہیں، فتح و تسخیر کے جال بچھاتی ہیں اور ایک دن اپنی طاقتیں اور صلاحیتیں نچوڑ کر گردشِ روزگار کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس دنیا کے اسٹیج پر یہ تماشا برابر ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ گردشِ روزگار کے کرشمے ہیں۔ جو لوگ اس چیز کو عقائد و اعمال سے باندھتے ہیں وہ بالکل وہمی اور لوگوں کو خواہ مخواہ ایک وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

قریش کے لیڈر اپنے اسی فلسفۂ باطل کو تقویت پہنچانے کے لیے اپنے عوام کو یہ سبق بھی پڑھاتے تھے کہ اگر کوئی قحط یا بلا یا طوفان آ جائے تو اس وہم میں نہ مبتلا ہو جایا کرو کہ یہ چیز تمہارے اعمال یا عقائد کے فساد کے نتیجہ میں تم پر خدا نے نازل کی ہے۔ اس طرح کے سخت اور نرم دن ہمارے اگلوں پر بھی آئے حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ بڑے ہی پاکیزہ اعمال و عقائد والے لوگ تھے۔ قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا السَّرَّآءُ وَالضَّرَّآءُ کے تحت ان کے اس فلسفہ کی وضاحت ہو چکی ہے۔

یہ خیال نہ فرمائیے کہ یہ جاہلی فلسفہ اب نابود ہو چکا ہے۔ اس زمانے میں بھی ذہنوں پر یہی فاسد فلسفہ مسلط ہے اور ان لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہے جو قرآن کے حامل اور اسلام پر عامل ہونے کے مدعی ہیں۔ ان کو بھی اگر توجہ دلائیے کہ فلاں فلاں آفتیں جو آئیں یا آ رہی ہیں یہ سب ہمارے ایمانی و اخلاقی فساد کا نتیجہ ہیں، اگر یہ فساد باقی رہا تو ڈر ہے کہ کہیں یہ بیڑا ہی غرق نہ ہو جائے تو اس سے ان کا پندارِ ایمان و اسلام مجروح ہوتا ہے اور وہ بڑے دانش فروشانہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ اس طرح کی گردشیں تو قوموں پر آیا ہی کرتی ہیں۔ ہمارے اگلوں پر بھی آ چکی ہیں، پھر یہ کیوں سمجھا جائے کہ یہ ہمارے کسی فساد کا نتیجہ ہیں!

وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ: یعنی یہ بات یہ لوگ کہتے تو ہیں بڑے ادعا اور طنطنہ کے ساتھ لیکن اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں ہے بلکہ محض ظن و گمان ہے جس پر اس فلسفہ کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ عقل و فطرت، آفاق و انفس اور انبیاء و حکما کی تعلیم تو وہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے لیکن یہ لوگ علم کی جگہ اپنے گمان کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کی ہر خواہش کے جواز کی سند علم نہیں بلکہ ان کا گمان ہی دے سکتا ہے۔ یہ اسلوب کلام اظہار حسرت کا ہے کہ بڑے ہی بدقسمت ہیں یہ لوگ جنھوں نے ایسے عظیم معاملہ میں علم کی جگہ اپنے خیال و گمان کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۵)

قرآن کے دلائل کے مقابل میں کفار کی واحد ڈھال

یہ ان کے اس گمان کی وضاحت ہے جس کو انھوں نے قرآن کے واضح دلائل کے مقابل میں اپنا رہنما بنایا۔ فرمایا کہ جب قیامت کے باب میں ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں سنائی جاتی ہیں تو واحد چیز جس کو وہ ان کی تردید میں اپنی حجت بناتے ہیں وہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے ان کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو وفات پا چکے ہیں، زندہ کر کے لاؤ۔

'حُجَّتَهُمْ'، 'كَانَ' کی خبر ہے۔ یہی مضمون سورۂ عنکبوت میں بھی ذرا مختلف الفاظ میں آیا ہے 'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ' (۲۹) (ان کی قوم کا جواب صرف ان کا یہ قول ہوا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لا دکھاؤ) 'حُجَّت' سے مراد ان کا جواب ہی ہے لیکن اپنے زعم میں وہ اس کو ایک قاطع حجت خیال کرتے تھے اس وجہ سے 'بطور طنز' قرآن نے اس کو 'حجت' سے تعبیر فرمایا۔ مقصد یہ دکھانا ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ میں اگر انھوں نے سہارا لیا تو ایک ایسے جواب کا سہارا لیا جس کو نہ اصل بحث سے کوئی دور یا قریب کا واسطہ ہے اور نہ عقل و منطق سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ یہ محض ان کا ایک بے بنیاد خیال ہے لیکن یہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ قرآن جس چیز سے ڈرا رہا ہے اس سے ان کی جان چھوٹ گئی۔

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۶)

قرآن کا جواب

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اصل دعوے کی از سر نو یاددہانی کرائی گئی اور ایسے اسلوب میں کرائی گئی ہے کہ دعوے کی دلیل خود بخود واضح ہو گئی ہے۔ فرمایا کہ تم سے یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ آج جس کو کہو اس کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے بلکہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی تمھیں زندگی دیتا ہے، پھر وہی تم کو موت بھی دیتا ہے پھر وہ تم کو جمع کرے گا اور یہ جمع کرنا قیامت کے دن تک جاری

رہے گا اور قیامت کے آنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یعنی جب زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ سوال تو خارج از بحث ہوا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ آخر جس نے زندہ کیا ہے، وہ دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ اور جب اپنے پیدا کیے ہوئے کو موت بھی اسی نے دی ہے، کسی اور نے نہیں دی ہے تو وہ اگر اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہے تو اس کے اس ارادے میں کس کی طاقت ہے کہ مزاحم ہو سکے! مزاحمت تو جب ہو سکتی کہ زندگی پر کسی کا اختیار ہوتا اور موت پر کسی اور کا۔ لیکن ناقابلِ تردید دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اس قسم کی ثنویت سے یہ کارخانۂ کائنات بالکل پاک ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کے اوپر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔

'ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' یہ زندگی اور موت کے لازمی تقاضے کا بیان ہے کہ اس کے بعد اگر حساب کتاب اور جزا و سزا کا کوئی دن نہ آئے تو یہ سارا کارخانہ بالکل عبث اور بے مقصد ہو کے رہ جاتا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے اور یہ جمع کرنا اس قیامت کے دن تک جاری رہے گا جس کا آنا اس زندگی اور موت کے بامقصد ہونے کے لیے ناگزیر اور جس کے آنے میں کسی پہلو سے کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

'يَجْمَعُكُمْ' کے بعد 'إِلَىٰ' کا صلہ اتصال اور تسلسل کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی یہ جمع کرنا قیامت تک جاری رہے گا جس سے یہ بات بھی نکلی کہ مرنے والوں میں سے قیامت سے پہلے نہ کوئی اٹھے گا اور نہ کسی کے اٹھائے جانے کا قرآن یا پیغمبرؐ کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے، ان کا مطالبہ بے معنی ہے۔

'وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ' یہ منکرینِ قیامت کے حال پر اظہارِ حسرت ہے کہ جس چیز سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں کسی شک کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی اس بات کو نہیں جانتے کہ اس واضح حقیقت کا انکار کر کے اپنے لیے کس ہولناک انجام کا دروازہ کھول رہے ہیں۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ (۲۷)

یعنی اگر ان لوگوں کا بھروسہ اپنے مزعومہ شرکاء پر ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے تو یہ محض ایک خیالِ خام ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ کسی کی بھی مجال نہیں ہے کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ وہ دن جب آئے گا تو جو لوگ اس قسم کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا ہیں وہ سب خسارے میں پڑیں گے۔

وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً قف کُلُّ اُمَّۃٍ تُدْعٰۤی اِلٰی کِتٰبِہَا ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۸)

تصویرِ قیامت

اس دن لوگوں کو جس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن ہر گروہ اپنا فیصلہ سننے کے لیے دوزانو بیٹھا ہوا ہو گا، ہر گروہ اپنے اپنے دفترِ اعمال کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ آج تمھیں بدلے ہیں وہی ملے گا جو تم دنیا میں کر کے آئے ہو۔

'تَرٰی' اگرچہ واحد کا صیغہ ہے لیکن 'اَلَمْ تَرَ' کی طرح اس کا خطاب بھی عام ہو سکتا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں عام ہی ہے۔

'کُلَّ اُمَّۃٍ' یعنی مومن اور کافر، ابرار اور فجار اس دن سب اکٹھے ہوں گے، کوئی بھی اس حاضری سے مستثنیٰ نہیں ہو گا۔

'جَاثِیَۃً'، 'جثا یجثوا' سے ہے۔ 'جثا الرجل' کی تشریح اہلِ لغت نے یوں کی ہے کہ 'جلس علٰی رکبتیہ' آدمی اپنے دونوں زانوؤں پر بیٹھا۔ غلام، محکوم اور مجرم اپنے آقاؤں اور حاکموں کے حضور میں اپنا فیصلہ سننے کے لیے اسی طرح دوزانو بیٹھتے تھے۔

'کتاب' یہاں دفترِ اعمال کے مفہوم میں ہے۔ اس لیے کہ اس کتاب میں گروہوں اور امتوں کے تمام اعمال کا ریکارڈ ہو گا جس کی موزوں تعبیر دفتر ہی سے ہو سکتی ہے۔ سورہ تطفیف کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی وضاحت آئے گی۔ وہاں ان دفتروں کے نام بھی مذکور ہیں۔

'اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ 'اَلْیَوْمَ' سے پہلے 'قِیْلَ لَھُمْ' (ان سے کہا جائے گا) بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی ہر گروہ کو ان کے اعمال سے متعلق دفتر کی طرف پکارا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم دنیا میں کر کے آئے ہو آج تم کو وہ بدلے میں ملے گا۔

مطلب یہ ہوا کہ جس نے کیا کرایا کچھ نہیں، صرف شرک و شفاعت کے بھروسہ پر وہ لذیذ خواب دیکھتا رہا ہے اس کے لیے یہاں محرومی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ھٰذَا کِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْکُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹)

یہ بھی اوپر والی بات ہی کا حصہ ہے۔ یعنی ان کو آگاہ کر دیا جائے گا کہ اس دفتر سے کسی ناانصافی یا کسی سہو و نسیان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ کس نے کیا کیا ہے اس لیے کہ ہر ایک کا سارا ریکارڈ مکمل تحریری موجود ہے۔ تم جو کچھ کرتے رہے ہو ہم اس کو برابر فرشتوں سے لکھواتے رہے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُھُمْ رَبُّھُمْ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ (۳۰)

ہر گروہ کو اس کے ریکارڈ سے آگاہ کر دینے کے بعد اب ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ انجام بیان ہو رہا ہے۔ پہلے اہل ایمان کا انجام بیان ہوا۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزاری ہو گی ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ لفظ 'رحمت' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان لوگوں کو صرف ان کے اعمال ہی کا بدلہ نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ ان کے رب کا بے پایاں فضل بھی ہو گا۔ اس کے بعد بطور تحسین فرمایا کہ کھلی ہوئی کامیابی یہ ہے جو یہ لوگ حاصل کریں گے نہ کہ اس دنیا کا وہ چند روزہ عیش جس کے عشق میں پھنس کر نادانوں نے یہ ابدی بادشاہی گنوا دی!

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۳۱)

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے اور ان کا انجام اہل ایمان کے مقابل میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس سورہ میں اصلی بحث کفار ہی سے ہے اور خاص طور پر ان کے متکبرین کے طبقہ سے۔ فرمایا کہ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو ان سے کہا جائے گا کیوں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے جب تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم نے تکبر کیا اور ہماری تنبیہ و تذکیر کے باوجود تم بدستور اپنے جرم پر مصر رہے! اس تکبر اور اصرار کی تفصیل اسی سورہ کی آیات ۸-۹ اور ۲۴-۲۵ میں گزر چکی ہے۔ اس مرحلہ میں ان لوگوں سے یہ سوال ظاہر ہے کہ جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا بلکہ مقصود صرف ان کو ملامت کرنا ہو گا تاکہ ان کی رسوائی میں مزید اضافہ ہو۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲)

منکرین کا احمقانہ مطالبہ

یہ ان کے استکبار کی وضاحت ہے کہ تمھارا حال یہ ہو رہا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدۂ جزا و سزا شدنی اور قیامت کے واقع ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے تو تم بڑی رعونت سے یہ جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کس چیز کا نام ہے، بس ایک گمان ہے جو ہم رکھتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جہاں تک گمان کا تعلق ہے یہ منکرین بھی اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جب ان کو اس کا پورا یقین ہو جائے گا تب وہ مانیں گے۔ اس یقین کے لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دو) ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان صرف اسی چیز کو مانے جو اس نے آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اس کے علاوہ کسی بات پر بھی یقین نہ کرے خواہ اس کے حق میں کتنے ہی واضح عقلی و اخلاقی دلائل موجود ہوں۔ اگر انسان اس حد تک سفاہت پر اتر آئے

تو پھر عقل ایک بالکل فالتو چیز بن کے رہ جاتی ہے بلکہ آدمی اور بیل میں پھر شکل و صورت کے سوا کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ انسان اپنے اندر عقل کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرے اس لیے کہ عقل کو بھی نہ اس نے دیکھا ہے نہ چھوا ہے۔ انسان کے پاس علوم کا جو سرمایہ ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بہت بڑا حصہ عقلی اور اخلاقی اصولوں ہی پر مبنی ہے۔ اگر محسوس پرستی کا وہ نظریہ مان لیا جائے جو ان متکبرین کے سامنے تھا تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سارے علوم دفن کر دیے جائیں جو انسان نے اب تک پیدا کیے ہیں۔

دانش مندی کا راستہ

غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہوگی کہ اس طرح کے اہم اور دور رس نتائج رکھنے والے امور میں ظن غالب کی رہنمائی کافی ہے۔ ایک عظیم بند جس میں شگاف پڑنے سے پورا شہر خطرہ میں پڑ سکتا ہو ہماری توجہ کا طالب اسی وقت نہیں ہوگا جب اس میں شگاف پڑ جائے بلکہ عاقل لوگ اس طرح کے معاملات میں بہت پہلے سے چوکنے رہتے ہیں۔ آخرت کا معاملہ ایک نہایت اہم بلکہ اس پوری کائنات کا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کے حق میں جو دلائل قرآن اور دوسرے صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر اس کو اس طرح کا یقین نہیں ہے جس طرح کا یقین آنکھوں دیکھی چیز پر ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کا یقین نہیں ہے تو نہ ہو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ پوری قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آخرت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی موازنہ کرے کہ دونوں راہوں میں سے سلامتی کی راہ کون سی ہے۔ یہ کہ آدمی فکرِ آخرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خواہشوں کی پیروی میں زندگی گزارے اور اس بحث میں نہ پڑے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا یا یہ کہ آخرت کو مان کر، جزا اور سزا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، زندگی گزارے اگرچہ اس کے لیے اس کو اپنی بعض خواہشوں کی قربانی بھی دینی پڑے۔ غور کیجیے تو دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی یہ دوسری راہ اختیار کرے اس لیے کہ پہلی صورت اختیار کرنے میں ایک ابدی اور دائمی خطرہ مضمر ہے اور فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اپنے زعم کے مطابق اپنی خواہشوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے اگرچہ ان کا پورا ہونا آپ کے ارادہ پر منحصر نہیں ہے۔ برعکس اس کے اس دوسری راہ میں خطرہ کوئی نہیں ہے۔ اگر آخرت ہوئی تب تو ابدی بادشاہی حاصل ہوگی اور اگر منکرین کے خیال کے مطابق نہ ہوئی تو نقصان کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی تو، کہ اس فانی زندگی میں چند فانی خواہشوں کی قربانی دینی پڑی اور ان کا پورا ہونا بھی اپنے اختیار میں نہیں بلکہ کسی اور ہی کے اختیار میں تھا۔

عقلی و اخلاقی جرائم کے نتائج آخرت میں سامنے آئیں گے

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳)

انسان جو عقلی و اخلاقی جرائم اس دنیا میں کرتا ہے ان کے بُرے نتائج اس کے سامنے فوراً نہیں

آتے اس وجہ سے ان کے معاملہ میں وہ دلیر ہوتا جاتا ہے اور ناصحوں کی نصیحت قبول کرنا تو درکنار وہ ان کو بے وقوف سمجھتا اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اعمال کے حقیقی نتائج سے پردہ اٹھا دے گا۔ اس دن اندھے سے اندھے کو بھی نظر آجائے گا کہ اس نے دنیا میں جو بس بھری فصل بوئی اور جس کے انجام سے اس کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں نے اس کو ڈرایا لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اس کا حاصل کس ہولناک شکل میں اس کے سامنے آیا۔ اس دن وہ عذاب جس کا وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مذاق اڑاتا رہا اس کو اس طرح گھیرے گا کہ اس کے سامنے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔

وَقِيۡلَ الۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا وَمَاۡوٰٮكُمُ النَّارُ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ (۳۴)

'نسی'، یہاں نظر انداز کرنے کے مفہوم میں ہے یعنی ان کو پہلے ہی مرحلہ میں آگاہ کر دیا جائے گا کہ جس طرح تم نے دنیا میں اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کے انذار کو نظر انداز کیے رکھا اور اس ہولناک دن کی پیشی سے انھوں نے تم کو آگاہ کیا تو تم نے سنی اَن سنی کر دی اسی طرح آج ہم تم کو نظر انداز کریں گے۔ تم کتنا ہی چیخو اور چلاؤ لیکن ہمارے ہاں تمھاری کوئی شنوائی نہیں ہونی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم کو اپنی جمعیت پر ناز تھا تو وہ بھی آج تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی اور اگر اپنے شرکاء و شفعاء پر بھروسہ تھا تو وہ بھی تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

ذٰلِكُمۡ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتۡكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا‌ۚ فَالۡيَوۡمَ لَا يُخۡرَجُوۡنَ مِنۡهَا وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ (۳۵)

یعنی تم اس رویہ کے سزاوار اس وجہ سے ٹھہرے کہ جب تم کو اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو تم ان کا مذاق اڑاتے اور اس طرح وہاں سے چل دیتے گویا تم نے کوئی بات سنی ہی نہیں۔ آیات ۸-۹ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

'وَغَرَّتۡكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا' یعنی تم کو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو رفاہیت و خوش حالی بخشی اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ تم اسی کے سزاوار و حقدار ہو اور تمھاری یہ خوش حالی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمھارے عقیدہ یا عمل میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس غرور میں مبتلا ہو کر تم نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا، جنھوں نے تمھارے عقائد و اعمال کے فساد کی طرف تم کو توجہ دلانے کی کوشش کی اور ان کو یہ طعنہ دیا کہ بتاؤ ہمارے حالات اچھے ہیں یا تمھارے؟ جب ہمارے حالات تم سے بدرجہا بہتر ہیں تو ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارے ہی عقائد و اعمال بھی اچھے ہیں اور خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ تمھارے ہی دماغوں کے اندر ہے۔

'فَالۡيَوۡمَ لَا يُخۡرَجُوۡنَ مِنۡهَا وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ'۔ فرمایا کہ ان کے اس غرور کی پاداش میں نہ تو ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب ہوگا اور نہ ان کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب سے معافی مانگ کر اس

کو راضی کر سکیں تو راضی کر لیں۔ بلکہ ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔

اس ٹکڑے میں اسلوب کی اچانک تبدیلی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوب خطاب کا تھا۔ اس میں دفعتہً غائب کا اسلوب آ گیا۔ گویا نظر انداز کیے جانے کی جو دھمکی ان کو دی گئی تھی اس کا عمل شروع ہو گیا یہاں تک کہ وہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ ان کو خطاب کر کے کوئی بات کہی جائے۔ یہاں ملحوظ رہے کہ غائب کا اسلوب نظر انداز کیے جانے کے مواقع میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۶-۳۷)

یہ آخر میں ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا کہ جب یہ سارے حقائق بالکل واضح ہیں تو بندوں کے شکر کا سزاوار وہی اللہ ہے جو آسمانوں کا خداوند، جو زمین کا خداوند اور جو عالم والوں کا خداوند ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اس کے سوا تم نے دوسرے ارباب کہاں سے نکال لیے؟ آسمانوں اور زمین کے الگ الگ الٰہ کس طرح ٹھہرا لیے؟ اور خدا کی مخلوق اور اس کے مربوب ہو کر تم نے اتنے دیوی دیوتا کس لیے ایجاد کر لیے؟

'وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ ..... الاٰیۃ' یہ اوپر والی بات کا دوسرا لازمی نتیجہ بیان ہوا کہ جب اس ساری کائنات کا خداوند وہی ہے تو اصل مالک اور بادشاہ کے ہوتے آسمانوں یا زمین میں کسی دوسرے کی کبریائی اور بڑائی کے لیے گنجائش کہاں سے نکلی؟ پھر تو ساری کبریائی کا حق دار وہی ہوا، سب کو اسی کے آگے سرافگندہ ہونا اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اگر کوئی اس کی مملکت کے اندر اس کے مقابل میں سر اٹھاتا ہے تو وہ اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اور جو اس کی کبریائی کو چیلنج کرے گا وہ لازماً کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے کوئی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اگر اس نے لوگوں کو سرکشی کے لیے مہلت دے رکھی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر ہو گیا بلکہ اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور یہ حکمت ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے تمام ہوئی۔ فالحمد للّٰہ علیٰ احسانہ

رحمان آباد

۲۱ر جون ۱۹۷۶ء

۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۶

الأحقاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی آخری مکی سورہ ہے۔ اس کے بعد تین سورتیں مدنی ہیں جن میں انہی وعدوں اور وعیدوں کی تکمیل ہے جن کا پچھلی مکی سورتوں میں ذکر ہوا ہے۔ اس کا قرآنی نام وہی ہے جو پچھلی سورہ کا ہے اور اس کی تمہید بھی بعینہٖ وہی ہے جو پچھلی سورہ کی ہے۔ اس میں مخالفین قرآن کو نہایت آشکارا الفاظ میں آگاہ کیا گیا ہے کہ قرآن جس روزِ قیامت سے تم کو خبردار کر رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے۔ شرک و شفاعت کے بل پر اگر تم اس اندار کو نظر انداز اور پیغمبرؐ کو ایک مفتری قرار دے رہے ہو تو یاد رکھو کہ تمہارے ان اوہام کے حق میں عقل و نقل کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ برعکس اس کے یہ قرآن ایک ایسی چیز ہے جس کی شہادت اس کے نزول سے پہلے ہی بنی اسرائیل کے ایک عظیم شاہد نے بھی دی ہے اور اس کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں جن کا یہ ٹھیک ٹھیک مصداق ہے اس وجہ سے تمہیں یہود و نصاریٰ کی شہ سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ لوگ تو خود اپنے رسولوں اور اپنے صحیفوں کو جھٹلا رہے ہیں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت واضح الفاظ میں تسلی دی ہے کہ ان مخالفین کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری ذمہ داری لوگوں تک اس کتاب کو پہنچا دینے کی ہے۔ اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کی طبیعت میں سلامت روی، حق شناسی اور عاقبت بینی ہے۔ ان لوگوں سے کسی خیر کی امید نہ رکھو جو بالکل مادر پدر آزاد ہیں۔ تم جو چیز پیش کر رہے ہو اس کی اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ راہ چلتے جنوں کے کان میں بھی اس کے کلمات پڑ گئے ہیں تو وہ بھی اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اگر ان لوگوں پر اس کا اثر نہیں پڑ رہا ہے تو یہ اس کلام کی کوئی خرابی نہیں بلکہ ان کے دلوں ہی کی خرابی ہے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کرو اور ان کو ان کے انجام کے حوالہ کرو جس کے ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) قرآن خدائے عزیز و حکیم کا نازل کیا ہوا صحیفہ ہے لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ اس سے اعراض کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ دنیا کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم غایت و مقصد کے

ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایک دن اس کی مدت پوری اور اس کا انجام ظاہر ہو۔ ان لوگوں کا اعتماد اپنے شرکاء و شفعاء پر ہے۔ ان کا گمان ہے کہ قیامت ہوئی تو وہ ان کو بچا لیں گے حالانکہ ان شرکاء کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل موجود ہے نہ عقلی۔ یہ لوگ ان سے لو لگائے بیٹھے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں کہ کوئی ان کی پرستش کر رہا ہے اور ان کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ وہ قیامت کے دن ان کے مددگار ہونے کے بجائے اُلٹے ان کے دشمن ہوں گے۔ یہ قرآن کے دلائل سے مرعوب ہو کر اس کو سحر کہتے اور پیغمبرؐ کو مفتری قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہٹ دھرم منہ لگانے کے قابل نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں دنیا میں پہلا رسول نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ میں بھی انہی خصوصیات و صفات کے ساتھ آیا ہوں جن خصوصیات و صفات کے ساتھ وہ آئے۔ ان کو آگاہ کر دو کہ یہود و نصاریٰ کے چکمے میں آکر اگر تم میری مخالفت کر رہے ہو تو اس کے انجام بد کو اچھی طرح سوچ لو۔ بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد میری گواہی دے چکا اور مجھ پر ایمان لا چکا ہے اور تورات کی پیشین گوئیوں کا بھی میں مصداق ہوں۔ اگر میرے اوپر غریب لوگ ایمان لائے ہیں تو اس کو بہانہ بنا کر اپنے کو اللہ کی رحمت سے محروم نہ کرو۔

(۱۵ ـــ ۲۰) اس امر کا بیان کہ کس طرح کے لوگ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس کی تکذیب کریں گے۔

اس پر ایمان وہ لائیں گے جو ان حقوق کو پہچانتے ہیں جن کا شعور فطرت کے اندر ودیعت ہے۔ جو اپنے ماں باپ کے احسان شناس اور ان کے فرمانبردار رہے ہیں۔ جوانی کے دور میں، اگرچہ جذبات کے غلبہ سے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں، لیکن اس طرح نہیں کہ گرے ہوں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو بلکہ گرنے کے بعد سنبھلتے بھی رہے ہیں یہاں تک کہ جب وہ پختگی کے سن و سال یعنی چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا کہ اے رب، اب تو ہمیں سنبھال کہ ہم تیرے ان انعامات کا شکر ادا کر سکیں جو تو نے ہم پر اور ہمارے ماں باپ پر کیے ہمیں عمل صالح کی توفیق بخش اور ہماری اولاد کو بھی صالح بنا۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرماں برداروں میں سے بنتے ہیں۔ اس طرح کے سلیم الفطرت لوگوں کے گناہوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا اور ان کو اہل جنت میں شامل کرے گا۔

اس کو جھٹلانے والے وہ ہوں گے جنھوں نے اس کے بالکل برعکس مادر پدر آزاد زندگی گزاری۔ نہ ماں باپ کے حقوق انھوں نے پہچانے اور نہ خدا کے حقوق کا کبھی ان کو خیال آیا۔ اگر ماں باپ نے آخرت اور حساب کتاب سے ڈرایا تو انھوں نے جھڑک دیا کہ یہ سب اگلوں کے ڈھکوسلے ہیں، ہم اس طرح کی خرافات پر ایمان لانے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر مرنے کے بعد پھر زندگی ہے تو آخر بے شمار خلقت جو مر چکی ہے وہ زندہ ہو کر کیوں نہیں واپس آتی۔

مذکورہ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں ان کے اعمال کے اعتبار سے جزا یا سزا ہو گی۔ نیک اپنی نیکیوں کا بھرپور صلہ پائیں گے اور بد اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔

وہ متکبرین جو قرآن کے خلاف اس بات کو دلیل بنائے ہوئے ہیں کہ اس کو غریبوں نے قبول کیا ہے وہ جب دوزخ میں جھونکے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا میں لے چکے۔ اب یہاں تمھارے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۲۱-۲۸) قریش کی تنبیہ کے لیے قومِ عاد کی مثال کہ ان کو بھی تمھاری ہی طرح اللہ کی پکڑ سے ڈرایا گیا لیکن انھوں نے اپنی قوت و صولت کے غرور میں اس کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا درآنحالیکہ وہ قوت و شوکت اور تعمیر و تمدن کے اعتبار سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے لیکن ان کی ساری ذہانت و فطانت اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آئی۔

(۲۹-۳۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے قرآن سے متعلق جنوں کے ایک تاثر کا حوالہ کہ اگر قریش کے ناقدرے قرآن کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس میں قرآن کا یا تمھارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ انہی کے دلوں کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کی تاثیر و تسخیر کا حال تو یہ ہے کہ جنوں کی ایک جماعت کے کان میں اس کی چند آیتیں پڑ گئیں تو وہ اس پر اس طرح فریفتہ ہو گئے کہ اپنی قوم کے اندر وہ اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۳۳-۳۵) خاتمۂ سورہ۔ کفار کے لیے تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین۔

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ (۴۶)

مَكِّيَّةٌ ———— آیات: ۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۱۴

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۲﴾
مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾
قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا
خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ
بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِیْنَ ﴿۴﴾ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ
دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً
وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۶﴾ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا
بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِیْنٌ ﴿۷﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَلَا
تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ

كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٨﴾ قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾ ع ۱ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١١﴾ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۴

یہ حٰمٓ ہے۔ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے اتاری گئی ہے ۱-۲

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اس چیز سے اعراض کیے ہوئے ہیں جس سے ان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ ۳

ان سے کہو کہ کبھی تم نے غور بھی کیا ان چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! مجھے دکھاؤ کہ زمین کی چیزوں میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں میں کون سا ساجھا ہے! میرے سامنے اس سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کر دیا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اور ان سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ان کی دہائی دیتے ہیں جو تا قیامت ان کو جواب دینے والے نہیں ہیں اور وہ ان کی دعاؤں سے بے خبر بھی ہیں! اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔ ۴-۶

اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو تم لوگ مجھے خدا سے ذرا بھی نہ بچا سکو گے اور تم جو سخن سازیاں کر رہے ہو وہ ان سے خوب واقف ہے، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ ۷-۸

ان سے کہو کہ میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا کہ تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ ۹

ان سے پوچھو کہ اس وقت کیا ہوگا اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد نے اس کے مانند کتاب کی گواہی بھی دی ہے سو وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم نے تکبّر کیا! بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا! ۱۰

اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر قرآن کوئی خیر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم پر سبقت نہ پاتے اور چونکہ انھوں نے اس سے ہدایت نہیں حاصل کی تو اب کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔ ۱۱

اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب موجود ہے، رہنما اور رحمت! اور یہ کتاب اس کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے، عربی زبان میں تاکہ ان لوگوں کو آگاہ کرے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور یہ بشارت ہے خوب کاروں کے لیے۔ ۱۲

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ اہلِ جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے۔ یہ صلہ ہوگا ان کاموں کا جو وہ کرتے رہے۔ ۱۳-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱-۲)

یہ دونوں آیتیں پچھلی سورہ کی تمہید میں بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ بعینہٖ اسی نام اور اسی تمہید سے اس سورہ کا آغاز نہایت واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ چنانچہ آگے کے مباحث سے ان کے اشتراک کا پہلو بھی سامنے آجائے گا اور جملہ حوامیم کا، جو پیچھے گزر چکی ہیں، خلاصہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۳)

یہ ان لوگوں کے حال پر اظہار افسوس ہے جو خدائے عزیز و حکیم کے اتارے ہوئے اس صحیفۂ گرامی کی تکذیب پر مُصر اور اس چیز سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے تھے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ نے اس کو نازل کیا تھا۔

اس دنیا کے باتقصد ہونے کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد روزِ جزا ہو

'عَمَّآ اُنْذِرُوْا' سے اشارہ ظاہر ہے کہ قیامت کی طرف ہے اور قیامت ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نہ ماننے سے یہ سارا کارخانۂ عالم ایک بالکل عبث اور بے مقصد و بے غایت کھیل بن کے رہ جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ عالم 'بِالْحَقِّ' یعنی ایک غایت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ 'عزیز' یعنی غالب و مقتدر ہونے کے ساتھ 'حکیم' بھی ہے۔ اگر قیامت نہ ہو تو اس دنیا کو دیکھ کر یہ بات تو ثابت ہوگی کہ اس کے بنانے والے کی قدرت بے نہایت ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ اس نے یہ ایک بالکل بے مقصد اور باطل کام کر ڈالا ہے۔ حالانکہ یہ بات اس کی ظاہر صفات کے بالکل منافی ہے۔ اس دنیا سے جس طرح اس کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح اس کی حکمت بھی مشاہد میں آتی ہے اور یہ دونوں صفتیں بالکل پہلو بہ پہلو اس میں موجود ہیں۔ یہاں زبان کا وہ نکتہ یاد رکھیے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ جب صفات کا بیان بغیر حرفِ عطف کے ہو جس طرح 'العزیز الحکیم' میں ہے تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

'بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى' یعنی جس طرح اس کائنات کا 'بِالْحَقِّ' ہونا واضح ہے اسی طرح اس کے 'بالحق' ہونے کا ایک بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ دنیا اسی طرح برابر چلتی نہ رہے بلکہ ضروری ہے کہ یہ ایک معین مدت تک کے لیے ہو جس کے بعد یہ ختم ہو۔ پھر اس کی عدالت قائم ہو۔ جس نے اس میں نیکی کمائی ہو اس کو اس کی نیکی کا صلہ ملے اور جس نے بدی کمائی ہو وہ اپنی بدی کی سزا بھگتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کی جزا یا سزا پائے۔ لیکن اس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ یہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہو جائے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ برابر قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں ان کی عدالت بھی ہوتی رہے؟ یہ سوال یوں تو ذہن میں متعدد غلط فہمیوں کے موجود ہونے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے جن پر یہاں بحث کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ایک چیز کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے، وہ یہ کہ انسان کا ہر عمل خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، اپنے اندر متعدی ہونے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک شخص ایک نیکی کا تخم بوتا ہے جس کی برکتوں سے صدیوں اور قرنوں تک اولادِ آدم مستفید ہوتی ہے، اسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گمراہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک

خلقِ کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور پھر وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اس کو اکھاڑنا تو در کنار، قوموں کے بعد قومیں اٹھتی اور اپنی صلاحیتیں ان کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے سبب سے کسی کی نیکی یا بدی کا صحیح اندازہ اس کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ ان کے بعید سے بعید اثرات اس کے سامنے لائے جائیں اور عناصرِ کائنات میں سے جو بھی اس کی کسی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں ان کو پیش کیا جائے۔ اس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ ایک دن اس دنیا کی مدت پوری ہو اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی عدالت میں لوگوں کا فیصلہ فرمائے جس میں سب حاضر ہوں۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین سے بھی اگر کسی معاملہ میں گواہی مطلوب ہو تو ان کو بھی ان کے سارے ریکارڈ کے ساتھ طلب کیا جائے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سب کا روزِ انصاف ایک ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِىْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴)

شرک کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے

یہ ان لوگوں کے اعراض کے اصل سبب پر ضرب لگائی ہے کہ ان کا اعتماد چونکہ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء پر ہے اس وجہ سے یہ قرآن کے انذار کی کوئی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اول تو قیامت محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو ہم جن معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ ہم کو ہر خطرے سے بچائیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ تم اللہ کے سوا جن چیزوں کو پکارتے ہو کبھی ان پر غور بھی کیا ہے کہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہے یا یہ محض تمھارے ذہن ہی کی ایجاد ہیں! اگر تم ان کی کچھ حقیقت سمجھتے ہو تو ذرا مجھے بھی دکھاؤ کہ انھوں نے زمین یا اس کی چیزوں میں سے کیا چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کیا حصہ ہے! مطلب یہ ہے کہ خدا کے شریک بننے کے حق دار تو صرف اسی شکل میں وہ ہو سکتے ہیں جب آسمان و زمین کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہو۔ اگر اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے تو آخر ان کو اس خدا کے حقوق میں شریک کرنے کے کیا معنی جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خالق ہے۔ وہ خالق ہو کر کس طرح گوارا کرے گا کہ اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کے مالک دوسرے بن بیٹھیں! اور تم نے یہ کس طرح جائز سمجھا کہ اس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس کی حکومت اور اس کے حقوق میں شریک بنا دو! یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین عرب ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اس وجہ سے اس دلیل کی بنیاد ایک ایسی حقیقت پر ہے جو ان کے نزدیک بھی مسلم تھی۔

اِيْتُوْنِىْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ 'اَثَارَة' اس

روایت کو کہتے ہیں جو سلف سے منقول ہوتی چلی آرہی ہو۔ الاثارۃ البقیۃ من العلم تؤثر وھم علی اثارۃ من العلم ای بقیۃ منہ یاثرونھا من الاوّلین (اقرب الموارد) اس کے ساتھ 'مِنْ عِلْمٍ' کی قید اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اس روایت کی بنیاد محض وہم و گمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔

خدا کی گواہی کے معلوم کرنے کا قابلِ اعتماد ذریعہ

یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمھارے معبودوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے تو اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یا تو اس قرآن سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کر دیا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد وہم و گمان پر نہیں بلکہ علم پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں؟ اس باب میں اصلی گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنا شریک کسی کو بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو کس کو؟ خدا کی گواہی کو جاننے کا واحد ذریعہ اس کی نازل کردہ کتابیں ہیں یا وہ روایات و آثار جو اس کے نبیوں اور رسولوں سے صحیح طور پر سلف سے خلف کو منتقل ہوئے۔ فرمایا کہ اس طرح کی کوئی چیز ہو تو اس کو پیش کرو محض وہم کی بنیاد پر ایک ہوائی قلعہ تعمیر کر کے اپنی عاقبت نہ خراب کرو۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ علم یا تو اس کی کتابوں کے ذریعہ سے خلق کو منتقل ہوا ہے مثلاً تورات و انجیل وغیرہ کے ذریعہ سے یا روایات و آثار کے ذریعہ سے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی تعلیمات بعد والوں کو روایات ہی کے ذریعہ سے پہنچیں۔ ان ذرائع سے جو علم منتقل ہوا اس میں کہیں شرک کے حق میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں میں اگرچہ بہت سی تحریفات ہو چکی ہیں تاہم ان کے اندر شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق جو روایات، تورات، انجیل یا دوسرے صحیفوں میں نقل ہوئی ہیں ان میں بھی شرک کا کوئی جزو موجود نہیں ہے۔ مشرکین عرب اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہونے کے مدعی ضرور تھے لیکن قرآن کے بار بار کے چیلنج کے باوجود وہ یہ ثابت کرنے سے قاصر رہے کہ ان کے باپ دادا کے طریقہ کی بنیاد کسی شرعی یا عقلی دلیل پر تھی۔ آخر تک وہ یہی کہتے رہے کہ جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اسی پر ہم چلتے رہیں گے، اس سے بحث نہیں کہ انھوں نے یہ طریقہ کہاں سے لیا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کٰفِرِیْنَ (۵-۶)

مشرکوں کے معبودوں کی بے حقیقتی اور بے خبری

یہ ان نادانوں کے حال پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ اور محروم القسمت کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے سوا ان سے دعا و فریاد کر رہے ہیں جو قیامت تک ان کو کوئی جواب دینے والے نہیں ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ کوئی ان سے دعا و فریاد کر رہا ہے! قیامت

کے دن ان کی طرف سے کوئی مدد ملنا تو درکنار وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔

مشرکین جن کی پرستش کرتے تھے وہ یا تو فرضی ہستیاں تھیں جن کا کوئی مسمّٰی سرے سے موجود ہی نہ تھا، اس وجہ سے ان کے کسی چیز سے باخبر ہونے یا کسی دعا کے قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی وہ ہستیاں جن کی کچھ حقیقت ہے مثلاً ملائکہ یا جنّات جن کی پرستش مشرکینِ عرب کرتے تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام جن کی پرستش عیسائی کرتے تھے وہ تو بذاتِ خود کسی کی دعا و فریاد سے واقف بھی نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کو قبول کر سکیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے قیامت کے دن سوال کرے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ وہ جواب دیں گے کہ میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا! میں نے ان کو وہی بتایا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ میرے بعد انھوں نے کیا بنایا اس کی خبر مجھے نہیں ہے۔ اس کو تو ہی جانتا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرشتوں کا جواب ان الفاظ میں منقول ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِیْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًاۢ بُوْرًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)	اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ ان کو اور ان سب کو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اکٹھا کرے گا۔ پس پوچھے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا انھوں نے خود راہ کھوئی؟ وہ جواب دیں گے تو پاک ہے۔ ہمارے لیے یہ زیبا نہ تھا کہ ہم تیرے سوا دوسرے کو کارساز بناتے۔ بلکہ یوں ہوا کہ تو نے ان کو اور ان کے آباء و اجداد کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ وہ تیری یاد دہانی بھول بیٹھے اور ہلاک ہونے والے بنے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک انبیاء اور صالحین کا تعلق ہے وہ تو ساری ذمہ داری ان لوگوں پر ڈال دیں گے جنھوں نے ان کی تعلیم کے بالکل خلاف ان کو شریکِ خدا ٹھہرایا اور ان کی پرستش کی۔ رہے دوسرے معبود یعنی جنات و شیاطین وغیرہ تو وہ جس طرح اپنے پرستاروں سے اعلانِ برارت کریں گے اور ان کے پرستار جس طرح ان پر لعنت کریں گے اس کی تفصیلات مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے دن ان کا کچھ نافع ہونا تو درکنار سب سے زیادہ بدتر دشمن اپنے پرستاروں کے وہی ہوں گے۔ سورۂ قصص کی آیات ۶۲ - ۶۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ (۷)

قرآن سے فرار کے بہانے

اب یہ ان بہانوں کا ذکر ہو رہا ہے جو قرآن سے فرار کے لیے وہ ایجاد کرتے تھے۔ فرمایا کہ جب ہماری نہایت واضح آیتیں درباب توحید و قیامت ان کو سنائی جاتی ہیں اور ان سے ان کا کوئی جواب نہیں بن آتا تو وہ اس قرآن کے باب میں کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ قرآن کو جادو کہنے کی وجہ کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ قریش کے لیڈروں کے لیے جب اس کی تاثیر و تسخیر کا لوہا ماننے بغیر چارہ نہیں رہا تو انھوں نے اپنے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہے تو یہ کلام نہایت پُرزور اور پر تاثیر لیکن یہ زور و تاثیر اس کے خدائی کلام ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے۔

'لِلْحَقِّ' کے بعد 'لَمَّا جَاءَهُمْ' کے الفاظ ان کے اس فعل کی شناعت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس حق کو انھوں نے جادو اس وقت قرار دیا جب کہ وہ ان کے پاس آ گیا۔ حق کے بارے میں کوئی مغالطہ اس وقت تک تو بعید نہیں ہے جب تک وہ سامنے نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے سامنے آجانے کے بعد وہی لوگ اس قسم کی باتیں بناتے ہیں جو خود بھی مغالطہ میں رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۸)

یہ قرآن کے مخالفین کے ایک اور پراپیگنڈے کا حوالہ ہے۔ چونکہ یہ نہایت ہی لغو پروپیگنڈہ تھا جس کا لغو ہونا خود ان لوگوں پر بھی واضح تھا جو اس کے مرتکب ہو رہے تھے اس وجہ سے اس کا ذکر نہایت استعجاب و حیرت کے انداز میں فرمایا ہے کہ اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا ہے کہ اگر تم لوگ میری مخالفت کے جنون میں اس حد تک اتر آئے ہو کہ اپنے ضمیر کے بالکل خلاف مجھے ایک مفتری قرار دینے میں بھی کوئی باک نہیں رہا تو اب تم سے کوئی بحث بے سود ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

'قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا'۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن ہے تو تمھاری اپنی تصنیف لیکن تم اس کو جھوٹ موٹ خدا کی وحی قرار دے رہے ہو تو ان سے کوئی بحث نہ کرو۔ بس یہ کہہ دو کہ اگر میں نے خدا پر اتنا بڑا افترا کیا ہے تو کوئی چیز مجھے اس کی پکڑ سے نہ بچا سکے گی اور اس وقت تم لوگ میرے کچھ کام آنے والے نہیں بنو گے کہ تم میرے اس جرم کا بار اپنے اوپر

محسوس کرو۔

'هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ' - 'اَفَاضَ فِى الحديث' کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کا اصل مفہوم کسی بات میں نکتہ چینی کرتے کرتے اس کو اس حد تک بڑھا دینا ہے کہ رائی پربت بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہو اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح آگاہ ہے اس وجہ سے میں معاملہ اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ فی الواقع میں کوئی مفتری ہوں اس وجہ سے تم مجھے کوئی وزن نہیں دے رہے ہو یا مجھے ایک راستباز اور امین جانتے ہوئے محض اس وجہ سے مفتری قرار دے رہے ہو کہ میری دعوت تمہارے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔

ہٹ دھرموں کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیا جائے

'كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ' - اس قضیہ میں اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے مابین گواہی کے لیے کافی ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب معلوم ہو کہ فریق مخالف ضد اور دھاندلی پر اتر آیا ہے اور جان بوجھ کر وہ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو خود اس کے اپنے ضمیر کے بھی خلاف ہے تو ایسی صورت میں واحد چارہ کار ایک معقول انسان کے لیے یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ معاملہ اللہ کے حوالہ کر کے بحث ختم کر دے۔ یہ شریفانہ طریقہ بعض اوقات ضدی مخاطبوں کو بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ وہ اس سے متاثر نہ بھی ہوں جب بھی دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت طریقہ یہی ہے۔ غیر جانبدار ذہن کے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوتے ہیں اور مخالفوں کے دل میں بھی داعی کی عظمت اس کی اس خود اعتمادی کے سبب سے دو چند ہو جاتی ہے۔

'وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' : یعنی میں یہ معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کا فیصلہ ضرور فرمائے گا اور یہ حقیقت سب پر واضح ہو جائے گی کہ میں مفتری ہوں یا تم لوگ جان بوجھ کر حق کو جھٹلانے والے ہو۔ اگر اس فیصلہ میں کچھ دیر بھی ہوئی جب بھی میرے لیے مایوسی اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ آخری حد تک مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ و اصلاح کرنا چاہیں وہ توبہ و اصلاح کر کے اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ ۖ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۹)

یعنی اگر تم میری مخالفت اس وجہ سے کر رہے ہو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں اور وہ عذاب دکھا نہیں سکتا جس سے تم کو ڈرا رہا ہوں تو یاد رکھو کہ میں دنیا میں پہلا شخص نہیں ہوں جو رسول بن کر آیا ہو۔ مجھ سے پہلے بھی بہت سے رسول آ چکے ہیں۔ وہ سب بشر ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مافوق بشر نہیں۔ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی یہی رہی ہے کہ انسانوں کے اندر رسول ہمیشہ انسانوں ہی کے

اندر سے آئے ہیں اور یہ بات بھی سن لو کہ اگر میں تمہاری طلب کے مطابق عذاب نہیں لا سکتا تو یہ چیز بھی میرے دعوائے رسالت کی نفی نہیں کرتی۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدا یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ مجھے تو برملا یہ اعتراف ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور نہ یہ علم ہے کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھے وحی کی جاتی ہے اور اسی سے تم کو بھی آگاہ کر رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ میں اس سے زیادہ کچھ اور ہونے کا مدعی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے اگر کوئی بحث کرنی ہے تو میرے اصل دعوے سے متعلق کرو، غیر متعلق سوالات چھیڑ کر نہ اپنے آپ کو الجھن میں ڈالو، نہ دوسروں کو۔

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ ٱللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِۦ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِۦ فَـَٔامَنَ وَٱسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ (۱۰)

یہاں جواب شرط محذوف ہے اور یہ حذف اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جواب شرط ایسے خوفناک نتائج پر متضمن ہے کہ الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کتاب کا انکار اور اس کو خدا کے اوپر میرا افترا قرار دے رہے ہو لیکن اگر یہ خدا کی طرف سے ہوئی تب کیا بنے گا!! ساتھ ہی یہ بات بھی تمہارے سوچ لینے کی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد اس طرح کی چیز کی گواہی دے چکا ہے، وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم استکبار کی بنا پر اس سے اعراض کیے جا رہے ہو!

شاہد سے کون مراد ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہد سے کس کی طرف اشارہ ہے۔ اس سوال کے تین جواب ہمارے مفسرین نے دیے ہیں۔

عام رائے تو یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں لیکن ایک دوسرے گروہ نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ اس سورہ کے نزول کے بہت بعد مدینہ میں اسلام لائے تو اس مکی سورہ میں ان کے اسلام سے پہلے ہی ان کی گواہی کے حوالہ دینے کے کیا معنی، جب کہ کوئی ادنیٰ قرینہ بھی یہاں اس بات کا نہیں ہے کہ کم از کم اس آیت ہی کو مدنی قرار دیا جا سکے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے لیکن یہ قول بھی کچھ وزنی نہیں ہے۔ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا ذکر قرآن کے حق میں ان کی شہادت ہی کا حوالہ دینے کے لیے مستقلاً، نام کی تصریح کے ساتھ، آ رہا ہے تو یہاں اشارے کی صورت میں ان

کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک تیسرے گروہ نے اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لے کر اس سے ان عام لوگوں کی شہادت مراد لی ہے جو بنی اسرائیل میں سے قرآن پر ایمان لائے۔ اس گروہ میں ابن کثیرؒ بھی شامل ہیں لیکن یہ قول بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ اس کو اسم جنس کے مفہوم میں لینا تو اعد زبان کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن ہم اس غیر ضروری بحث میں یہاں پڑنا نہیں چاہتے۔ اسلوب کلام یہاں خود شاہد ہے کہ نکرہ تفخیم شان کے لیے ہے نہ کہ تحقیر و تعمیم کے لیے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ اشارہ کسی ایسے شاہد کی طرف ہو جس کی شخصیت اور شہادت دونوں کا مرتبہ ایسا ہو کہ اس کو بطور ایک دلیل کے پیش کیا جا سکے۔

ہمارے نزدیک یہ اشارہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی بعثت کا خاص مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ میں آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں۔ آپ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ آخری نبی بھی ہیں اور آخری رسول بھی۔ اس وجہ سے اس آنے والے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔ انجیلوں کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کو حضرت مسیح کی بشارت دینے کے لیے مبعوث فرمایا اسی طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کریں۔ انجیلوں میں اصل مضمون جو گوناگوں اسلوبوں سے سامنے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہی ہے۔ استاذ امامؒ نے خاص اس موضوع پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ انجیلوں کا اصل مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور تعارف ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جس آسمانی بادشاہت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کی جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی دعوت ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اگرچہ تورات اور زبور وغیرہ میں بھی ہے جن کے حوالے ہم پچھلی سورتوں میں نقل کر آئے ہیں لیکن حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ آپ کی بشارت دی ہے۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ	اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل
یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ	میں اللہ کی جانب سے تمھاری طرف رسول ہو کر آیا ہوں،
اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ	مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو میرے پہلے سے
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ	تورات میں موجود ہیں اور خوش خبری دیتا ہوا ایک
مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا	رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہو گا۔

جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف: ۶)
پس جب وہ کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن نے اس آیت میں جس بشارت کا حوالہ دیا ہے وہ انجیلوں میں موجود ہے۔ بعض انجیلوں میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی تصریح بھی بار بار وارد ہوئی ہے۔ مثلاً برنا باس کی انجیل میں — عیسائی اسی وجہ سے اس انجیل کو مستند نہیں مانتے لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا، دوسری انجیلوں میں بھی آپ کا حوالہ موجود ہے۔ اگرچہ نام غائب کر کے صرف صفات کا حوالہ باقی رہنے دیا گیا ہے اور ترجموں کے ذریعہ سے ان صفات کو بھی مسخ و محرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم جو شخص ایمان داری کے ساتھ ان پر غور کرے گا وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورۂ صف کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث کریں گے۔

۳- تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئیوں میں قرآن، قرآن کی دعوت، اس دعوت کے مزاج، دنیا پر اس دعوت کے غلبہ اور اس غلبہ کے مراحل و مدارج کا نہایت صاف الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم بعض چیزوں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ آگے سورۂ فتح کی آیت ۲۹ کے تحت بھی ہم اس مسئلہ پر بحث کرنے والے ہیں۔ قارئین کے اطمینان کے لیے بعض حوالے یہاں بھی ہم نقل کرتے ہیں۔

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتابِ مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔"
متی: باب ۲۱: ۴۲-۴۴

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔"
یوحنا: باب ۱۴: ۱۶

اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔
یوحنا: باب ۱۴: ۳۰

اسلامی دعوت کے تدریجی فروغ کی طرف بھی متعدد تمثیلوں میں اشارے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تمثیل جس کی طرف سورۂ فتح میں قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے، یہ ہے۔

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند

ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب
بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر
اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔" متی، باب ۱۳: ۳۱-۳۲

۴۔ چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس واضح شہادت کا یہ اثر تھا کہ عیسائیوں میں سے جو لوگ اصل نصرانیت پر قائم رہے یعنی ان کے خلیفہ صادق شمعون کے پیرو، وہ قرآن کے نزول کے بعد بڑے جوش و خروش سے اس پر ایمان لائے اور قرآن نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے۔ سورۂ مائدہ میں اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (المائدۃ: ۸۲-۸۳)	تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہل ایمان کی محبت میں سب سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں علماء اور راہب ہیں اور وہ تکبر کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو حق کو پہچان لینے کے سبب سے تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب ہم ایمان لائے تو ہم کو تو حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔

تدبر قرآن میں ان آیات کی تفسیر غور سے پڑھ لیجیے۔ نصاریٰ کی تاریخ سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس وجہ سے ان آیات کا صحیح مفہوم ان پر واضح نہیں ہو سکا۔ یہ پال کے پیرووں کی تعریف نہیں ہے بلکہ شمعون کے پیرووں کی ہے۔ پال کے پیرو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے بھی نہیں۔ وہ اس لفظ کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انھوں نے اپنے لیے مسیحی کا لفظ اختیار کیا ہے۔ شمعون کے پیرو بے شک اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے۔ یہ لوگ اس شہادت کے حامل رہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے آخری رسول کی بعثت کے باب میں دی تھی اور جب وقت آیا تو انھوں نے پورے جوش و خروش اور نہایت سچے جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس کی شہادت دی۔ اسی چیز کی طرف رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے جس میں پال اور اس کے پیرو مبتلا ہوئے اس وجہ سے اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہوئے۔ انہی لوگوں کے باب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب

ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔" اوپر سورۂ مائدہ کی آیت میں 'وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ' کے الفاظ سے ان کے اسی وصف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت کی نوعیت ایک عام شہادت سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی بعثت ہی خاص اس مقصد سے ہوئی تھی کہ وہ آپؐ کی راہ صاف کریں اور خلق کو اس آسمانی بادشاہی کی بشارت دیں جس کا آپؐ کے ذریعہ سے ظہور ہونے والا تھا۔ اس حوالہ سے قرآن نے مشرکین پر بھی حجت قائم کی ہے اور اہل کتاب پر بھی۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ دعوت کے اس دور میں قریش کو اہل کتاب کی پشت پناہی بھی حاصل ہو گئی تھی اس وجہ سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں یہی دکھایا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے جنون میں آج یہودی اور مسیحی جو حرکتیں چاہیں کریں لیکن بنی اسرائیل کا ایک عظیم شاہد اس حق کی نہایت آشکارا الفاظ میں شہادت دے چکا اور اس پر ایمان لا چکا ہے۔ اس کے ایمان اور اس کی شہادت کے بعد جو لوگ محض استکبار کی بنا پر اس حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اپنا انجام اچھی طرح سوچ لیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' ۔ یہ ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کبھی راہ یاب نہیں کرتا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور اس کی بخشی ہوئی روشنی کی ناقدری کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے عقل کی رہنمائی اور آفاق و انفس کی گواہی کے ساتھ ساتھ اپنے نبیوں اور رسولوں کی شہادت کے ذریعہ سے بھی حق کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اب جو لوگ ان ساری چیزوں کو ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اپنی ضلالت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں ایسے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو وہ بھٹکنے ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۱۱)

منکرین کے استکبار کی

اوپر والی آیت میں ان منکرین کے جس استکبار کا حوالہ ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ ان ظالموں کی رعونت کا حال یہ ہے کہ اس حق کے خلاف ایک دلیل وہ یہ بھی لاتے ہیں کہ اس کو سب سے پہلے غریبوں نے قبول کیا ہے چنانچہ ان کے اغنیاء کہتے ہیں کہ اگر اس نئے دین میں کوئی خیر ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ نفر فقیر لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت کر جاتے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی کوئی اور نعمت تو ان کے حصہ میں آئی نہیں تو یہ چیز اگر فی الواقع کوئی نعمت ہوتی تو یہ اس کی طرف سبقت کرنے والے نہ بنتے بلکہ ہم ہی اس کی طرف بھی سبقت کرتے۔ ان کا اس کی طرف سبقت کرنا دلیل ہے کہ اس میں کوئی

خیر نہیں ہے بلکہ یہ انہی چیزوں میں سے ہے جن کے درپے ادنیٰ درجہ کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔

'وَاِذْ لَمْ یَہْتَدُوْا بِہٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ ھٰذَآ اِفْکٌ قَدِیْمٌ' یعنی اب جبکہ اس روشنی سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے گمراہی اور خیرگی ہی حاصل کی ہے تو جو کچھ انھوں نے کہا ہے صرف اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ کوئی نیا جھوٹ نہیں ہے بلکہ یہ جھوٹ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے، ہر دور میں کچھ لوگ رہے ہیں جو اسی قسم کے ڈراوے سنا کر لوگوں پر اپنی دھونس جماتے رہے ہیں لیکن ان کی بات آج تک سچی ثابت نہیں ہوئی۔ جس قیامت سے انھوں نے ڈرایا نہ وہ آئی نہ کبھی آئے گی۔ اس طرح کے لوگوں کا جھوٹ اب بالکل کھل چکا ہے اس وجہ سے ہم ان کی دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

'اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا' سے قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کفار کے اغنیاء مراد ہیں جن کے استکبار کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ 'لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں غربائے مسلمین مراد ہیں اور 'لِ' یہاں 'فِیْ' کے مفہوم میں ہے یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'وَاِذْ لَمْ یَہْتَدُوْا بِہٖ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب انھوں نے ایک بالکل واضح حق کا انکار کیا ہے تو اپنے ضمیر کو تسلی دینے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے انھیں اور بھی باتیں بنانی پڑیں گی چنانچہ وہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹ تو بہت پرانا جھوٹ ہے۔ اس کو پرانا جھوٹ قرار دینے میں دلیل کا پہلو، ان کے زعم کے مطابق یہ ہے کہ اس کا جھوٹ ہونا بالکل ثابت ہو چکا ہے۔ اگر قیامت آنے والی ہے تو آخر وہ کہاں غائب ہے! ایک مدت دراز سے اس کا چرچا ہے لیکن جہاں تک اس کے ظہور کا تعلق ہے ہنوز روزِ اول ہے۔

وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰٓی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً ؕ وَھٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ (۱۲)

قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ

یہ قرآن کے حق میں تورات کی شہادت کا حوالہ ہے۔ اگرچہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس کا ذکر مقدم ہونا تھا لیکن ان خاص وجوہ سے، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، حضرت مسیحؑ کی شہادت کا ذکر پہلے آیا۔ اب یہ تورات کا حوالہ دے کر اس شہادت کے تسلسل کو ظاہر فرما دیا کہ اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی 'امام' اور 'رحمت' بن کر آ چکی ہے۔ 'امام' کے معنی رہنما کے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو قرآن کے باب میں 'ھُدًی وَّرَحْمَۃً' کے الفاظ سے ارشاد ہوئی ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ کی کتاب دنیا میں رہنمائی کرتی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کی اصل حیثیت امام کی ہے۔ جس طرح امام کی اقتدا لازمی ہے اسی طرح زندگی کے معاملات میں اس کتاب کی اقتدا واجب ہے۔ اگر

اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے تو خواہ زبان سے اس کا کتنا ہی احترام کیا جائے اور اس کو کتنا ہی چوما چاٹا جائے لیکن یہ ساری باتیں عنداللہ بے سود ہیں۔

قرآن تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا: یہ قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوا ہے۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کے باب میں شہادت دی ہے اسی طرح اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کی پیشین گوئی کر چکے ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں اپنے مصداق کی منتظر تھیں۔ قرآن کے نزول سے یہ مصداق سامنے آگیا اور اس طرح قرآن نے تورات کی تصدیق کر دی۔

عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن چونکہ تورات کو ایک آسمانی کتاب تسلیم کرتا ہے اس وجہ سے قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہوا۔ یہ بات بالکل لایعنی ہے۔ قرآن اگر تورات کو ایک آسمانی کتاب مانتا ہے تو یہ تورات کے آسمانی ہونے کی ایک دلیل تو بے شک ہوئی لیکن اس سے قرآن کا آسمانی ہونا کیسے ثابت ہو جائے گا؟ قرآن کے آسمانی ہونے کی تصدیق تورات کی زبان سے تو اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے اندر قرآن اور اس کے حامل سے متعلق پیشین گوئیاں ہوں اور قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان پیشین گوئیوں کی اس طرح تصدیق ہو جائے کہ کسی منصف کے لیے اس سے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے بلکہ ہر دیانتدار اور غیر جانبدار آدمی پکار اٹھے کہ بے شک ان پیشین گوئیوں کا حقیقی مصداق سامنے آگیا اور اس مصداق نے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اسی پہلو سے پچھلے صحیفوں کا مصداق کہا ہے، نہ کہ اس پہلو سے جو لوگوں نے عام طور پر سمجھا ہے۔ قرآن ان صحیفوں کا آسمانی ہونا تو بے شک مانتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کے محرّف ہونے کا بھی اعلان کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ تصدیق مطلق نہیں بلکہ اس خاص مفہوم میں ہے جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔ اس مفہوم کے لیے لفظ تصدیق کا استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

لِسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: یہ اہل عرب پر احسان کا اظہار بھی ہے اور اس میں تورات کی بعض پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اہل عرب پر احسان کا پہلو تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب عربی میں نازل فرما کر ان کی زبان کی عزت بڑھائی، اس کو بقائے دوام کی سند عطا فرمائی، ان کو اپنے دین کی ترجمانی اور اس کی گواہی کے لیے چنا اور ان کے ہر عذر کا خاتمہ کر دیا۔

سابق پیشین گوئیوں کی طرف اس میں اشارہ کا پہلو یہ ہے کہ تورات میں آخری رسول سے متعلق یہ بات موجود ہے کہ اس کی بعثت امیوں یعنی بنی اسماعیل میں ہوگی۔ ان امیوں کی زبان ظاہر

ہے کہ عربی تھی اس وجہ سے ان کی زبان کا حوالہ گویا خود ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

'لِّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' یہ اس کتاب کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے اتارا ہے کہ جن لوگوں نے شرک و کفر میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو اس کے انجام سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ جو اپنی اصلاح کرنی چاہیں وہ آخری نتائج کے سامنے آنے سے پہلے پہلے اپنی اصلاح کر لیں۔

قرآن کا اصل مقصد

'وَبُشۡرٰی لِلۡمُحۡسِنِیۡنَ' یہ اس کتاب کا دوسرا مقصد بیان ہوا ہے اور چونکہ اصل مقصود یہی ہے اس وجہ سے اس کا ذکر بشکل اسم ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم اور دائمی خوش خبری ہے خوب کاروں کے لیے۔ 'مُحۡسِنِیۡنَ' یہاں 'الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' کے مقابل میں ہے جس سے لفظ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی تمام توزنوں اور صلاحیتوں کی حفاظت کی اور اپنی زندگی کو اپنے خالق کے حدود و قیود کے اندر رکھا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۚ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۱۳-۱۴)

'محسنین' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ

یہ اس بشارت کی وضاحت بھی ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا اور 'مُحۡسِنِیۡنَ' کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ بھی۔ فرمایا کہ ہمارے جن بندوں نے قرآن کی دعوت حق قبول کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہمارا رب بس اللہ ہی ہے اور اپنے اس اقرار پر وہ تمام مخالفتوں سے بالکل بے خوف ہو کر ڈٹ گئے ہیں ان کے لیے ابدی جنت کی بشارت ہے۔ نہ ان کو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی غم۔ وہی جنت کے مالک ہوں گے ہمیشہ کے لیے اور یہ چیز ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گی۔

۲- آگے آیات ۱۵ ـــــ ۲۰ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگوں کو یہ کتاب اپیل کرے گی اور کس طرح کے لوگ ہیں جو اس سے ہمیشہ بیزار ہی رہیں گے۔ اوپر 'اَلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' اور 'مُحۡسِنِیۡنَ' کے الفاظ سے جن دو قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ گویا انہی کی تفصیل ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہیں، جو ہوش گوش رکھنے والے ہیں، جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے اور اپنے ماں باپ کے حقوق پہچاننے والے ہیں وہ اپنے رب کے حقوق ادا کرنے والے بھی بنیں گے۔ قرآن کی دعوت ان کو اپیل کرے گی۔ رہے وہ لوگ جو بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارنے والے، اپنی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض سے بالکل بے پروا ہیں ان

سے کسی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ وہ اپنی ہی راہ چلیں گے اور اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لاابالیوں کے لیے مقدر ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۰

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ
كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ
اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا
تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ
مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ
الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ
اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِيْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ
مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا
عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ
يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ
حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿٢٠﴾ ع ۲

ترجمۂ آیات ۱۵ - ۲۰

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دُکھ کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور دُکھ کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کو دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ پہنچ جاتا ہے اپنی پختگی کو اور پہنچ جاتا ہے چالیس سال کی عمر کو وہ دعا کرتا ہے، اے رب! مجھے سنبھال کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا اور وہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں۔ اور میری اولاد میں بھی میرے نیک بخت وارث اٹھا۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بنتا ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے جنت والوں کے ساتھ۔ یہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۵-۱۶

رہا وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم پر تُف ہے! کیا تم لوگ مجھے اس سے ڈراتے ہو کہ دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں! اور وہ اللہ سے فریاد کر رہے ہوتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ایمان لا، اللہ کا وعدہ شدنی ہے! پس وہ جواب دیتا ہے کہ یہ سب محض اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی وعید پوری ہوئی ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزرے جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک یہ نامراد ہونے والوں میں سے ہوئے! ۱۷-۱۸

اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ہوں گے (تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو) اور تاکہ وہ ان کے اعمال ان کو پورے کر دے اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور اس دن کو یاد رکھو جس دن کفر کرنے والے جہنم کے سامنے لائے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصہ کی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے اور برت چکے تو آج تم ذلت کا عذاب بدلے میں پاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کرتے رہے اور بوجہ اس کے کہ تم نافرمانی کرتے رہے۔ ۱۹-۲۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۱۵)

ایک سلیم الفطرت کے اندر حقوق کے شعور کا ارتقاء

یہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وضاحت ہو رہی ہے اس بات کی کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح المزاج انسان کے اندر حقوق و فرائض کے شعور کا فطری ارتقا کس طرح ہوتا ہے یا کس نہج پر اس کو ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر بھی ودیعت فرمائی ہے اور اسی کی تعلیم اس کے تمام نبیوں اور نیک بندوں نے بھی دی ہے۔ یہ حقیقت تمام مذاہب و ادیان میں ابتداء سے مسلّم رہی ہے کہ خدا کے بعد انسان پر سب سے بڑا حق اس کے ماں باپ ہی کا ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ جہاں تک شعور میں آنے کا تعلق ہے ماں باپ کا حق سب سے پہلے شعور میں آتا ہے۔ پھر اسی حق کے شعور سے انسان خدا اور اس کے حقوق کے شعور تک ترقی کرتا ہے۔ جب تک انسان بچہ رہتا ہے اس وقت تک وہ سب کچھ ماں باپ ہی کو سمجھتا ہے اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے انہی سے پاتا ہے لیکن جب وہ سنِ رشد کو پہنچتا ہے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی

ہے کہ اصلی منعم و پروردگار وہ ہے جس نے ماں باپ کو بھی وجود بخشا۔ اس طرح وہ ماں باپ کی انگلی پکڑ کر خدا تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے اندر ماں باپ کے حق سے بھی بڑے حق کا شعور بیدار ہوتا ہے اور یہی دو حق انسان پر سب سے بڑے ہیں اور پھر انہی دو سے بہت سے حقوق کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

ماں باپ کا حق اولاد پر یہ ہے کہ جب اولاد ہاتھ پاؤں والی ہو جائے اور ماں باپ بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ ان کو اپنے اوپر ایک بوجھ نہ محسوس کرے بلکہ یاد رکھے کہ ایک دن وہ ان کی گود میں ایک مضغہ گوشت کی شکل میں ڈالا گیا تھا لیکن انھوں نے بوجھ سمجھنے کے بجائے اس کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھا اور پال پوس کر اس کو جوان کیا۔ ان کے اس احسان کا حق یہ ہے کہ وہ اپنی اطاعت اور مہر و محبت کے بازو ان کے لیے ہمیشہ جھکائے رکھے۔ نہ ان کی کسی خدمت کو اپنے اوپر بار سمجھے نہ زبان سے کبھی ان کے لیے بیزاری کا کوئی کلمہ نکالے۔

ماں کی جان بازیاں بچہ اولاد کے لیے

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَ حَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ یہ ان چند جاں بازیوں اور قربانیوں کی طرف اشارہ ہے جو ہر ماں کو اپنی اولاد کے لیے لازماً کرنی پڑتی ہیں۔ اس اشارے سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کوئی اولاد خواہ کچھ ہی کر ڈالے لیکن وہ اپنے ماں باپ کے احسان کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ فرمایا کہ اس کی ماں مہینوں نہایت دکھ کے ساتھ اس کو اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، پھر وہ جان کی بازی کھیل کر اس کو جنتی ہے۔ اس کے بعد اس کی رضاعت کا دور آتا ہے اور پورے دو سال وہ اپنے خون کو دودھ بنا کر اس کو پلاتی اور پرورش کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کون ہے جو اس کے لیے اتنے دکھ خوشی خوشی جھیل سکے؟ پھر یہ کتنی بڑی ناسپاسی ہوگی اولاد کی اگر وہ اس احسان کو بھول جائے اور جب ماں باپ اس کے احسان کے محتاج ہوں تو ان سے بے پروائی برتے!

یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ حسنِ سلوک کا مطالبہ تو ماں باپ دونوں ہی کے لیے کیا گیا ہے لیکن تین قربانیاں جو مذکور ہوئی ہیں وہ صرف ماں ہی کی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس کے وجوہ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فی الواقع اولاد کی ابتدائی پرورش و پرداخت میں جو حصہ ماں کا ہوتا ہے وہ باپ کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدمت کے معاملے میں ماں کا حق باپ کے بالمقابل تین گنا رکھا ہے۔ یہ حدیث اسی آیت پر مبنی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کا تعلق جنسِ ضعیف سے ہے۔ اس کا یہ پہلو بھی متقاضی ہے کہ اولاد اس کی خدمت و اطاعت باپ سے بھی زیادہ کرے۔

۲- تیسری وجہ یہ ہے کہ باپ سے بالعموم اولاد کا مادی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ان کو اس سے جائداد املاک وراثت میں ملنے والی ہوتی ہیں اس سبب سے اس کے معاملے میں کوتاہی یا نافرمانی کا اندیشہ کم ہے برعکس اس کے ماں سے عام حالات میں اس طرح کی توقع کم ہی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ لوگ ماں کی حقیقی قدر نہیں کرتے جن کے اندر اس کی قربانیوں کا صحیح شعور نہیں ہوتا۔

ایک لطیف استنباط

'وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا' سے بعض فقہائے صحابہؓ نے یہ استنباط بھی کیا ہے کہ وضع حمل کی اقل مدت چھ مہینے ہے۔ اس لیے کہ یہاں، حمل اور رضاعت دونوں کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے اور قرآن کے دوسرے مقام میں یہ تصریح ہے کہ مدتِ رضاعت پورے دو سال ہے۔ اگر ان تیس مہینوں میں سے دو سال نکال دیے جائیں تو حمل کے چھ مہینے بچتے ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اقل مدتِ حمل چھ ماہ ہے۔ یہ استنباط لطیف ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ جیسے اکابر صحابہ اس سے متفق ہیں۔

ماں باپ کے حقوق کا شعور خدا کے حقوق کے شعور کے لیے نشانِ راہ ہے

'حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ..... الآیۃ' یعنی جو شخص اپنے ماں باپ کے حقوق پہچانتا ہے وہ جب جوانی اور عمر کی پختگی کو پہنچتا ہے تو اس کی طبیعت کی یہ سلامت روی لازماً اس کے اندر ربِ حقیقی کے حق کا شعور بھی بیدار کر دیتی ہے۔ وہ ماں باپ کی شفقت و محبت اور ان کی پرورش و پرداخت کے اندر اپنے اصل خالق کی مہر و محبت اور اس کی ربوبیت کی ایک جھلک لیتا ہے اور یہیں سے اسے اس پروردگارِ حقیقی تک پہنچنے کی راہ مِل جاتی ہے جس نے اس کی پرورش کے لیے ماں باپ کا سایۂ عاطفت مہیا فرمایا۔ گویا ایک حق کا احساس اس کو دوسرے اس سے بڑے حق کے ادا کرنے کے لیے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ماں باپ کے حقوق کا احساس بیدار نہ ہو تو اس کی رسائی خدا کے حقوق تک نہیں ہو سکتی۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے نشانِ راہ در اصل ماں باپ کے حقوق ہی ہیں۔ جس نے اس دروازے کو نہیں کھولا اس کے لیے آگے کی راہ مسدود ہی رہے گی۔

فرمایا کہ اس طرح کا سلیم الفطرت انسان جب اپنی پختگی، خاص کر چالیس سال کی عمر کو، پہنچتا ہے تو وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ اے رب، تو مجھے سنبھال کہ میں تیری ان عنایات کے شکر کی توفیق پاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمائیں اور ایسے نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں اور میری اولاد میں بھی میرے صالح وارث اٹھا، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اس شعور کے بیدار ہونے کا اصلی وقت تو جوانی یا سنِ رشد ہے جس کو یہاں 'بَلَغَ اَشُدَّهٗ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن 'رشد' کے پیدا ہونے میں اصلی عامل کی حیثیت صرف عمر ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں ماحول، تربیت اور دوسرے عوامل کو بھی بڑا دخل ہے اس وجہ سے ہر شخص کے

لیے کوئی ایک عمرِ رشد کی معین نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہمارے علماء کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے اور اس اختلاف کے لیے معقول وجوہ موجود ہیں۔ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے اس میں وسعت رکھی ہے اور چالیس سال کی عمر (وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً) کا ذکر یہاں اس کی آخری حد کی حیثیت سے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کو پہنچ جانے کے بعد یہ شعور ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر بیدار ہو جانا چاہیے۔ کسی کے اندر اگر بعض موانع کے سبب سے بیدار نہ ہو یا پوری طرح بیدار نہ ہو تو چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر تو اس کو لازماً بیدار ہو جانا چاہیے۔ اس عمر کو پہنچ کر بھی اگر کسی کے اندر یہ بیدار نہ ہو تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس شخص نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے۔

اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ربِ رحیم و کریم نے ہماری طبیعت کی کمزوریوں کا لحاظ کر کے چالیس سال کی عمر تک فی الجملہ رعایت رکھی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ اس عمر تک جذبات و خواہشات کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے۔ آدمی اگر اپنی اصلاح کی کوشش کرتا بھی ہے تو بسا اوقات خواہشوں اور جذبات سے مغلوب ہو کر راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے۔ چالیس سال کے بعد جذبات و خواہشات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر آدمی ان کو غلط طریقہ پر مہمیز کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ اپنے رہوارِ نفس کو قابو میں کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد اسے کسی مزید الاؤنس کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہاں جو بات فرمائی گئی ہے عام انسانی فطرت اور عام انسانی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے، ایک خالص اسلامی معاشرہ اور اسلامی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں فرمائی گئی ہے۔ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کے اندر مزاحمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ خاص رعایت فرماتا ہے جو اس طرح کے معاشرے کے اندر اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اسلامی معاشرہ میں یہ مزاحمتیں نہیں ہوتیں اس وجہ سے اس میں لوگوں کی مسئولیت بھی زیادہ ہے۔

توفیقِ رشد کی دعا

'اَوْزِعْنِیْ' کی وضاحت سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مجھے روک۔ مجھے تھام، مجھے سنبھال۔ یعنی اب تک تو میں اپنے جذبات کی رو میں بہتا رہا ہوں لیکن اب تو مجھے توفیق دے کہ میں جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے کے بجائے تیری ان بے پایاں عنایات کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی شکر کا جذبہ تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

'وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ' شکر کا جذبہ لازماً عمل صالح کا محرک بنتا ہے اور عمل صالح وہ ہے جو نفس کی خواہشوں کی پیروی کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ اس راہ میں بعض اوقات آدمی کو یہ مغالطہ پیش آتا ہے کہ وہ ایک کام اپنے گمان کے مطابق، خدا کی رضا جوئی کے لیے کرتا ہے لیکن وہ خدا کی خوشنودی کے بجائے اس کے غضب کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کام جو فی الظاہر تو نیکی کے ہوتے ہیں لیکن

ان کے اندر بدعت یا شرک کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو یہ دعا بھی برابر کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کے ان کاموں کی توفیق بخشے جو اس کی پسند کے مطابق ہوں۔

'وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ' یعنی ساتھ ہی وہ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا کرتا ہے کہ ان کے اندر بھی اس کے صالح وارث اٹھیں تاکہ دنیا میں بھی اس کے لیے سرخروئی کا باعث ہوں اور آخرت میں بھی ان کی نیکی اس کے لیے شفاعت بن سکے۔ یہی مضمون رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ ..... الآیۃ والی آیت میں گزر چکا ہے اور ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ' یہ آئندہ کے لیے اس کا اقرار صالح ہوتا ہے کہ اب میں نے تیری طرف رجوع کیا اور تیرے فرماں بردار بندوں میں سے بننے کا عہد کرتا ہوں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (۱۶)

فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔

'فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ' حال کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوگا جو جنت کے مستحقین کے ساتھ ہوگا۔ یہ انہی کے زمرے میں شمار ہوں گے۔

'وَعْدَ الصِّدْقِ' مصدر مؤکد ہے یعنی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ سچا اور پکا وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

چالیس سال کی عمر کو پہنچنے والوں کو تنبیہ

یہ آیت جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، جوانوں، خاص طور پر چالیس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے لوگوں کو تشویش و ترغیب بلکہ ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ اب ان کے لیے بیدار ہونے کا آخری وقت آگیا ہے۔ اگر اب بھی انھوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی رعایت سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۷)

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بالکل مادر پدر آزاد لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں۔

تمثیل میں 'الذی' کا مصداق ایک معین شخص ہونا ضروری نہیں ہے

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ 'اَلَّذِیْ' جب تمثیل کے لیے آتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس سے لازماً کسی خاص شخص ہی کو مراد لیا جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہوگا جس پر تمثیل منطبق ہو۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں اس کی نہایت واضح مثال گزر چکی ہے۔ یہاں بھی یہ عام ہی ہے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں اس کا ذکر جمع کے صیغوں ہی سے ہوا ہے۔ جو لوگ عربیت کے اس اسلوب سے آشنا نہیں ہیں وہ ہر جگہ 'اَلَّذِیْ' سے کسی خاص شخص کو مراد لینے کی کوشش کرتے ہیں وہ آیت کے صحیح مفہوم

سے بہت دور نکل جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی بعض لوگوں نے اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فرزند حضرت عبدالرحمانؓ کو مراد لیا ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اس قول کو رد کیا ہے لیکن ان کی یہ تردید کسی محکم اصول پر مبنی نہیں ہے اس وجہ سے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر 'اَلَّذِیْ' معرفہ کے لیے آتا ہے تو اس سے کون مراد ہے؟ ہم نے جو توجیہ کی ہے اس کے بعد یہ سوال نہیں پیدا ہوتا۔

لاابالیانہ رویّہ

یہ اوپر والے گروہ کے مقابل گروہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ جو نوجوان بالکل مادر پدر آزاد زندگی گزارتے ہیں ان کو اپنے رویّہ کا جائزہ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کے ماں باپ ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوکتے اور خدا و آخرت کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان کو بھی نہایت بے دردی سے جھڑک دیتے ہیں۔ ماں باپ نہایت شفقت اور دردمندی کے ساتھ سمجھاتے ہیں کہ بیٹے! ایمان کی راہ اختیار کر، خدا کا وعدہ شدنی ہے تو وہ ان کو بے وقوف بناتا ہے کہ کیا تم لوگ مجھے اس بات سے ڈراتے ہو کہ مر کھپ جانے کے بعد پھر زندہ کر کے قبر سے نکالا جاؤں گا؟ یہ ایک بالکل مہمل بات ہے۔ نہ جانے کتنی بے شمار خلقت مجھ سے پہلے گزر چکی ہے، ان میں سے کوئی بھی اب تک زندہ ہو کر واپس نہیں آیا تو میں کس طرح باور کروں کہ مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا! یہ سب اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہر دور میں کچھ لوگ اس طرح کی بے سروپا باتیں کرتے رہے ہیں کہ قیامت آ رہی ہے لیکن قیامت کو نہ آنا تھا، نہ آئی اور نہ کبھی آئے گی۔

'وَیْلَکَ اٰمِنْ' لفظ 'ویل' اگرچہ لعنت کے الفاظ میں سے ہے لیکن بعض مواقع میں یہ دل سوزی، شفقت اور دردمندی کے اظہار کے لیے بھی آتا ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہاں بھی یہ اسی طرح کے محل میں ہے۔ بعض ماں باپ نہایت دل سوزی کے ساتھ اس کو سمجھاتے ہیں کہ تیرا ناس ہو! ضد نہ کر، یہ بے راہ روی چھوڑ، ایمان کی راہ اختیار کر اور آخرت سے ڈر۔ لیکن وہ ان کی اس شفقت کی قدر کرنے کے بجائے نہایت نفرت کے ساتھ ان کو جھڑک دیتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْہِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ اِنَّہُمْ کَانُوْا خٰسِرِیْنَ (۱۸)

لاابالیوں کا انجام

یہ ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ یہاں اشارے، ضمیریں اور افعال سب جمع استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ 'اَلَّذِیْ' یہاں 'اَلَّذِیْنَ' ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ اوپر والی آیت میں ذکر کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ ایک خاص قماش کے لوگوں کا تھا۔ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات پوری ہو گئی۔ 'اللہ کی بات' سے مراد وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمائی تھی کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔ 'فِیْٓ اُمَمٍ' بالکل اسی موقع و محل میں ہے جس محل میں اوپر والی آیت میں 'فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّۃِ' ہے۔

مقصود اس سے ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ یہ انہی جنوں اور انسانوں کے ساتھی بنیں گے جو ان سے پہلے انہی کی طرح لاابالیانہ زندگی گزار کے اپنی عاقبت برباد کر چکے تھے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۹)

مذکورہ دونوں گروہوں کا انجام

'کُلٌّ' سے مراد یہاں وہی دونوں گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ فرمایا کہ ان دونوں گروہوں کو ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ملیں گے۔ جنھوں نے اپنے ماں باپ اور اپنے رب کے حقوق پہچانے اور ادا کیے وہ جنت کے مدارج حاصل کریں گے اور جنھوں نے بالکل شتر بے مہار زندگی گزاری وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے دوزخ کے جس طبقہ کے مستحق ہوں گے، اس میں جائیں گے۔ لفظ 'دَرَجَاتٌ' یہاں علی سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے۔

'وَلِيُوَفِّيَهُمْ' کا معطوف علیہ یہاں محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ ترجمہ میں اس حذف کو میں نے کھول دیا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۲۰)

اوپر 'وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا' میں اگرچہ اجمالاً دونوں گروہوں کے نتائج اعمال کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہاں مخاطب خاص طور پر متکبرین قریش ہیں اس وجہ سے ان کے انجام کی وضاحت خاص طور پر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ اس دن کا خیال کرو جس دن یہ متکبرین جہنم کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے حصہ میں جو نعمتیں مقدر تھیں وہ تم دنیا میں برت چکے۔ اب تمہارے لیے صرف ذلت کا عذاب ہے اس لیے کہ تم بلا کسی حق کے خدا کی زمین میں تکبر اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے رہے۔

'اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ' کے معنی ہیں تم نے اپنے حصہ کی نعمتیں ختم کر لیں۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اگر وہ اپنے رب کے شکر گزار رہتے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو وہ اپنی آخرت کے لیے بھی نعمتوں کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جو لوگ نعمتیں پاکر استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا سارا ذخیرہ یہیں ختم ہو جاتا ہے، آخرت میں صرف ان کا وبال ان کے حصہ میں آئے گا۔

'اِسْتِكْبَار' کے ساتھ 'بِغَيْرِ الْحَقِّ' کا اضافہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ ساری نعمتیں بخشتا تو اللہ تعالیٰ ہے تو ان کو پاکر کسی کو اکڑنے اور اترانے کا کیا حق ہے۔ آدمی اترائے تو جب کہ وہ کسی چیز کا خالق ہو اور خدا کے دیے بغیر اس نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے کوئی چیز حاصل کی ہو۔

جب ہر چیز خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو اترانا بالکل جہل و حماقت ہے اور اس سے بھی بڑی حماقت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتیں اسی کی نافرمانی میں استعمال کرے۔

۴۔ آگے آیات ۲۱ — ۲۸ کا مضمون

آگے بالاجمال قومِ عاد کی تکذیب اور ان کے انجام کا حوالہ ہے۔ مقصود اس حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور قریش کے متکبرین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو وہ بھی اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۱-۲۸

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـــِٕدَةً ڮ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـــِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا

ع ۲/۳

مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۲۱ - ۲۸

اور عاد کے بھائی کو یاد کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اس کے آگے اور پیچھے آگاہ کرنے والے گزر چکے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ جھوٹ بول کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو تو اگر تم سچوں میں سے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس کا صحیح علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں تو تمھیں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت میں مبتلا ہو۔ ۲۱-۲۳

پس جب انھوں نے اس عذاب کو بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے! نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم نے جلدی مچا رکھی تھی! یہ باد تند ہے جس میں دردناک عذاب ہے، یہ تہس نہس کر دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے۔ پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کسی چیز کا بھی نشان باقی نہیں رہا۔ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ ۲۴-۲۵

اور ہم نے ان کے قدم ان رفاہیتوں کے اندر جمائے تھے جن کے اندر تمھارے قدم نہیں جمائے اور ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل دیے لیکن چونکہ وہ اللہ کی آیات

کے منکر رہے اس وجہ سے نہ ان کے کان ان کے کچھ کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل۔ اور ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اور ہم نے تمھارے گردوپیش کی بستیاں بھی تباہ کر دیں اور ان کے لیے اپنی آیتیں گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو کیوں نہ ان کی مدد کی انھوں نے جن کو انھوں نے خدا کے تقرب کے لیے معبود بنا رکھا تھا بلکہ وہ سب ان سے کھوئے گئے اور یہ ان کا جھوٹ اور ان کا افترا تھا۔ ۲۶-۲۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۲۱)

'أَخَا عَادٍ' سے مراد حضرت ہود علیہ السلام ہیں جو قوم عاد کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم عاد ہی کے ایک فرد تھے اس وجہ سے ان کو عاد کا بھائی کہا۔ رسول کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمام حجت کے پہلو سے اپنے اندر گوناگوں اہمیتیں رکھتا ہے جن کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

'الْأَحْقَافُ' لغت میں تو ریگ کے مستطیل تودوں کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ ریگستان ہے جو عمان و یمن اور نجد و حضرموت کے درمیان الاحقاف کے نام سے موسوم ہے اور جو قوم عاد کا اصل مسکن رہا ہے۔ اس نام سے ذکر کر کے قرآن نے یہاں اس عظیم تباہی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس علاقہ پر آئی۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں قوم عاد یہاں اپنے عروج پر تھی اس زمانے میں یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور ان عظیم تمدنی کارناموں سے معمور رہا ہوگا جن کے سبب سے قوم عاد کو تاریخ میں ایک خاص شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ لیکن اب وہی مقام ہے جہاں ایک لق و دق صحرا ہے جس کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں تعمیر و تمدن کا بھی کوئی نقش قائم ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ الاحقاف کے نام سے یہ علاقہ عاد کے زوال کے بعد موسوم ہوا ہے جب یہاں شاندار تعمیرات کی جگہ صرف ریت کے ٹیلے رہ گئے۔

'وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ'۔ یہ سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ ہے۔ 'نُذُرُ' یہاں 'نَذِيْرٌ' کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا انذار کوئی انوکھا انذار نہیں تھا، آگے اور پیچھے کے علاقوں میں بھی اسی طرح کے منذر آچکے تھے اور انھوں نے اللہ کے جس عذاب سے لوگوں کو ڈرایا تھا اس کے آثار بھی موجود تھے لیکن جس طرح اگلوں نے کوئی سبق نہیں لیا اسی طرح ان پچھلوں نے بھی اپنے منذر کے انذار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

تمام فساد کی جڑ شرک ہے

'اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ'۔ یہ حضرت ہود علیہ السلام کا اصل انذار ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی نہ کرو۔ اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب آدھمکے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل فساد کی جڑ شرک ہے جس سے تمام دوسرے فسادات کی شاخیں پھوٹتی ہیں اس وجہ سے اللہ کے رسولوں نے سب سے پہلے اسی سے آگاہ کیا اور اس کا انجام یہ بتایا کہ اگر لوگوں نے اپنی روش کی اصلاح نہ کی تو خدا کے ہولناک عذاب کی زد میں آجائیں گے۔ شرک خدا کی زمین میں اس کے خلاف بغاوت ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جس قوم پر اپنے رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کر دیتا ہے اور پھر بھی وہ اپنی اس سرکشی سے باز نہیں آتی تو اس کو مزید مہلت نہیں ملتی۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۲)

قوم کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

'اِفْكٌ' کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔ اس کے بعد 'عَنْ' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ کسی ایسے فعل پر متضمن ہے جس کے معنی پھیرنے اور برگشتہ کرنے کے ہیں۔ یعنی انھوں نے حضرت ہودؑ کے اس انذار کا جواب یہ دیا کہ اچھا، آپ اس مقصد سے ہمارے پاس رسول بن کر تشریف لائے ہیں کہ جھوٹ موٹ اپنی رسالت اور ایک عذاب کی دھونس جما کر ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کریں! اگر یہ بات ہے تو وہ عذاب ہمارے اوپر لاؤ جس سے ڈرا رہے ہو، اس کے بغیر ہم تمہارا سچا ہونا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ڮ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۳)

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں فرمایا کہ تم کو اس عذاب سے آگاہ کر دینے کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے آگاہ کر دیا، رہی یہ بات کہ وہ عذاب کب آئے گا اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ نہایت ہی سخت جہالت

میں مبتلا ہو کر جس عظیم خطرے سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کے سدّباب کی تدبیر سوچنے کے بجائے تم اس کو دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ میں اس خطرے کو لانے والا نہیں بلکہ اس سے آگاہ کرنے والا ہوں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ لا قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ط بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ط رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۴)

عذابِ الٰہی کا ظہور اور مجرموں کا حشر

ضمیر مفعول کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا اوپر والی آیت میں ذکر ہوا۔ 'عارض' کے معنی بادل کے ہیں اور یہ یہاں حال کے محل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے جب وہ ایک ابر کی شکل میں ان وادیوں کی طرف بڑھتا نظر آیا تو خوش ہو کر بولے کہ یہ ابرِ باراں ہے جو ہماری وادی کو جل تھل کر دے گا! بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ۔ یعنی وہ تو اس کو ابرِ باراں سمجھے لیکن صورتِ حال نے بتایا کہ ابرِ باراں نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے لیے وہ جلدی مچائے ہوئے تھے۔ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یہ اس عذاب کی نوعیت واضح فرمائی ہے کہ وہ ایک بادِ تند تھی جس کے اندر ایک دردناک عذاب چھپا ہوا تھا۔ اس بادِ تند کو دوسرے مقام میں 'صرصر' سے تعبیر فرمایا ہے جو کئی دن تک ان پر مسلط رہی اور اس نے ان کو بالکل پامال کر کے رکھ دیا۔ سورۂ حاقّہ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ o سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ لا حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى لا كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ o (الحاقۃ: ۶-۷)	اور رہے عاد تو وہ ایک بے قابو بادِ تند سے ہلاک کیے گئے۔ اس کو اللہ نے ان پر مسلط رکھا سات رات اور آٹھ دن ان کی جڑ کاٹ دینے کے لیے۔ تم دیکھتے کہ وہ اس کے اندر اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ط كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۵)

یہ اس بادِ تند کی تباہ کاریوں کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے اس طرح کا ستھراؤ کر دیا کہ ان کے مکانوں کے آثار کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے کے لیے باقی نہیں رہ گئی۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ صرف ماضی کی ایک کہانی ہے بلکہ ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔ اگر قریش نے بھی وہی روش اختیار کی جو عاد نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ مختلف ہو۔ یہ بھی لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۡ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے سامنے وہ سبق رکھا ہے جو اس سرگزشت سے حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اسباب و وسائل کی جو فراوانی اور تعمیر و تمدن کی جو عظمت و شوکت ان کو حاصل ہوئی وہ تم کو حاصل نہیں ہے لیکن دیکھ لو، جب ہم نے ان کو پکڑنا چاہا تو وہ ہماری پکڑ سے اپنے کو بچا نہ سکے[1]۔ ہم نے ان کو کان، آنکھ اور دل کی تمام صلاحیتیں عطا فرمائیں لیکن چونکہ وہ ہماری آیات کی روشنی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اس وجہ سے ان کے کان، آنکھ، دل ان کے کچھ کام آنے والے نہ بنے بلکہ وہ ساری ذہانت و فطانت رکھتے ہوئے اس عذاب کی گرفت میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔

کان، آنکھ اور دل کی صلاحیتیں آیاتِ الٰہی سے بیدار ہوتی ہیں

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ کان، آنکھ اور دل کے اندر بھی حقیقی روشنی اللہ تعالیٰ کی آیات ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ آیاتِ الٰہی کے نور سے یہ منور نہ ہوں تو ان کی ساری رسائی صرف محسوسات تک محدود رہتی ہے اور ان محسوسات پر بھی وہ اپنا سارا زور محسوس فوائد ہی کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اس محسوس پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی یہ ساری اصلی صلاحیتیں بالکل کند ہو کے رہ جاتی ہیں۔ وہ اشیاء کے محسوس اور مادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو پر نہ غور کر سکتا اور نہ اس پر غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کرتا حالانکہ غور کرنے کا اصلی پہلو وہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس طرح کے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کے پاس کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷)

قریش کو ایک اور تنبیہ

یہ خطاب بھی قریش ہی سے ہے۔ فرمایا کہ عاد کا قصہ اگر کچھ دور کا سمجھتے ہو تو اپنے ماحول کی بستیوں پر نگاہ ڈالو۔ ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں کے پردے ہٹانے کے لیے بھی ہم نے اپنی آیات ان کے سامنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کیں تاکہ وہ اپنے اصل خالق و مالک کی طرف رجوع کریں لیکن انھوں نے بھی ہماری آیات قبول کرنے سے انکار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ اشارہ ان تباہ شدہ بستیوں کی طرف ہے جن پر سے قریش کو اپنے تجارتی سفروں میں گزرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸)

ایک سوال

یہ قریش کے سامنے ایک سوال رکھا ہے کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمہارے یہ دیوی دیوتا تمھیں

خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے تو آخر ان کے معبودوں نے ان کو خدا کے عذاب سے کیوں نہیں بچایا، انھوں نے بھی تو تمھاری ہی طرح ان معبودوں کو خدا کے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا! ‘بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ’ یعنی وہ تو سب عین وقت پر کھوئے گئے، کوئی بھی ان کے کام آنے والا نہ بنا۔

‘ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ’ یعنی ثابت ہوا کہ یہ سب ان کا جھوٹ اور افترائے محض تھا، انھوں نے محض اپنے جی سے ان کو معبود بنایا اور پھر خدا پر یہ بہتان باندھا کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔

‘قُرْبَانًا’ مفعول لہ ہے۔ یہ مشرکین کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر ان کے قول ‘مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى’ (ہم ان کو صرف اس خیال سے پوجتے ہیں کہ ہمیں خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب کر دیں) میں ہوا ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ مشرکین جن معبودوں کو پوجتے تھے ان کو خلق کا خالق و مالک سمجھ کر نہیں پوجتے تھے بلکہ اس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں، ان کی عبادت خدا کے تقرب کا ذریعہ ہوگی۔ فرشتوں کے متعلق ان کا جو عقیدہ تھا وہ اس کتاب میں جگہ جگہ زیرِ بحث آچکا ہے۔

۶۔ آگے آیات ۲۹ - ۳۵ کا مضمون

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چند آیات میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر تمھاری قوم کے لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ یہ اس کتاب کا یا تمھارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے ورنہ اس کتاب کی دل کشی اور اثر آفرینی کا حال تو یہ ہے کہ اگر صالحینِ جن کی کسی جماعت کے کانوں میں اتفاق سے بھی اس کی آواز پڑ گئی ہے تو وہ سراپا گوش ہو کر اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور پھر اس کی دعوت لے کر اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ حیف ہے اگر یہ لوگ، جن کے لیے یہ کتاب اتاری گئی ہے، اس کی قدر نہ کریں۔

اس کے بعد خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں کفار کے لیے تہدید و وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و عزیمت کی تلقین ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۵

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ

بَعۡدِ مُوۡسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ یَهۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۳۰﴾ یٰقَوۡمَنَاۤ اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوۡا بِهٖ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُجِرۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنۡ لَّا یُجِبۡ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیۡسَ بِمُعۡجِزٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَیۡسَ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ لَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیَِۧ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیۡسَ هٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ ؕ کَاَنَّهُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَ مَا یُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنۡ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلۡ یُهۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

ع ۴ / ۹ / ۴

ترجمۂ آیات: ۲۹-۳۵

اور یاد کرو جب کہ ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کر دیا قرآن سننے کے لیے۔ تو جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ خاموش ہو کر سنو! تو جب وہ تمام ہو چکا تو وہ اپنی قوم کی طرف انذار کرتے ہوئے لوٹے۔ انھوں نے کہا کہ اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس کے باب میں پہلے سے موجود

ہیں۔ یہ کتاب حق اور ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تمھارے گناہوں کو بخشے گا اور تم کو ایک دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ۲۹-۳۱

اور جو اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہیں کہے گا وہ یاد رکھے کہ وہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکے گا اور اس کے لیے اس کے بالمقابل دوسرے مددگار بھی نہ ہوں گے۔ یہی لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۲-۳۳

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا ہے دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے! وہ جواب دیں گے، ہاں! ہمارے رب کی قسم، یہ تو حقیقت ہے!! ارشاد ہوگا، تو چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں! ۳۴

پس ثابت قدم رہو جس طرح صاحب عزم رسول ثابت قدم رہے اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ پس پہنچا دینا ہے! بالآخر تباہ تو وہی ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ ۳۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا

اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (۲۹)

جنوں کے قرآن سننے کے واقعہ کی نوعیت

'صَرَفْنَآ اِلَيْكَ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جنوں کے قرآن سننے کا یہ واقعہ بالکل اتفاقاً، محض اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے پیش آگیا۔ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے کوئی اہتمام فرمایا اور نہ جنوں ہی نے اس کا پہلے سے کوئی ارادہ کیا تھا۔ بس اللہ نے سرِ راہے ان کی ایک پارٹی کو متوجہ فرما دیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے ذرا سن لیں۔ چنانچہ انھوں نے سنا اور اسی سننے کا اثر ان پر یہ پڑا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ طائف والوں کے رویّہ سے نہایت کبیدہ خاطر ہو کر واپس ہوئے ہیں تو راستہ میں نخلہ میں آپ نے رات گزاری ہے۔ وہیں شب کی نماز میں سے کسی نماز میں آپ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اسی موقع پر جنوں کی اس پارٹی نے قرآن سنا اور اس پر وہ اثر پڑا جو اوپر مذکور ہوا اور جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ مقصود اس واقعہ کے ذکر سے اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ جن کے لیے اور جن کی زبان میں یہ کلام اترا، جن کی اصلاح کے لیے اللہ کا رسول اپنے دن رات ایک کیے ہوئے ہے، جن کی تلاش میں وہ مکہ سے سفر کر کے طائف تک پہنچا ہے وہ تو نہ صرف یہ کہ اس کلام کو سننے کے روادار نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول کے ساتھ نہایت بدسلوکی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں اور جنات کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر جو سلیم الفطرت ہیں اگر وہ سرِ راہے بھی قرآن کی کچھ آیتیں سن لیتے ہیں تو سن کر تڑپ اٹھتے ہیں اور اپنی قوم کے اندر اس کتاب کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خرابی قرآن اور اس کے پیش کرنے والے کے اندر نہیں بلکہ خود ان لوگوں کے اندر ہے جو اس سے گریز کر رہے ہیں۔

مکہ اور طائف کے گنڈوں پر تعریض

'فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا'۔ یعنی قرآن کی بھنک کان میں پڑتے ہی انھوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت کی کہ خاموش اور مؤدّب ہو کر اس لاہوتی کلام کو سنو کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ ان کے اس حسنِ ادب کا حوالہ مکہ اور طائف کے ان گنڈوں کی بدتمیزیوں پر تعریض ہے جن کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے کہ وہ اپنے کارندوں کو یہ سکھاتے کہ جب قرآن سنایا جائے تو اس میں خوب گڑبڑ پیدا کرو کہ اس کی آواز دب جائے اور تم غالب رہو۔ ان کے اسی رویہ کا ذکر سورۂ جن میں بدیں الفاظ ہوا ہے: 'وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا' (الجن: ۱۹) (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ، خالص اللہ ہی کی دعوت کے لیے اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے)۔

جنوں کی سچی اثر پذیری

'فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ'۔ یہ بات ان کے سچے اور حقیقی تاثر کی شہادت

کے طور پر بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے صرف واہ واہ، سبحان اللہ، ماشاءاللہ کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جس سے اس کتاب نے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ کسی اچھی اور سچی بات پر واہ واہ کر دینے والے تو بُرے سے بُرے زمانے میں بھی نکل آتے ہیں لیکن اس واہ واہ کی اس وقت تک کوئی قیمت نہیں ہے جب تک زندگی کے اندر اس سے کوئی عملی تبدیلی نہ واقع ہو۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر سر دھننے والے اور اس کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے والے اس زمانے میں بھی بہت ہیں لیکن اس پر عمل کرنے والے اگر آپ ڈھونڈھیں تو وہ عنقا ہیں۔ ان جنوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ ان پر اس کتاب کا یہ اثر پڑا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی قوم کے اندر، تمام خطرات سے بے پروا ہو کر، اس کی منادی کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ہ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ہ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۰-۳۲)

جنوں کی دعوت اپنی قوم کو

یہ وہ دعوت ہے جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو دی۔ سب سے پہلے انھوں نے اس کتاب کا تعارف کرایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی ہے جو اس کے باب میں سابق صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد صاحب شریعت نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء بنی اسرائیل میں گزرے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔ اسی طرح قرآن سے پہلے اصل کتاب کی حیثیت صرف تورات کو حاصل رہی ہے، دوسرے آسمانی صحیفے اسی کے ضمیمے ہیں۔ تورات کے بعد مستقل کتاب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہوئی اور اس کے آسمانی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ ٹھیک ٹھیک ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر نازل ہوئی جو اس کے باب میں، پہلے سے تورات اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں موجود تھیں۔

'یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ' یہی بات سورۂ جن میں انہی جنوں کی زبان سے معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یوں نقل ہوئی ہے۔ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (الجن: ۱-۲) (ہم نے ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے، جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے) ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 'حق' سے مراد یہاں عقیدۂ توحید ہے

جو خدا تک پہنچانے والا سیدھا راستہ ہے۔ لفظ 'حق' اس عقیدہ کے رسوخ و استحکام اور اس کے مطابقِ حقیقت و موافقِ عقل و فطرت ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور 'صراطِ مستقیم' سے اس کے آسان، ہموار اور کج پیچ سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ دونوں ہی باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ تنکیر یہاں تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ ۔۔۔۔۔۔ الآیۃ' یہ وہ اصل دعوت ہے جو انھوں نے اپنی قوم کو دی کہ اللہ کے اس داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ۔ 'وَاٰمِنُوْا بِہٖ' اسی لبیک کہنے کی وضاحت ہے کہ اصل مطلوب شے ایمان ہے۔ جو ایمان لائیں گے اللہ ان کے گناہوں کو بخشے گا اور ایک دردناک عذاب سے ان کو نجات دے گا۔

حقوق العباد کے معاملات کی نزاکت

'مِنْ ذُنُوْبِکُمْ' میں 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بعض گناہ ایسے بھی ہیں جن کی معافی کا معاملہ اس ایمان کے بعد بھی محوّل رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ سنگین قسم کے گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ حقوق العباد کی معافی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی ان کی تلافی کرے۔ اگر ان کی تلافی نہیں کی گئی ہے یا تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ یہ معاملہ فریقین کی موجودگی میں آخرت کی عدالت میں پیش ہو۔ وہاں کیا فیصلہ ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن اتنی بات واضح ہے کہ تلافی کا موقع ہوتے ہوئے اگر تلافی نہیں کی گئی ہے تو یہ چیز ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے اور اگر تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل جا چکا ہے تو امید ہے کہ آدمی کا سچا احساس، سچی توبہ، سچی ندامت اور اس کی وہ نیکیاں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے سفارشی بنیں جو وہ اپنے جرائم کی تلافی کے لیے اپنی بعد کی زندگی میں مرتے دم تک کرے گا۔

قنوطیت کی طرح بے جا رجائیت بھی فتنہ ہے

جن لوگوں نے اس آیت کے اندر 'مِنْ' کو ایک بالکل زائد چیز سمجھ کر اس کی تاویل کی ہے انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ قرآن میں ایک حرف بھی زائد نہیں ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں جس طرح بے جا قنوطیت ناجائز ہے اسی طرح بے جا رجائیت بھی ایک فتنہ ہے۔ نقطۂ اعتدال بیم و رجا دونوں کے بین بین ہے۔

'وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰہِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ' یہ بات اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین کے طور پر بھی ہو سکتی ہے لیکن نظائرِ قرآن کی روشنی میں میرے نزدیک یہ جنوں ہی کے قول کا ایک حصہ ہے۔ سورۂ جن میں ان کی یہی بات بدیں الفاظ نقل ہوئی ہے۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ — اور یہ کہ ہم نے جان لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں

فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَہٗ ھَرَبًاہ خدا کے قابو سے باہر نکل سکتے نہ آسمان میں بھاگ کر اس کو ہرا سکتے۔
(الجن: ۱۲)

'وَلَیْسَ لَہٗ مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءُ' کا تعلق آخرت سے ہے۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں وہ خدا کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے اسی طرح آخرت میں بھی خدا کے مقابل میں ان کا کوئی مددگار و کارساز نہیں بنے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنات بھی قرآن کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح بنی نوع انسان مخاطب ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنات کے بھی اسی طرح رسول ہیں جس طرح ہمارے لیے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو جنوں کے اس قول کا کیا مطلب کہ 'یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ' (اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ) اور اگر اثبات میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسالت سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہمیشہ سے جاری ہے اور جو قرآن میں وضاحت سے بیان ہوئی ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں بدل دی گئی؟ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی تو یہ رہی ہے کہ وہ اسی قوم کے اندر سے مبعوث ہوئے جس کی دعوت پر وہ مامور ہوئے۔ اسی زبان میں انھوں نے اپنی دعوت پیش کی جو پوری قوم کی زبان تھی۔ قوم ہی کے اندر انھوں نے اپنی زندگی گزاری اور اس کے ہر طبقہ کے پاس خود جا جا کر، ان کو جھنجھوڑا، جگایا اور ان پر اللہ کی حجت تمام کی۔ اس کے بعد اگر قوم ایمان نہیں لائی تو انھوں نے اس سے اعلان براءت کر کے ہجرت کی اور قوم پر اللہ کا عذاب آیا۔ کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے اندر بھی یہ تمام ذمہ داریاں اسی طرح ادا فرمائیں جس طرح انسانوں کے اندر ادا فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ رسول کی ساری زندگی اس کے متبعین کے لیے اسوہ اور نمونہ ہوتی ہے۔ کیا جنات کے لیے کسی بشر کی زندگی کامل اسوہ اور نمونہ ہو سکتی ہے جب کہ یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ ہم انسانوں کے لیے کسی فرشتہ یا جن کی زندگی اسوہ اور نمونہ نہیں ہو سکتی؟ چنانچہ قرآن نے ان لوگوں کے جواب میں، جو مطالبہ کرتے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو کیوں بھیجا گیا، کسی فرشتہ کو کیوں نہیں بھیجا گیا، کہا بھی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے کوئی فرشتہ کس طرح بھیجا جاتا۔ اگر فرشتہ بھیجا جاتا تو وہ بھی بہرحال انسانوں ہی کے بھیس میں آتا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ جب جنوں اور انسانوں کی خلقت دو بالکل متضاد عناصر سے ہوئی ہے تو لازماً دونوں کی سرشت، دونوں کے مزاج، دونوں کی معاشرتی، سماجی اور تمدنی ضروریات اور دونوں کے احکام و شرائع میں بڑا فرق ہو گا۔ ان میں مشترک ہو سکتے ہیں تو توحید، معاد اور خیر و شر کے بنیادی کلیات ہی ہو سکتے ہیں، باقی امور تو بہرحال الگ الگ ہوں گے اس وجہ سے قرآن ان کی

رہنمائی کر سکتا ہے تو صرف عقائد اور اخلاقی کلیات کی حد تک ہی کر سکتا ہے۔ زندگی کے دوسرے ابواب میں لازماً وہ محتاج ہیں کہ ان کے اندر انہی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی رہنمائی ان کے فطری تقاضوں ان کی ضروریات اور ان کے حالات و مسائل کے مطابق کریں تاکہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو سکے۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے قرآن پر غور کیجیے تو یہی بات اس سے بھی نکلتی ہے۔ اوپر قرآن سے متعلق جنوں کا جو تاثر نقل ہوا ہے اس کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوا۔ بعینہٖ یہی تاثرات جنوں کے، زیادہ تفصیل کے ساتھ، سورۂ جن میں نقل ہوئے ہیں۔ وہاں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تاثرات کا علم وحی الٰہی کے ذریعہ سے ہوا۔ چنانچہ اس سورہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے: قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن: ۱) (لوگوں کو بتا دو کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک پارٹی نے قرآن کو سنا تو انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب و غریب کلام سنا ہے) اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بھی رسول ہوتے تو ان کے ان سارے تاثرات کا علم آپ کو براہِ راست ہونا تھا۔ آپ کو ان کے اندر اسی طرح تبلیغ و دعوت کا فرض ادا کرنا چاہیے تھا جس طرح آپ نے اہلِ عرب کے اندر یہ فرض ادا کیا، لیکن قرآن سے اس طرح کی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ بعض روایات سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جنوں کے ایک آدھ وفود آپ کے پاس آئے اور خود آپ بھی بعض وفود کی دعوت پر ان سے ملنے گئے لیکن اول تو ان روایات میں ایسا اضطراب ہے کہ وہ روایت و درایت دونوں کی کسوٹی پر جانچے جانے کی محتاج ہیں، دوسرے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ جنوں کے وفود آپ سے ملے یا ایک آدھ بار آپ ان کی دعوت پر ان کے پاس گئے۔ صرف اتنی سی بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ آپ نے بحیثیت ان کے رسول کے ان کے اندر اپنا فرضِ رسالت ادا فرمایا۔

رہی یہ بات کہ ان جنوں نے قرآن کی تعریف کی اور اپنی قوم کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی تو یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جہاں تک کلیاتِ دین کا تعلق ہے وہ انسانوں اور جنوں کے درمیان بالکل مشترک ہیں بلکہ ہمارے اور فرشتوں کے درمیان بھی مشترک ہیں بلکہ اس سے ایک قدم بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان میں چرند پرند، شجر و حجر اور شمس و قمر سب شریک ہیں۔ اس وجہ سے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے نغماتِ حمد میں پرندے اور پہاڑ ان کی ہمنوائی کرتے تھے، اسی طرح جنوں کے صالحین کی اس پارٹی نے قرآن سنا تو عش عش کر اٹھی اور اس نے اپنی قوم کو بھی توحید اور آخرت پر ایمان لانے اور خدا کے عذاب سے ڈرتے رہنے کی دعوت دی۔ جنوں کی جو دعوت اوپر

مذکور ہوئی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے اور سورۂ جن پر بھی، جس میں ان کی دعوت پوری تفصیل سے نقل ہوئی ہے، ایک نظر ڈال لیجیے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے انھی باتوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے اور انسانوں بلکہ تمام کائنات کے اندر مشترک ہیں۔ اس سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی بنیادی دعوت انسانوں اور جنوں دونوں کے لیے یکساں ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کے لیے بھی اسی طرح رسول تھے جس طرح انسانوں کے لیے تھے۔ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے ان کی بات اس سنتِ الٰہی کے خلاف ہے جو قرآن میں رسالت سے متعلق نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔

یہاں ایک اور ضمنی بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔

اوپر کی آیات میں جنات کے اہلِ ایمان کے لیے چونکہ صرف عذابِ الیم سے نجات کا ذکر ہوا ہے، ان کو صریح الفاظ میں دخولِ جنت کی بشارت نہیں دی گئی ہے اس وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ صالحینِ جن کے لیے دخولِ جنت کے قائل نہیں تھے یا کم از کم یہ کہ وہ یہ بات صریح الفاظ میں کہنے سے احتیاط کرتے تھے۔ ہماری سمجھ میں امام صاحبؒ کی یہ احتیاط کسی طرح نہیں آئی۔ جب جنات کے بُروں کے لیے دوزخ لازمی ہے تو آخر ان کے صالحین جنت سے کیوں محروم رہیں گے؟ بعض متاخرین نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی تائید میں یہ دلیل دی ہے کہ خدا کے اوپر کسی کا حق قائم نہیں ہے اس وجہ سے اگر وہ کسی کے صلاح و تقویٰ کے باوجود اس کو جنت میں نہ داخل کرے تو یہ بات خلافِ عدل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دلیل بالکل لا یعنی ہے۔ خدا کے اوپر کوئی دوسرا تو کوئی حق قائم نہیں کر سکتا لیکن جو حقوق اس نے از خود اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اپنے اوپر قائم کر رکھے ہیں اور جن کو پورا کرنے کا نہایت قطعی اور حتمی الفاظ میں اس نے اپنے صالح بندوں سے وعدہ کیا ہے آخر ان سے اس کے نیک بندوں کو، خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، وہ کیوں محروم رکھے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ امام صاحب نے اگر فرمائی ہوگی تو یہ بات فرمائی ہوگی کہ صالحینِ جن اس جنت میں نہیں جائیں گے جو انسانوں کے لیے ہے۔ اگر انھوں نے یہ بات فرمائی تو اس کا ایک محل ہے۔ اس مسئلہ پر ان شاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کریں گے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۳)

مکذبین کو انذار

یہ سورہ کے خاتمہ پر مکذبین کو انذار ہے کہ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی وہ مُردوں کو بھی زندہ کر کے اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے۔ یہی سوال دوسرے مقامات میں بھی قرآن نے منکرینِ قیامت کے سامنے

رکھا ہے، مثلاً فرمایا ہے، اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (ق: ۱۵) (کیا ہم پہلی بار لوگوں کو پیدا کرنے سے عاجز رہے ؟) بعض جگہ یہ سوال کیا ہے کہ بتاؤ، آسمان و زمین کو پیدا کر دینا زیادہ مشکل ہے یا مُردوں کو دوبارہ پیدا کر دینا ؟

بَلٰٓی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، سوال کر کے خود ہی جواب دیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہا وہ نہ صرف مردوں کو زندہ کر دینے پر قادر ہے بلکہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم قرآن مجید کے اس اسلوبِ بیان کی طرف جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ مخاطب کے لیے جس جواب سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی بعض اوقات قرآن وہ خود ہی اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۴)

یہ اسی انذار کی تصویر ہے کہ اس دن کی یاد کو ہمیشہ مستحضر رکھو جس دن کفر کرنے والوں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ان سے سوال ہو گا کہ بتاؤ قیامت ایک واقعہ اور حقیقت ثابت ہوئی ہے یا نہیں ؟ اس وقت وہ اپنے رب کی قسم کھا کر جواب دیں گے، ہاں ! ہمارے رب کی قسم، بلاشبہ یہ ایک امر واقعی ثابت ہوئی ! ان کے اس اعتراف کے بعد حکم ہو گا کہ اب جاؤ، اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو ! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قیامت کے دلائل آفاق و انفس کے اندر اتنے واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے بھی قیامت کا انکار کیا ہے کسی دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ محض اس لیے کیا کہ وہ اپنی نفس کی خواہشوں کو قربان کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں اپنی عقل، اپنی فطرت پھر تمام نبیوں اور رسولوں کی تکذیب کر ڈالی وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۳۵)

نبی صلعم کو استقامت کی تلقین

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین ہے کہ جس طرح تم سے پہلے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے عزم و جزم کے ساتھ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور اپنے موقف حق پر جمے رہے اسی طرح دشمنوں کی تمام سازشوں اور ایذا رسانیوں کے علی الرغم تم بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ مِنَ الرُّسُلِ، میں 'من'، میرے نزدیک تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے لیے ہے۔ امتحان اللہ کے تمام رسولوں کو پیش آئے ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، اور تمام رسولوں نے بلا استثناء

ان امتحانوں میں سو فی صد کامیابی حاصل کی ہے۔

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔ یعنی اگر یہ لوگ تمھیں زچ کرنے کے لیے عذاب کی جلدی مچائے ہوئے ہیں تو ان کی جلد بازی سے پریشان ہو کر تم ان کے لیے عذاب کی جلدی نہ کرو۔ آج ان کو جو مہلت طویل معلوم ہو رہی ہے جب عذاب سامنے آئے گا تو یہ محسوس کریں گے کہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں رہے ہوں گے۔

بَلٰغٌ، فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ بَلٰغٌ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ساری توجہ خبر پر مرکوز کر دینے کے لیے مبتدا کو حذف کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا کام بس لوگوں تک اپنے انذار کو اچھی طرح پہنچا دینا ہے تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اس کے بعد اگر یہ لوگ تباہ ہوئے تو اس کی ذمہ داری خود ان پر ہوگی۔ اگر یہ نادان لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں تو مچائیں، جب وہ آئے گا تو اس کی برقِ خرمن سوز کن پر گرے گی! انہی نافرمانوں ہی پر تو گرے گی!!

رب کریم و کارساز کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد

۴ راگست ۱۹۷۶ء

۷ رشعبان ۱۳۹۶ھ

تدبّرِ قرآن

۴۷

محمّد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور گروپ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت

پچھلی سورہ ــــــ سورۂ احقاف ــــــ پر اس گروپ کی مکی سورتیں تمام ہوئیں۔ اب آگے تین سورتیں مدنی ہیں۔ سورۂ احقاف کے بعد یہ سورہ اس طرح بلا تمہید شروع ہو گئی ہے گویا احقاف کی آخری آیت میں کفار کے لیے جو وعید ہے اس میں اس کا عملی ظہور ہے۔ پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا کہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے کہ قریش اور ان کے حامی اہل کتاب جس باطل کی حمایت میں لڑ رہے ہیں نہ آفاق وانفس اور عقل و فطرت کے اندر اس کی کوئی بنیاد ہے نہ انبیاء کی تاریخ اور آسمانی صحیفوں میں اس کی کوئی شہادت ہے۔ یہ گھورے پر اگا ہوا ایک درخت ہے جس نے محض اس وجہ سے جگہ گھیر رکھی ہے کہ اس کو اکھاڑنے والا ہاتھ موجود نہیں ہے۔ اب اس سورہ اور اس کے بعد کی دونوں سورتوں میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اس کو اکھاڑ پھینکنے والے ہاتھ اللہ نے پیدا کر دیے ہیں اور تقدیر کا یہ اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے کہ کفار کی وہ تمام کوششیں رائگاں ہو کے رہیں گی جو انھوں نے خلق کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے لیے صرف کی ہیں۔ ساتھ ہی اہل ایمان کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ ان کی مساعی اس دنیا میں بھی بار آور ہوں گی اور آخرت میں بھی وہی سرخرو ہوں گے بشرطیکہ وہ اپنے فرائض پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ ادا کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ اسی ضمن میں منافقوں کو دھمکی دی گئی ہے جو مدعی تو ایمان کے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں کفار اور اہل کتاب کے ساتھ تھیں۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اس نفاق کو چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ اللہ اور رسول کا ساتھ نہ دیا تو ان کا بھی وہی حشر ہونا ہے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) اس فیصلۂ الٰہی کا اعلان کہ کفار نے چونکہ اپنی تمام جدوجہد باطل کی پیروی اور اس کی حمایت میں صرف کی ہے اس وجہ سے یہ بالکل رائگاں جائے گی۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے اپنے رب

کی طرف سے آئے ہوئے حق کی پیروی کی ہے اور اس راہ میں قربانیاں دی ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی دنیا اور آخرت دونوں میں برومند کرے گا۔

(۴-۱۲) اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کہ اگر ان کفار سے جنگ کی نوبت آئے تو تم ان سے ذرا مرعوب نہ ہونا۔ یہ بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہیں۔ ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دینا۔ ان کا قافیہ اس طرح تنگ کر دو کہ یا تو تمھارے احسان کے طفیل رہائی پائیں یا فدیہ دے کر جان چھڑائیں۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان سے نمٹنے کے لیے خود کافی ہے لیکن وہ تمھارا امتحان کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے تم کو یہ حکم دے رہا ہے۔ اگر تم اللہ کی مدد کے لیے اٹھو گے تو اللہ تمھاری مدد فرمائے گا اور تمھارے دشمن ذلیل و پامال ہوں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان سے پہلے جن قوموں نے حق کی مخالفت کی اللہ نے ان کو پامال کر دیا۔ یہی حشر تمھارے ان دشمنوں کا بھی ہونا ہے۔

(۱۳-۱۵) قریش کو قوت و شوکت کا جو غرّہ ہے یہ بالکل بے بنیاد ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جو ہر اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتی تھیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ دلیل و برہان کی روشنی میں زندگی گزارنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے والے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں! لازم ہے کہ دونوں کا انجام مختلف ہو۔ چنانچہ دلیل و برہان کی روشنی میں چلنے والوں کا انجام جنت ہے جس میں ان کے لیے یہ یہ نعمتیں ہوں گی اور خواہشوں کی پیروی کرنے والوں کے لیے دوزخ ہے جس میں ان کا انجام یہ ہو گا۔ بالاجمال جنت اور دونوں کے احوال کی تصویر۔

(۱۶-۱۹) مسلمانوں کے اندر کے مارِ آستین گروہ ـــــ منافقین ـــــ کی طرف اشارہ کہ یہ لوگ پیغمبرؐ کی باتیں بظاہر سنتے تو ہیں لیکن سمجھتے کچھ بھی نہیں۔ جن باتوں سے اہلِ ایمان کے ایمان اور ان کے تقویٰ میں افزونی ہوتی ہے ان سے ان کے نفاق میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ فیصلہ کی گھڑی کے منتظر ہیں حالانکہ پیغمبرؐ کی بعثت کے بعد اس کے ظہور کی شرطیں پوری ہو چکی ہیں۔ اگر وہ گھڑی اچانک آ دھمکی تو پھر اس موعظت سے فائدہ اٹھانے کا موقع کہاں باقی رہے گا جو اللہ نے ان کے لیے نازل فرمائی ہے؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ تم اپنے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے رب سے مغفرت مانگو، کیا عجب کہ عذاب سر پر آیا کھڑا ہو۔

(۲۰-۳۱) منافقین کے باطن اور ان کی پسِ پردہ سازشوں کی پردہ دری کہ یہ محض زبان کے غازی ہیں۔ پہلے تو آگے بڑھ بڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ جہاد کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو ان پر خوف سے موت کی غشی طاری ہو رہی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت دین سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان کا ساز باز اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ یہ ان کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ اگر آپ لوگوں پر کوئی سخت وقت آیا تو ہم آپ ہی کا ساتھ دیں گے۔ ان کے نفاق اور ان کی سازشوں سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے۔ اگر وہ چاہتا

تو ان کی پیشانیوں سے ان کے نفاق کی گواہی دلوا دیتا اور ہر شخص ان کو پہچان لیتا لیکن ابھی وہ ان کو مہلت دے رہا ہے۔ تاہم وہ ایسے امتحانوں میں ان کو ڈالے گا جو ان کے ہر کھوٹ کو ظاہر کر دیں گے۔

(۳۲ - ۳۸) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کی یاد دہانی کے بعد مسلمانوں کو عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ اور رسول کے ہر حکم کی اطاعت کرو۔ اگر اس میں کمزوری دکھائی تو تمہارے تمام اعمال رائگاں جائیں گے۔ اب کفار میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا ہے اس وجہ سے جو لوگ ان سے سمجھوتے کی سکیمیں سوچ رہے ہیں وہ گرتی دیوار کے سایہ میں پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھو۔ اگر تم آگے بڑھے تو بازی تمہاری ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ اس دنیائے دُنی کی محبت میں پھنس کر اللہ کی راہ میں انفاق سے جی نہ چراؤ۔ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے پیسہ پیسہ کا اجر دے گا۔ وہ تم سے تمہارے کل مال کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے کہ تم اس سے جی چراؤ۔ اگر وہ ایسا کرتا تو جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور حسد ہے ان کا سارا بھرم کھل جاتا۔ یاد رکھو کہ جو اللہ سے بخل کرتا ہے وہ خود اپنی ہی جان سے بخل کرتا ہے۔ خدا کسی کے مال کا محتاج نہیں ہے وہ بالکل بے نیاز ہے۔ البتہ تم اللہ کے محتاج ہو۔ یہ تمہارا امتحان ہو رہا ہے۔ اگر تم اس امتحان میں فیل ہو گئے تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا جو تمہاری طرح نکمے نہیں ہوں گے۔

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات: ۳۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

آيات: ۱-۱۵

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ①
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ
مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ
بَالَهُمْ ② ذَٰلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الَّذِينَ
آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ
أَمْثَالَهُمْ ③ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ
إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا
فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ
لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ④ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ
بَالَهُمْ ⑤ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ⑥ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ⑦ وَ
الَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ⑧ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّاۗءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ڬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ﴿۱۵﴾

ع ۵ / ۱

ترجمۂ آیات ۱۵-۱

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا، اللہ نے ان کے تمام اعمال رائگاں کر دیے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے اور ایمان لائے اس چیز پر جو محمد پر نازل کی گئی۔ اور وہی حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال سنوار دیا۔ یہ اس وجہ

سے ہوا کہ جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جو لوگ ایمان لائے
انھوں نے اپنے رب کی طرف سے آئے ہوئے حق کی پیروی کی۔ اس طرح اللہ لوگوں
کے لیے ان کی مثالیں بیان کر رہا ہے۔ ۱-۳

پس جب ان کافروں سے تمھارے مقابلہ کی نوبت آئے تو ان کی گردنیں اڑاؤ
یہاں تک کہ جب ان کو اچھی طرح چور کر دو تو ان کو مضبوط باندھ لو پھر یا تو احسان کر کے
چھوڑنا ہے یا فدیہ لے کر یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ کام ہے تمھارے
کرنے کا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے لیتا لیکن اس نے تم کو یہ حکم
اس لیے دیا کہ ایک کو دوسرے سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے
اللہ ان کے اعمال ہرگز رائگاں نہیں کرے گا، وہ ان کی رہنمائی منزلِ مقصود کی طرف
کرے گا اور ان کا حال سنوار دے گا اور ان کو جنت میں داخل کرے گا، جس کی ان
کو شناخت کرا دی ہے۔ ۴-۶

اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے
قدم اچھی طرح جمائے گا۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو ان کے لیے ہلاکی ہے اور اللہ
نے ان کے اعمال رائگاں کر دیے۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے اس چیز کو برا جانا
جو اللہ نے اتاری پس اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے۔ ۷-۹

کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہو چکا ہے ان لوگوں کا
جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ نے ان کو پامال کر چھوڑا اور ان کافروں کے سامنے
بھی انھی کی مثالیں آنی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ اللہ اہلِ ایمان کا کارساز ہے اور

کافروں کا کارساز کوئی بھی نہیں۔ ۱۰-۱۱

بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسی طرح بہرہ مند ہو رہے اور کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں۔ دوزخ ان کا ٹھکانا ہے۔ ۱۲

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو قوت میں تمھاری اس بستی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں جس نے تم کو نکالا ہے۔ ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا پس کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ بن سکا۔ ۱۳

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہیں ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی بدعملی ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے! اس جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں نہریں ہوں گی پانی کی جس میں ذرا بھی تغیّر نہ ہوا ہوگا، اور نہریں ہوں گی دودھ کی جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہوگا اور نہریں ہوں گی شراب کی جو پینے والوں کے لیے یکسر لذت ہوں گی اور نہریں ہوں گی صاف شفاف شہد کی اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے پھل بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت بھی! کیا یہ لوگ جن کو یہ نعمتیں حاصل ہوں ان لوگوں کے مانند ہوں گے جو ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں اور جن کو اس میں گرم پانی پلایا جائے گا پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر کے رکھ دے گا۔ ۱۴-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۱)

کفار قریش کو وعید

سورۂ احقاف کفار کے لیے جس تہدید و وعید پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے یہ سورہ بلا کسی تمہید کے، اس طرح شروع ہو گئی ہے گویا اسی تہدید و وعید کا یہ عملی ظہور ہے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکا اللہ نے ان کی تمام کوششیں رائگاں کر دیں۔ یہ اشارہ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ کی طرف ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ فتح کی آیت ۲۵ کے تحت آئے گی۔ 'اعمال' سے مراد ان کی وہ سرگرمیاں ہیں جو انھوں نے اللہ کے بندوں کو ایمان اور عمل صالح کی راہ سے روکنے کے لیے صرف کیں۔ لفظ 'اضلال' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں سورۂ فیل میں لفظ 'تضلیل' استعمال ہوا ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ' (الفیل: ۲) (کیا ان کی ساری چال اللہ نے نابود نہ کر دی؟) یہ مضمون اسی سورہ کی آیات ۴، ۳۲ اور ۳۳ میں بھی آئے گا۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہ وعید اگرچہ ہے تو مستقبل سے متعلق اس لیے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت قریش ابھی مکہ پر مسلط تھے لیکن اس کا بیان ماضی کے صیغہ سے ہوا ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جو بات اللہ تعالیٰ کے ہاں قطعی طور پر طے ہو گئی اور جس کا ظہور لازمی ہے وہ گویا واقع ہو چکی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ اس قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے وعدے اور اس کی وعیدیں قرآن میں ماضی کے صیغوں سے بھی بیان ہوئی ہیں۔ یہ اسلوب ہر زبان میں معروف ہے اور اس کے فوائد بالکل واضح ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۲)

اہل ایمان کے لیے بشارت

اوپر کی آیت میں کفار کے لیے جس درجے کی تہدید و وعید ہے اس آیت میں، اسی اسلوب بیان میں، اہل ایمان کے لیے، دنیا اور آخرت دونوں میں، فیروز مندی کی بشارت ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح بھی کیے، ان کے گناہ اللہ تعالیٰ نے دور فرما دیے اور ان کے تمام احوال بالکل درست کر دیے۔

بشارت بھی ماضی کے اسلوب میں

جس طرح کفار کے لیے تہدید قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے اسی طرح اہل ایمان کے لیے بشارت بھی ماضی کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے۔

اس آیت میں 'وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ' کے الفاظ خاص

طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیے ان کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ اس چیز پر ایمان لائے جو محمدؐ پر اتاری گئی ہے، پھر مزید تصریح یہ ہے کہ اب خدا کی طرف سے حق یہی ہے۔ اس تصریح کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس دور میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی پیدا ہو گیا تھا جو کفر اور اسلام دونوں کے درمیان سمجھوتے کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کا اپنی انفرادیت پر اصرار ٹھیک نہیں ہے بلکہ کچھ گنجائش دوسروں کے لیے بھی تسلیم کرنی چاہیے۔ اہل کتاب کے اندر بھی ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو کہتا تھا کہ مومن تو ہم بھی ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہیں لائے۔ اس قسم کے باطل رجحانات کی بیخ کنی قرآن نے پچھلی سورتوں میں بھی کی ہے۔ یہاں بھی مذکورہ بالا تصریح نے اسی رجحان پر ضرب لگائی ہے کہ اب ایمان و ہدایت کا واحد راستہ وہی ہے جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، اس سے ہٹ کر کوئی راہ نہیں ہے۔

'وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ' لفظ 'بال' ایک جامع لفظ ہے۔ یہ ظاہر و باطن دونوں قسم کے احوال پر حاوی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن اور دنیا و آخرت دونوں کے تمام احوال درست کر دے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۳)

قوت صرف حق کے اندر ہے

یہ وجہ بتائی ہے اس بات کی کہ کیوں کفار کی تمام مساعی رائگاں ہوں گی اور کیوں اہل ایمان اپنی کوششوں میں سرخ رو اور فائز المرام ہوں گے۔ فرمایا کہ ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ کفار نے شیطان کے سکھائے ہوئے باطل کی پیروی کی ہے اور اہل ایمان نے اس حق کی پیروی کی ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ باطل کے لیے ان کی عقل اور اس کی فطرت کے اندر کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی مثال خودرو جھاڑی کی ہے جو کسان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کی زمین میں اگ پڑتی ہے۔ اگر وہ اکھاڑی نہ جائے تو زمین میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور اگر اکھاڑ دی جائے تو وہ بالکل بے ثبات ہوتی ہے۔ چنانچہ اب جب کہ اہل حق اس باطل سے نبرد آزمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو اس کا مٹ جانا یقینی ہے۔ 'جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا' (بنی اسرائیل: ۸۱) (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

اس کے برعکس اہل ایمان نے اس حق کی پیروی کی ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ حق کی فطرت میں ثبات و استحکام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق حق ہے اور اس نے یہ دنیا 'بالحق' پیدا کی ہے۔ اس کا اصلی مزاج باطل کی پرورش نہیں بلکہ حق کی پرورش ہے۔

اب جب کہ حق آگیا ہے تو اس باطل کو لازماً ٹھکرا دے گی جو اکاس بیل کی طرح اس پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلی زور و قوت اسباب و وسائل کے اندر نہیں بلکہ حق کے اندر ہے۔ اگر کشمکش باطل اور باطل کے درمیان ہی برپا ہو تب تو فیصلہ کی میزان اسباب و وسائل کے ہاتھ ہی میں ہوتی ہے لیکن کشمکش اگر حق اور باطل کے درمیان ہو تو اصلی فیصلہ کن اہمیت حق کو حاصل ہو گی، اسباب و وسائل کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔

'کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمۡثَالَهُمۡ' مومنین اور کفار کا یہ انجام جو بیان ہوا ہے اس کی نوعیت چونکہ اس مرحلہ میں ابھی ایک پیشین گوئی ہی کی تھی، اس نے واقعہ کی شکل نہیں اختیار کی تھی اس وجہ سے اس کو مثال بیان کرنے سے تعبیر فرمایا۔ 'لِلنَّاس' سے مراد یہی اہل ایمان اور کفار ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کے انجام کی یہ تمثیل بیان فرما دی ہے اور اس کی حقیقت عنقریب سب کے سامنے آکے رہے گی۔

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا ۚ۟ۛ ذٰلِکَ ؕۛ وَ لَوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانۡتَصَرَ مِنۡهُمۡ ۙ وَ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَا۠ بَعۡضَکُمۡ بِبَعۡضٍ ؕ وَ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَلَنۡ یُّضِلَّ اَعۡمَالَهُمۡ (۴)

کفار کے اندر ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے

یہ مسلمانوں کو ابھارا ہے کہ کفار حق کے سہارے سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے اندر ریڑھ کی ہڈی گویا نہیں ہے تو جب جنگ میں ان سے مقابلہ ہو تو بے دریغ ان کی گردنیں مارو، اللہ نے ان کو تمہارے لیے شکار اور تمہاری تلواروں کے لیے ایک لقمۂ تر بنا دیا ہے۔ یہی بات سورۂ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے۔ 'فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَ اضۡرِبُوۡا مِنۡهُمۡ کُلَّ بَنَانٍ' (الانفال: ۱۲) (پس ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور اور جوڑ جوڑ پر مارو)۔

'حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ'۔ 'اِثۡخَان' کے معنی ہیں اچھی طرح خون ریزی کرنا اور 'وَثَاق' بندھن کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اچھی طرح خون ریزی کر کے ان کے کس بل نکال چکو تو جو بچ رہیں ان کو اچھی طرح بندھنوں میں باندھ لو۔ یہ تمہارے سامنے چوں نہیں کر سکیں گے۔

'فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا' یعنی اس کے بعد اگر یہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹیں تو صرف دو ہی شکلوں سے چھوٹیں۔ یا تو تمہارے احسان کا قلادہ اپنی گردن میں لے کر یا فدیہ دے کر۔ اور تمہارا یہی معاملہ اس وقت تک ان کے ساتھ رہے جب تک ان کے اندر جنگ کا حوصلہ بالکل سرد نہ پڑ جائے اور یہ تمہارے آگے ڈگ نہ ڈال دیں۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں فرمائی گئی: 'وَ قٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ' (الانفال: ۳۹) (اور ان سے جنگ

جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے)۔

بنو اسمٰعیل کے معاملے کی خاص نوعیت

یہ امر واضح رہے کہ جہاں تک مشرکین عرب یا بالفاظِ دیگر مشرکین بنی اسماعیل کا تعلق ہے ان پر اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ایک رسول بھیج کر ان پر حجت تمام کر دی اس وجہ سے دوسرے غیر مسلموں کی طرح ان کے لیے یہ رعایت نہیں تھی کہ وہ اسلامی حکومت کے اندر ذمّی یا معاہدین کر رہ سکیں یا ان کو غلام بنایا جا سکے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راستے تھے یا اسلام قبول کریں یا تلوار۔ اس کے وجوہ کی تفصیل سورۂ براءت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ کسی مسلمان قیدی کے فدیہ میں یا نقد و جنس کی شکل میں فدیہ لے کر یا احساناً ان کے کسی قیدی کو چھوڑا بھی جا سکتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی اپنے رویہ پر غور کرنے کے لیے امان کا طالب ہو تو اس کو امان بھی دی جا سکتی تھی لیکن بحیثیت جماعت ان کے ساتھ جنگ کی حالت اس وقت تک باقی رہنی تھی جب تک سرزمینِ حرم کفر و شرک کے ہر شائبہ سے پاک نہ ہو جائے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے اندر جو اختلافات ہیں وہ بڑی الجھن میں ڈالنے والے ہیں۔ اس کی وضاحت سورۂ براءت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں معاملہ زیرِ بحث مشرکین بنی اسماعیل کا ہے، دوسرے غیر مسلموں کے مسئلہ پر یہاں بحث نہیں ہوئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ جو یہ فرماتے ہیں کہ مشرکین کے قیدیوں کے باب میں احسان اور فدیہ کی اجازت منسوخ ہو گئی، وہ صرف قتل کیے جا سکتے ہیں یا غلام بنائے جا سکتے ہیں تو اس کا اتنا حصہ صحیح ہے کہ مشرکین عرب کے ساتھ یہ رعایت مؤقت تھی جو بالآخر فتح مکہ کے بعد ختم ہو گئی لیکن ان کا یہ فرمانا کہ وہ غلام بنائے جا سکتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ مشرکین عرب نہ غلام بنائے جا سکتے تھے نہ ذمّی نہ معاہد۔

امام شافعیؒ کے نزدیک امام کو اختیار ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر، اس قسم کے قیدیوں کے ساتھ چار باتوں میں سے جو بات بھی مناسب خیال کرے، کر سکتا ہے۔ چاہے قتل کرا دے، چاہے غلام بنا لے، چاہے فدیہ لے کر چھوڑ دے، چاہے احساناً چھوڑ دے۔ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کی یہ رائے عام غیر مسلم قیدیوں کے حد تک تو صحیح ہے لیکن مشرکین عرب کے باب میں یہ کلیہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ذمّی یا غلام نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ یہاں اس مسئلہ کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ تفصیل کے طالب ہماری کتاب "اسلامی ریاست" میں باب "اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق" کا مطالعہ کریں۔

'ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ'۔ 'ذٰلِكَ' ایک جملہ کا قائم مقام ہے۔ اس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ یہ کام ہے جو تمہارے کرنے کا ہے۔ یا یہ کام ہے جس کے لیے کمرِ ہمت باندھو یا یہ کام ہے جس کے لیے تمہیں ہدایت کی جاتی ہے۔ اس قسم کے اجمال کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر تفصیل بھی سما جاتی ہے اور جملہ کے اندر زور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

جہاد کی مصلحت

'وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ ...... الآیۃ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں ان سے جنگ کا حکم جو دے رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان سے نمٹنے کے لیے تمھارا یا کسی کا محتاج ہے۔ وہ چاہتا تو خود ہی کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج کر ان کو ٹھکانے لگا دیتا۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے چشم زدن میں اپنے کسی عذاب سے تباہ کر دیا۔ اسی طرح اللہ ان کو بھی تباہ کر دیتا لیکن اس نے تمھیں ان سے جنگ کا حکم اس لیے دیا کہ اس طرح تمھارا اور ان کا دونوں کا امتحان ہو۔ وہ اپنے باطل کی حمایت کے لیے جو جوش و جذبہ رکھتے ہیں وہ بھی سامنے آ جائے اور تم اپنے حق کے لیے جو جذبۂ فدویت و وفاداری رکھتے ہو وہ بھی بالکل ظاہر ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تمھارے اندر کتنے ہیں جو راستباز و وفا شعار ہیں اور کتنے ہیں جو محض منافقانہ اپنے مفادات کے لیے تمھاری صفوں میں آ گھسے ہیں۔

ایک سنت الٰہی

یہاں اس سنتِ الٰہی پر بھی نگاہ رہے کہ رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یوں رہا ہے کہ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوئی ہے تو رسول اور اس کے ساتھیوں کو ہجرت کا حکم ہوا ہے اور اس کے تمام مکذبین کو اللہ نے کسی ارضی یا سماوی عذاب سے تباہ کر دیا ہے اور اگر رسول کے ساتھیوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوئی ہے تو ان کو جہاد کا حکم ہوا ہے اور ان کے ہاتھوں اللہ نے ان کے دشمنوں سے انتقام لیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ آپ سے پہلے بھی نبیوں اور رسولوں کو جہاد کرنا پڑا ہے۔ فرعون کے مقابل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی مدد اللہ تعالیٰ نے سمندر کے طوفان سے کی۔ پھر دریا پار کرنے کے بعد ان کو متعدد چھوٹی بڑی جنگیں خود لڑنی پڑیں جن میں بنی اسرائیل کا اچھی طرح امتحان ہو گیا۔ وہ بیشتر امتحانوں میں ناکام رہے جس کی ان کو سزا بھگتنی پڑی۔

منافقین کے ایک گمان کی تردید

'وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ'۔ یعنی اس جہاد میں جو لوگ شہید ہوں گے وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی رائگاں نہیں کرے گا بلکہ اس قربانی کا بھرپور صلہ ان کو دے گا۔ 'فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ' کے الفاظ ان منافقین کے خیال کو سامنے رکھ کر ارشاد ہوئے ہیں جن کا ذکر تفصیل سے آگے آ رہا ہے۔ یہ لوگ چونکہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے اس وجہ سے ہر وہ قربانی ان کے نزدیک خسارہ کے حکم میں تھی جس کا نفع ان کو نقد نقد حاصل نہ ہو جائے۔ یہ الفاظ انہی کے خیال پر ضرب لگانے کے لیے ارشاد ہوئے ہیں۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے باب میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ زندہ ہیں، وہ بھی اسی قسم کے لوگوں کی تردید میں ہے۔

'وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا' میں مستقبل کی جگہ ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ یہ بشارت ان لوگوں

پر بھی حاوی ہو جائے جو راہ حق میں اس سے پہلے قتل ہوئے۔

سَیَھْدِیْھِمْ وَیُصْلِحُ بَالَھُمْ ۝ وَیُدْخِلُھُمُ الْجَنَّۃَ عَرَّفَھَا لَھُمْ (۵-۶)

اوپر والی آیت میں جو بات فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَھُمْ کے منفی اسلوب میں فرمائی گئی ہے وہی بات یہ مثبت اسلوب میں ارشاد ہوئی تاکہ بات پوری طرح واضح اور مؤکد ہو جائے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو راہ یاب کرے گا اور ان کے جملہ حالات سنوار دے گا۔ ہدایت یاب کرنے سے مقصود یہاں منزلِ مقصود کی ہدایت ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی آخری منزل ـــــ جنّت ـــــ سے ان کو ہمکنار کرے گا۔ لفظ 'ہدایت' قرآن میں جگہ جگہ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں، آگے بھی آئیں گی۔ یُصْلِحُ بَالَھُمْ کے اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو اہلِ جنت کی سرفرازی و فیروزمندی سے متعلق قرآن میں مذکور ہوئی ہے بلکہ اس اجمال کے اندر ایک نہایت لطیف اشارہ ان فیروزمندیوں کی طرف بھی ہے جن کا ذکر فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (السجدۃ: ۱۷) کے الفاظ سے ہوا ہے۔

جنت کا وعدہ کوئی مبہم وعدہ نہیں ہے

وَیُدْخِلُھُمُ الْجَنَّۃَ۔ یہ اسی ہدایت کی تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرے گا۔ اس جنت کے باب میں فرمایا کہ عَرَّفَھَا لَھُمْ اللہ نے اچھی طرح اس کی شناخت کرا دی ہے۔ اس تصریح کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جنت کا یہ وعدہ ایک مجمل و مبہم وعدہ ہے، کچھ نہیں معلوم کہ اس اسم کا مسمّٰی کیا ہے! اگر کوئی معاہدہ مبہم ہو، اس کی تفصیلات واضح نہ ہوں تو کمزور فریق برابر اندیشہ میں رہتا ہے کہ معلوم نہیں وقت پر اس کی کیا تفسیر و تاویل سامنے آئے۔ جنت کے وعدے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں، کو اس قسم کے اندیشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ کیا ہے کہ اس کی ساری تفصیلات سے ان کو قرآن میں آگاہ کر دیا ہے اور جو باتیں تعبیر و بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ بندوں کو پورا اطمینان رہے کہ جس چیز کے عوض میں انھوں نے اپنی جانیں اپنے رب کے حوالہ کی ہیں وہ کوئی مبہم شے نہیں ہے بلکہ اس کی ساری تفصیلات طے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان میں سے ہر بات کے پورا کرنے کا ذمہ لیا ہے بلکہ ان پر مزید اضافوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ جنت کی یہ تعریف یوں تو پورے قرآن ہی میں بیان ہوئی ہے لیکن خاص طور پر اس سورہ میں بھی اس کی تفصیل مذکور ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۱۵۔ یہ امر واضح رہے کہ عَرَّفَھَا لَھُمْ کے الفاظ یہاں 'جنت' کی صفت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔ ایسا ہوتا تو لفظ 'جنت' کو نکرہ آنا تھا بلکہ ان کی حیثیت مستقل جملہ کی ہے اور اس کے مستقل جملہ ہونے ہی سے وہ مفہوم پیدا ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ۝ وَالَّذِیْنَ

كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۸-۹)

نصرتِ الٰہی کا ظہور کب ہوتا ہے

یہ مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ اگر تم عزم و حوصلہ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو آگے کا کام تمہارا رب سنبھال لے گا۔ وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدم اس طرح جمائے گا کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہ سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی راہ میں پہلا قدم وہ اٹھائیں۔ اگر انھوں نے یہ قدم اٹھا دیا تو اس کے بعد اس کی شانیں ظاہر ہوں گی۔ ان لوگوں کے لیے اس کی مدد نہیں نازل ہوتی جو گھروں میں بیٹھے بیٹھے اس کا انتظار کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے نازل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو میدان میں ڈال دیتے ہیں پھر اس کی نصرت کا انتظار کرتے ہیں۔

'وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ' یہ کفار کا حشر بتایا کہ ان کے لیے خدا کی پھٹکار ہے اور ان کے تمام اعمال برباد و رائگاں ہو کر رہیں گے۔ ان کو جو مہلت ملی وہ محض امتحان اور اتمام حجت کے لیے ملی۔ اب اگر تم ان سے نمٹنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو گے تو دیکھو گے کہ ان کی ساری کوششیں نابود ہو جائیں گی۔ 'تَعْسًا لَّهُمْ' لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اس کا استعمال اسی طرح معروف ہے۔

کفار کی نامرادی کا سبب

'ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ' یہ سبب بتایا ہے اس بات کا کہ کیوں یہ اس قدر بودے، بے ثبات اور خدا کی لعنت کے مستحق بن گئے ہیں؟ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اس چیز سے نفرت کی جو ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتاری اور اپنی بدعتوں اور ضلالتوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وہ اعمال بھی خدا نے رائگاں کر دیے جو انھوں نے دین کے کام سمجھ کر کیے۔ یہ ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو تھے تو نیکی کے لیکن ان کے شرک کے سبب سے وہ بالکل لاحاصل ہو کے رہ گئے۔ اس طرح کے کاموں میں سے بعض کا قرآن نے سورۂ براءت میں حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً حرم کا اہتمام و انتظام اور حجاج کی خدمت۔ مشرکین کو اپنی ان خدمات پر بڑا ناز تھا۔ لیکن یہ تمام دین داریاں خدا کی میزان میں بالکل بے وزن ثابت ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول صرف وہی اعمال ہوتے ہیں جو اس کے شرائط پر انجام دیے جائیں وہ کسی کی نیکی کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح بھی کوئی نیک عمل کر دیا جائے وہ ممنون ہو کر اس کو قبول کر لے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا (۱۰)

کفارِ قریش کی بے بصیرتی

یہ ان مشرکین کی کور چشمی اور بے بصیرتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ کیا یہ لوگ اپنے ملک میں اس مقصد سے چلے پھرے نہیں کہ ان قوموں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، اللہ نے ان کو بالکل پامال

کر دیا! آیت کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ چلے پھرے تو ہیں، اپنے تجارتی سفروں پر برابر نکلتے رہے ہیں لیکن ان بستیوں پر کبھی عبرت کی نگاہ انھوں نے نہیں ڈالی جو کسی زمانے میں عظیم قوموں کا مسکن تھیں لیکن اب وہ ویرانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں سنائی جا چکی ہیں۔

'وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا' فرمایا کہ کافروں کے لیے تو انہی کی مثالیں ہیں یعنی جب وہ اپنے کفر اور اپنی تکذیب کے نتیجہ میں اس انجام کو پہنچیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ (قریش) انہی کی روش اختیار کر کے اس سے کسی مختلف انجام سے دوچار ہوں۔ اللہ کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ اوپر آیت ۳ 'كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ' کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۱۱)

کفار کا کوئی کارساز نہیں

یعنی اس کائنات کا حقیقی کارساز و کارفرما تو اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اہل ایمان کے ساتھ ہے تو وہ کفار ان کے مقابل میں کیا وزن رکھتے ہیں جن کا کوئی کارساز نہیں۔ وہ جن کو اپنا کارساز سمجھے ہوئے ہیں وہ نہ تو اس دنیا میں ان کے کام آنے والے ہیں، نہ آخرت میں — اوپر آیت ۳ میں یہی مضمون ایک دوسرے اسلوب سے گزر چکا ہے۔ وہ بھی پیش نظر رہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۱۲)

یہ اہل ایمان کے اعمال کے مثمر اور کفار کے اعمال کے رائگاں ہونے کی مزید وضاحت اور اس شبہ کا جواب ہے کہ جب کفار کے اعمال کی کوئی حیثیت نہیں تو اس دنیا میں وہ کیوں دندناتے پھر رہے ہیں؟ فرمایا کہ اہل ایمان کو تو اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ رہے یہ کفار تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اس دنیا میں ان کو کھانے پینے کی جو مہلت ملی ہے یہ کوئی خوش انجام چیز نہیں ہے۔ ان کا کھانا پینا جانوروں کے مانند ہے۔ یہ عقل و خرد سے عاری اور ان حقوق کے شعور سے بالکل نابلد ہیں جو اللہ کی نعمتیں ان پر عائد کرتی ہیں اس وجہ سے یہ چند روز ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا لیں لیکن یہ ان کے لیے موجب وبال ہوں گی اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۱۳)

یعنی کسی کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ آج قریش کو بڑا زور و دبدبہ حاصل ہے، جب انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو مکہ سے نکال چھوڑا تو ایسے زور آور لوگوں کو کون زیر کر سکتا ہے! فرمایا کہ کتنی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ نے ان کو تباہ کر

دیا اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ بن سکا۔ یہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں سنائی جا چکی ہیں اور قریش کو جن کی شوکت و عظمت کا پورا اعتراف تھا۔ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ میں ان کی اس دنیوی جمعیت کی نصرت کی بھی نفی ہے جس پر ان کو بڑا ناز اور اعتماد تھا اور ان مزعومہ شرکاء کی نصرت کی بھی نفی ہے جن کو وہ خدا کے مقابل میں اپنی سپر سمجھے ہوئے تھے۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم (۱۴)

اہل ایمان کے حسن انجام پر عقل و فطرت کی گواہی

اوپر کی آیت میں ان کے دنیوی انجام کی طرف اشارہ تھا اور اس کی دلیل تاریخ کی مثالوں سے پیش کی گئی ہے۔ یہ ان کے اخروی انجام کی طرف اشارہ ہے اور اس پر انسان کی عقل و فطرت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ فرمایا کہ کیا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہیں اور اس کی روشنی میں وہ چلتے ہیں اور وہ لوگ جن کی نگاہوں میں ان کی بدعملی کھبا دی گئی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے اور اس کا بنانے والا نعوذ باللہ ایک کھلنڈرا ہے!

لفظ 'بَيِّنَةٍ' پر سورۂ یونس میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک حجت قاطع خود انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور اس کی مزید تائید اپنی وحی کی روشنی سے کی ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل کر انسان کے باطن کو، جیسا کہ سورۂ نور کی تفسیر میں وضاحت ہو چکی ہے، 'نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ' بنا دیتی ہے جس کی جگمگاہٹ لازماً اس کی ظاہری زندگی میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص اپنی فطرت کے چراغ کو گل کر دیتا ہے وہ وحی کے نور سے بھی محروم رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن دونوں ہی تاریک ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے ظاہر اور باطن دونوں میں اتنا عظیم تفاوت ہے وہ اپنے انجام کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں!

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اہلِ ایمان کے ذکر میں تو صرف ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے، ان کے ظاہر کا ذکر نہیں کیا ہے؛ اور اہلِ کفر کے ذکر میں ان کے ظاہر کا حوالہ دیا ہے، ان کے باطن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ تقابل کے اس اصول کی روشنی میں، جس کی مثالیں ہم دیتے آ رہے ہیں، اس خلا کو بھر لیجیے تب اس آیت کی بلاغت واضح ہو گی۔

آیت میں 'مَنْ' کے لیے ضمیریں اور فعل واحد اور جمع دونوں شکلوں میں استعمال ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واحد جمع، مذکر و مؤنث سب میں مشترک ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن

لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۱۵)

جنت کی تمثیل

یعنی جب دونوں گروہوں کا انجام یکساں ہونا عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے تو لازم ہے کہ جس نے پاکیزہ فطرت اور اللہ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی گزاری اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے نوازے اور جس نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی وہ اپنی ضلالت پسندی کی قرار واقعی سزا بھگتے۔ چنانچہ دونوں کا انجام بالکل مختلف ہوگا۔ اللہ نے اپنے متقی بندوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی تمثیل یہ ہے کہ اس میں بے آمیز خالص پانی کی نہریں ہوں گی، غیر متغیر دودھ کے چشمے ہوں گے، شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لیے ہر فساد و ضرر سے پاک، یکسر لذت ہی لذت ہوں گی، اسی طرح صاف شفاف شہد کی نہریں ہوں گی، مزید برآں ان کے لیے ہر قسم کے میوے بھی ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مستقل مغفرت کی بشارت بھی۔ برعکس اس کے دوسرے گروہ کے لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ان کی پہلی ہی ضیافت ایسے گرم پانی سے ہوگی جو ان کی انتڑیوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

نعمتوں کے بے آمیز ہونے کے پہلو پر ایک نظر

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے خالص اور بے آمیز ہونے کو خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نعمتیں جتنی بھی ہیں سب کا اصلی منبع جنت ہی ہے لیکن اس عالم ناسوت میں جب ہمیں وہ ملتی ہیں تو اتنے مراحل اور اتنے وسائل و وسائط سے گزر کر ملتی ہیں کہ ان کی حقیقت و ماہیت بھی بالکل بدل جاتی ہے اور ان کی شکل و صورت بھی بالکل مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سب سے زیادہ عام چیز پانی ہی کو لیجیے، یہ فضاؤں، بادلوں، ہواؤں دریاؤں، ندیوں، نالوں اور زمین کی تہوں کے کتنے مراحل طے کر کے ہم تک پہنچتا ہے! ظاہر ہے کہ ہر مرحلے کے اثرات سے یہ متاثر ہوتا ہے جس کے سبب سے اس کا وہ مزاج، جو اس کے اصل منبع یعنی جنت میں ہے، بالکل بدل جاتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس دودھ کو لیجیے۔ اس دنیا میں یہ جن راستوں سے گزر کر ہمیں ملتا ہے اس کے متعلق تو خود قرآن کا بیان ہے کہ وہ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ (النحل: ۶۶) یعنی گوبر اور خون کے درمیان سے ہو کر ہم تک پہنچتا ہے۔ غور کیجیے کہ جنت کی جو نعمت اس راستہ سے گزر کر ہم تک پہنچے گی وہ اپنی اصلی مزاجی خصوصیات پر کس طرح باقی رہ سکے گی۔ اس وجہ سے جنت کے دودھ اور شہد اور اس دنیا کے دودھ اور شہد میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق آسمان و زمین میں ہے۔ یہاں کی نعمتوں سے وہاں کی نعمتوں کا ایک مبہم سا تصور تو آپ کر سکتے ہیں اور یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی بھی اسی لیے ہیں کہ ہم ان مجازی نعمتوں سے ان حقیقی نعمتوں کا تصور کر سکیں لیکن دونوں میں نسبت بہر حال حقیقت و مجاز ہی کی ہے۔ اس نسبت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

خالص نعمتیں سلیم الفطرت لوگوں کے لیے خاص ہیں

آیت ۱۴ کے ساتھ اس آیت کے ربط پر اگر اچھی طرح تدبر کیجیے تو یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں، ان کی اصل شکل میں، اپنے ان بندوں کے لیے خاص کر رکھی ہیں جو اپنی فطرت کو جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا' (الروم: ۳۰) سے تعبیر فرمایا ہے، ہر قسم کے غلل و فساد سے محفوظ رکھیں گے اور قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوٹیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ کر کے اپنی خواہشوں کے غلام بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قلب سلیم کو گندگیوں سے آلودہ کر لیں گے تو ان کے لیے ان نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ انھوں نے جتنا فائدہ اٹھانا تھا اس دنیا میں اٹھا لیا۔ آخرت میں ان کے لیے وہ عذاب ہی ہے جو اپنی فطرت کو مسخ کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

آیت کا مدعا سمجھ لینے کے بعد ایک نظر الفاظ اور جملوں کے در و بست پر بھی ڈال لیجیے۔

'اٰسِنٍ' صفت کے طور پر اس پانی کے لیے آتا ہے جس کا رنگ اور ذائقہ تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ فاسد پانی سے جو فسادِ نظامِ جسم میں پیدا ہوتا ہے اس کا علاج کسی طبیب کے پاس نہیں ہے۔

دودھ سے متعلق فرمایا کہ 'لَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ' (اس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو گا)۔ اس سے مراد ذائقہ کی وہ تبدیلی ہے جو اس کے فساد سے نمایاں ہوتی ہے۔ دودھ فطری غذا کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اس کا فساد بھی ایک اہم فساد ہے۔

'خَمْرٌ' کی صفت 'لَذَّةٍ' میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے جس طرح 'زَیْدٌ عَدْلٌ' میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ یعنی وہ یکسر لذت ہی لذت ہو گی۔ پینے والے اس سے نہ کسی قسم کی تلخی، ناگواری یا خمار کا احساس کریں گے نہ وہ بدمستی اور گناہ کی محرک ہو گی۔

'عَسَلٍ' کے ساتھ 'مُّصَفًّی' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا میں جو شہد میسر آتا ہے وہ بہرحال مکھیوں ہی کے واسطہ سے میسر آتا ہے جو ان کے غل و غش سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جنت کا شہد اپنے اصل منبع سے نکلا ہوا ہو گا۔ اس پر کوئی مگس کی قے ہونے کی پھبتی چست نہ کر سکے گا۔

'وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ' کا ذکر آخر میں جنت کی سب سے بڑی نعمت کی حیثیت سے آیا ہے اس لیے کہ خدا کی مغفرت اور خوشنودی ہی ہے جو ان تمام نعمتوں کی ضامن بھی ہو گی اور اسی سے آگے کے مدارج کی راہیں بھی کھلیں گی۔

'کَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ' سے پہلے 'اَفَمَنْ کَانَ لَهٗ مِثْلُ هٰذِهِ الْجَنَّةِ' یا اس کے ہم معنی الفاظ برنبائے قرینہ محذوف ہیں۔ استفہامیہ اور شرطیہ جملوں میں اس قسم کا حذف معروف ہے۔ پیچھے اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'مَآءً حَمِیْمًا' کا ذکر اہل دوزخ کے لیے 'نُزُلٌ' یعنی اولین سامانِ ضیافت کی حیثیت سے آیا ہے

قرآن میں جگہ جگہ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اہل دوزخ کی پہلی ضیافت کھولتے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کے لیے ہر قسم کے عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

۲۔ آگے آیات ۱۶ ـــــ ۳۸ کا مضمون

آگے منافقین کے رویہ پر تبصرہ ہے اور یہی مضمون سورہ کے آخر تک چلا گیا ہے۔ منافقین کا ذکر یہاں بھی بعینہٖ اسی تقریب سے آیا ہے جس تقریب سے سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ انفال اور سورۂ براءت وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ جب مسلمانوں کو ایک عظیم مہم کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا گیا تو ضروری ہوا کہ ان کے اندر کے اس گروہ کو بے نقاب کر دیا جائے جو مارِ آستین بن کر چھپا ہوا تھا اور آگے کے مراحل میں جس کی کمزوریاں اور ریشہ دوانیاں مسلمانوں کے لیے خطرہ بن سکتی تھیں۔ یہ مضمون تین حصوں میں تقسیم ہے۔

پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو تمہاری بات سنتا تو ہے لیکن سمجھتا کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ تمہاری باتوں پر یقین کرنے کے لیے کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ رسول کی بعثت ان لوگوں کے لیے عذاب کا دیباچہ ہوتی ہے جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے بعد ان کی بزدلی سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ زبان سے تو یہ جہاد کے لیے بڑے ولولہ کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن اب جب کہ نہایت واضح الفاظ میں اس کا حکم دے دیا گیا تو خوف سے ان کے اوپر موت کی غشی طاری ہو رہی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت دین سے منہ موڑ چکے ہیں اور دشمنوں کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب آزمائشوں کے ذریعہ سے وہ ان کے دلوں کے کھوٹ اور نفاق کو ظاہر کر کے رہے گا۔

آخر میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو دہراتے ہوئے مسلمانوں کو بالعموم اور منافقین کو بالخصوص آگاہ فرمایا کہ ان لوگوں کا سہارا ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرو جن کی تباہی مقدر ہو چکی ہے۔ اب ان لوگوں کے ساتھ سمجھوتے کی راہیں سوچنے کی جگہ عزم و حوصلہ کے ساتھ دین کو سربلند کرنے کے لیے اٹھو۔ اللہ تم کو سرفرازی بخشے گا۔ اگر تم دنیا کی محبت میں پھنس کر اللہ سے منہ موڑ لوگے تو اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہیں۔ وہ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا جو تمہاری طرح بزدل اور منافق نہیں ہوں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۸

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا

لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا قف اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ
اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا
زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا
السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ج فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ج فَاَنّٰى لَهُمْ
اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع ۲ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ
سُوْرَةٌ ج فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ لا
رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ
الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ط فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ قف فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ قف فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا
لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ
تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ
وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ
اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا
تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى لا الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ
بَعْضِ الْاَمْرِ ج وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ

الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ
اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾
وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ
الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ
الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيُحْبِطُ
اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾
فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ
مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ
وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ
اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ
اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا

ع ۳ ۹ ۷

غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُم ﴿٣٨﴾ ع
۴
۱۰
۸

ترجمۂ آیات ۱۶ - ۳۸

اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھاری طرف کان تو لگاتے ہیں لیکن جب تمھارے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو علم والوں سے پوچھتے ہیں کہ ابھی انھوں نے کیا بات فرمائی! یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کی پرہیزگاری ان کو عطا فرمائی۔ ۱۶-۱۷

یہ لوگ تو بس اسی بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر اچانک آ دھمکے۔ سو یاد رکھیں کہ اس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں تو جب وہ گھڑی آ ہی جائے گی تو ان کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں باقی رہے گا! تو جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں پس اپنی اور باایمان مردوں اور عورتوں کی خطاؤں کی معافی مانگتے رہو اور اللہ جانتا ہے تمھاری آمد و شد کی جگہوں اور تمھارے ٹھکانوں کو۔ ۱۸-۱۹

اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے تھے کہ کوئی سورہ (در باب جہاد) کیوں نہیں اتاری جاتی، پس جب اتاری گئی ایک واضح سورہ اور اس میں جنگ کا بھی ذکر ہوا تو جن کے دلوں میں روگ ہے ان کو تم دیکھتے ہو کہ وہ اس طرح تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہو۔ پس ان کے حال پر افسوس ہے! ان کے لیے پسندیدہ روش اطاعت اور قول معروف کی تھی پس جب معاملہ کا قطعی فیصلہ ہو جاتا تو اگر وہ اللہ سے راست باز ثابت ہوتے تو ان کے لیے یہ بات بہت بہتر ہوتی۔ پس اگر تم نے منہ پھیرا تو اس کے سوا تم سے کچھ متوقع نہیں کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے

رحمی روابط پر چھری چلاؤ۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پس ان کے کانوں کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں! بے شک جو لوگ، بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہو گئی، پیٹھ پیچھے پلٹ گئے شیطان نے ان کو فریب دیا اور اللہ نے ان کو ڈھیل دے دی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے ان لوگوں سے، جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کو برا جانا، کہا کہ بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کی بات مانیں گے۔ اور اللہ ان کی اس رازداری کو جانتا ہے۔ تو اس وقت کیا ہوگا جب فرشتے ان کے مونھوں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے ان کی روحیں قبض کریں گے! یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے پیروی کی اس چیز کی جو خدا کو غصہ دلانے والی تھی اور نفرت کی اس کی خوشنودی سے۔ پس اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے۔ ۲۰-۲۸

کیا ان لوگوں نے، جن کے دلوں میں روگ ہے، یہ گمان کر رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینوں کو کبھی بے نقاب نہیں کرے گا؟ اور اگر ہم چاہتے تو تمھیں ان کو دکھا دیتے پس تم ان کی علامتوں سے ان کو پہچان لیتے اور تم ان کے لہجہ کے تذبذب سے تو ان کو پہچان ہی لو گے! اور اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہی ہے۔ ۲۹-۳۰

اور ہم لازماً تمھیں آزمائیں گے تاکہ تم میں سے جو مجاہد اور ثابت قدم ہیں ان کو ممیز کر دیں اور تمھارے حالات کو جانچ لیں۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور ہدایت کے واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کی وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے سارے اعمال ڈھا دے گا۔ ۳۱-۳۲

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو

رائگاں نہ کرو۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا پھر اسی عالتِ کفر میں مر گئے، اللہ ان کو کبھی نہیں بخشے گا۔ تو تم کمزور نہ پڑو اور سمجھوتے کی دعوت نہ دو اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کے باب میں تمہارے ساتھ کوئی خیانت نہیں کرے گا۔ ۳۲ - ۳۵

یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور تمہارا مال سمیٹ کر تم سے نہیں مانگے گا۔ اور اگر وہ تم سے مانگے اور سمیٹ کر مانگے تو تم بخیلی کرو گے اور وہ تمہارے کینوں کو ظاہر کر دے گا۔ آگاہ! تم وہ لوگ ہو کہ تمھیں اللہ کی راہ میں خرچ کی دعوت دی جاتی ہے تو تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بخیلی کرتے ہیں۔ اور جو بخیلی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ وہ اپنے ہی سے بخیلی کرتا ہے، اللہ بالکل بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔ ۳۶ - ۳۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا خَرَجُوا۟ مِنْ عِندِكَ قَالُوا۟ لِلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْعِلْمَ مَاذَا قَالَ ءَانِفًا ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَٱتَّبَعُوٓا۟ أَهْوَآءَهُمْ (۱۶)

منافقین کے ایک گروہ کی طرف اشارہ

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں سے خبردار کیا ہے جو بظاہر تھے تو مسلمانوں کے ساتھ لیکن ان کی ہمدردیاں تمام تر اسلام کے مخالفین کے ساتھ تھیں۔ ان لوگوں سے خبردار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو جس مہم کے لیے تیار ہونے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس کو سب سے زیادہ نقصان اسی طرح کے لوگوں سے پہنچ سکتا تھا۔ فرمایا کہ انہی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تمہاری بات سننے کے لیے کان تو لگاتا ہے لیکن سنتا سمجھتا کچھ بھی نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ تمہارے پاس سے اٹھتے ہیں تو مجلس کے دوسرے اصحابِ علم سے پوچھتے ہیں کہ بھائی، ابھی ابھی انھوں

نے کیا فرمایا!

'مِنْهُمْ' کی ضمیر کا مرجع وہ گروہ ہے جس کا ذکر اوپر کَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یعنی ایک گروہ تو تمہارے پاس اپنی بیزاری کی شدت کے باعث پھٹکتا ہی نہیں اور انہی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تمہارے پاس آتا تو ہے لیکن سننے سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بالکل منافقانہ آتا ہے۔

'مَاذَا قَالَ اٰنِفًا' کے سوال سے ایک تاثر تو وہ لوگوں کو یہ دینا چاہتے کہ جہاں تک بات سننے کا تعلق ہے وہ تو ہم نے بھی سنی اور اس پر عمل کرنے کے لیے بھی ہم جی جان سے حاضر ہیں لیکن ابھی تو بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ فرمانا کیا چاہتے ہیں؟ اس طرح وہ اپنی منافقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے۔

دوسرا تاثر یہ دینا چاہتے کہ یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ بے سوچے سمجھے ان پر آمنّا و صدّقنا کہہ دیا جائے بلکہ ان پر اچھی طرح غور کرنے اور ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ گویا درپردہ وہ ان مسلمانوں کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہتے، اپنے اس فقرے سے دل شکنی کرتے کہ تم لوگ محض سادہ لوحی کے سبب سے ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتے ہو، ہم تو ان کی باتیں بہت توجہ سے سنتے ہیں لیکن ان کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ واضح رہے کہ یہ طریقہ کسی کی عمدہ سے عمدہ بات کو مشتبہ بنا دینے کے لیے ایک نہایت کارگر طریقہ ہے۔ اسی مقصد سے یہ منافقین بعض اوقات یہ بھی کرتے کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سناتے تو یہ مجلس سے اٹھنے کے بعد طنزیہ انداز میں یہ سوال کرتے کہ بھئی! بتاؤ اس سورہ سے کس کس کا ایمان تازہ ہوا ہے! سورۂ توبہ میں ان کی اس شرارت کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ	اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو ان میں
يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ	بعض یہ کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کس کا ایمان اس
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا	نے تازہ کیا ہے! تو جو ایمان لائے ان کے ایمان کو تو اس نے زیادہ
وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ	کیا اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں
مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا	روگ ہے تو اس نے ان کی ناپاکی پر مزید ناپاکی
وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبۃ: ۱۲۴-۱۲۵)	کا اضافہ کیا اور وہ کفر ہی کے حال میں مرے۔

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ'۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے۔ یہ اوپر کی آیت 'كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ' کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی بدعملی ان کی نگاہوں میں کھبا دی گئی ہے اور یہ اپنی خواہشوں کے پیرو بن گئے ہیں اس وجہ سے اب یہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح

کے لوگوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے آپ کو اس نورِ بصیرت سے محروم کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اس وجہ سے وہ وحی کے نور سے محروم ہی رہتے ہیں اور ان کی بدعملی کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (۱۷)

جنھوں نے اپنے نورِ فطرت کی حفاظت کی ان کے نور میں اضافہ ہوا

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ توبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے کہ جن کا نورِ فطرت بجھا نہیں تھا بلکہ انھوں نے اس کو محفوظ رکھا اللہ نے اپنے نبی کی صحبت سے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور ان کی استعداد اور طلب کے اعتبار سے ان کے تقویٰ میں برکت بخشی۔ رہے وہ لوگ جو اپنے اندر نفاق کی پرورش کرتے رہے تو ان سے وہ بھی چھین لیا گیا جو ان کو بخشا گیا تھا۔

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرَاهُمْ (۱۸)

جو عذاب کے منتظر ہیں ان کے لیے عذاب ہی ہے

یعنی اگر پیغمبر کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اب فیصلہ کی گھڑی ہی کے انتظار میں ہیں کہ وہ اچانک ہی ان کے سر پر آدھمکے۔ 'السَّاعَة' سے مراد قیامت بھی ہو سکتی ہے اور وہ فیصلہ کن عذاب بھی جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم پر آجاتا ہے۔ اللہ کے رسول ان دونوں ہی عذابوں سے اپنی اپنی قوموں کو آگاہ کرتے رہے ہیں اور ان دونوں میں نسبت مقدمہ اور تتمہ کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان لوگوں پر اپنا کرم فرمایا کہ خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے اپنا رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی تاکہ جب وہ فیصلہ کی گھڑی آئے تو وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ان کے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ جان کر انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ انجان بن رہے ہیں تو بنیں اللہ تو اپنا رسول آخری اتمامِ حجت کے لیے بھیجتا ہے۔ اگر اس کی تذکیر سے بھی ان کے کان نہ کھلے تو اب آخری چیز عذاب اور قیامت ہی ہے۔ اب یہ اسی سے دوچار ہوں گے اور جب یہ پیشگی آگاہی کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچانک ہی ان پر آجائے۔

عذاب کی علامتیں

'فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا' یعنی عذاب کی گھڑی کا انتظار رہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی علامتیں اب نمایاں ہو چکی ہیں۔ یہ اشارہ اس سنتِ الٰہی کی طرف ہے جس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں تفصیل سے ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ کن عذاب اس وقت تک کسی قوم پر نہیں بھیجتا جب تک اس کی مرکزی بستی میں اپنا رسول نہ بھیج لے۔ یہ چیز واقع ہو چکی اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھ رہا ہے کہ قوم کے لوگ رسول کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ اب تک قوم نے جو کچھ کیا ہے وہ مقتضی تو عذاب ہی کا ہے لیکن اللہ تعالیٰ مزید مہلت دے رہا ہے کہ جس کو سنبھلنا ہو وہ چاہے تو اب بھی سنبھل جائے۔

اگر لوگ اب بھی نہ سنبھلے تو خدا کا قانون ظاہر ہو کے رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو الگ کر لے گا اور ان لوگوں کو تباہ کر دے گا جو سرکشی اور فساد میں اڑے رہ جائیں گے۔ اس انجام کے آثار آفاق اور انفس دونوں میں نمایاں ہو رہے ہیں اور آگے یہ مزید نمایاں ہوں گے۔ یہاں تک کہ ایمان لانے والوں اور کفر کرنے والوں کی عدالت اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کر دے گا اور یہ عدالت تمہید اور توطیہ ہوگی اس عدالتِ کبریٰ کی جو اس کے بعد آخرت میں قائم ہوگی۔ آخری رسول کی بعثت اور اس کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اب آگے اسی کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں حضورؐ نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ جس طرح ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اسی طرح میری بعثت اور قیامت کے مابین بھی کوئی فاصل نہیں ہے۔

'فَاَنّٰی لَھُمْ اِذَا جَآءَتْھُمْ ذِکْرٰىھُمْ'۔ 'جَآءَتْ' کا فاعل 'اَلسَّاعَۃُ' ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ رسول پر ایمان لانے کے لیے فیصلہ کی گھڑی کے منتظر ہیں تو خواہ وہ فیصلہ کن عذاب کی شکل میں ظاہر ہو یا قیامت کی صورت میں، اس وقت ان کے لیے یاددہانی اور نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں باقی رہے گا! اس تذکیر سے فائدہ اٹھانے کا موقع تو اسی وقت تک ہے جب تک وہ پردے میں ہے۔ اس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد تو کسی کے ایمان کی قیمت دو کوڑی کے برابر بھی نہ ہوگی۔

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰىکُمْ (۱۹)

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اب فیصلہ کی گھڑی قریب آ لگی ہے تو تم اس بات کو اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو لوگ اپنے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے بل پر اس سے نچنت ہیں ان کو اس وقت اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ خدا کے مقابل میں کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔

عذاب سے بچنے کے لیے تیاری کی ہدایت

'وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ'۔ یہ اس وقت کی آفات سے محفوظ رہنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تیاری کی ہدایت ہے کہ جو لوگ اس سے نچنت ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تم اپنی کوتاہیوں اور مومنین و مومنات کی کوتاہیوں کی اپنے رب سے معافی مانگتے رہو۔

یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے وکیل اور شفیع کی حیثیت سے ہے۔ اللہ کا رسول اپنے تمام ساتھیوں کا، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے برابر اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی استغفار کرتا رہتا ہے۔ اس عمل کو مزید اہتمام و سرگرمی کے ساتھ جاری رکھنے کی یہ ہدایت ہوئی تاکہ فیصلہ کی گھڑی جب ظاہر ہو تو اہل ایمان اس کی آفتوں سے محفوظ رہیں۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنب کی نسبت اول تو، جیساکہ ہم نے اشارہ کیا، امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ براہِ راست اس کے ذمہ دار کی حیثیت سے۔ پھر انبیاء علیہم السلام سے جو خطائیں صادر ہوتی ہیں وہ اتباعِ ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتیں بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ اتباعِ حق میں اس کے متعیّن حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس قسم کا تجاوز بجائے خود کوئی معصیت نہیں ہے لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السلام چونکہ حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت اور ان کی اصلاح فرماتا رہتا ہے۔

پیغمبر اور مسلمانوں کو حفاظت کی ضمانت

'وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰىکُمْ'۔ 'مُتَقَلَّب'، مصدری معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور ظرف کے مفہوم میں بھی۔ ہم نے لفظ 'مَثْوٰی' کی رعایت سے اس کو ظرف کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی آمد و شد کی جگہ۔

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے کہ اگر تم برابر اپنے رب سے استغفار کرتے رہے تو جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تعالیٰ تم کو اپنی حفاظت میں رکھے گا۔ وہ تمہاری آمد و شد کی جگہوں اور تمہارے ٹھکانوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم عذاب کی زد میں آجاؤ۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَۃٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ وَّذُکِرَ فِیْہَا الْقِتَالُ ۙ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰی لَہُمْ (۲۰)

منافقین کا جہاد سے فرار

یہ انہیں منافقین کے اس رویے کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے جہاد کا حکم بالفاظ صریح (مذکورہ آیت نمبر ۴) سننے کے بعد اختیار کیا۔ فرمایا کہ پہلے تو یہ لوگ مسلمانوں پر اپنے دعوائے ایمان کی دھونس جمائے رکھنے کے لیے آگے بڑھ بڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ جہاد کے باب میں کوئی واضح حکم نازل نہیں ہوتا لیکن جب ایک سورہ نازل کر دی جاتی ہے اور اس میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں جہاد کا ذکر آتا ہے تو جن کے دلوں میں نفاق اور حسد کا روگ ہے وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح وہ شخص دیکھتا ہے جس پر سکراتِ موت کی غشی طاری ہو۔

'یَقُوْلُ' سے پہلے ہمارے نزدیک عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے یعنی یہ مدعیانِ ایمان کہتے تھے۔

'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' میں فعل دعوائے فعل کے مفہوم میں ہے اور فعل کا اطلاق دعوائے فعل پر عربی میں معروف ہے۔ مثلاً 'یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ' (النساء: ۱۳۶)

(اے وہ لوگو! جنھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا، اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان لاؤ)۔

'وَلَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ' کے بعد 'فِي الْجِهَادِ' یا 'فِي الْقِتَالِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ قرآن میں یہ اسلوب بھی معروف ہے کہ اگر ایک چیز کی تفصیل آگے آ رہی ہو تو پہلے اس کا ذکر اجمال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۳۶ میں بھی اس کی مثال آ رہی ہے۔ لوگوں کے سوالات نقل کرنے میں بھی اجمال کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ 'يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ' (البقرۃ ۱۸۹) کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو یہ لوگ بہت بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر رہے تھے کہ صریح الفاظ میں کفار کے خلاف جہاد کا حکم کیوں نہیں نازل ہوتا لیکن اب جبکہ جہاد کا حکم دے دیا گیا اور بالکل قطعی الفاظ میں دے دیا گیا تو یہ مدعیانِ ایمان چھپتے پھرتے ہیں۔

لفظ 'سُوْرَةٌ' لفظ 'کِتَابٌ' کی طرح قرآن کی کسی سورہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے اور اس کے کسی اہم حکم کے لیے بھی۔ یہاں دونوں معانی بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'مُّحْكَمَةٌ' کی صفت اس کی قطعیت اور مستغنی عن التاویل ہونے کو ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی اس میں نہ کسی قسم کا اجمال و ابہام ہے کہ وہ تعبیر و تاویل کا محتاج ہو، نہ وہ متشابہات کی قسم کی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اس کی تاویل معلوم نہ ہو۔

'رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'۔ 'مَرَضٌ' سے مراد نفاق بھی ہے اور وہ کینہ و حسد بھی جو ان منافقین کے اندر اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھا۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۲۹ اور ۳۰ کے تحت اس کی وضاحت آ رہی ہے۔ البقرۃ کی تفسیر میں اس کی تحقیق بیان ہو چکی ہے۔

یہاں ان منافقین کی جو تصویر پیش کی گئی ہے یہی تصویر ان کی سورۂ نساء میں بھی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا	تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا
اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ	تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ جنگ سے روکے رکھو اور نماز کا
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ	اہتمام کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو تو جب ان پر جنگ واجب
الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ	کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ کا حال یہ ہے کہ وہ
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ	لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا
خَشْيَةً ۚ (النساء: ۷۷)	چاہیے بلکہ کچھ اس سے بھی سوا۔

یعنی جب تک جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا اس وقت تک تو اللہ و رسول کے ساتھ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے جہاد کا بڑا ولولہ ظاہر کرتے تھے لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو اللہ سے زیادہ ان کے اندر آدمیوں کا ڈر سمایا ہوا ہے اور چھپتے پھرتے ہیں۔

'فَاَوْلٰى لَهُمْ' لعنت اور اظہارِ نفرت کا کلمہ ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو 'وَيْلٌ لَّهُمْ' کا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دعوے کے ساتھ جب انھوں نے اپنے اندر اس نفاق اور بزدلی کی پرورش کی ہے تو ان پر خدا کی پھٹکار ہو!

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱)

ایمان کا صحیح تقاضا

یعنی ان کے لیے صحیح روش تو یہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس حکم جہاد کا 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے قولِ معروف سے خیر مقدم کرتے۔ پھر جب جہاد کا فیصلہ ہو جاتا تو اپنے عمل سے ثابت کر دیتے کہ انھوں نے اپنے رب سے جو عہد باندھا اس میں سچے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ روش ان کے لیے بہتر ہوتی لیکن انھوں نے اپنے لیے ہلاکت کی راہ اختیار کی۔

'طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ' مبتداء کے محل میں ہے اور خبر یہاں برنبائے قرینہ و بتقاضائے بلاغت محذوف ہے۔ ہم جگہ جگہ عربیت کے اس اسلوب کا حوالہ دیتے آ رہے ہیں کہ جب مخاطب کی توجہ پوری طرح مبتدا پر مرکوز کرانی ہو تو خبر کو حذف کر دیتے ہیں۔ 'قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ' سے مراد 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا کلمہ ہے۔ اللہ و رسول کے معاملے میں یہی کلمہ دستور اور اہلِ ایمان کی روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ کے مخلص اور وفادار بندوں نے ہمیشہ اسی کلمہ سے اللہ اور اس کے رسولوں کی ہر بات کا خیر مقدم کیا۔ یہی بات اِن کے شایانِ شان بھی تھی جب کہ انھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا تھا لیکن ان کا حال یہ ہوا کہ جہاد کا ذکر سنتے ہی ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی۔

'فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ'۔ 'عَزَمَ الْاَمْرُ' کے معنی ہیں معاملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کے لیے اقدام کا تہیہ ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے شایانِ شان بات تو یہ تھی کہ جہاد کا ذکر سن کر 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے معروف قول سے اس کا خیر مقدم کرتے پھر جب اللہ و رسول کی طرف سے اس کا حتمی اور آخری فیصلہ ہو جاتا تو اپنے عمل سے اس قول کی صداقت کا ثبوت دیتے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس سورہ کی آیت ۴ میں جو حکم دیا گیا ہے اس کی نوعیت حکم جہاد کی نہیں بلکہ جہاد کے لیے تیار رہنے کی ہدایت اور اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ عملی اقدام کی نوبت اس کے بعد آئی۔

'فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ' یعنی اب تک تو اللہ کے رسول کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی نوعیت محض دعوے کی ہے۔ اس دعوے کی صداقت کے امتحان کا مرحلہ تو اب آیا تھا۔ اس مرحلے میں اگر یہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے کہ یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو یہ چیز ان کے لیے بہت بڑے خیر کا دروازہ کھولتی لیکن انھوں نے یہ راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے لیے بزدلی کی راہ پسند کی۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوٓا أَرْحَامَكُمْ (۲۲)

منافقین کو نصیحت

اوپر کی آیات میں ان منافقین کے رویّہ پر جو تبصرہ ہوا ہے وہ تمام تر غائب کے اسلوب میں ہے لیکن اس آیت میں ان سے براہِ راست خطاب ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی اس موعظت کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ہے جو اس میں ان کو کی گئی ہے۔ فرمایا کہ اگر تم نے اس دعوت سے اعراض کیا تو اس سے تم اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو کوئی نفع نہ پہنچاؤ گے۔ بس یہی کرو گے کہ دورِ جاہلیت میں جس فساد فی الارض اور جس قطع رحم و برادرکشی میں مبتلا رہے ہو اسی میں پھر مبتلا ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اسی چیز کے خواہاں ہو تب تو تم آزاد ہو کہ جو راہ چاہو اختیار کرو اور اس کا انجام دیکھو لیکن اگر فساد کی جگہ حقیقی امن و عدل مطلوب ہے اور باہمی تعلقات کو اخوّت و مودّت کی صحیح بنیاد پر استوار دیکھنے کے خواہاں ہو تو واحد راہ اس کی یہی ہے کہ اس دین کو مستحکم کرنے کے لیے جی جان کی بازی لگاؤ جو شرک اور قبائلی و گروہی عصبیاتِ جاہلیت کو ڈھا کر تمام بنی آدم کو اللہ کی بندگی و اطاعت اور وحدتِ آدم کے عقیدے پر مجتمع کر رہا ہے۔

امن اور صلح کی اصل راہ

ان منافقین کو خاص اہتمام کے ساتھ خطاب کر کے یہ نصیحت کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ ان کے اندر ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کفارِ قریش کے ساتھ سمجھوتے کا خواہشمند تھا۔ سورۂ بقرہ میں بھی اس قسم کے ایک گروہ کا ذکر گزر چکا ہے اور اس سورہ کی آیت ۳۵ میں بھی اسی کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ لوگ قریش اور یہود کو یہ اطمینان بھی دلاتے رہتے تھے کہ ہم اگرچہ مسلمانوں کے اندر شامل ہیں لیکن بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ میں بھی اسی گروہ کا ذکر آئے گا۔ یہ لوگ اپنی اس منافقانہ پالیسی پر اس وقت تک تو پردہ ڈالنے میں ایک حد تک کامیاب رہے جب تک جنگ کا مرحلہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن جب یہ مرحلہ سر پر آ گیا تو ان کے لیے چھپنے کا موقع باقی نہیں رہا۔ قریش اور ان کے حلیفوں کے خلاف یہ لوگ تلوار اٹھانے پر تیار نہیں تھے اور اب مسلمانوں کے اندر شامل رہنے کے لیے اس چیز سے کوئی مفر باقی نہیں رہا تھا چنانچہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے ان لوگوں نے یہ وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ ہم بھائیوں بھائیوں کے اندر خون ریزی پسند نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اور قریش اور اس ملک کے دوسرے عناصر سب مل جل کر صلح اور محبت کے ساتھ رہیں۔ یہی راہ اصلاح کی ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر جنگ کی راہ اختیار کی گئی تو اس ملک میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جس کو دبانا ناممکن ہو گا۔ یہ لوگ اپنی اسی منافقانہ پالیسی کی وجہ سے اپنے کو مصلح اور امن پسند کہتے تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ مسلمان ان کی یہ پالیسی اپنا لیں تاکہ ان کے نفاق پر پردہ بھی پڑا رہے اور اسلام کے دشمنوں کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر آیت زیرِ بحث میں فرمایا کہ یہ راہ جو تم نے اختیار کی ہے اور جس کو چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اختیار کریں امن اور صلح کی راہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی فساد اور برادرکشی کی طرف تمہاری رجعت ہے جس میں تم پہلے مبتلا رہے

ہو۔ امن اور اخوت کی راہ یہ ہے کہ سب ایک اللہ کے بندے اور ایک آدمؑ کی اولاد کی حیثیت سے زندگی بسر کریں اور اس نظامِ زندگی کو اپنائیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور آدمؑ کی وحدت کے عقیدے پر قائم ہے اور جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ یہ چیز اس جاہلی نظامِ زندگی کو برقرار رکھنے سے حاصل نہیں ہو گی جس میں قبیلہ قبیلہ کا خدا بھی جدا ہے اور ہر ایک کا باوا آدم بھی الگ الگ ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اسلام میں نظامِ اجتماعی کی بنیاد وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے عقیدے پر ہے۔ اس مسئلہ پر سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ (۲۳)

[منافقین کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں]

فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے۔ اس لعنت کے اثر سے ان کے کان بہرے اور ان کی آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو روشنی دکھائی اور یہ بات ان پر اچھی طرح واضح بھی ہو گئی کہ یہ روشنی اللہ نے اتاری ہے لیکن یہ لوگ مڑ مڑ کر اپنی اسی جاہلیت کی تاریکی ہی کو دیکھتے اور اسی میں واپس جانے کے متمنی ہیں۔ ان کی اس ناقدری کے سبب سے اللہ نے ان پر لعنت کر دی اور اپنی روشنی ان سے سلب کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ان کے کان حق نیوشی کی صلاحیت سے اور ان کی آنکھیں بصیرت سے محروم ہیں۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۲۴)

[دلوں کا زنگ قرآن کے تدبر سے دور ہوتا ہے]

فرمایا کہ دلوں کو زندہ کرنے والی چیز قرآن ہے بشرطیکہ یہ اس پر تدبر کرتے لیکن یہ ناقدرے لوگ کبھی اس پر غور نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دلوں کو جو زنگ لگتے ہیں وہ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گئے ہیں کہ جس طرح قفل سے دروازے بند ہو جاتے ہیں اسی طرح ان کے دل بھی اس زنگ سے بند ہو چکے ہیں۔

لفظ 'قُلُوبٍ' کی تنکیر یہاں اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے ہے۔ اس کی مثال سورۂ نساء کی آیت ۴۷ میں گزر چکی ہے۔ وہاں اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: 'آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا' (ایمان لاؤ اس چیز پر جو ہم نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس موجود ہے، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا کر ان کے پیچھے کی طرف موڑ دیں) یہاں جس طرح 'وُجُوهًا' کی تنکیر اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے ہے اسی طرح آیت زیرِ بحث میں لفظ 'قلوب' کی تنکیر بھی اظہارِ کراہت کے لیے ہے۔ گویا یہ دل ایسے قابلِ نفرت اور گھنونے ہیں کہ متکلم کو تعیین کے ساتھ ان کی طرف اشارہ بھی گوارا نہیں۔

'أَقْفَالُهَا' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دلوں کو روگ یا زنگ کی طرح لگتی ہیں۔ اس قسم کے روگوں کا ذکر اس سورہ میں بھی ہوا ہے (مثلاً اوپر آیت ۲۰ اور آگے آیت ۲۹ میں) اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ان کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ دنیا کی محبت، موت کا ڈر، بخل، بزدلی، کینہ، حسد، نفاق

اور اس قبیل کی دوسری چیزیں اس کے نمایاں اجزاء ہیں۔ اگر ریاست و امارت حاصل ہو تو کبر و غرور کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور قساوت بھی اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بیماریوں کا علاج قرآن کو سننا اور سمجھنا ہے، جیسا کہ سورۂ انفال کی آیات ۲۳-۲۴ کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے لیکن اس طرح کے لوگوں کو سب سے زیادہ وحشت قرآن ہی سے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ (۲۵)

نفاق ارتداد ہے

فرمایا کہ ان منافقین کی یہ روش ارتداد کی روش ہے۔ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ راہِ حق یہی ہے جس کی طرف پیغمبر دعوت دے رہے ہیں۔ چنانچہ آگے بڑھ کر انھوں نے اس کو قبول بھی کر لیا لیکن جب آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا تو شیطان نے ان کو فریب دیا اور یہ اس کے فریب میں مبتلا ہو گئے اور خدا نے بھی ان کو ڈھیل دے دی اس لیے کہ جو لوگ جان بوجھ کر محض اپنی خواہشوں کی پیروی میں راہِ حق سے انحراف اختیار کرتے ہیں اللہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے کہ وہ جس وادی میں ہرزہ گردی کرنا چاہتے ہیں کریں۔

نفاق کا ارتداد ہونا قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی واضح ہے۔ سورۂ مائدہ آیت ۵۴ میں انہی منافقین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (اے ایمان لانے والو! جو تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہونا چاہتا ہے وہ برگشتہ ہو جائے، خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے وہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے)۔

'اَمْلٰی' کا فاعل یہاں اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن میں یہ فعل اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اسی کے لیے اس کا استعمال موزوں ہے۔ شیطان کی طرف اس کی نسبت کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ قرینہ موجود ہو تو مجرد فعل ہی بتا دیتا ہے کہ اس کا فاعل کون ہے۔ اس کی متعدد نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۱۱۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ (۲۶)

منافقین کے ماندۂ درگاہ ہونے کا سبب

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اس وجہ سے شیطان کے حوالہ کر دیا کہ حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد بھی ان کا ساز باز اسلام کے ان دشمنوں کے ساتھ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب سے سخت نفرت کرنے والے ہیں۔ یہ ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیتے

رہیں گے۔ 'لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ' سے اشارہ یہود اور قریش کے لیڈروں کی طرف ہے جن کی اسلام کے ساتھ دشمنی بالکل واضح تھی لیکن یہ منافقین ان کو اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ ہرچند ہم مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اب آپ لوگوں کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ باقی ہی نہیں رہا۔ اگر آپ لوگوں پر کوئی مشکل وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ ہم آپ ہی کا ساتھ دیں گے اور اس معاملے میں ہم کسی کی بھی خوشی یا ناخوشی کی پروا کرنے والے نہیں ہیں۔ انہی منافقین کے متعلق سورۂ حشر میں بیان ہوا ہے کہ یہ یہود کے پاس جا جا کر ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر آپ لوگ یہاں سے نکالے گئے تو ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ کے معاملے میں ہرگز کسی کی بات کا لحاظ نہیں کریں گے۔ 'لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا' (الحشر: ۱۱) (اگر آپ لوگ نکالے گئے تو آپ لوگوں کے ساتھ ہم بھی نکلیں گے اور آپ لوگوں کے بارے میں ہم کسی کی بات بھی کبھی ماننے والے نہیں ہیں)۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ'۔ 'اسرار' سے مراد ان کا یہی ساز باز ہے جس کی طرف اوپر والے ٹکڑے میں اشارہ ہوا ہے اور یہ جملہ مجرد خبر کا نہیں بلکہ تہدید و وعید کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان رازداریوں سے اچھی طرح واقف ہے اور اس کا انجام عنقریب ان کے سامنے آئے گا۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (۲۷)

منافقین کا حال موت کے وقت

یہ ان کا انجام بیان ہوا ہے کہ اسلام کے خلاف اس طرح کی سازشیں کرنے والوں کو ان کے جرم کی سزا اسی وقت سے ملنی شروع ہو جاتی ہے جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے آتے ہیں تو یہ لوگ سوچ لیں کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب خدا کے سخت گیر فرشتے ان کی روحیں ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے قبض کریں گے اور کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۲۸)

یعنی ان لوگوں کے ساتھ یہ خاص معاملہ اس وجہ سے ہوگا کہ ان کی ساری بھاگ دوڑ اللہ تعالیٰ کی مخالفت میں رہی ہے۔ جو باتیں اللہ کو ناراض کرنے والی تھیں وہ انھوں نے اختیار کیں اور جو کام اس کو خوش کرنے والے تھے ان سے یہ بیزار رہے۔ اس کی پاداش میں فرشتے ان کی موت کے وقت ہی سے ان پر عذاب کی مار شروع کر دیں گے اور ان کے وہ سارے اعمال اللہ تعالیٰ حبط کر دے گا جو انھوں نے اسلام کے دعوے کے ساتھ بظاہر نیکی کے کیے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ (۲۹)

منافقین کا پردہ اللہ چاک کر کے رہے گا

یہ بھی ان کو دھمکی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ ریشہ دوانیاں جو کر رہے ہیں تو کیا ان کا گمان ہے کہ ان حرکتوں پر ہمیشہ پردہ ہی پڑا رہے گا، کبھی اللہ ان کو بے نقاب نہیں کرے گا؟ اگر

ان کا گمان یہ ہے تو بالکل غلط ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے چہرے کی نقاب الٹ دی جائے تاکہ سب ان کو اچھی طرح پہچان لیں، کسی کو یہ فریب میں مبتلا نہ کر سکیں۔

'مَرَضٌ' سے مراد نفاق بھی ہے اور کینہ و حسد بھی جو ان منافقین کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھا اور جس کے سبب سے وہ ان حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ نفاق بجائے خود بھی مرض ہے لیکن یہ مرض شدید تر ہو جاتا ہے جب اس کے اوپر حسد اور کینہ کا اضافہ ہو جائے۔ یہاں لفظ 'اَضْغَان' سے اسی حسد اور کینہ کی طرف اشارہ ہے۔ 'اَضْغَان' جمع ہے 'ضِغْن' کی جس کے معنی کینہ کے ہیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۳۰)

لفظ 'لَحْن' توریہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی آدمی بات اس طرح کرے کہ اپنے دل میں تو اس کا مفہوم کچھ اور رکھے لیکن دوسرے کو اس کا کچھ اور مفہوم سمجھانے کی کوشش کرے۔ منافقین اس فن میں بڑے مشاق تھے۔ وہ بات ایسے ہیر پھیر سے کرتے کہ کفار اور مسلمانوں دونوں کو بیک وقت یہ باور کرانا چاہتے کہ ان کی تمام ہمدردیاں انہی کے ساتھ ہیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے منافقین کو دھمکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ ان کو اس طرح بے نقاب کر دے کہ تم ان میں سے ہر ایک کو اس کی خاص علامتِ امتیاز سے پہچان جاؤ کہ یہ منافق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کر رہا ہے تو یہ اس کی ستاری ہے تاہم تمہارے لیے ان کا پہچان لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ تم ان کی باتوں کے ایچ پیچ، ان کے کلام کے دورُخے پن اور ان کے لہجہ کے تذبذب سے ان کو نہایت آسانی سے تاڑ سکتے ہو۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ' یہ اسی سیاق میں منافقین کو براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم مسلمانوں کو اپنے کلام کے دورُخے پن سے دھوکا دینے میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو یہ کامیابی تمہارے لیے کوئی خوش انجام چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے ہی اور جب وہ باخبر ہے تو تم دوسروں سے چھپا کر کیا فائدہ اٹھا سکو گے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ (۳۱)

کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کے لیے امتحان

یعنی مختلف قسم کے نرم و گرم حالات پیش کرکے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ لازماً تمہارا امتحان کرے گا یہاں تک کہ وہ اچھی طرح پرکھ لے گا کہ تمہارے اندر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں اور کون محض زبان کے غازی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ تو نہیں ہے کہ وہ ہر منافق کی پیشانی پر لکھ دے کہ یہ منافق ہے لیکن اس کی یہ سنت بالکل لازمی اور قطعی ہے کہ وہ مختلف

امتحانات کے ذریعہ سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کرتا ہے اور یہ بات چونکہ اس کی سنت کا تقاضا ہے اس وجہ سے اس امتحان سے تمھیں بھی لازماً گزرنا پڑے گا اور وہ لوگ اپنے کو زیادہ دنوں تک چھپائے رکھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے جو محض فریب کے جامے میں مسلمانوں کے اندر گھسے رہنا چاہتے ہیں۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ ان امتحانوں کا اصل مقصد تو مجاہدین و صابرین کو ممیّز کر دینا ہے لیکن اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان لوگوں کے حالات بھی کسوٹی پر آجائیں گے جو محض فریب سے اپنے آپ کو اس زمرے کے اندر گھسائے رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ 'وَ نَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ' میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ 'اخبار' سے مراد ان کے حالات ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس لیے بلوتا ہے کہ ان کے اندر جو مکھن ہے وہ نکل کر سامنے آجائے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ چھاچھ بھی سامنے آجاتا ہے۔

یہ امتحان چونکہ سنتِ الٰہی کا تقاضا ہے اس وجہ سے اس کا بیان لامِ تاکید کے ساتھ ہوا ہے۔ اور 'عِلم' 'یَعْلَمُ' کے معنی یہاں پرکھنے اور امتیاز کرنے کے ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی لا لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا ط وَسَیُحْبِطُ اَعْمَالَھُمْ (۳۲)

منافقین کو تنبیہ

یہ سورہ کے آخر میں اس مضمون کا پھر اعادہ فرمایا ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اور مقصود اس کے اعادے سے، جیسا کہ آگے کے مضمون سے واضح ہوگا، منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ اور رسول سے جو زور آزمائی کفار کر رہے ہیں اس سے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے بلکہ یہ خود منہ کی کھائیں گے۔ ان کی تمام کوششیں اس دنیا میں بھی رائگاں ہو کے رہیں گی اور آخرت میں بھی یہ خوار ہونے والے ہیں۔ تو ان کے پیچھے لگ کر تم اپنی دنیا اور آخرت برباد نہ کرو بلکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم نے کمزوری نہ دکھائی تو اللہ تمہی کو سربلند کرے گا اور یہ مخالفین ذلیل و خوار ہوں گے۔

کفارِ قریش اور ان کے حلفاء کی تباہی لازمی ہے

'اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ'، کے الفاظ دلیل ہیں کہ یہاں قریش اور ان کے حلفاء مراد ہیں۔ آیت ا میں بھی انہی الفاظ سے ان کا ذکر ہوا ہے۔ 'وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی' انہی کی تعریف مزید ہے کہ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ کا رسول ان کو جس دین کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن یہ محض اپنی سیادت کے زعم میں اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت اللہ کے دین کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی البتہ یہ خود اپنے کو تباہ کر لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ اللہ کے رسول کو اس کا رسول جانتے ہوئے اور اس کی دعوت کو پہچانتے ہوئے اس کی مخالفت کے لیے اٹھے ہیں تو ان کا یہ بناوٹی دم خم کتنی دیر تک ان کا ساتھ

دے گا۔ بالآخر یہ ڈگ ڈال دیں گے اور ذلیل ہوں گے۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (۳۳)

خدا کی اطاعت اپنے ذاتی مصالح سے بالاتر ہو کر کرو

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن اندازِ کلام دلیل ہے کہ روئے سخن خاص طور پر ان کمزور قسم کے مسلمانوں ہی کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھارے اس ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں فعل 'اَطِیْعُوْا' اپنے کامل اور حقیقی مفہوم میں ہے اس وجہ سے اس کا صحیح مدعا یہ ہو گا کہ ہر طرح کے حالات میں اپنے ذاتی مفادات و مصالح سے بے پروا ہو کر، اللہ اور رسول کے ہر حکم کی اطاعت کرو۔

'وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ' یعنی اسی طرح کی اطاعت سے تمھارے اعمال مثمر اور نتیجہ خیز ہوں گے۔ اگر تم نے اس اطاعت کو اپنے مصالح کے تابع رکھا تو یاد رکھو کہ تمھارے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اگرچہ وہ اعمال دین ہی کے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان صرف وہی قبول ہوتا ہے جو اس کے شرائط کے مطابق ہو، جو لوگ اپنے شرائط پر ایمان لانا اور صرف اپنے مصالح کے حد تک اس کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کی دینداری ان کے منہ پر پھینک ماری جاتی ہے تو اس طرح کی کوئی بات کر کے اپنے اعمال رائگاں نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتُوْا وَہُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَہُمْ (۳۴)

یعنی ان کافروں کو اللہ تعالیٰ کبھی بخشنے والا نہیں ہے جنھوں نے خود بھی کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکا اور پھر اسی کفر پر جمے ہوئے مر گئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی انجام ان لوگوں کا بھی ہونا ہے جو ان کا سہارا لیں گے اور ان کے ساتھ اپنی دوستی برقرار رکھنے کے لیے سازشیں کریں گے۔

فَلَا تَہِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَی السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ (۳۵)

اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کے لیے منافقین کی ایک تدبیر

'سَلْم' کے معنی صلح اور سمجھوتے کے ہیں۔ اوپر آیات ۲۲، ۲۳ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ منافقین چونکہ جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اس وجہ سے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتے کہ جنگ کے بجائے صلح سے معاملات طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہی دعوت وہ قریش کو بھی دیتے۔ وہ اپنے آپ کو ایک صلح پسند پارٹی کی حیثیت سے پیش کرتے اور لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہی پالیسی اختیار کرنے میں اس ملک کی خیر ہے ورنہ یہاں بھائیوں کا خون بھائیوں کے ہاتھوں بہے گا اور پوری قوم کا شیرازہ ابتر ہو جائے گا۔ ان کی یہ پالیسی مبنی تو تھی تمام تر ان کی بزدلی اور مفاد پرستی

پر لیکن وہ اس کی دعوت صلح پسندی اور امن دوستی کے روپ میں دیتے اور ان لوگوں کو متاثر کر لیتے جن کے اندر نفاق کے جراثیم ہوتے۔ اس آیت میں ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ تم بزدل ہو کر صلح اور سمجھوتے کے داعی نہ بنو بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو۔ اگر تم سچے ایمان کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھو گے تو تمہی سربلند رہو گے اور تمہارے دشمن ذلیل و خوار ہوں گے۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جب اللہ تمہارے ساتھ ہے تو اس کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوگی اور یہ اطمینان رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال کے صلہ کے معاملے میں کوئی خلاف وعدگی و بے وفائی ہرگز نہیں کرے گا بلکہ تمہارے ہر عمل کا، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، بھرپور صلہ دے گا۔

زبان کا ایک نکتہ

'فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ' میں عربیت کا وہی اسلوب ہے جو البقرۃ کی آیت ۴۲ 'وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ' کے تحت زیر بحث آ چکا ہے۔ جہاں معطوف اور معطوف علیہ دونوں میں ایک ہی حقیقت ظاہر کی گئی ہو وہاں لائے نفی کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی صورت آیت زیر بحث میں بھی ہے۔ ان منافقین کی یہ دعوتِ صلح چونکہ ان کی بزدلی ہی کا نتیجہ تھی اس وجہ سے 'تَدْعُوْٓا' کو 'فَلَا تَهِنُوْا' پر عطف کر دیا اور 'لَا' کو حذف کر دیا تاکہ اسلوب کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ دعوتِ صلح اس لیے نہیں دے رہے ہو کہ تم بڑے صلح پسند ہو بلکہ یہ محض اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام سعی ہے۔

'وَتَرَهٗ حَقَّهٗ' کے معنی ہوں گے اس نے اس کے حق میں خیانت یا کمی کی۔ 'لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ' کے معنی ہوں گے کہ اللہ سے یہ اندیشہ نہ رکھو کہ وہ تمہارے اعمال کے صلہ کے باب میں تمہارے ساتھ کوئی بے وفائی یا خیانت کرے گا بلکہ وہ بھرپور صلہ دے گا۔ جب ہر عمل کا بھرپور صلہ ملنے والا ہے تو اس کی راہ میں قربانی سے جی چرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔـلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۳۶)

بے حوصلہ لوگوں کی حوصلہ افزائی

یعنی دنیا کی محبت میں پھنس کر خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔ اس دنیا کے مال و متاع کی قدر و قیمت اگر کچھ ہے تو اسی شکل میں ہے جب اس سے آخرت کی کچھ کمائی کر لی جائے اگر کسی نے آخرت کی کمائی نہیں کی تو اس نے اپنی زندگی بوالہوسی و بے حاصلی میں گزار دی۔ اطمینان رکھو کہ اگر تم ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرو اور اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کا بھرپور صلہ دے گا اور تم اس دنیا کے خزف ریزوں کے عوض ابدی بادشاہی کا تخت و تاج حاصل کرو گے۔

'وَلَا يَسْـَٔـلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ' کے بعد لفظ 'اِحْفَاءً' محذوف ہے۔ بعد والی آیت میں اس کی وضاحت آ رہی

ہے اس وجہ سے یہاں بربنائے قرینہ اس کو حذف کر دیا۔ تفصیل سے پہلے اجمال کا اسلوب قرآن میں بہت معروف ہے۔ سوالوں کے نقل کرتے ہیں بھی اسی وجہ سے اجمال کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جواب سے اس اجمال کی وضاحت خود ہو جاتی ہے۔ 'اِحْفَاءٌ' کے معنی کسی شے کو سمیٹ کر پوری کی پوری لے لینے یا کسی شے کا الحاح و اصرار کے ساتھ مطالبہ کرنے کے ہیں۔ یہ ان بے حوصلہ لوگوں کو اطمینان دہانی ہے کہ مطمئن رہو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اس امتحان میں کبھی نہیں ڈالے گا کہ تم سے تمھارا کل مال سمیٹ کر طلب کرے بلکہ وہ اس کا ایک حصہ ہی طلب کرے گا اور اس کا بھی وہ تمھیں بھرپور صلہ دے گا تو اس کی راہ میں انفاق سے ہراساں ہونے اور اس کی دعوتِ انفاق سے تنگ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنْ یَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۳۷)

اللہ تعالیٰ بندوں کا امتحان لینے میں نہایت کریم ہے

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمھارے کل مال کا مطالبہ اس وجہ سے نہیں کرے گا کہ وہ ایسا کرے تو تمھارا سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پھر تم لازماً بخل کرو گے اور اس طرح تمھارا وہ حسد اور کینہ جو تم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہو سب پر آشکارا ہو جائے گا۔ اوپر آیت ۲۹ میں ان منافقین ہی کے لیے یہ دھمکی گزر چکی ہے کہ یہ اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ اللہ ان کے حسد و کینہ پر ہمیشہ پردہ ڈالے رکھے گا۔ وہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال کر جب چاہے ان کا سارا پول کھول دے۔ وہی بات یہاں دوسرے پہلو سے ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ اپنا سارا مال یا اس کا بہت بڑا حصہ اس کے حوالہ کر دو اس لیے کہ یہ مال اسی کا عطا کردہ ہے لیکن وہ ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ اس طرح کے امتحان سے ان لوگوں کا سارا بھرم کھل جائے گا جن کی بخالت اور نفاق پر ابھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کریمی کے شکر گزار ہو کہ اس نے تمھیں اس قسم کے کسی کڑے امتحان میں نہیں ڈالا ورنہ وہ چاہے تو ابھی تمھارے چہرے کی نقاب نوچ کر پھینک دے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۳۸)

بخیلوں کو دھمکی

'هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ' کے اسلوب کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ان منافقین کے حال پر افسوس اور حسرت کا اظہار ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کی جو دعوت دی جاتی ہے تو تم بخالت کر رہے ہو گویا کسی اور کو دے رہے ہو حالانکہ خدا سے بخالت کرنا خود اپنے سے بخالت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے مانگتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے ہی لیے مانگتا ہے کہ وہ اس کے صلہ میں تم کو ابدی بادشاہی بخشے۔ اللہ بالکل بے نیاز ہے، محتاج اگر ہو تو تم ہو، اللہ محتاج نہیں ہے۔

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ' یہ ان منافقین کو دھمکی ہے کہ تمھاری

یہ روش ارتداد کی روش ہے۔ اگر تم ارتداد کی راہ اختیار کرنی چاہتے ہو تو جاؤ کرو۔ اللہ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے، وہ تمہاری جگہ دوسروں کو اپنے دین کی خدمت کے لیے اٹھائے گا جو تمہاری طرح بیزار اور نکمے نہیں ہوں گے۔ سورۂ مائدہ میں یہی بات اسی قسم کے منافقین کو خطاب کر کے یوں فرمائی گئی ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ (۵۴) (اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! جو تم میں سے اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے تو برگشتہ ہو جائیں اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے، وہ اہل ایمان کے لیے نرم خو اور کفار پر گراں ہوں گے)۔

سورۂ مائدہ کی اس آیت کی روشنی میں ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ کے اجمال کی وضاحت کیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ تم تو اللہ سے عناد رکھنے والے اور اس کی رضا طلبی سے بیزار ہو اس وجہ سے خدا بھی تم سے بیزار ہے۔ تمہارے برعکس وہ اللہ سے محبت کرنے والے اور اس کی رضا مندی کے طالب ہوں گے اس وجہ سے اللہ بھی ان سے محبت کرے گا۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم کفار کے لیے بہت ہی نرم چارہ ہو، تم ان سے دوستی کے طالب ہو اور وہ تم کو جس طرح چاہتے ہیں اپنے اغراض کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ برعکس اس کے وہ اہل ایمان کے لیے تو بے شک نہایت ہی کریم اور نیک خو ہوں گے لیکن کفار اگر ان کے اندر لنگی دھنسانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کو پتھر کی چٹان پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

رحمان آباد

۹ر ستمبر ۱۹۷۶ء

۱۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۴۸

الفتح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے ربط

سابق سورہ کی آیت ۳۵ میں اہلِ ایمان سے یہ وعدہ جو فرمایا ہے کہ اگر تم کمزور نہ پڑے تو تمہی سربلند ہوگے، تمہارے حریف ذلیل و پامال ہوں گے، اس سورہ میں اسی وعدہ کے ایفار کی واقعاتی شہادت ہے۔ اس کا آغاز صلح حدیبیہ کے ذکر سے ہوا ہے جو فتح مکہ کی تمہید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر اتمامِ نعمت کا فتح باب ثابت ہوئی۔ اس میں فتح و غلبہ کی ان پیشین گوئیوں اور بشارتوں کا بھی حوالہ ہے جو اس امت کے باب میں تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہیں تاکہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے اور آگے ہوگا، ان میں سے کوئی بات بھی اتفاقی نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی سکیم میں پہلے سے طے ہے اور یہ سکیم پوری ہو کے رہے گی۔ کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس میں مزاحم ہو سکے۔

ب۔ سورہ کا پس منظر

اس سورہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو نگاہوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ نہایت مایوس کن حالات کے اندر امید کی روشنی اور شکست کے عام احساس کے اندر فتح مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ اس نے نہایت نازک حالات کے اندر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور دو سال سے زیادہ کی مدت نہیں گزری کہ اس کے ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید کی سچائی اس طرح سامنے آگئی کہ دوست اور دشمن کسی کے لیے بھی اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں یہ بشارت ہوئی کہ آپ صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔ اس رؤیا کی بنا پر آپ نے منادی کرا دی کہ لوگ عمرہ کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ قریش کے ساتھ مسلسل جنگ کی حالت قائم تھی اور نہایت قوی اندیشہ تھا کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے نکلے تو وہ لازماً مزاحم ہوں گے اور جنگ کی نوبت آجائے گی لیکن مسلمانوں پر بیت اللہ سے محرومی اتنی شاق تھی کہ وہ اس خطرے سے بے پروا ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے تیار ہو گئے۔ منافقین نے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کی بہت کوشش کی، ڈرایا کہ جو لوگ مکہ جائیں گے ان کو گھر پلٹنا نصیب

نہیں ہو گا لیکن مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا پر پورا اعتماد تھا اس وجہ سے تقریباً چودہ پندرہ سو صحابہؓ ہم رکابی کے لیے تیار ہو گئے۔

اس امر میں راویوں کا اختلاف ہے کہ مہینہ رجب کا تھا یا ذوقعدہ کا۔ بہرحال انہی دونوں مہینوں میں سے کوئی مہینہ تھا۔ یہ مہینے ہمیشہ سے حج و عمرہ کے لیے خاص رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس توقع کے لیے معقول وجہ موجود تھی کہ قریش ان کا احترام ملحوظ رکھیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے مکّہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ میں عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ ساتھ لیے جن کی گردنوں میں علامتِ امتیاز کے طور پر پٹے بھی ڈال دیے گئے کہ ہر دیکھنے والے پر واضح ہو جائے کہ یہ ہدی کے جانور ہیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ جنگ کا کوئی سامان ساتھ نہیں تھا صرف تلواریں تھیں وہ بھی میانوں کے اندر۔ غرض اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ قریش جنگ کا کوئی بہانہ پیدا نہ کر سکیں لیکن ان کی نخوتِ جاہلیت نے گوارا نہیں کیا کہ یہ قافلہ مکہ میں داخل ہونے پائے۔ اپنے آدمیوں کے ذریعے سے انھوں نے چھیڑ چھاڑ کے مختلف بہانے پیدا کیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے ان کی کوئی شرارت کامیاب نہ ہونے دی۔ حدیبیہ پہنچ کر آپ نے ایک شخص کو قریش کے لیڈروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ صرف عمرہ کے قصد سے آئے ہیں، اس کے سوا کوئی اور غرض نہیں ہے لیکن انھوں نے قاصد کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے گروہ کی مداخلت سے اس کی جان بچی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے خاص سفیر حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انھوں نے بھی قریش کو اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی لیکن قریش اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ انھوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ عزت سے پیش آئے اور یہ پیش کش کی کہ اگر وہ تنہا طواف کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی یہ پیش کش رد کر دی کہ رسول اللہ صلعم کے بغیر وہ طواف کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسی بیچ میں حضرت عثمانؓ کی واپسی میں کچھ دیر ہو گئی اور ادھر مسلمانوں کے کیمپ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کے اندر ایک شدید قسم کا اشتعال پیدا ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے نہایت متاثر ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو بیعتِ جہاد کی دعوت دی کہ اب ہم قریش سے جنگ کریں گے، تحتِ یا تختہ! صحابہؓ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جب قریش کو خبر پہنچی کہ مسلمان مرنے مارنے پر تل گئے ہیں تو انھوں نے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا۔ اس وفد نے قریش کی آن رکھنے کے لیے اس بات پر بہت اصرار کیا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں، اہلِ مکّہ تین دن کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی اصرار کیا کہ اگر کوئی ہمارا آدمی بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آ جائے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ صحابہؓ یہ شرطیں قبول کرنے پر کسی طرح بھی راضی نہیں تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۂ غیبی کے تحت یہ مان لیں اور مندرجہ ذیل شرائط پر ایک معاہدہ طے پا گیا۔

۱۔ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ اس دوران میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کے خلاف

کوئی خفیہ یا علانیہ کارروائی نہ کرے گا۔

۲۔ اس دوران میں قریش کا کوئی آدمی اگر بھاگ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو وہ اسے واپس کر دیں گے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی قریش کے پاس آ جائے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

۳۔ قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے فریقین میں سے کسی کا حلیف بن کر اس معاہدہ میں شامل ہو سکتا ہے۔

۴۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔ آئندہ سال وہ عمرہ کے لیے آئیں۔ تین دن تک وہ مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ اسلحہ میں سے ہر شخص صرف ایک تلوار میان میں لا سکتا ہے۔ ان تین دنوں میں اہلِ مکہ ان کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ان میں سے دو شرطیں، جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، مسلمانوں کو شدید ناگوار تھیں۔ لوگ ان کو قبول کرنا اعترافِ شکست کے ہم معنی سمجھتے تھے اور کسی طرح بھی راضی نہیں تھے کہ کوئی بات قریش سے دب کر مانی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے جذبات کا اظہار اس موقع پر ایسے تند الفاظ میں کیا کہ زندگی بھر ان کو اس کا پچھتاوا رہا۔ صلح نامہ طے پا جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ لوگ قربانی کر کے سر منڈوائیں اور عمرہ سے فارغ ہوں۔ لیکن لوگوں کی افسردگی و کبیدگی کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ بالآخر حضورؐ نے خود پہل کی، جب لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ اب فیصلہ میں کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی تب بادلِ ناخواستہ لوگ اٹھے اور عمرہ سے فارغ ہوئے۔ واپسی کے وقت لوگوں کا عام احساس یہ تھا کہ ہم ناکام واپس ہو رہے ہیں اس وجہ سے قدرتی طور پر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بھی تھا کہ نبی کی رؤیا سچی ہوتی ہے تو اس رؤیا کا کیا بنا جو حضورؐ نے دیکھی اور جس کی بنا پر گھر سے نکلے! —— یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی اور، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، فتحِ مبین کی بشارت بن کر نازل ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ جس چیز کو عام مسلمانوں نے اپنی شکست تصور کیا وہ 'فتحِ مبین' کس طرح بنی تو اس کا جواب سورہ کی تفسیر سے سامنے آئے گا۔ پہلے سورہ کے مطالب پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بشارت کہ صلح حدیبیہ کی شکل میں تمھیں ایک فتحِ مبین حاصل ہوئی ہے۔ یہ فتحِ مبین تمہید ہے اس بات کی کہ اب وہ وقت قریب ہے جب فتحِ مکہ کی صورت میں تمھیں کفار پر کامل غلبہ حاصل ہو گا، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نعمت تم پر تمام کرے گا اور تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اپنے رب کی کامل اور ابدی خوشنودی حاصل کر دگے۔ اس مہم کا یہ پہلو بھی نہایت مبارک ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے اس نے ایمان میں افزونی اور حصولِ جنت کی راہ کھولی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک فوزِ عظیم ہے اور ان منافقین و منافقات کے لیے یہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت کا سبب بنی جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے اور اس حقیقت کو نہ پا سکے کہ آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں خدا ہی کے حکم کے تحت ہیں اور وہ اپنے علم و حکمت کے تحت

جس طرح چاہے ان سے کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے۔

(۱۰-۸) عام مسلمانوں کو خطاب کر کے اس حقیقت کی وضاحت کہ رسولؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شاہد اور بشیر و نذیر ہو کر آتا ہے۔ لوگوں کا فرض ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس کی توقیر کریں، تمام مہمات میں اس کے ساتھی اور مددگار بنیں۔ جو لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس بیعت کا حق ادا کریں تو اس کا اجر بہت بڑا ہے اور اگر اس کا حق ادا نہ کریں تو یاد رکھیں کہ اس میں انہی کی تباہی ہے۔ اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

(۱۱-۱۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آگاہی کہ اس موقع پر جو منافقین پیچھے بیٹھ رہے اب وہ تمہارے پاس یہ درخواست لے کر آئیں گے کہ گھر بار کی ذمہ داریوں نے ان کو مجبور رکھا اس وجہ سے وہ معافی اور پیغمبرؐ کی دعائے مغفرت کے سزاوار ہیں۔ ان کو بتا دیجیو کہ تمہارے نہ اٹھنے کی وجہ تمہارا یہ گمان تھا کہ اب کے مسلمانوں اور پیغمبرؐ کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہوگا تو تم نے اپنے اس گمان کے باعث خود اپنی تباہی کا سامان کیا۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی جس کو چاہے گا معاف کرے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

ان منافقین کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ یہ لوگ جب دیکھیں گے کہ کسی مہم میں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر ہاتھ آنے والا ہے تو یہ پورا زور لگائیں گے کہ انھیں بھی ساتھ نکلنے کی اجازت دی جائے لیکن ان کو ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ آگے ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ ہونے والا ہے اگر اس موقع پر تم نکلے تو خیر ہے اور اگر اس وقت بھی اسی طرح بہانہ سازی کر کے بیٹھ رہے تو تمہارے لیے بھی وہی عذاب مقدر ہے جو کفار کے لیے ہے۔

(۱۷) ان معذورین کا بیان جن کی جنگ سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ دل سے اللہ اور رسول کے فرمانبردار رہیں۔

(۱۸-۲۱) ان جاں نثاروں کا بیان جنھوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، فتوحات، غنیمت اور فتح مکہ کی بشارت۔

(۲۲-۲۵) اس امر کا بیان کہ حدیبیہ کے موقع پر قریش جنگ کرتے تو منہ کی کھاتے۔ مسلمانوں کے غلبہ کے پہلو کی طرف اشارہ۔ قریش کی کھلی ہوئی اخلاقی و مذہبی شکست۔ قریش کی مرعوبیّت کے باوجود مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دینے کی حکمت۔

(۲۶) قریش کی اخلاقی شکست کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی طرف سے اخلاقی فتح کا جو مظاہرہ ہوا اس کی طرف اشارہ۔ حمیّتِ جاہلیت کے بالمقابل مسلمانوں نے تقویٰ اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت کی جو شان نمایاں کی اس کا حوالہ۔

(۲۷) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کی تصدیق۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی اس کی حکمت۔

(۲۸-۲۹) اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی تصویر تورات میں اور حق کے تدریجی غلبہ کی تمثیل انجیل میں۔

سُوْرَةُ الْفَتْحِ

مَدَنِيَّةٌ ــــــــــ اٰيات: ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۷

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۴﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾

ترجمۂ آیات ۱-۷

بے شک ہم نے تم کو ایک کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی کہ اللہ تمھارے تمام اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخشے، تم پر اپنی نعمت تمام کرے، تمھارے لیے ایک بالکل سیدھی راہ کھول دے اور تمھیں اپنی ناقابلِ شکست نصرت سے نوازے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر طمانیت نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو اور آسمانوں اور زمین کی تمام فوجیں اللہ ہی کی ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے تاکہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور تاکہ ان سے ان کے گناہوں کو جھاڑ دے اور اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی یہی ہے! ۴-۵

اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے باب میں برے گمان کرتے رہے، برائی کی گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان پر اس نے لعنت کی اور ان کے لیے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے! اور اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی فوجیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۷

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۱)

معاہدۂ حدیبیہ کو فتح مبین قرار دینے کے وجوہ

'فتح مبین' سے یہاں مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور فتح کو مراد لینے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کو فتح مبین قرار دینے کے متعدد پہلو بالکل واضح ہیں۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ پہلا موقع ہے کہ قریش نے علانیہ بیت اللہ پر مسلمانوں کا حق تسلیم کیا اور یہ تسلیم کرنا بطورِ احسان نہیں بلکہ مسلمانوں سے دب کر تھا۔ آگے آیت ۲۴ سے واضح ہوگا کہ اگر معاہدہ نہ ہوتا اور

جنگ چھڑتی تو مسلمانوں کی فتح یقینی تھی۔ قریش نے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا اس وجہ سے وہ معاہدہ کے دل سے خواہش مند تھے۔ البتہ اپنی ناک ذرا اونچی رکھنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسی سال عمرہ کرنے پر اصرار نہ کریں بلکہ آئندہ سال آئیں۔ مسلمانوں کو اس بات پر راضی کرنے کے لیے انھوں نے بہت بڑی رشوت بھی دی کہ تین دن کے لیے وہ شہر بالکل خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ قریش کی طرف سے یہ پیش کش کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

دوسرا یہ کہ قریش نے اس معاہدے کی رُو سے مسلمانوں کو اپنے برابر کی ایک حریف قوت عرب میں تسلیم کر لیا۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت اب باغیوں اور غداروں کی نہیں رہی تھی، جیسا کہ وہ علانیہ اب تک کہتے رہے تھے، بلکہ مساوی درجے کی ایک سیاسی قوت کی ہو گئی چنانچہ انھوں نے علانیہ ان کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا کہ عرب کے جو قبائل ان کے حلیف بننا چاہیں وہ ان کو اپنا حلیف بنا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ قریش نے مسلمانوں کی جنگی صلاحیت کا لوہا بھی اس حد تک مان لیا کہ خود اصرار کر کے معاہدے میں دس سال کے لیے جنگ بندی کی شرط رکھوائی۔

چوتھا یہ کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت جو نہیں دی تو اس کی وجہ مسلمانوں کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں بہت سے ظاہر اور مخفی مسلمان تھے جو وہاں سے ابھی ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اندیشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچ جائے گا۔

غرض اس کے ایک فتح مبین ہونے کے گوناگوں پہلو واضح تھے جو مسلمانوں سے مخفی نہیں ہو سکتے تھے لیکن قریش نے اپنی حمیتِ جاہلیت کا مظاہرہ کچھ اس طرح کیا اور بعض واقعات نہایت اشتعال انگیز مثلاً ابو جندل کا واقعہ ـــــ اس دوران میں ایسے پیش آ گئے کہ مسلمانوں کے اندر عام احساس یہ پیدا ہو گیا کہ یہ معاہدہ دب کر کیا جا رہا ہے۔ جذبات کے ہیجان میں لوگ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ اس معاہدے کی رُو سے انھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ اس سورہ نے جب اصل حقائق کی طرف توجہ دلائی تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ فی الواقع انھوں نے معاہدے کے مضمرات سمجھنے میں غلطی کی اور جب اس کے نتائج سامنے آئے تو ہر شخص نے کھلی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فی الواقع یہی معاہدہ فتح مکہ کی تمہید ثابت ہوا۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا (۲-۳)

اس فتح مبین کے چند نتائج

'ل' یہاں غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے یہ فتح مبین جو عنایت فرمائی ہے یہ تمہید ہے جو منتہی ہوگی مندرجہ ذیل باتوں پر جن سے اللہ تعالیٰ تمھیں سرفراز فرمانے والا ہے۔

ایک یہ کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ تم اپنے مشن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اگلے پچھلے تمام گناہوں کو معاف کر کے اپنی رحمت سے نوازے گا۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمت تمام کرنے والا ہے۔

تیسری یہ کہ ہدایت کی صحیح راہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول دے گا۔

چوتھی یہ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ایسا غلبہ عطا فرمائے گا جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ چاروں باتیں یہاں اجمال کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ قرآن کے نظائر کی روشنی میں ان کی وضاحت کی جائے۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ اس فتح مبین کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آگیا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ مثلاً سورۂ نصر میں فرمایا ہے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۱-۳)	جب اللہ کی مدد اور فتح ظاہر ہو جائے اور تم دیکھو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

اس سورہ میں فتح و غلبہ کی بشارت کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کے بعد فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا وقت آپ کے لیے قریب آجائے گا لیکن صاف الفاظ میں اس کی بشارت دینے کے بجائے اس کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی کہ تسبیح، نماز اور استغفار سے اس کے لیے تیاری کرو۔ آیت زیرِ نظر میں یہی مضمون موقع و محل کے تقاضے سے نہایت واضح بشارت کے اسلوب میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فتح مبین جو تمہیں حاصل ہوئی ہے اس کے بعد اب وہ وقت قریب ہے کہ تمہارے رب نے جو ذمہ داری تم پر ڈالی تھی اس سے فارغ فرمائے گا اور نہایت سرخروئی و سرفرازی کے ساتھ اس طرح فارغ فرمائے گا کہ تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سب سے بڑی بشارت کوئی ہو سکتی تھی تو لاریب یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس عظیم مشن پر مامور فرمایا تھا اس سے آپ کو اس طرح فارغ فرمائے کہ اس کے متعلق کوئی بھی چھوٹی یا بڑی مسئولیت آپ پر باقی نہ رہے بلکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ آپ نے یہ فریضہ ٹھیک ٹھیک اپنے رب کی مرضی کے مطابق انجام دے دیا۔ اس ٹکڑے میں آپ کو خوشنودی کا بھی پروانہ عطا ہوا ہے

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑا پروانہ کوئی اور آپ کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی کی شکرگزاری نے آخری دور میں جب آپ کی عبادت کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ کر دیا تو لوگ آپ سے سوال کرتے کہ یا رسول اللہ، آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ اس کا جواب دیتے کہ اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا (کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟)

انبیاء علیہم السلام سے کس طرح کے گناہ صادر ہوتے ہیں۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس 'ذنب' کی نسبت کی گئی ہے اس سے متعلق یہ وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے اتباعِ ہوا کی نوعیت کے گناہ تو کبھی صادر نہیں ہوئے لیکن اقامتِ دین کی جدوجہد میں، نیک دواعی کے تحت، کبھی کبھی ان سے بھی ایسی باتیں صادر ہو گئی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس منافقین آتے اور کوئی بہانہ پیدا کر کے یہ چاہتے کہ ان کو جہاد میں شرکت سے رخصت دی جائے۔ آپ کو علم ہوتا کہ یہ لوگ محض بہانہ سازی کر رہے ہیں لیکن کریم النفسی کے سبب سے آپ ان کو رخصت دے دیتے کہ ان کا فضیحتا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نرمی اگرچہ آپ کی کریم النفسی کا نتیجہ تھی، اس میں اتباعِ ہوا کا کوئی شائبہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ کی گرفت فرمائی اس لیے کہ نبی ہر معاملے میں حق و عدل کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کرنے کے معاملے میں بھی اس حد سے متجاوز نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے شریفانہ سلوک کے لیے ٹھہرا دی ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اپنی قوم کے سرداروں کی دلداری، اس خیال سے، زیادہ فرماتے کہ اگر یہ لوگ ایمان لائیں گے تو یہ دعوت کی تقویت و ترقی کا ذریعہ بنیں گے۔ یہ چیز بجائے خود کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ دین کی مصلحت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے لیکن اگر یہ اتنی زیادہ ہو جائے کہ اس سے اصلی حق داروں کے حق سے غفلت ہونے لگے یا نااہلوں کی رعونت میں اس سے اضافہ ہونے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔ سورۂ عبس میں ایک نابینا کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔

اسی طرح کے واقعات دوسرے انبیاء کی زندگیوں میں بھی پیش آئے جن کی وضاحت ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کے محل میں کی ہے۔ آیت زیرِ بحث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس گناہ کی نسبت کی گئی ہے اس کی نوعیت یہی ہے۔ اس طرح کی تمام باتوں کے متعلق آپ کو بشارت دے دی گئی کہ یہ ساری چیزیں آپ کو بخش دی جائیں گی۔

'اگلے اور پچھلے'، کے الفاظ اصلاً تو احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہیں۔ لیکن ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس بشارت سے پہلے کی غلطیاں بھی معاف اور اس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی ہوئی تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ اس کے لیے کسی نئی بشارت کی ضرورت نہیں ہے۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ۔ یہ نعمت دین کے اتمام اور اس کی تکمیل کی بشارت ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب اس نعمت کی تکمیل ہو گئی تو یہ اعلان کر دیا گیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ: ۳) (اب میں نے تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا)۔

تکمیل دین کی نعمت کا ثمرہ

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ یہ تکمیل دین کی نعمت کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے گا، جس سے شیطان نے لوگوں کو ہٹا دیا تھا۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لیے جو دین نازل فرمایا تھا یہود اور نصاریٰ نے بھی اس کو ضائع کر دیا تھا اور اہل عرب نے بھی، حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تعمیر کردہ مرکزِ توحید کو ایک بت خانہ کی شکل میں تبدیل کر کے، اصل نشانِ راہ گم کر دیا تھا۔ جس سے خدا تک پہنچانے والی سیدھی راہ بالکل ناپید ہو چکی تھی۔ یہ راہِ خلق کے لیے از سرِ نو اس وقت باز ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اپنے دین کی تجدید و تکمیل فرمائی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مینارۂ توحید کفر کے نرغہ سے نکل کر اپنے اصل ابراہیمی جمال و شان میں نمایاں ہوا ہے۔ اس ٹکڑے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اب دین بھی نکھر کر سامنے آ جائے گا اور وہ مرکزِ نور بھی بے نقاب ہو جائے گا جو ہدایت کی اصل شاہراہ کی طرف رہنمائی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

یہاں یہ بشارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دی گئی ہے۔ یہی بشارت اسی سورہ کی آیت ۲۰ میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے دی گئی ہے۔ وہاں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'نصر عزیز' کا صحیح مفہوم

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ 'نَصْرًا عَزِيْزًا' سے مراد کفر کے مقابل میں ایسی فتح و نصرت ہے جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ اس طرح کی نصرت ظاہر ہے کہ اسی شکل میں آپ کو حاصل ہو سکتی تھی جب کفر کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جب قریش کا زور بالکل ختم ہو جائے اور بیت اللہ مسلمانوں کی تحویل میں آ جائے۔ اب تک مسلمانوں کو قریش کے مقابل میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں وہ بھی اہم تھیں لیکن ایسی نہیں تھیں کہ ان کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔ قریش جب تک مکہ پر متسلط تھے اس وقت تک وہ بہرحال ایک طاقت تھے لیکن واقعۂ حدیبیہ نے ان کی یہ طاقت متزلزل کر دی اور وہ وقت اب دور نہیں رہ گیا تھا کہ ان کے اقتدار کی یہ کہنہ عمارت ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو جائے۔ یہ اسی 'نصر عزیز' کی بشارت دی گئی ہے۔ 'عزیز' کے معنی غالب و مقتدر کے ساتھ منیع کے بھی ہیں یعنی جس تک کسی کی پہنچ نہ ہو سکے۔

ترتیب بیان کی ایک بلاغت

یہاں ان بشارتوں کے ظہور کی ترتیب میں جو بلاغت ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو چیز سب سے

پہلے ظہور میں آنے والی ہے اس کا ذکر سب سے آخر میں ہوا اور جو چیز سب کا خلاصہ ہے اور سب سے آخر میں ظاہر ہوگی اس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ یہ ترتیب نزولی ہے۔ یعنی بیانِ مطالب میں نیچے سے اوپر چڑھنے کی نہیں بلکہ اوپر سے نیچے اترنے کی ترتیب اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دینے کا تھا۔ فتح مکہ کی بشارت بھی اگرچہ اہم بشارت تھی لیکن اس سے بھی بڑی بلکہ سب سے بڑی بشارت آپ کے لیے یہ تھی کہ وہ انعام اخروی آپ کے سامنے رکھ دیا جائے جو آپ کو ملنے والا ہے اور جس کے ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ 'لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ'۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِہِمْ ؕ وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (۴)

وعدۂ نصرت کی دلیل

اُوپر والی آیت میں جس نصرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ اللہ ہی کی نصرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مومنوں کے دلوں میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ تمہاری دعوت پر عمرہ کے لیے تمہارے ہم رکاب ہو گئے تاکہ جو دولتِ ایمان ان کو حاصل تھی اس پر وہ اپنی اس حوصلہ مندی اور نبی کی رفاقت سے مزید اضافہ کریں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ سفر اگرچہ عمرہ کے لیے تھا لیکن اس کا ارادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خطرناک حالات میں فرمایا تھا۔ قریش سے برابر جنگ کی حالت قائم تھی اور اب تک ان کے حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ برابر اُمنڈ اُمنڈ کر مدینہ پر حملے کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں کسی طرح بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے عمرہ کے لیے جائیں گے تو وہ بغیر مزاحمت کے آسانی سے ان کو مکہ میں داخل ہونے دیں گے۔ چنانچہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ منافقین اسی بنا پر یہ گمان رکھتے تھے کہ مسلمان موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور اب کے اس سفر سے ان کو گھر پلٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ ایسے حالات کے اندر چودہ پندرہ سو صحابہؓ کا اپنے گھروں کو چھوڑ کر، ڈھائی سو میل دور کے سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور وہ بھی بالکل غیر مسلح، کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان میں برکت دی، ان پر خاص اپنے پاس سے عزم و حوصلہ اتارا اور وہ اس سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمہارے ساتھیوں کو اس موقع پر یہ حوصلہ عطا فرمایا وہ آگے کے مراحل میں بھی ان کی حوصلہ افزائی فرمائے گا اور اللہ تم سے جس 'نصر عزیز' کا وعدہ فرما رہا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

اہل ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں

'لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِہِمْ' میں دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں اہل ایمان کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں وہ درحقیقت ان کے ایمان کی جانچ کے لیے پیش آتی ہیں۔ اگر وہ اس جانچ میں پورے اترتے جاتے ہیں تو ان کے ایمان کی قوت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو نفسِ مطمئنہ کی بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے اور اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں اور برابر فیل ہی ہوتے رہتے ہیں تو بالآخر

ان کا نورِ ایمان بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

ایمان کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا صحیح پہلو

اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں اور اس سنت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایمان ایک گھٹنے بڑھنے والی چیز ہے۔ اگر وہ کوئی جامد شے ہوتا تو اس امتحان کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے بڑھنے کے قائل نہیں تھے تو اس کا ایک خاص محل ہے۔ اس سے ان کی مراد وہ قانونی ایمان ہے جس پر ایک اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے شہری حقوق قائم ہوتے ہیں، نہ کہ وہ ایمان جس پر آخرت کے مدارج و مقامات مبنی ہیں۔ قانونی فقہی ایمان کے اعتبار سے ہر مسلمان جو ضروریاتِ دین کا قائل ہے، برابر ہے اور اسلامی ریاست سب کے ساتھ مسلمان ہی کی حیثیت سے معاملہ کرے گی۔ اس پہلو سے ایک بدوی اور ایک شہری میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ رہا آخرت کا معاملہ تو اس کا انحصار حقیقی ایمان پر ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور وہی اس کا فیصلہ فرمائے گا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک بجائے خود ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے لیکن اس کی وکالت بھی بالکل غلط طریقہ پر کی جاتی ہے اور اعتراض کرنے والوں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

جو رسول کی مدد کرتے ہیں وہ اپنے لیے کسبِ سعادت کی راہ کھولتے ہیں

وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمہاری رفاقت کے لیے جو آمادہ کر دیا تو یہ ان پر اس نے احسان فرمایا کہ وہ اپنی اس نیکی سے اپنے ایمان پر مزید ایمان کا اضافہ کریں ورنہ وہ اپنے رسول اور اپنے دین کی نصرت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تمام قوتیں اور تمام فوجیں اللہ ہی کے تصرف میں ہیں۔ وہ جب چاہے کفار سے اپنی ان فوجوں کے ذریعہ انتقام لے سکتا ہے لیکن اس نے اہل ایمان کو اپنے رسول کی نصرت کی دعوت دے کر یہ چاہا کہ ان کے لیے ایک فوزِ عظیم کے حصول کی راہ کھولے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور اس کے اس کام میں بھی اس کی عظیم حکمت ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو سورۂ محمد کی آیت ۴ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ آگے یہی آیت ایک اور پہلو سے آ رہی ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَيُكَفِّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ فَوۡزًا عَظِيۡمًا (۵)

ازدیادِ ایمان کا صلہ

یہ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ۔ کا صلہ بیان ہوا ہے اور اسلوبِ بیان بدایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نورِ باطن میں اضافہ کی راہیں جو کھولتا ہے تو اس لیے کہ اس طرح وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور ان سے ان کے سارے گناہ دور فرما دے گا۔ یعنی یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں

ہے بلکہ تمام تر نفع ہی نفع ہے۔

یہاں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ دخول جنت کا ذکر پہلے ہے اور گناہوں کے جھاڑنے کا ذکر بعد میں۔ حالانکہ لوگ جنت میں گناہوں کے جھاڑے جانے کے بعد داخل ہوں گے، ہمارے نزدیک یہ تقدیم و تاخیر محض ظاہری ہے۔ بشارت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے دخولِ جنت کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے، مقصود یہی بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک کر کے جنت میں داخل کرے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

'وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا' یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصلی اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے تو مبارک ہیں وہ جنھوں نے یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام خطرات سے بے پروا ہو کر بازی کھیلی۔ یہ ٹکڑا تمہید ہے منافقین کے ذکر کی جو آگے آ رہا ہے اور جن کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ قریش کے ڈر سے گھروں میں دبک کر بیٹھ رہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ان کی سیاست بڑی کامیاب رہی اور بڑی ہوشیاری سے انھوں نے اپنے کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے حالانکہ انھوں نے اپنے کو خطرے سے بچایا نہیں بلکہ خطرے میں جھونک دیا ہے جس کا اندازہ ان کو بہت جلد ہو جائے گا۔

منافقین پر تعریض

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۶)

یہ اس امتحان کے دوسرے پہلو کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ جس امتحان سے اہلِ ایمان کے لیے فوزِ عظیم کی راہ کھولتا ہے وہی امتحان لازماً منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کے لیے سب سے بڑی تباہی یعنی دوزخ کی راہ کھولتا ہے اس لیے کہ اس سے ان کے کھوٹ ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور اللہ کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے امتحان کا دوسرا پہلو

'اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ' سے ان منافقین کے ان گمانوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ آیا ہے: 'بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا' (بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور مسلمانوں کو اس سفر سے اپنے گھر والوں کی طرف کبھی پلٹنا نصیب نہ ہو گا۔ یہ گمان تمھارے دلوں میں رچ بس گیا اور تم نے بُرے بُرے گمان کیے اور اس طرح تم ہلاک ہونے والے بنے)۔

منافقین و منافقات کے ساتھ مشرکین و مشرکات کا جوڑ اس گہری قلبی و ذہنی مماثلت کی بنا پر ہے جو دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک مشرک اپنے رب کے ساتھ عہد بندگی کا مدعی ہوتے ہوئے دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا ہے، اسی طرح ایک منافق بھی اللہ و رسول کے ساتھ

منافقین اور مشرکین میں مماثلت

عہدِ ایمان و اطاعت کا مُدعی ہوتے ہوئے غیروں سے سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ (محمد ۴۷: ۲۶) (بعض معاملات میں ہم آپ ہی لوگوں کے ساتھ رہیں گے) کی سازشیں کرتا ہے۔ اس اشتراک کی بنا پر قرآن نے نفاق کو شرک قرار دیا ہے جس کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب "حقیقت شرک" میں کی ہے۔ یہاں منافقین کا ذکر مشرکین کے ساتھ کر کے قرآن نے ان کا درجہ معین کر دیا کہ اس طرح کے مدعیانِ ایمان کا حشر بالآخر ان مشرکوں کے ساتھ ہی ہوگا جن کے یہ ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔

ایک بلیغ جملہ معترضہ

'عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ' کا فقرہ بطور جملہ معترضہ ہے۔ جب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق ان کے بُرے گمانوں اور ان کی بُری تمناؤں کا ذکر آیا تو سلسلۂ کلام کے بیچ میں بغیر توقف کے فرما دیا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر بری گردش کے منتظر ہیں حالانکہ بری گردش درحقیقت خود انہی کے اوپر ہے اس لیے کہ یہ لوگ جن لوگوں سے لو لگائے ہوئے ہیں ان کا انجام بہت جلد ان کے سامنے آ جانے والا ہے اور اسی انجام سے یہ بھی دوچار ہوں گے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے، ان کے لیے اللہ نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں کے ذکر کی حکمت

یہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ اوپر اہلِ ایمان کے بیان میں بھی اور پھر منافقین و مشرکین کے ذکر میں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آزمائش کے دَور کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ اس دَور میں اگر کسی گروہ کے اندر نفاق پرورش پاتا ہے تو اس کی پرورش میں بڑا دخل بیوی بچوں کا ہوتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ منافقین کے اس قول سے بھی ہو رہا ہے جس کا حوالہ آگے آیت ۱۱ میں ہے کہ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا (ہم کو ہمارے مال اور اہل و عیال نے پھنسائے رکھا) اور حدیث میں بھی ارشاد ہے کہ 'الولد مبخلۃ مجبنۃ' (آل و اولاد سب سے زیادہ بخل و بزدلی میں مبتلا کرنے والے ہیں) اسی طرح اگر کسی گروہ کے اندر ایمان مستحکم ہوتا ہے تو اس میں بھی بیوی بچوں کے عزم و صبر اور ان کے اعتماد علی اللہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ صورت حال متقتضی ہوئی کہ اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق دونوں کے ذکر میں عورتوں کا کردار بھی سامنے آ جائے تاکہ مومنات اور منافقات دونوں اپنی اپنی جگہ پر واقف ہو جائیں کہ ان کا رب نہ اپنی مومنہ بندیوں کی جاں نثاریوں سے بے خبر ہے اور نہ منافقات کی تن آسانیوں اور دنیا پرستیوں سے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۷)

منافقین سے اظہارِ بیزاری

یہی ٹکڑا صرف ایک لفظ 'عزیز' کے فرق کے ساتھ اوپر آیت ۴ میں بھی شامل ہے۔ وہاں یہ ایک خاص پہلو سے آیا ہے۔ یہاں یہ ان منافقین کے اظہار سے بیزاری و بے نیازی کے لیے وارد ہوا ہے کہ اگر یہ منافقین جہنم ہی کے ایندھن بننا چاہتے ہیں تو بن جائیں۔ خس کم جہاں پاک! اللہ کو ان بزدل لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر اس کے اپنے ہیں۔ وہ

ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے اور ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ اپنی حکمت کے تحت وہ ان لشکروں کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی کی بزدلی اور پست ہمتی اس کے ارادوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

۵۔ آگے آیات ۸-۲۱ کا مضمون

آگے کی آیات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ و مقام واضح فرمایا ہے پھر اس مرتبہ و مقام کے تقاضے سے اہل ایمان پر آپ کے جو حقوق قائم ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوئیں ان کی تصریح فرمائی ہے۔ پھر ان منافقین کے رویہ پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے جو اس موقع پر جھوٹے بہانے پیدا کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے، عمرہ کے لیے اس ڈر سے نہیں نکلے کہ مسلمانوں کو اس سفر سے پلٹنا نصیب نہیں ہو گا۔ پھر ان جاں باز مسلمانوں کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے نہایت بے سروسامانی کے حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی اور اپنے اخلاص و صدقِ نیت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی ابدی خوشنودی کے حق دار اور دنیا میں اس کی تائید و نصرت کے سزاوار قرار پائے ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸-۲۱

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ ٱللَّهَ يَدُ ٱللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَٰهَدَ عَلَيْهُ ٱللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾ سَيَقُولُ لَكَ ٱلْمُخَلَّفُونَ مِنَ ٱلْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ أَمْوَٰلُنَا وَأَهْلُونَا فَٱسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِى قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًۢا ۚ بَلْ كَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًۢا ﴿١١﴾ بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ ٱلرَّسُولُ وَٱلْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰٓ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ

ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا
بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ
لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۴﴾
سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا
ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ
تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ
بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ
فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا
تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶﴾ لَیْسَ عَلَى
الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِیْضِ حَرَجٌ ؕ
وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ
ع ۲ ۱۰
عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ
قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۱۸﴾ ۙ
وَّ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۹﴾
وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ

وَّكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ‌ۚ وَلِتَكُوۡنَ اٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ يَهۡدِيَكُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخۡرٰى لَمۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَيۡهَا قَدۡ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا ﴿۲۱﴾

ترجمۂ آیات ۸ - ۲۱

بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری پہنچانے والا اور آگاہ کردینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔ ۸ - ۹

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تو جس نے عہد توڑا وہ اس نقضِ عہد کا وبال اپنے ہی سر لیتا ہے اور جو پوری کرے گا وہ بات جس کا اس نے اللہ سے عہد کیا تو اللہ اس کو ایک اجرِ عظیم دے گا۔ ۱۰

جو لوگ اہلِ بدو میں سے پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اب تم سے عذر کریں گے کہ ہم کو ہمارے مال مویشی اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں نے پھنسائے رکھا اس وجہ سے آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔ یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ ان سے کہو، کون ہے جو تمہارے لیے اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہو اگر وہ تم کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا چاہے؟ بلکہ اللہ ان سب باتوں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور ان کے ساتھیوں کو اب کبھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنا نصیب نہ ہوگا اور یہ بات تمہارے دلوں میں رچ بس گئی ہے۔ اور تم نے بُرے بُرے گمان کیے اور بالآخر ہلاک ہونے والے بنے۔ اور جو ایمان نہ لایا اللہ اور اس کے رسول پر تو ہم نے ان کافروں

کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ وہی بخشے گا جس کو چاہے گا اور سزا دے گا جس کو چاہے گا اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحیم ہے۔ ۱۱-۱۴

جب تم غنیمتیں لینے کے لیے چلو گے تو یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ کہہ دو، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے بھی فرمائی تھی! تو وہ کہیں گے کہ بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو۔ بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔ ۱۵

اہل بدو میں سے ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں سے کہہ دو کہ عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم کو ان سے جنگ جاری رکھنی ہو گی یا وہ اسلام لائیں گے۔ تو اگر تم نے اس حکم کی اطاعت کی تو اللہ تم کو ایک اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے منہ موڑا جیسا کہ تم نے پہلے منہ موڑا تو وہ تم کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۶

نہ نابینا پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو روگردانی کرے گا تو اللہ اس کو ایک دردناک عذاب دے گا۔ ۱۷

اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب کہ وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا تو اتاری ان پر طمانینت اور ان کو ایک عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے نوازا اور بہت سی غنیمتوں سے بھی جن کو وہ حاصل کریں گے

اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۱۹

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم پاؤ گے۔ پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ یہ موجب طمانیت اور مسلمانوں کے لیے نشانی ہو اور تمہیں سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔ اور ایک دوسری فتح بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو لیکن اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۰-۲۱

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۸-۹)

نبیؐ کے مرتبہ و مقام کا بیان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم کو لوگوں کی طرف اپنے دین کی گواہی دینے والا اور بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ 'گواہی دینے والا'، یعنی اپنے دین کی گواہی دینے والا کہ ہم اپنے بندوں کو کس چیز کا حکم دیتے اور کس بات سے روکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس لیے بھی بھیجا ہے کہ ان لوگوں کو جنت کی بشارت دو جو تمہاری گواہی قبول کر کے اپنی زندگیاں سنوار لیں اور ان لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراؤ جو تمہاری گواہی کو رد کر دیں یا اس کو وہ اہمیت نہ دیں جس کی یہ سزاوار ہے۔ یہ بات اگرچہ ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے لیکن کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جائے گی کہ روئے سخن منافقین کی طرف ہے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا زبان سے اقرار تو کر لیا تھا لیکن اس اقرار کے تضمنات سے وہ گریز اختیار کرنے کی راہیں ڈھونڈھتے رہتے تھے۔

شاہد کا مفہوم

'شَاهِدٌ' کے معنی ہیں گواہی دینے والا، یعنی لوگوں کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے والا۔ عام طور پر لوگوں نے اس سے وہ گواہی مراد لی ہے جو آپ آخرت میں دیں گے لیکن ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آخرت میں حضرات انبیاء علیہم السلام جو گواہی دیں گے وہ اسی بنا پر تو دیں گے کہ انھوں نے اس دنیا میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دی ہے۔ اس گواہی پر الاحزاب کی آیات ۴۵-۴۶ کے تحت ہم بحث کر آئے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ حضرات انبیاء

جو گواہی آخرت میں دیں گے المآئدۃ کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلعم کی بعثت کا مقصد اور امت پر آپ کا حق

لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا۔ یہ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے اپنے رسول کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر اس مقصد سے بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی صبح و شام تسبیح کرو۔ ایمان سے مراد ظاہر ہے کہ سچا اور پکا ایمان ہے اللہ پر بھی اور اس کے رسول پر بھی۔ اس کے بعد صعودی ترتیب سے یعنی نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہوئے اس ایمان کے وہ تقاضے بیان ہوئے جو بالکل بدیہی ہیں۔ رسول پر ایمان کا یہ تقاضا بیان فرمایا کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس میں ان کے دست و بازو بنو اور ان کی توقیر و تعظیم اللہ کے رسول کی حیثیت سے کرو۔ پھر اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ بیان فرمایا کہ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں نے تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ، کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانا ہے۔ ان کے خیال میں اگر ضمیر مفعول کا مرجع رسول مانا جائے تو اس سے بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہاں ترتیب، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صعودی ہے، اس وجہ سے بُعد نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ و رسول پر ایمان کے مطالبہ کے بعد پہلے رسول کا حق اس نے بیان فرمایا کہ رسول کا ذکر ترتیب میں مؤخر تھا اس وجہ سے اس کے ذکر سے متصل ہی اس کا حق بیان فرما دیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حق بیان فرمایا۔ یہ ترتیب بیان قرآن میں جگہ جگہ اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اگر تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو اس سے کلام میں بعض خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جن سے کلام کو پاک ہونا چاہیے۔ مثلاً

ایک یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بیان کے سیاق و سباق میں ہے اس میں غایت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس مقصد سے شاہد اور مبشر و نذیر بنا کر بھیجا لیکن یہ تاویل اختیار کر لی جائے تو آیت آپ کے حقوق کے ذکر سے خالی رہ جاتی اور سیاق و سباق سے کٹ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں روئے سخن اصلاً منافقین کی طرف ہے جن کی اصلی کمزوری یہ تھی کہ وہ، ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، جہاد میں آپ کی نصرت اور آپ کی صحیح تعظیم و توقیر (جس کی وضاحت اگلی سورہ میں آئے گی) سے عاری تھے۔ یہ صورت حال مقتضی تھی کہ ان کو رسول پر ایمان کے یہ بدیہی تقاضے بتائے جائیں۔ اگر تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مانا جائے تو آیت اپنے موقع و محل سے بے تعلق ہو جائے گی۔

تیسری یہ کہ 'تعزیر' اور 'توقیر' کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ 'تُوَقِّرُوْهُ' کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ 'تُعَزِّرُوْهُ' بھی کہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے۔ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رسولوں ہی کے لیے ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو المائدۃ: ۱۲ اور الاعراف: ۱۵۷۔ الفاظ کی موزونیت پر ہم نے سورۂ محمد کی آیت ۲۷ کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں مختلف افعال استعمال ہوئے ہیں اور صرف نقل سے یہ متعین ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی فعل کا فاعل یا مفعول کون ہے۔ اس چیز کا تعلق زبان کے ذوق سے ہے۔ اگر اس کا پورا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس سے آیات کی تاویل میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْرًا عَظِيْمًا (۱۰)

رسول کے ہاتھ پر بیعت کی ذمہ داریاں

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تائید ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ تمھارے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کرتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے بیعت نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ بیعت کے وقت ان کے ہاتھوں کے اوپر جو ہاتھ ہوتا ہے وہ تمھارا نہیں بلکہ اللہ کا ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بیعت کر کے ان کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کریں گے اور اپنے عمل سے اس عہد کو توڑیں گے جس کو اپنے قول سے انھوں نے باندھا ہے تو یاد رکھیں کہ اس کا وبال انھی کے اوپر آئے گا اس لیے کہ اس معاہدے میں اصل فریق اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ بدعہدی کرنے والا خود ہی خسارے میں پڑتا ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص وہ ذمہ داری پوری کرے گا جس کے اٹھانے کا اس نے عہد کیا ہے وہ ہرگز خسارے میں نہیں رہے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس وہ اس کا بہت بڑا اجر پائے گا۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو بیعتِ رضوان سے متعلق سمجھا ہے حالانکہ اس کو بیعتِ رضوان سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ بیعتِ رضوان کا ذکر آگے آیت ۱۸ میں آئے گا۔ یہ سمع و طاعت کی اس عام بیعت کا ذکر ہے جو ہر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کرتا تھا۔ یہاں اس کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریاں منافقین کو غیرت دلانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ وہ رسول کے ہاتھ پر بیعت تو کر بیٹھے لیکن جب اس کے مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول کے ہاتھ پر بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے معاہدہ ہے۔ اگر کوئی اس بیعت کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ سے کیے ہوئے معاہدے کو توڑتا ہے۔

اور اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی ہے۔

ایک نحوی شبہ کا ازالہ

اس آیت میں عَلَيْهُ اللّٰهَ کی ضمیر مجرور پر جو ضمہ ہے اس کی بنا پر بعض مستشرقین نے قرآن کی نحو پر اعتراض کیا ہے۔ ان بیچاروں کو پتہ نہیں ہے کہ نحو کی کتابیں قرآن کے اسلوب و اعراب کو پرکھنے کے لیے کسوٹی نہیں ہیں بلکہ قرآن نحو کی کتابوں کے جانچنے کے لیے کسوٹی ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے اور ہر پہلو سے بالکل محفوظ بھی ہے۔ اس وجہ سے اگر اس کی کوئی چیز نحو کے ترجیحات کے خلاف نظر آئے گی تو اس کی بنا پر قرآن کو متہم نہیں کریں گے بلکہ اس کو اہل نحو کے تتبع کے نقص پر محمول کریں گے۔ سیبویہ فن نحو کا امام ہے۔ میرے استاذ مولانا فراہیؒ بھی اس کو امام مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کے متعدد مسائل پر کلام عرب کی روشنی میں تنقید کر کے بتایا ہے کہ معروف اسلوب وہ ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے نہ کہ وہ جو سیبویہ نے قرار دیا ہے۔

فصیح عربی میں صرف آہنگ و صوت کے تقاضوں کے تحت بھی الفاظ، حروف اور ضمیروں پر ایسے ایسے تصرفات ہوئے ہیں کہ اگر کسی شخص کا علم صرف نحو کی کتابوں ہی تک محدود ہو تو وہ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضمیروں ہی کا مسئلہ لیجیے۔ قرآن میں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ ضمیر لفظ کے اندر بالکل مدغم ہو کے رہ گئی ہے اور اس کی وجہ آہنگ و صوت کے تقاضے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مثلاً الاعراف کی آیت ۱۱۱ میں ہے: اَرْجِهْ وَاَخَاهُ (اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالو) اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵۲ میں ہے: يَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ (اللہ سے ڈرے اور اس سے تقویٰ اختیار کرے)۔

آیت زیر بحث میں جس طرح ضمہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے بعینہٖ یہی صورت سورۂ کہف آیت ۶۳ میں بھی ہے: وَمَا اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ (اور مجھے اس سے نہیں غافل کیا مگر شیطان نے) یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے خواہش مندوں کو آخری گروپ کی سورتوں میں بہت سی مثالیں ملیں گی کہ صرف آہنگ و صوت کے تقاضے سے حروف، الفاظ اور ضمیروں کی ہیئت میں ایسی تبدیلیاں ہو گئی ہیں جن کی اہل نحو کوئی توجیہ نہیں کر پاتے۔ یہاں بھی وہی صورت ہے۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْلَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۱)

منافقین کی پردہ دری

اب یہ وہ اصل بات ارشاد ہوئی ہے جس کے لیے اوپر کی تمہید استوار کی گئی ہے۔ فرمایا کہ جب تم اس سفر سے بخیریت گھر پہنچو گے تو بدویوں میں سے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے جھوٹے عذرات لے کر تمہارے پاس آئیں گے کہ مال مویشی کی ذمہ داریوں اور بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی مصروفیتوں

نے ہمیں آپ کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رکھا۔ ہماری مجبوریوں پر نگاہ فرما کر اس کوتاہی کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ ان لوگوں کی یہ معذرت درخورِ اعتنا نہیں۔ یہ زبانوں سے وہ بات کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا' یعنی ان لوگوں سے پوچھو کہ اگر اپنے مفادات و مصالح کی اتنی اہمیت ہے کہ ان کی خاطر خدا اور رسول کے حقوق نظر انداز کرتے ہو تو بتاؤ کہ خدا اگر تمہیں کوئی ضرر یا نفع پہنچانا چاہے تو اس کے مقابل میں کون آڑے آئے گا!

'بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا' یعنی اس قسم کے لاطائل عذرات کی آڑ میں چھپنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تمہارے تمام کارناموں سے، جو پس پردہ تم کرتے رہے ہو، اچھی طرح باخبر ہے۔

لفظ مخلف کا مفہوم

یہاں ان منافقین کے لیے لفظ 'مُخَلَّفُوْنَ' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے درآنحالیکہ یہ لوگ خود پیچھے رہ جانے والے تھے۔ اس کی وجہ ہم سورۂ برارت میں بسلسلۂ منافقین غزوۂ تبوک واضح کر چکے ہیں کہ جب ان لوگوں نے پیچھے بیٹھ رہنے ہی کو اپنی دانش مندانہ سیاست سمجھا تو اللہ نے بھی ان کو پیچھے پھینک دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ' (الصف ۵) یعنی یہ لوگ اپنی بزدلی کے سبب سے آگے بڑھنے والے نہ بنے۔ اس وجہ سے اللہ نے بھی ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ یہ لوگ زیادہ تر اطرافِ مدینہ کے دیہاتوں سے تعلق رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کے لیے لفظ 'اعراب' استعمال ہوا ہے جو اہل بدو کے لیے معروف ہے۔

'قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا' میں 'يَمْلِكُ' متضمن ہے 'يَمْنَعُ' کے معنی پر اور 'مِنْ' کا صلہ اس تضمین پر دلیل ہے۔ ترجمہ میں ہم نے لفظ کے اس مضمر مفہوم کو کھول دیا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا (۱۲)

منافقین کے دلوں کا اصلی بھید

اوپر والی آیت میں ان کے دلوں کے جس بھید کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اصل چیز جس نے تم کو اس سفر سے روکا وہ تمہارا یہ گمان تھا کہ اب کے قریش ان مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے اور کبھی ان کو اور ان کے پیغمبر کو اپنے اہل و عیال کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

'وَزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ' یعنی یہ گمان چونکہ تمہارا ایک دل پسند گمان تھا اس وجہ سے تم نے اپنے دلوں میں اس کو اچھی طرح آراستہ کیا اور سنتِ الٰہی کے مطابق یہ تمہارے دلوں میں اچھی طرح کھبا دیا گیا۔ پھر اس کے زیر اثر تم نے اسلام کے مستقبل سے متعلق نہایت بُرے بُرے گمان کیے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ بس اب چند دنوں کے اندر اندر اس کا قصہ تمام ہوا جاتا ہے۔

'وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا' یعنی تم تو اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے منتظر رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

تمھارے علی الرغم ان کو فتح مبین عطا فرمائی البتہ تم لوگ جو اس بات پر نازاں رہے کہ پیغمبر کا ساتھ نہ دے کر تم نے بڑی دانش مندانہ اور کامیاب سیاست اختیار کی، اپنے آپ کو ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے بنے۔

'بُوْرٌ' جمع ہے 'بَائِرٌ' کی۔ اس کے معنی ہلاک ہونے والے کے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَعِیْرًا (۱۳)

منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

یہ انہی منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے اللہ و رسول کے حقوق ادا کرنے کے معاملے میں ایسے بزدل اور اسلام کے غلبہ کے بجائے اس کی تباہی کی آرزوئیں اپنے دلوں میں پرورش کر رہے ہیں وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھنے والے نہیں بلکہ کافر ہیں اور یہ کافر لوگ یاد رکھیں کہ ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۱۴)

اور یہ لوگ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ خدا کی پکڑ سے کوئی اور بچانے والا نہیں ہو گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس کی اس بادشاہی میں شریک نہیں ہے۔ وہی جس کو چاہے گا بخشے گا، جس کو چاہے گا سزا دے گا۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا' البتہ یہ اطمینان ہر شخص کو رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ لوگوں کو پکڑنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان پر مہربانی کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو چاہیے کہ وہ غلط سہارے ڈھونڈنے کے بجائے اس کی رضا طلبی کی وہ راہ اختیار کریں جو اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے لوگوں کے لیے کھولی ہے۔

سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۵)

یعنی اس موقع پر تو یہ بزدل لوگ بہانے بنا کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہے لیکن آگے جب ایسے مواقع آئیں گے جن میں تم کو بغیر کسی جنگ کے بھرپور مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع ہو گی تو یہ بھی بڑے شیر مرد بن کر تمھارے پاس آئیں گے کہ انھیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح وہ چاہیں گے کہ اللہ نے ان کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس کو بھی بدل دیں اور بغیر کوئی خطرہ مول لیے مال غنیمت بھی حاصل کر لیں۔ فرمایا کہ جب اس طرح کا موقع آئے تو ان سے کہہ دینا کہ تم لوگ ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اللہ نے اسی طرح کا حکم تمھیں اس سے پہلے بھی دیا لیکن اس وقت تم اپنے گھروں میں بیٹھ

رہے تو اب ہمارے ساتھ نکلنے کے لیے کیوں بے چین ہو۔

'اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْھَا' سے خیبر وغیرہ کی ان غنیمتوں کی طرف اشارہ ہے جو واقعۂ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ ان غنیمتوں کے لیے مسلمانوں کو کوئی خاص جنگ نہیں کرنی پڑی بلکہ دشمن نے مسلمانوں سے مرعوب ہو کر خود ہی میدان خالی کر دیا۔ خیبر کے یہودی بڑے مالدار تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو کثیر تعداد میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ 'لِتَاْخُذُوْھَا' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ گویا مسلمان گھروں سے نکلے ہی اس لیے کہ بغیر لڑے بھڑے مالِ غنیمت باندھ کر واپس آ جائیں۔

'یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰہِ'۔ یعنی یہ منافقین اس طرح کے مواقع پر ساتھ دینے کی پیشکش کر کے یہ چاہیں گے کہ اللہ کی اس بات کو بدل دیں جو ان کے بارے میں اس نے فرمائی ہے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے جو اوپر آیت ۶ میں بدیں الفاظ ارشاد ہوئی ہے: 'وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِکِیْنَ وَالْمُشْرِکٰتِ الظَّآنِّیْنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَیْھِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَلَعَنَھُمْ وَاَعَدَّ لَھُمْ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا' (اور تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرکین و مشرکات کو جو اللہ کے باب میں برے گمان رکھنے والے ہیں۔ برائی کی گردش انہی پر ہے! اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم اس نے تیار کر رکھی ہے! اور وہ برا ٹھکانا ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں دین کے لیے کچھ کرنا تو نہ پڑے لیکن دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے فوائد ان کو حاصل ہوں لیکن ان کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے۔ ان کے باب میں اللہ کی بات اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک وہ اپنی حالت دین کے صحیح تقاضوں کے مطابق بدل نہ لیں۔

'قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ'۔ یعنی اگر وہ تمہارے ساتھ نکلنے کی اجازت چاہیں گے تو ان کو اجازت نہ دیجیو بلکہ ان سے صاف صاف کہہ دیجیو کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ اسی طرح کا حکم تو اللہ نے تم کو پہلے دیا تھا لیکن تم نے اس کی تعمیل نہ کی بلکہ دبک کر گھروں میں بیٹھ رہے۔ ہمارے نزدیک یہ اشارہ عمرہ کی اس منادیٔ عام کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کرائی لیکن ان منافقین نے اس کی تعمیل سے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے واضح ہوا، گریز اختیار کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس سے پہلے تم رسول اور مسلمانوں کے ساتھ نکلنے سے گریز اختیار کر چکے ہو تو اب اس کے لیے اتنے کیوں بے قرار ہو؟ کیا اس لیے کہ اب کے تمہیں بغیر کسی خطرے کے لقمۂ تر کی توقع ہے۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے 'کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ' سے اس قول کو مراد لیا ہے جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت ۸۲ میں ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا ذکر ہے جنہوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر بزدلی دکھائی تھی۔ یہ غزوہ، حدیبیہ کے واقعہ کے بہت بعد پیش آیا اور یہاں اشارہ کسی ایسے واقعہ کی طرف ہے جو حدیبیہ سے پہلے پیش آیا ہو۔ 'مِنْ قَبْلُ' کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

'فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ... الاية' یعنی اگرچہ یہ لوگ اجازت نہ دینے پر بہت جزبز ہوں گے اور حسد کرنے کا طعنہ دیں گے لیکن ان کے اس طعنہ کی مطلق پروا نہ کی جائے اس لیے کہ یہ نہایت کم فہم لوگ ہیں۔ اپنی کم فہمی کے سبب سے یہ چاہتے ہیں کہ دین کے نام پر فوائد تو سب حاصل کریں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، لیکن قربانی ان کو کوئی نہ دینی پڑے۔ ان پر اب یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ ان کی اس طرح کی طفلانہ آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶)

منافقین کے لیے امتحان کی ایک کسوٹی

یہ ان منافقین کے سامنے امتحان کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی گئی ہے کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ اگر تم فی الواقع اللہ و رسول کے وفادار ہو تو اس کا ثبوت تم اس طرح نہیں پہنچا سکتے کہ بغیر کوئی خطرہ مول لیے مالِ غنیمت حاصل کرنے کی توقع کرو بلکہ آگے وقت آ رہا ہے جب تمہیں ایک طاقتور گروہ سے جنگ کی دعوت دی جائے گی جس سے تمہیں اس عزم کے ساتھ جنگ کرنی پڑے گی کہ یا تو وہ اسلام قبول کرے یا تلوار۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کی اور اس دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں نہایت اچھا صلہ دے گا اور اگر تم اس وقت بھی بزدل ثابت ہوئے، جیسا کہ اس سے پہلے ثابت ہو چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہایت دردناک عذاب دے گا۔

بیت اللہ کی آزادی کے لیے قریش سے فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی

'قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' سے مراد قریش ہیں۔ عرب میں انہی کی قوت و صولت ایسی تھی جس کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ موزوں ہو سکتے ہیں۔ ان سے اگرچہ جنگ بندی کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن بیت اللہ کو ان کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

مشرکین عرب کے لیے دو ہی راہیں تھیں، اسلام یا تلوار

'تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ' قریش کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ براہ راست ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث کر کے، انہی کی زبان میں، ان پر حجت تمام کر دی تھی اس وجہ سے ان کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ گئی تھیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسری قوموں کے لوگ ذمی اور معاہد بنائے جا سکتے تھے لیکن مشرکین بنی اسماعیل کے لیے اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ غلام بھی نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ بنی اسماعیل کے معاملے کی اس خاص نوعیت پر سورۂ براءت میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

'وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ'۔ یعنی اگر اس وقت بھی تم نے وہی بزدلی دکھائی جو اس سے پہلے عمرہ کے موقع پر دکھا چکے ہو تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح کا دردناک عذاب

دے گا جس طرح کا عذاب اس نے اسلام کے کھلے ہوئے معاندین کے لیے مقدّر کر رکھا ہے۔

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ ط وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج وَمَنْ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۷)

معذورین کا بیان

یہ ان معذورین کا بیان ہے جن کی جہاد سے غیر حاضری نفاق پر محمول نہیں کی جائے گی۔ فرمایا کہ اندھے، لنگڑے اور مریض پر کوئی الزام نہیں ہے اگر وہ جہاد میں حصہ نہ لے سکیں، بشرطیکہ وہ صدق دل سے اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں۔ اگر وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو اپنی اس مجبورانہ کوتاہی خدمت کے سبب سے جنت سے محروم نہیں کیے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں داخل کرے گا اور اگر وہ اللہ و رسول سے اعراض کی روش اختیار کریں گے تو وہ بھی اسی دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے جو دوسرے کفار و معاندین کے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔

ان معذورین کا بیان سورۂ توبہ کی آیات ۹۱-۹۳ میں بھی ہوا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں اس کے بعض وہ پہلو واضح ہو گئے ہیں جو یہاں واضح نہیں کیے گئے ہیں۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۙ وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا (۱۸-۱۹)

جان بازوں کا صلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکنے کے بعد اس بیعت کے حقوق سے گریز اختیار کرنے والوں کے ذکر کے بعد یہ ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے نہایت نازک حالات میں آپ کے ہاتھ پر حدیبیہ میں جہاد کی بیعت کی اور اس بیعت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان بیعت کرنے والوں کے ذکر کا آغاز ہی 'لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ' کے الفاظ سے فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جانبازوں کی اس بیعت ہی نے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ایسی قدر کی جگہ پائی کہ ان کے لیے ابدی خوشنودی کا اعلان ہو گیا۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں یہ بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیعت جن حالات میں آپ نے کی اور مسلمانوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ، عین دشمن کے مرکز میں، یہ بیعت کی، اس کی طرف ہم سورہ کی تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

اہل ایمان پر سکینت کا نزول

'اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ'۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت کیکر کے ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ 'الشَّجَرَةِ' سے اشارہ کیکر کے اسی درخت کی طرف ہے۔ اس اشارے سے مقصود غربت و مسافرت کی اس حالت کو سامنے لانا ہے جس میں اسلام کی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ پیش آیا۔

'فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ'۔ اس بیعت میں شرکت کرنے والے مسلمانوں

کی تعداد چودہ پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ عمرہ کی پابندیوں کے سبب سے وہ نہتے بھی تھے۔ صرف حمیتِ دینی کے تقاضے سے، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بھروسے پر، قریش کی زبردست طاقت سے ٹکر لینے کے لیے وہ کمربستہ ہو گئے۔ ایسے حالات میں ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ و انابت کی جو حالت طاری رہی ہو گی اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے! اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان کی دلداری کے لیے خاص اپنے پاس سے ان پر سکینت و طمانیت نازل فرمائی۔ یہ بات اس سنتِ الٰہی کے مطابق ہوئی جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جب اللہ کے بندے اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ظاہری حالات خواہ کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن ربِ کریم ان کی حوصلہ افزائی فرماتا ہے اور یہی حوصلہ افزائی وہ اصل قوت ہے جس کو کوئی طاقتور سے طاقتور دشمن بھی شکست نہیں دے سکتا۔

حدیبیہ کے بعد کی فتوحات کی طرف اشارہ

'وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا'۔ یہ اشارہ فتح خیبر اور ان غنائم کی طرف ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد معاً مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کے دلوں کے اندر یہ اعتماد راسخ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فتح و نصرت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ پورے ہوں گے اور حدیبیہ کا معاہدہ ان کی شکست نہیں بلکہ فتح مبین ہے اور یہ فتح مبین ان شاء اللہ فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوگی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان صفات کا حوالہ دیا ہے جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ اس کے تمام وعدے ضرور پورے ہوں گے۔ ظاہری حالات خواہ کتنے ہی نامساعد ہوں لیکن اس کی قدرت و حکمت ہر چیز پر غالب ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۲۰)

اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمائی گئی تھی، یہ بات مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمائی گئی کہ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کو تم مستقبل قریب میں حاصل کرو گے۔ ان وعدوں کی تصدیق کے لیے اللہ نے تمھیں یہ نقد نقد غنیمت بخش دی تاکہ تمھارے لیے یہ حوصلہ افزائی کا ذریعہ اور اسلام کے غلبہ کی ایک نشانی ہو۔

'فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ' سے مفسرین نے خیبر کی غنیمت مراد لی ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ خیبر کی فتح کا واقعہ حدیبیہ سے واپسی کے معاً بعد ہوا ہے۔

'وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ'۔ 'النَّاس' سے مراد قریش ہیں۔ معاہدۂ حدیبیہ میں دونوں فریق، مسلمان اور قریش یہ پابندی قبول کر چکے تھے کہ دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی اقدام نہیں کریں گے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ انھیں خیبر کے یہودیوں کے خلاف اقدام کے لیے ایک

اچھا موقع مل گیا اور وہ یہ خیال کر کے کہ اب ان کو قریش کی پشت پناہی نہیں حاصل ہو سکے گی بڑی جلدی حوصلہ ہار بیٹھے۔ اس طرح معاہدۂ حدیبیہ نے مسلمانوں کے لیے ایک قریبی فتح کی راہ کھول دی اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی شکست نہیں بلکہ درحقیقت ایک فتح عظیم اور آئندہ کی فتوحات کا دیباچہ ہے۔

'وَلِتَكُونَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ' یہاں معطوف علیہ عربی کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ یعنی اللہ نے خیبر کی یہ نقد نقد غنیمت مسلمانوں کو اس لیے عطا فرمائی کہ یہ ان کے لیے معاہدۂ حدیبیہ کے فتح مبین ہونے کی بھی ایک دلیل ہو اور مستقبل میں اسلام کے غلبہ و تمکن کی بھی ایک نشانی کا کام دے۔

فتح مکہ کی بشارت

'وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا' یہ ٹکڑا آیت ۲ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تکمیل دین کی نعمت سے سرفراز فرمائے گا اور اپنے بندوں کے لیے ہدایت کی وہ صراط مستقیم پھر کھول دے گا جو اعدائے حق نے بند کر رکھی تھی۔ اس صراط مستقیم کے لیے اصلی نشان راہ کی حیثیت چونکہ خانہ کعبہ کو حاصل تھی اس وجہ سے اس میں کفار کے تسلط سے اس کے آزاد ہونے کی بشارت بھی مضمر ہے۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۲۱)

یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ایک دوسری اور بھی بہت بڑی کامیابی ہے جس کا اللہ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ یہ کامیابی اگرچہ تم ابھی حاصل نہیں کر سکے ہو لیکن اس کے حصول میں بھی اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور جس کا اللہ نے احاطہ کر رکھا ہو وہ چیز قابو سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ بہت جلد یہ کرشمہ بھی اپنی نصرت کا دکھا دے گا۔

۷۔ آگے آیات ۲۲-۲۶ کا مضمون

آگے مسلمانوں کو اس بات کی اطمینان دہانی فرمائی گئی ہے کہ اگر قریش اس موقع پر جنگ کرتے تو وہ خود ہی منہ کی کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ابھی اس جنگ کی نوبت نہ آئے تاکہ ان مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے جو مکہ میں گرفتار بلا ہیں۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کی وہ اخلاقی برتری نمایاں فرمائی ہے جو ان کو اس نازک موقع پر کفار کے مقابل میں حاصل ہوئی اور جس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اب قریش کی حمیت جاہلیت کی عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲-۲۶

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا

وَلَا نَصِيرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٢٤﴾ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٢٥﴾ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾ ع ۳

ترجمۂ آیات ۲۲-۲۶

اور اگر یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تم سے جنگ کرتے تو پیٹھ دکھاتے، پھر نہ کوئی کارساز پاتے نہ مددگار۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور اللہ کی سنت میں تم کوئی تبدیلی نہیں پا سکو گے۔ ۲۲-۲۳

اور وہی ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے وادیٔ مکہ میں بعد اس کے کہ تم کو ان پر غلبہ دے دیا تھا اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ ۲۴

وہی ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روکے رکھا کہ وہ اپنی جگہ پر نہ پہنچنے پائیں اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے پس ان کے باعث تم پر لاعلمی میں الزام آتا تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے لیکن اللہ نے یہ اجازت اس لیے نہ دی کہ جن کو وہ چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ان لوگوں کو ان میں سے دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا۔ ۲۵

اس وقت کا خیال کرو جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی جاہلیت کی حمیت۔ تو اللہ نے اپنی طمانیت نازل فرمائی اپنے رسول اور ایمان والوں پر اور ان کو پابند رکھا تقویٰ کی بات کا اور یہ اس کے حقدار اور سزاوار تھے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۲۲)

مڈبھیڑ ہوتا تو قریش کی شکست یقینی تھی

یہ مسلمانوں کو تسلی اور قریش کو تنبیہ ہے کہ خدا نے حدیبیہ کے موقع پر تمھیں جنگ کی جو اجازت نہیں دی تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جنگ میں تمھاری شکست کا کوئی اندیشہ تھا۔ اگر جنگ ہوتی تو تم نہیں بلکہ تمھارے یہ حریف ہی پیٹھ دکھاتے اور اس طرح پٹتے کہ کوئی کارساز و مددگار ان کو سہارا دینے والا نہ ملتا۔ اس وجہ سے ان کے لیے مغرور ہونے اور اس معاہدے کو تمھاری کمزوری پر محمول کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے بلکہ انھیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان کو حالات پر غور کرنے کی کچھ مہلت دے دی۔

[illegible]

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۳)

یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ

نے ٹھہرا رکھی ہے کہ جب ان کا پیمانہ بھر جاتا ہے تو ان پر ایسی مار پڑتی ہے کہ پھر کہیں بھی وہ پناہ نہیں پاتے اور یہ سنت ایسی حتمی اور اٹل ہے کہ کبھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تمام رسولوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۲۴)

حدیبیہ کے موقع پر جو کچھ ہوا تدبیر الٰہی سے ہوا

'بطن مکۃ' سے اشارہ حدیبیہ کی طرف ہے۔ یہ بالکل مکہ کے دامن میں ہے اس وجہ سے اس کو 'بطن مکہ' سے تعبیر فرمایا۔

یعنی اس موقع پر جنگ کی نوبت جو نہیں آئی تو یہ تدبیر الٰہی کا کرشمہ ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا تھا، جنگ ہوتی تو ان کو منہ کی کھانی پڑتی، لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی یہ جنگ نہ ہو اس وجہ سے اس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے۔

'وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا' یعنی اللہ تعالیٰ سارے حالات کا خود جائزہ لے رہا تھا اس وجہ سے یہ جو کچھ ہوا اس کی حکمت کے مطابق ہوا اور اسی میں تمہاری بہتری ہے۔

مسلمانوں کے حوصلہ نے قریش کے اعصاب ڈھیلے کر دیے

'مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ' یعنی اخلاقی پہلو سے بھی تمہاری برتری ان کے مقابل میں نمایاں تھی اور عزم و حوصلہ کے اعتبار سے بھی تم ان پر حاوی رہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و جذبہ کی اطلاع ہوئی جس کا اظہار انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے کیا تو ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً وفد بھیج کر صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ اس وفد نے اپنی آن رکھنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑنے کا دم خم نہیں رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ازخود معاہدے میں یہ بات تسلیم کر لی کہ اگلے سال جب مسلمان عمرہ کے لیے آئیں گے تو وہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵)

جنگ کی نوبت نہ آنے دینے کی حکمت

یہ حکمت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جنگ نہیں ہونے دی۔ فرمایا کہ اگرچہ قریش کی زیادتیاں بالکل کھلی ہوئی تھیں، انھوں نے دعوتِ حق کا انکار کیا، اہل ایمان کو مسجد حرام کی حاضری سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو ان کے قربان ہونے کی جگہ پہنچنے کی اجازت

نہ دی لیکن ان تمام گستاخیوں اور تعدّیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی مسلمان ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں۔ اس کی سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ مکہ میں ایسے بہت سے اہلِ ایمان تھے، مرد بھی اور عورتیں بھی، جن سے مسلمان واقف نہیں تھے، اندیشہ تھا کہ اگر وہ حملہ کرتے تو کفار کے ساتھ یہ مظلوم اہلِ ایمان بھی نادانستہ ان کی زد میں آجاتے جس سے ان کے اوپر اپنے بھائیوں کے خون کا الزام آتا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ان اہلِ مکہ میں ایسے لوگ بھی بہت سے تھے جو اگرچہ ابھی ایمان نہیں لائے ہیں لیکن وہ ایمان کے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو بھی اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔

'لَوْ تَزَیَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا'۔ فرمایا کہ اگر یہ اہلِ ایمان ان سے الگ ہو چکے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کفارِ قریش کو اپنے دردناک عذاب کا مزا چکھا دیتا۔

اس دردناک عذاب سے مسلمانوں کا حملہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور اس طرح کا کوئی عذاب بھی جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں پر آیا۔ ان کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ جب انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ان کے اندر سے الگ کر لیا اور باقی پوری قوم کو تباہ کر دیا۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی ایسی قوم سے جنگ کرنی پڑ جائے جس کے اندر مسلمان بھی ہوں تو انھیں حتی الامکان یہ کوشش کرنی ہوگی کہ مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ البتہ اگر دشمن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے، مثلاً وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے محاذ پر لا کھڑا کرے یا اپنے کو بچانے کے لیے ان کو سپر کے طور پر استعمال کرے یا مسلمان خود ہی وطنی عصبیت یا کسی دنیوی مصلحت سے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آکھڑے ہوں تو ان حالات میں اسلام اور ملت کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا اگرچہ اس سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو نقصان بھی پہنچ جائے۔

قریش کی ایک سنگین گستاخی کی طرف اشارہ

آیت میں 'ھدی' کے ساتھ 'مَعْکُوْفًا' صورتِ حال کی نزاکت کے اظہار کے لیے ہے کہ باوجودیکہ قریش کی یہ حرکت نہایت گستاخانہ تھی کہ بادشاہِ کائنات کے حضور میں پیش کرنے کے لیے جو ہدیے لائے گئے ان کو انھوں نے روک دیا اور وہ قربان گاہ تک نہ پہنچنے پائے تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی ان کو اس گستاخی کی سزا نہ دی جائے تاکہ جو مسلمان ان کے اندر محصور ہیں ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

آیت میں 'لَوْ' کا جواب محذوف ہے اور یہ حذف متکلم کے شدتِ غضب پر دلیل ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ آگے کے ٹکڑے 'لَوْ تَزَیَّلُوْا ..... الایۃ'

نے اس خوف کو کھول دیا ہے۔

'تُمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ' میں 'اَنْ تَطَئُوْ' ضمیر 'ھُمْ' سے بدل پڑا ہوا ہے یعنی اندیشہ تھا کہ تم ان کو پامال کر دینے سے بے خبر رہ جاتے اور اس طرح بے خبرانہ تمہارے اپنے ہی بھائیوں کا خون خود تمہارے ہی ہاتھوں بہہ جاتا۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (۲۶)

نہایت نازک حالات میں مسلمانوں نے اخلاقی برتری کا ثبوت دیا

یہ مسلمانوں کی اخلاقی برتری واضح فرمائی ہے کہ ہر چند قریش نے قدم قدم پر حمیتِ جاہلیت کا مظاہرہ کیا جس سے مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو بھی اور مسلمانوں کو بھی یہ توفیق بخشی کہ وہ ان نازک حالات سے نہایت صبر و سکون اور حلم و تدبّر کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، حریف کی اوچھی حرکتوں سے متاثر ہو کر کوئی ایسا قدم انھوں نے نہیں اٹھایا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور دین کے مصالح کے خلاف ہو۔

'سَكِیْنَت' سے مراد یہاں صبر، حلم، رزانت اور حکمت و تدبّر ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایسے مراحل بہت پیش آتے ہیں جب کسی جماعت کے حلم و تدبّر کا نہایت سخت امتحان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اگر جماعت حریف کے رویّہ سے مشتعل ہو کر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دے تو اس سے اصل مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ایسے امتحانات سے کوئی جماعت اور اس کے لیڈر حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور یہ توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر حال میں اپنے رب سے وابستہ رہتے ہیں۔

قریش کی طرف سے حمیتِ جاہلیت کا مظاہرہ

'حمیتِ جاہلیت' سے اشارہ قریش کے لیڈروں کی ان حرکتوں کی طرف ہے جو انھوں نے حق و عدل کے بالکل خلاف محض اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے کیں۔ مثلاً

ان پر یہ حقیقت واضح تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف عمرہ کے لیے تشریف لائے ہیں، جنگ کا نہ آپ کے دل میں کوئی خیال ہے، نہ اس کا آپ کے پاس کوئی سامان ہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح آپ کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے اور اس کے حضور میں اپنے لائے ہوئے ہدیے پیش کرنے کی اجازت دینے پر راضی نہ ہوئے۔

حضورؐ نے اپنے جو سفیر ان کے پاس اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجے ان کی سفارتی حیثیت کا نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ان میں سے ایک سفیر کے وہ قتل کے درپے ہو گئے اور دوسرے کو انھوں نے اس طرح لیت و لعل میں رکھا کہ مسلمانوں کے اندر

یہ افواہ پھیل گئی کہ اس کو بھی انھوں نے قتل کر دیا۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط طے کرنے میں انھوں نے بالکل بے ضرورت الجھنیں پیدا کیں اور ایسی شرطیں اس میں داخل کرنے پر اصرار کیا جن کا کوئی سیاسی فائدہ ان کو حاصل نہیں ہوا بس وقتی طور پر ان کو یہ تسلی ہو گئی کہ ان کی بات اونچی رہی۔

مسلمانوں کا علم اور تقویٰ

قریش کے اس رویہ کا قدرتی ردِ عمل مسلمانوں پر یہی ہو سکتا تھا کہ وہ اشتعال میں آ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں لیکن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کے فیض سے وہ اللہ اور رسول کے فیصلہ پر راضی رہے۔

'وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى' یعنی قریش کی ان تمام اشتعال انگیز حرکتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلمۂ تقویٰ' کا پابند رکھا۔ 'کلمۂ تقویٰ' سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جاں نثار صحابہؓ کا یہ اعتراف و اعلان ہے کہ 'رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا'۔ یہی کلمہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں ہمیشہ صداقت شعار اور باوفا مسلمانوں کی سپر رہا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے جب کبھی ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں رسول کی کوئی بات بظاہر خلافِ مصلحت محسوس ہوتی ہے تو انھوں نے اس کو ایک وسوسہ خیال کیا اور اس وسوسہ کو اسی اعتراف سے رفع کیا۔ یہی عظیم کلمہ اس نازک موقعہ پر بھی مسلمانوں کی ڈھال بنا اور وہ رسول کے فیصلہ پر راضی رہے اگرچہ ان کے جذبات اور ان کی امنگوں کا مطالبہ کچھ اور تھا۔

'وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا' یعنی اس کلمۂ تقویٰ پر استقامت ہر مدعی کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ انہی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے حق دار اور اہل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ چونکہ اس کے حق دار اور اہل تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان نازک حالات کے اندر بھی استوار رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ایمان کو ضائع نہیں ہونے دیتا جو اپنے ایمان کی قدر کرتے اور ہر قسم کے حالات کے اندر اس پر استوار رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا' یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال سے بے خبر نہیں رہتا۔ وہ ان آزمائشوں سے بھی باخبر رہتا ہے جن میں وہ ڈالے جاتے ہیں اور ان حالات و احساسات سے بھی پوری طرح آگاہ رہتا ہے جن سے وہ گزرتے ہیں۔ اگر بندے اپنا وہ فرض ادا کرتے ہیں جو ان سے مطلوب ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ہر کام پر ان کا مددگار و کارساز بنتا ہے۔

۹۔ آگے آیات ۲۷-۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے یہ واضح فرمایا ہے کہ رسول نے جو رؤیا دیکھی وہ

بالکل سچی تھی۔ اس کی تعبیر کے ظہور میں جو تاخیر ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد تورات اور انجیل میں اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی جو پیشین گوئیاں ہیں ان کا حوالہ ہے تاکہ مسلمانوں کو تسلی بھی حاصل ہو اور وہ اپنے آپ کو ان صفات سے آراستہ بھی کریں جو پچھلے صحیفوں میں ان کی بیان ہوئی ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۷-۲۹

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝۲۷ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ (معانقہ) وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹

ع ۴ ۱۲

ترجمۂ آیات ۲۷-۲۹

اللہ نے اپنے رسول کو مبنی برحقیقت رؤیا دکھائی۔ بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈائے اور کترائے ہوئے، تمھیں کوئی اندیشہ نہیں ہو گا، بس اس نے جانی وہ بات جو تم نے نہیں جانی تو اس سے

پہلے اس نے تمھیں ایک فتح قریب سے نوازا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے سارے دینوں پر اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔ ۲۷-۲۸

محمدؐ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود میں سرگرم پاؤ گے۔ ان کا امتیاز ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے ہے۔ ان کی یہ تمثیل تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی تمثیل یوں ہے کہ جیسے کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کو سہارا دیا، پھر وہ سخت ہوئی پھر وہ اپنے تنہ پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو موہتی ہوئی تاکہ کافروں کے دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے مغفرت اور ایک اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ ۲۹

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (۲۷)

نبی صلعم کی رؤیا بنی بر حقیقت تھی

پیچھے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کا ارادہ اپنی ایک رؤیا کی بنا پر فرمایا تھا اس وجہ سے لوگوں کو توقع تھی کہ ان کا یہ سفر بامراد رہے گا لیکن جب نتیجہ توقع کے خلاف نکلا تو بہتوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ نبی کی رؤیا تو غلط نہیں ہوتی تو آخر ہم کو اس سفر سے بے نیلِ مرام کیوں لوٹنا پڑا؟ اسی سوال کے جواب کے لیے صلح حدیبیہ کی مذکورہ بالا مصلحتیں واضح فرمائی گئیں۔ آخر میں بہ خاص اس رؤیا کا حوالہ دے کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جو رؤیا دکھائی وہ بالکل

سچی اور مبنی بر حق رؤیا ہے۔ اس کے مبنی بر حق ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں نہایت امن کے ساتھ، سر گھٹائے اور کترائے ہوئے داخل ہو گے اور تمھیں کسی کی طرف سے کسی مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے عمرہ کی راہ خود معاہدے کی رو سے صاف ہو گئی۔ بس صرف اتنا فرق پڑا کہ اس سال نہیں بلکہ اگلے سال یہ سعادت حاصل ہوگی اور یہ التوا بھی رؤیا کے خلاف نہیں ہوا۔ اس لیے کہ رؤیا میں یہ وعدہ نہیں تھا کہ یہ عمرہ اسی سال لازماً ہوگا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ رؤیا میں یہ وعدہ تو نہیں کیا گیا تھا کہ ہم اسی سال عمرہ کریں گے۔ گویا رؤیا میں جو وعدہ فرمایا گیا وہ غلط نہیں ہوا بلکہ یہ ہوا کہ اس سال عمرہ کی راہ اچھی طرح ہموار کر دی گئی تاکہ آئندہ سال مسلمان آئیں تو انھیں کوئی خطرہ نہ پیش آئے۔ 'بِالْحَقِّ' کا تعلق 'رؤیا' سے ہے یعنی یہ رؤیا کوئی خواب پریشاں کے قسم کی چیز نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت رؤیا تھی۔

'مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ' سر منڈانا یا کترانا حج و عمرہ کے آداب میں سے ہے۔ اس کی حکمت پر اس کے محل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ ان دونوں میں سے افضلیت تو سر منڈانے کو حاصل ہے لیکن باعتبار حالات قصر کی بھی اجازت ہے۔ اس وجہ سے دونوں ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ جماعت دونوں ہی طرح کے زائرین پر مشتمل ہوگی جو عبدیت و تذلل کے اس نمایاں نشان کے ساتھ اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں داخل ہوں گے اور بے خوف و خطر داخل ہوں گے۔

التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف اشارہ

'فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا' یہ اشارہ التوائے عمرہ کی مصلحتوں کی طرف ہے جن کا ذکر آیت ۲۵ میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصلحتیں تمھارے علم میں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تھیں اس وجہ سے اس نے یہ تو نہیں پسند فرمایا کہ تم اسی سال قریش پر فتحیاب ہو کر عمرہ کرو لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس سال بھی تم عمرہ کے لیے نکلو تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں ایک 'فتح قریب' سے سرفراز کرے جو آگے حاصل ہونے والی فتوحات کی راہ بھی کھول دے اور تمھارا عمرہ بھی امن و اطمینان کی حالت میں ہو۔

'فتح قریب' سے مراد معاہدۂ حدیبیہ ہے

'فتح قریب' سے عام طور پر لوگوں نے 'فتح خیبر' کو مراد لیا ہے لیکن میرے نزدیک اس سے معاہدۂ حدیبیہ ہی مراد ہے جس کو اسی سورہ کی تمہید میں 'فتح مبین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس 'فتح مبین' کی برکات پر، ہم قرآن کی روشنی میں، پیچھے جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہی 'فتح قریب'، فتح مکہ کا دیباچہ ثابت ہوئی۔ فتح مکہ ابھی کچھ دور تھی لیکن معاہدۂ حدیبیہ نے، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزر چکی ہے، اس کی راہ ہموار کر دی تھی اس وجہ سے اس کو 'فتح قریب' سے تعبیر فرمایا۔ گویا اس کے بعد اب وہی اصلی فتح ظاہر ہونے والی ہے جو ابھی اگرچہ ظاہر نہیں ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے

اس کو، جیسا کہ آیت ۲۱ میں اشارہ فرمایا، اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (۲۸)

اسلام کے غلبہ کی بشارت

یہ آیت معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ توبہ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ صف میں بھی آئے گی۔ سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہم اس کے موقع و محل اور اس کے مدعا کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہ دوسرے الفاظ میں فتح مکہ کی بشارت ہے اس لیے کہ اسی کی فتح پر پورے ملک کے اندر دینِ حق کے غلبہ کا انحصار تھا چنانچہ اس کے فتح ہو جانے کے بعد تمام ادیان، جو عرب میں موجود تھے، اسلام کے آگے سرنگوں ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت کے اندر وہ وقت آ گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اس ملک میں دو دین مجتمع نہیں ہو سکتے۔ فرمایا کہ اسی خدا نے، جس نے اپنی وہ شانیں دکھائی ہیں، جو اوپر بیان ہوئیں، اپنے رسول کو اپنی ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے، نہ اس کو مشرکین بدل سکتے اور نہ یہود و نصاریٰ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سب کے علی الرغم نافذ ہو کے رہے گا۔ سورۂ توبہ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۳۲-۳۳)	(یہود و نصاریٰ) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں لیکن اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ ان کافروں کے علی الرغم اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے مشرکوں کے علی الرغم!

اس آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اوپر والی آیت میں اہلِ کتاب کو چیلنج ہے اور نیچے والی آیت میں مشرکینِ عرب کو۔ سرزمینِ عرب میں انہی گروہوں سے اسلام کا مقابلہ تھا۔ بعد میں یہ میدانِ مقابلہ بہت وسیع ہو گیا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان اسلام کے حامل رہے ہر جگہ اللہ نے ان کے دین کو غالب کیا۔

وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۔ یعنی اس بشارت کو مخالفین خواہ کتنا ہی بعید از قیاس سمجھیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یہ مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم مخالفین کی مخالفت اور حالات کی ناسازگاری سے ذرا بھی ہراساں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کے

رہے گا۔ سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت میں جو بات وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ اور وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں دوسرے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۲۹)

ان تمثیلات کا حوالہ جو اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق سابق صحیفوں میں ہیں

یہ آخر میں ان تمثیلوں کا حوالہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی صفات اور اسلام کے تدریجی غلبہ سے متعلق تورات و انجیل میں وارد ہیں۔

اس حوالہ سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو سابق صحیفوں کے آئینہ میں اس کی تصویر دکھا دی جائے تاکہ ان کو بشارت بھی حاصل ہو اور وہ اپنی ان صفات سے اچھی طرح آشنا بھی ہو جائیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو متصف دیکھنا چاہا ہے اور جو خلق میں ان کو متعارف کرانے والی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اہل کتاب کو متنبہ کیا جائے کہ وہ جان کر انجان بننے اور حق کو چھپانے کی کوشش نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے سے اس لیے آگاہ کیا تھا کہ جب وقت آئے گا وہ شہادت دینے والے بنیں گے۔ لیکن یہ ان کی بدبختی ہے کہ وہ شہادت دینے کے بجائے مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرا یہ کہ مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین میں ان کو غلبہ تو ضرور عطا فرمائے گا لیکن یہ غلبہ بالتدریج ظہور میں آئے گا۔ نہ انھیں جلد بازی کرنی چاہیے نہ حالات سے مایوس ہونا چاہیے۔ جو بیج انھوں نے ڈالا ہے صبر و استقامت کے ساتھ اس کی آبیاری اور دیکھ بھال میں لگے رہیں۔ وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسا تناور درخت بنائے گا کہ ایک دنیا اس کے سایہ میں پناہ لے گی۔

تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ

'مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ' کا ترجمہ عام طور پر مترجموں نے مبتدا اور خبر کا کیا ہے لیکن میرے نزدیک 'رَسُولُ اللَّهِ' یہاں صفت اور عطف بیان کے حکم میں ہے۔ خبر اس کی آگے 'أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ... الآیۃ' ہے۔ یہ تورات میں وارد ایک تمثیل کی طرف اشارہ ہے جس میں پورے زمرۂ مومنین کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں گل سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر 'رَسُولُ اللَّهِ' پر وقف اور 'وَالَّذِينَ مَعَهُ' سے استیناف مان لیا جائے تو آیت کی یہ بلاغت ختم ہو جائے گی۔ اس پورے گروپ کا اصل جمال اسی صورت میں نمایاں ہو گا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سرتاج کی حیثیت حاصل رہے جیسی کہ فی الواقع ہے۔

چٹان کی طرح سخت ریشم کی طرح نرم

'وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ' یہ آپ کی اور آپ کے صحابہؓ کی ایک

امتیازی خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ وہ کفار کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط و سخت اور باہمدگر موم کی طرح نرم ہیں۔ یعنی ان کی تمام حمیت و عصبیت ایمان و اسلام پر قائم ہے۔ جو ایمان و اسلام میں ان کے شریک نہیں ہیں وہ اگر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی گنجائش نہیں پائیں گے۔ برعکس اس کے اپنے شریک ایمان بھائیوں کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ یہی مضمون بعینہٖ اسی سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ میں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون کی ہیں اس وجہ سے وہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ اس ٹکڑے کا صحیح مفہوم اس کی نظیر کی روشنی میں واضح ہو جائے۔ 'اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے

"'اَذِلَّةٌ'، 'ذَلِيْلٌ' کی جمع ہے۔ عربی میں یہ لفظ جیسا کہ آل عمران آیت ۱۲۳ کے تحت ہم بتا چکے ہیں، اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ جب یہ اچھے معنوں میں آتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی نرم خو، نرم مزاج، فرمانبردار، متواضع اور سہل الانقیاد کے ہوتے ہیں۔ 'ذلول' کا لفظ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ فرمانبردار اونٹنی کو ناقۃ ذلول کہتے ہیں۔"

'اَعِزَّةٌ'، 'عَزِيْزٌ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ بالکل 'ذلیل' کے مقابل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت، مشکل، بھاری، ناقابل شکست، ناقابل عبور، عسیر الانقیاد۔ اگر کسی چیز کے متعلق کہیں کہ 'هُوَ عَزِيْزٌ عَلَيَّ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ چیز مجھ پر بھاری اور مشکل ہے۔ اس کو رام کرنا اور قابو میں کرنا میرے لیے دشوار ہے۔"[1]

اسی ضمن میں ہم نے 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا مفہوم بھی اس طرح واضح کیا ہے۔

"یہی مفہوم 'شَدِيْدٌ عَلَيَّ' کا بھی ہوتا ہے۔ کسی حماسی کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

اذا المرء اعيته المروءة ناشئاً　　　　فمطلبها كهلا عليه شديد

(اگر اٹھتی جوانی میں اولوالعزمی پیدا کرنے سے آدمی قاصر رہ جاتا ہے تو ادھیڑ پن میں اس کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے)۔

"مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے تو وہ نہایت نرم خو، بھولے بھالے، ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والے ہوں گے لیکن کافروں کے لیے وہ پتھر کی چٹان ہوں گے۔ وہ اگر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ان کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کہیں سے انگلی دھنسانے کی جگہ نہ پا سکیں گے...... سیدنا مسیح نے اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کبوتر کے مانند بے آزار اور

---

[1] تدبرِ قرآن، جلد دوم، صفحہ ۳۱۸

سانپ کی مانند ہوشیار رہو، اس میں بھی یہی دونوں پہلو ملحوظ ہیں۔"[1]

یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جس سیاق و سباق میں یہ سورۂ مائدہ والی آیت آئی ہے بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں یہ الفتح والی آیت بھی وارد ہوئی ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ منافقین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کا کردار اسلامی کردار کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اہلِ ایمان کے لیے نہایت سہل الانقیاد اور کفار کے لیے عسیر الانقیاد ہوتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ کفار کے ہاتھوں میں تو وہ کھلونا بنے ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں کو دھوکا دینے میں بڑے شاطر ہیں۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی یاد ہوگا، منافقین کا کردار آیات ۷-۱۸ میں تفصیل سے زیرِ بحث آیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کے اجتماعی کردار کا یہ پہلو اس لیے نمایاں کیا گیا ہے کہ منافقین اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھیں کہ مسلمانوں کا کردار کیا ہونا چاہیے اور وہ کس کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ پیغمبر اور اس کے جاں نثار ساتھیوں کے لیے تو روزِ بد کے منتظر ہیں اور کفار کو جا جا کر اطمینان دلا رہے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی طرف سے آپ لوگوں کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم آپ ہی لوگوں کا ساتھ دیں گے۔

'اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ' کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کے باعث بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اسلام روزمرہ زندگی کے سلوک و طرزِ عمل میں یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا رویہ ہر غیر مسلم کے ساتھ کرخت اور بیزارانہ ہو حالانکہ یہ بات نہ قرآن کے الفاظ سے نکلتی ہے اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طرزِ عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم نے الفاظ اور نظائر کی روشنی میں آیت کی جو تاویل کی ہے امید ہے کہ وہ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

خلق اور خالق دونوں کے ساتھ مربوط زندگی

'تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا' یہ ان کی توجہ الی اللہ، ان کی شب بیداری اور ان کی تہجد گزاری کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو بھی ان کو دیکھے گا اس پر پہلی ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دنیا کے عام انسانوں سے بالکل مختلف یہ ایسے قدسی صفت لوگوں کی ایک جماعت ہے جن کی زندگی کا اصلی نصب العین خدا کی رضا طلبی ہے۔ چنانچہ کبھی وہ ان کو رکوع میں پائے گا کبھی سجود میں۔ اوپر والے ٹکڑے میں ان کا وہ پہلو سامنے آیا ہے جن کا تعلق خلق سے ہے۔ اس ٹکڑے میں ان کی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق خالق سے ہے یعنی خلق کے ساتھ بھی ان کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر قائم ہے کہ وہ اہلِ باطل کے مقابل میں نہایت سخت اور اہلِ حق کے لیے نہایت نرم خُو ہیں اور خالق کے ساتھ بھی ان کا ربط نہایت محکم و استوار ہے کہ کسی وقت بھی وہ اس سے غافل نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں پسندیدہ زندگی وہی ہے جو خلق اور خالق دونوں سے بالکل صحیح بنیاد پر مربوط ہو۔

---

[1] تدبر قرآن، جلد دوم، صفحات ۳۱۸ - ۳۱۹

اگر اس میں کسی پہلو سے ذرا بھی خلل پیدا ہو جائے تو انسان کی ساری زندگی بے ہنگم ہو جاتی ہے۔

صحابہؓ کی ایک خاص علامتِ امتیاز

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ۔ یہ ان کی خاص علامتِ امتیاز کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان نمایاں ہیں۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ یہاں وہی نشان مراد ہیں جو کثرتِ سجود سے پیشانی پر پڑ جاتے ہیں اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ نشان بہت محبوب ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر یہ امت اسی نشان سے دوسری امتوں کے مقابل میں پہچانی جائے۔ یہ ساری باتیں الفاظِ قرآن سے واضح ہیں اس وجہ سے ہم ان لوگوں کی رائے صحیح نہیں سمجھتے جنھوں نے ان الفاظ کو ان کے ظاہر معنی سے ہٹا کر ان کے مجازی معنی لینے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں ہے کہ بعض لوگ محض ریا کے لیے بھی اپنی پیشانی پر گھٹا ڈالنے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن محض اس بنا پر کہ کچھ لوگوں کے گھٹے محض نمائشی ہوتے ہیں اہل ایمان کے اس عظیم نشانِ امتیاز کی وقعت کم نہیں کی جا سکتی۔ ریا کا امکان جس طرح اس چیز کے اندر ہے اسی طرح دین کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کام میں ہو سکتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو ٹوکا کہ انھوں نے اپنی پیشانیوں پر گھٹے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے حالات سے بہت باخبر تھے۔ اگر انھوں نے کسی شخص کو اس طرح کی کسی بات پر تنبیہ کی تو مسلمانوں کے ایک مربّی و معلّم ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ حق تھا اور اس کا ایک محل ہے۔ اس سے امت کے اس نشانِ امتیاز کی بے وقعتی نہیں ہوتی جس کا آیت زیرِ بحث میں حوالہ ہے۔

پیشین گوئیوں میں یہود کی تحریفات

ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی یہ تمثیل تورات میں بیان ہوئی ہے۔ یہ اشارہ ان پیشین گوئیوں کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے باب میں تورات، زبور اور یسعیاہ نبی کے صحیفوں میں ہیں اگرچہ یہود نے قطع و برید کر کے ان کو بالکل مسخ کر دیا ہے اور مسخ کرنے کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جن الفاظ کی نسبت بھی ان کو گمان ہو جاتا ہے کہ مسلمان ان کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں ان پر فوراً تحریف کی قینچی چلا دی جاتی ہے۔ تاہم آج بھی تورات اور انجیل دونوں میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مثلاً استثنا سباب ۳۳۔ ۲ میں ہے:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

اس پیشین گوئی کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ظاہر ہے کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس میں جبل فاران کا ذکر بھی ہے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آپ کے نمودار ہونے کا صریح الفاظ میں حوالہ بھی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں قرآن نے اس پیشین گوئی کا حوالہ مسلمانوں کے غلبہ و تمکن ہی کے پہلو سے دیا ہے اور یہ ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابہؓ آپ کے ہمرکاب تھے۔

یہ تو صرف خدائے علام الغیوب ہی کو علم ہے کہ اس پیشین گوئی میں کتنی تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن ایک تازہ مثال اس میں تحریف کی یہ ہے کہ "دس ہزار قدوسیوں" کے الفاظ جو اس میں وارد ہیں اب بعض نسخوں میں بدل کر وہ "دس لاکھ" کر دیے گئے ہیں جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان اس کو فتح مکہ پر منطبق نہ کر سکیں۔ تاہم اس پر اچھی طرح غور کیجیے تو اس میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا قرآن نے حوالہ دیا ہے۔

اس میں دس ہزار قدوسیوں، کا حوالہ ہے۔ 'قدوسیوں' سے مراد ظاہر ہے کہ پاکیزہ صفات، نیک نہاد، خدا ترس اور عبادت گزار بندے مراد ہیں۔ قرآن میں اس کی جگہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ..... سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ کے الفاظ ہیں۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ قرآن نے تورات کے لفظ 'قدوسیوں' کو قدوسیوں کی صفات بیان کر کے اچھی طرح شناخت کرا دی ہے تاکہ اہل کتاب پہچان لیں کہ جن قدوسیوں کا ان کے صحیفوں میں ذکر آیا ہے وہ یہی لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اور جو عنقریب دس ہزار کے لشکر کی صورت میں ظاہر ہو کر اس پیشین گوئی کی تصدیق کر دیں گے۔ یا پھر یہ ہوا ہے کہ تورات میں بھی یہ تمام صفات بیان ہوئی ہوں لیکن یہود نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دوسری پیشین گوئیوں کو چھپانے کی کوشش کی اسی طرح یہاں بھی تمام صفات کو غائب کر کے 'قدوسیوں' کا لفظ رکھ دیا تاکہ اس کی تاویل اپنے منشا کے مطابق کر سکیں۔ امکان ان دونوں ہی باتوں کا ہے لیکن کوئی منصف اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ تورات کی اس پیشین گوئی کے مصداق ہو سکتے ہیں تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی ہو سکتے ہیں۔

دوسری خاص بات جو اس پیشین گوئی میں ہے وہ یہ ہے کہ "اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی"۔ "آتشی شریعت" ہمارے نزدیک تعبیر ہے اس مضمون کی جو قرآن میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ اس کی وضاحت حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں یوں فرمائی ہے کہ "اس کے ہاتھ میں (یعنی پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں) اس کا چھاج ہوگا، وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا، دانے کو بھس سے الگ

رے گا، پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا۔"

یہی حقیقت حضرت مسیح علیہ السلام نے دوسرے الفاظ میں یوں بیان فرمائی ہے:

"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا ...... اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" متی باب ۲۱: ۴۲-۴۵

کتاب استثنا کی مذکورہ بالا پیش گوئی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہو گا۔"

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ ترجمہ نے کلام کے رُخ کو مبہم بنا دیا ہے تاہم یہ وہی بات فرمائی گئی ہے جس کا سراغ قرآن نے تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا کے الفاظ میں دیا ہے۔

انجیل کی تمثیل کا حوالہ

وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ تورات کی تمثیل کے بعد یہ انجیل کی تمثیل کا حوالہ ہے۔ تورات کی تمثیل میں اہل ایمان کے زہد و تبتل، ان کے غلبہ و تمکن اور امتوں کے ساتھ ان کے عدل اور رحم کی تصویر ہے۔ انجیل کی تمثیل میں ان کے تدریجی ارتقاء کو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ ان کی ابتدا اگرچہ نہایت کمزور ہو گی لیکن بالآخر وہ ایک ایسے تناور درخت کی شکل اختیار کریں گے کہ ان کے سایہ میں بڑی بڑی قومیں پناہ لیں گی۔ متی باب ۱۳: ۲-۹ میں یہ تمثیل یوں بیان ہوئی ہے:

"اس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں۔"

یہ تمثیل معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ مرقس باب ۴ اور لوقا باب ۸ میں بھی آئی ہے۔ اسی تمثیل کی قرآن نے یوں وضاحت فرمائی کہ جو حال کھیتی کے نشو و نما کا ہوتا ہے وہی حال اسلام کے تدریجی عروج و کمال کا ہو گا۔ کھیت میں جو دانے بوئے جاتے ہیں اول اول وہ باریک سوئیاں سی نکالتے ہیں پھر ان کو مزید سہارا ملتا ہے جس سے سوئیاں موٹی اور قوی ہو جاتی ہیں اور کھیتی اپنے تنے پر

کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دن آئے گا کہ جو تخمِ حق عرب کی سرزمین میں بویا گیا ہے اس کی فصل شباب پر آئے گی جو اپنے بونے اور آبیاری کرنے والوں کے دلوں کو تو موہ لے گی اور ساتھ ہی ان لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلائے گی جنھوں نے اس کے نشو و نما کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

'لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ' میں 'ل' غایت و انجام کے اظہار کے لیے ہے اور لفظ 'کفار' تمثیل کے اصل مفہوم پر روشنی ڈال رہا ہے۔ تمثیل میں یہاں مراد چونکہ اہل ایمان ہیں اس وجہ سے آخر میں یہ ظاہر کر کے کہ ان کا عروج بالآخر ایک دن کفار کے لیے باعث حسرت و حسد ہوگا گویا اس تمثیل کے ممثل کو ظاہر کر دیا۔ عربی زبان میں تمثیلات و استعارات کے اندر یہ طریقہ معروف ہے کہ آخر میں کسی لفظ کے ذریعہ سے تمثیل یا استعارے کے ممثل یا مستعار لہٗ کو واضح کر دیتے ہیں تاکہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔ سورۂ نور والی تمثیل میں اس کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔

'وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا'۔ یہ آخر میں اسی وعدۂ نصرت و مغفرت کی بشارت ہے جس کے اثبات کے لیے تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان صفات کے مصداق اور ایمان و عمل میں پختہ و راسخ رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم سے نوازے گا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے لیکن ان کی ہمدردیاں اللہ و رسولؐ سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہیں اور جنھوں نے حدیبیہ کے موقع پر وہ کمزوری دکھائی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اسلام کے مخالفوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
یکم نومبر ۱۹۷۶ء
۸۔ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ

تدبّرِ قرآن

۴۹

الحجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الفتح ـــــ کا ضمیمہ و تتمہ ہے۔ سورۂ فتح کی آخری آیت میں، تورات کے حوالہ سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ صفت جو وارد ہوئی ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے لیے سخت اور باہمدگر نہایت مہربان ہوں گے) یہ پوری سورہ اسی ٹکڑے کی گویا تفسیر ہے۔ جہاں تک اس کی اہمیت کا تعلق ہے اس کی وضاحت سورۂ فتح کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ اس کی یہ اہمیت مقتضی ہوئی کہ اس کے وہ مضمرات یہاں وضاحت سے بیان کر دیے جائیں جن کا بیان کیا جانا اس وقت مسلمانوں کے معاشرے کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری تھا۔ یہ بات اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے کہ قرآن میں احکام و ہدایات کا نزول حالات کے تقاضوں کے تحت ہوا ہے تاکہ لوگوں پر ان کی صحیح قدر و قیمت واضح ہو سکے۔ چنانچہ یہ سورہ بھی ایسے حالات میں نازل ہوئی ہے جب نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کی طرف سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جن سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ نہ تو رسول کے اصلی مرتبہ و مقام ہی سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ کے اندر اپنی ذمہ داریوں ہی سے۔ چنانچہ اس ضمیمہ میں ضروری ہدایات دے دی گئیں جو اس وقت کے حالات کے اندر ضروری تھیں۔ ان احکامات و ہدایات کا تعلق تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باہمی حقوق ہی سے ہے۔ کفار کا معاملہ اس میں زیر بحث نہیں آیا۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے اس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

سورہ کے تیسرے گروپ میں جس نوعیت کا تعلق سورۂ نور کا سورۂ مومنون کے ساتھ ہے اسی نوعیت کا تعلق اس سورہ کا سورۂ فتح کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مزاج باہمدگر بالکل ملتا جلتا ہوا ہے۔

ب ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۵) مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول کی رائے یا آپ کے حکم پر مقدم کرنے کی کوشش کرے یا گفتگو میں اپنی آواز کو آپ کی آواز پر بلند کرے یا آپ کو اس طرح پکارے جس طرح اپنے کسی مساوی درجہ کے آدمی کو پکارتا ہے۔ تقویٰ کی افزائش اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے دلوں کے اندر کرتا ہے جو اس کے رسول کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رسول اور اسلام کا محسن سمجھتے ہیں اور رسول کے سامنے خطاب و کلام میں اپنے تفوق کا اظہار کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ اس طرح کی حرکت سے غیر شعوری طور پر وہ اپنے اعمال ہی نہ گنوا بیٹھیں۔

(۶ - ۱۰) مسلمانوں کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ پارٹی اور گروہ کی عصبیت کی بنیاد پر۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمان مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف اقدام کر ڈالیں، جس پر بالآخر انھیں پچھتانا پڑے۔ تمام اہم معاملات میں رسول کی صوابدید اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ کسی پارٹی کو رسول کی حمایت اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے اس پر غلط قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ چیز اس فضل و انعام کی ناقدری ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی شکل میں اہلِ ایمان کو نوازا ہے۔ ایمان کا مزا چکھ لینے کے بعد کوئی ایسی بات کرنا جو اس کے منافی ہے کفر و عصیان کی طرف رجعت ہے جس سے لوگوں کو بچانے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دلوں میں رچانے اور کفر کو مبغوض بنانے کے لیے سارے جتن کیے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گروہی رجحانات کی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے ساتھی بن جائیں بلکہ انھیں معاملہ کو حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ حق و عدل کا پہلو معین ہو جانے کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ اس حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو تو اس کو بزور اس کے آگے جھکنے پر مجبور کرنا چاہیے۔

(۱۱ - ۱۳) ان باتوں سے بچنے کی ہدایت جو دلوں میں نفرت کی تخم ریزی اور معاشرے میں فساد کی آگ بھڑکانے والی ہیں۔ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی تحقیر کرے یا اس کا مذاق اڑائے یا اس کو عیب لگائے یا اس پر پھبتیاں چست کرے یا اس کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرے یا اس کی غیبت کرے یا اس کے عیوب کی ٹوہ میں لگے۔ حسب نسب اور خاندان و قبیلہ کا تفوق

جاہلیت کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی آدم و حوا سے پیدا کیا ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے نہ کہ نسب اور خاندان۔

(۱۴-۱۸) خاتمۂ سورہ، جس میں اس بات کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جو سورہ کی تمہید میں، اشارات کی شکل میں، فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی آیات میں جن لوگوں کا رویہ زیر بحث آیا ہے یہ اطراف مدینہ کے وہ اہل بدو تھے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح اترا نہیں تھا اس وجہ سے وہ اس پندار میں مبتلا تھے کہ اسلام لا کر انھوں نے اسلام اور پیغمبر پر ایک احسان کیا ہے۔ ان کے اس پندار کا اظہار بعض اوقات اس طرح کی حرکتوں سے ہو جاتا تھا جن سے ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اب یہ آخر میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ ان کو بتا دو کہ وہ اپنے ایمان و اسلام کا احسان نہ جتائیں۔ اللہ ان کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے اطاعت تو ضرور کر لی ہے لیکن ابھی ایمان نے ان کے اندر جڑ نہیں پکڑی ہے۔ یہ ان کا احسان نہیں ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان لائے بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ان کو ایمان کی توفیق بخشی۔ اگر وہ اس کا حق ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

سُورَةُ الحُجُرَاتِ

مَدَنِيَّةٌ ———— اٰيات: ۱۸

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اٰيات ۱-۱۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِىِّ وَلَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰى ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰى تَخۡرُجَ اِلَيۡهِمۡ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ ﴿۶﴾ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ؕ لَوۡ يُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ وَلٰكِنَّ

اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ﴿۷﴾ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ نِعۡمَۃً ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۸﴾ وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىہُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۰﴾

ع ۱۳

ترجمۂ آیات ۱-۱۰

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱

اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو مبادا تمہارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ نبی کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ ۲-۳

بے شک جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ صبر کے ساتھ اتنا انتظار کر لیتے کہ تم خود

ان کے پاس نکل کے آجاتے تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۴-۵

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو مبادا کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو، پھر تھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ اور اچھی طرح جان رکھو کہ تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر بہت سے معاملات میں وہ تمھاری بات مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے لیکن اللہ نے تمھارے سامنے ایمان کو محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں کھبا یا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں مبغوض کیا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے فضل و انعام سے راہِ راست پانے والے بنے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۶-۸

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کراؤ پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تعدی کرے تو اس سے جنگ کرو جو تعدّی کرے تاآنکہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرا دو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ مسلمان باہمدگر بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۹-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱)

وہ حالات جن میں یہ سورہ نازل ہوئی

خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن جن لوگوں کا رویّہ اس سورہ میں زیرِ بحث آیا ہے وہ، جیسا کہ آگے کی آیات سے بالتدریج واضح ہوتا جائے گا، اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ابھی ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح رچا بسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام کو سمجھ کر نہیں بلکہ اس سے مرعوب ہو کر اس میں داخل ہوئے، ثانیاً مرکز سے بے تعلق رہنے کے سبب سے ان کی تربیت بھی اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اندر ایک غلط قسم کا پندار بھی تھا کہ انھوں نے کسی جنگ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر لی جو آپ پر ان کا ایک احسان ہے۔ اس پندار کا اثر یہ تھا کہ ان کے سردار جب مدینہ آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس انداز سے بات کرتے گویا وہ اسلام کے بڑے مربی و محسن ہیں۔ بغیر اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں ان کی رائے دریافت کریں آگے بڑھ بڑھ کر اپنی رائیں پیش کرتے اور مشورے دینے کی کوشش کرتے۔ بات کرتے ہوئے حضورؐ کی آواز پر اپنی آواز، تفوّق کے اظہار کے لیے بلند رکھتے۔ جب کبھی آتے تو ان کی خواہش یہ ہوتی کہ حضورؐ بلا تاخیر سارے کام چھوڑ کر ان سے ملاقات کریں اور اگر ذرا تاخیر ہو جاتی تو بے درنگ آپ کو حجروں کے باہر سے اس طرح آواز دینا شروع کر دیتے جس طرح ایک عام آدمی کو آواز دی جاتی ہے۔ آپس میں ان کے درمیان جو جاہلی رقابتیں زمانۂ جاہلیت سے چلی آ رہی تھیں، ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا اور اس غرض کے لیے وہ اپنے حریفوں سے متعلق بعض اوقات ایسی خبریں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے جو غلط فہمی پیدا کرنے والی ہوتیں۔ ان کی بنا پر مدینہ کے مسلمان اگر کوئی اقدام کر گزرتے تو یہ چیز مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت مضر ہوتی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں رویّہ تو زیرِ بحث، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک مخصوص گروہ ہی کا ہے لیکن قرآن نے خطاب عام ہی رکھا ہے تاکہ اس کا زیادہ فضیحتا بھی نہ ہو اور وہ رخنے بند بھی ہو جائیں جن سے شیطان کو معاشرہ کے اندر فتنہ انگیزی کی راہ مل سکتی ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ یہاں ممانعت اللہ کے رسول کے سامنے اپنی رائے پیش کرنے میں پہل کرنے یا اپنی رائے کو اللہ اور رسول کے حکم پر مقدم کرنے کی ہے نہ کہ رسول کے سامنے مجرّد اپنی کوئی رائے پیش کرنے کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امورِ مصلحت میں صحابہؓ سے ان کی رائیں معلوم بھی فرماتے اور صحابہؓ اپنی رائے پیش بھی کرتے۔ اسی طرح صحابہؓ بعض اوقات عام امورِ مصلحت میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے یہ بھی عرض کرتے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاں اقدام وحی الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاں تدبیر زیادہ قرینِ مصلحت رہے گی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ان کی رائیں قبول بھی فرما لیتے۔ اس آیت میں اس طرح کی باتوں کی نہی نہیں ہے۔ حضورؐ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ سب سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی، جیسا کہ آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران : ۱۵۹) سے واضح ہے، آپ کو لوگوں سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔

یہاں ممانعت اسی بات کی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ کوئی شخص اللہ کے رسول کو ایک عام آدمی یا مجرد ایک لیڈر سمجھ کر اور اپنے آپ کو ان سے زیادہ مدبر خیال کر کے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کسی معاملہ میں اس کی رائے دریافت کریں، حضور کو اپنی رائے سے متاثر کرنے اور اپنی رائے کو حضورؐ کی بات پر مقدم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کا رویہ دلیل ہے کہ وہ رسول کے اصلی مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے۔ اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کرتا یا کہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنے کی جسارت کرتا ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر مقدم کرنا چاہتا ہے درآنحالیکہ یہ چیز اس کے تمام ایمان و عمل کو ڈھا دینے والی ہے اگرچہ اس کو اس کا شعور نہ ہو۔

اللہ اور رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے

بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کا رسول اللہ کا سفیر و نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کو بن پوچھے مشورہ دینا خود اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا ہے، اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا اللہ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے اور اس سے بڑھ کر اپنے کو مدبر سمجھنا خود خدائے علیم و حکیم سے بڑھ کر اپنے کو مدبر و حکیم سمجھنا ہے۔ یہ آدمی کے اس رویہ کے لازمی نتائج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اس کی بلادت کے سبب سے ان نتائج کا احساس نہ ہو لیکن ان کے لازمی نتائج ہونے سے انکار ناممکن ہے۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ اور رسول سے زیادہ دانشمند اور مدبر ہونے کے خبط میں مبتلا نہ ہو۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وہ تمہاری ساری باتوں کو سن بھی رہا ہے اور ان کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے ہیں ان سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا مکافاتِ عمل کا قانون لازماً ظہور میں آئے گا۔ اس قانون کا ذکر آگے والی آیت میں آ رہا ہے۔

اس آیت میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو اسلام کی خدمت کے دعوے

دور حاضر کے مدعیان اسلام کو تنبیہ

کے ساتھ اس کے اقدار کو مسخ اور اس کے قوانین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جس شکل میں اسلام دیا ہے اس شکل میں وہ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ ضروری ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ وہ شریعت کے احکام میں اپنی رائے کے مطابق ترمیم کر رہے ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلے ہی سے سبقت کر کے چاہتے تھے کہ اللہ و رسول کے آگے اپنے مشورے پیش کر دیں، اس زمانے کے مدعیان اسلام کو یہ موقع نہ مل سکا اس وجہ سے وہ اب ان غلطیوں کی اصلاح کر رہے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ و رسول سے العیاذ باللہ، دین کے معاملے میں ہو گئی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲)

جن کے اندر پندار ہو اس کا اظہار ان کے انداز کلام سے نمایاں ہوتا ہے

یہ اسی اوپر والی بات کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ خناس سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہیں یا جن کو یہ زعم ہو کہ ان کا اسلام قبول کر لینا اسلام اور پیغمبرؐ پر ایک احسان ہے۔ ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ کلام رسول کے آگے متواضعانہ و نیازمندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ان کے اس پندار کا اثر ان کی گفتگو سے نمایاں ہونا ایک امرِ فطری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے تو ان کے انداز کلام سے یہ واضح ہوتا کہ یہ اللہ کے رسول سے کچھ سیکھنے نہیں بلکہ ان کو کچھ سکھانے اور بتانے آئے ہیں۔ چنانچہ جس طرح یہ اپنی رائیں پیش کرنے میں سبقت کرتے اسی طرح ان کی کوشش یہ بھی ہوتی کہ ان کی آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند و بالا رہے اور اگر آپ کو مخاطب کرتے تو ادب سے 'یارسول اللہ' کہنے کے بجائے 'یا محمدؐ' کہہ کر خطاب کرتے جس طرح اپنے برابر کے ایک عام آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ یہاں ان کو اس غیر مہذب طریقۂ کلام و خطاب سے روکا گیا ہے کیونکہ یہ چیز غمازی کر رہی تھی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ رسول کا اصل مرتبہ و مقام نہیں پہچانا ہے بلکہ ان کے اندر اپنی برتری کا وہ زعم بھی چھپا ہوا ہے جو بالآخر قرآن کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے والا ہے۔

'اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ' میں 'اَنْ' سے پہلے، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں 'کَرَاهَةَ' یا 'مَخَافَةَ' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ اس بے ادبی سے تمھیں اس لیے روکا جا رہا ہے کہ مبادا تمھاری یہ حرکت اس بات کا سبب بن جائے کہ عند اللہ تمھارے سارے اعمال ڈھے جائیں۔

'وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ' یعنی تم تو اس پندار میں مبتلا رہو گے کہ تم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور نبیؐ کو اپنی رایوں سے مستفید کرنے کے لیے تمھاری بے چینی بھی خدمتِ دین ہی کے عشق

ہیں ہے لیکن ادھر تمھارے وہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے جو اپنے زعم میں تم نے دین کی خاطر انجام دیے اور تمھیں اس بات کا شعور بھی نہ ہو گا۔

ایک نہایت اہم حقیقت

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایک شخص بہت سے کام اپنی دانست میں دین کے کام سمجھ کر دین ہی کی خدمت کے لیے کرتا ہے لیکن اس کے اندر اگر یہ پندار سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول پر یا اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس زعم میں نہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت کو ملحوظ رکھے نہ اس کے رسول کے اصلی مرتبہ و مقام کا احترام کرے تو اس کے سارے اعمال اکارت ہو کے رہ جائیں گے اور اس کو اپنی اس بے شعوری کا پتہ آخرت میں چلے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ و رسول کا مُحسن سمجھ بیٹھے۔ اس کے ہاں قبولیت کا شرف صرف انہی لوگوں کے اعمال کو حاصل ہو گا جو اس کے دین کی خدمت صرف اس کی رضا کے لیے، ٹھیک ٹھیک اس کے مقرر کردہ شرائط کے مطابق، انجام دیں گے اور ساتھ ہی دل سے اس حقیقت کے معترف رہیں گے کہ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے اللہ و رسول پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان خود ان کے اوپر ہوا ہے کہ اس نے ان کو اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق بخشی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (۳)

رسول کے معاملے میں صحیح ادب کی تعلیم

یہ اس صحیح ادب کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا لازم ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ لفظ 'امْتَحَنَ' یہاں 'اِصْطَفٰی' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دل تقویٰ کی تخم ریزی اور اس کی افزائش کے لیے موزوں نہیں ہوتا بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان کر کے دلوں کا انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب میں اصل چیز جو ترجیح دینے والی بنتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور ان کے آگے فروتنی کا صحیح شعور ہے یا نہیں۔ یہ چیز جس کے اندر جتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اس کو اتنی ہی زیادہ تقویٰ کی نعمت عطا ہوتی ہے اور جو لوگ جس درجے میں اس شعور سے عاری ہوتے ہیں وہ اتنے ہی تقویٰ سے بعید ہوتے ہیں۔ آواز بلند کرنے کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انسان کے باطن کے ایک مُخبر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اونچا خیال کرتا ہے

یہ چیز اکتسابِ فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرزِ عمل ہو تو وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا اس لیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔

کتاب و سنت کے فیوض سے بہرہ مند ہونے کے لیے صحیح روش

یہی درجہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس کی کتاب اور رسول کی سنت کے سامنے فروتنی کی یہی روش اختیار کرتے ہیں جس کی ہدایت رسول کے معاملے میں ہوئی ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ و رسول کی ہر بات کے آگے سر جھکا دینے کا سچا جذبہ ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقویٰ کی راہیں کھولتا ہے اور ہر قدم پر غیب سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اصلاح کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا یہ پندار اس کے سارے عمل کو غارت اور اس کی آخرت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ اوپر والی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کا انجام یہ بتایا ہے کہ یہ روش اعمال کو برباد کر دینے والی روش ہے۔ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اپنی آواز رسول کے آگے پست رکھیں گے۔ فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ یعنی ان کی لغزشیں اور کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بخش دے گا اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے آگے فروتنی کی روش اختیار کی۔ کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنے کی جسارت نہیں کی۔ ان کی اس فروتنی کا انعام ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۴)

کم عقلوں کے ایک ناشائستہ طریقہ پر ان کو تنبیہ

یہ لوگ جس طرح مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے میں غیر مہذب تھے اسی طرح یہ حرکت بھی وہ کرتے کہ جب دیکھتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں موجود نہیں ہیں تو آتے ہی ازواج مطہراتؓ کے حجروں کے باہر ہی سے آپ کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے۔ اس قسم کی حرکت بجائے خود بھی نہایت ناشائستہ ہے لیکن اس کا باطنی محرک اس کے ظاہر سے بھی زیادہ مکروہ تھا۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے اس کی پوری وضاحت آئے گی، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے جو اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا بہت بڑا احسان ہے اس وجہ سے یہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ جب یہ آئیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بلا تاخیر ان کا خیر مقدم کریں۔ اگر کسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما نہ ہوتے تو انتظار کی زحمت گوارا

نہ کرتے بلکہ فوراً ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کا چکر لگانا اور چیخ چیخ کر نہایت بھونڈے طریقے سے، آپ کا نام لے لے کر، پکارنا شروع کر دیتے۔ فرمایا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ 'اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ' کے الفاظ میں ان لوگوں کی ناسمجھی پر ملامت بھی ہے اور لطیف انداز میں ان کی اس نادانی سے درگزر کرنے کا اشارہ بھی کہ ہرچند ہے تو ان کی یہ حرکت نہایت ناشائستہ لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام سے آشنا ہیں اور نہ اپنی اس حرکت کے انجام سے، اس وجہ سے یہ تربیت کے محتاج اور درگزر کے لائق ہیں۔

'مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ' میں لفظ 'وَرَآءِ' جو آیا ہے اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ حجروں کے پیچھے سے پکارتے تھے اس وجہ سے ان کی یہ حرکت قابلِ اعتراض ٹھہری۔ لفظ 'وَرَآءَ' پیچھے یا پچھواڑے کے مفہوم کے لیے خاص نہیں ہے۔ عربی میں 'نَادَانِیْ مِنْ وَّرَآءِ الدَّارِ' کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ اس نے گھر کے باہر سے مجھے پکارا، قطع نظر اس سے کہ مکان کے پیچھے سے پکارا یا مکان کے سامنے سے۔ قابلِ اعتراض ان کا اس بھونڈے طریقہ سے پکارنا تھا۔ یہ امر واضح رہے کہ ایک عام مسلمان کو بھی اس طرح پکارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو۔ سورۂ نور کی تفسیر میں وہ طریقہ آپ پڑھ آئے ہیں جو کسی صاحبِ خانہ سے ملاقات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵)

یہ ان کو صحیح ادب کی ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ صبر کے ساتھ تمہارے نکلنے تک انتظار کر لیتے تو یہ چیز ان کے لیے بڑے خیر و برکت کا موجب ہوتی! آیت کا اسلوب ان کی محرومی پر اظہارِ حسرت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس چشمۂ فیض پر پہنچے تھے اگر انھوں نے اس کی صحیح قدر پہچانی ہوتی تو اس سے سیراب ہو کر لوٹتے لیکن یہ ان کی محرومی ہے کہ وہاں سے کچھ پانا تو درکنار اپنی نادانی و ناقدر شناسی کے باعث یہ کچھ کھو کے پلٹے!

'وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ': یہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صفات 'غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ' کی یاد دہانی فرمائی ہے اور مقصود اس سے نہایت لطیف انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگرچہ ان کی یہ حرکتیں نہایت ناگوار ہیں لیکن یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اس وجہ سے ابھی ان کی اس طرح کی باتوں سے درگزر کرو۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور یہی عفو و درگزر اس کے رسول کے بھی شایانِ شان ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (۶)

خبر کے قبول کرنے کے معاملہ میں احتیاط کی تاکید

یہ مرکز (یعنی مدینہ) کے مسلمانوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف سے ایک سیاسی خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے بعض سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے۔ ان کے اندر تربیت سے محرومی کے باعث جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا صحیح شعور مفقود تھا اسی طرح اسلامی اخوت کے صحیح احساس سے بھی یہ لوگ ابھی نا آشنا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے اندر جو رقابتیں اور رنجشیں آپس میں تھیں ان کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ یہ لوگ مدینہ آتے تو ان میں سے بعض اپنے حریفوں کے خلاف غلط صحیح اطلاعات دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کرتے اور صحابہؓ میں سے بھی، جن پر ان کا اثر کارگر ہوتا، ان کو اپنے حق میں ہموار کرتے تاکہ مدینہ کی مرکزی طاقت کو اپنے حریفوں کے خلاف اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ یہ صورتِ حال ایک نازک صورتِ حال تھی۔ مدینہ کی حکومت اول تو ابھی اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً اس قسم کی بے بنیاد افواہ انگیزیوں کی بنا پر اس کا کوئی اقدام خاص طور پر مسلمانوں ہی کے کسی گروہ کے خلاف، عدل اور اجتماعی مصلحت دونوں کے خلاف ہوتا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ مرکز کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ وہ اس طرح کے اہم معاملات میں فیصلہ کلیتہً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر چھوڑیں، غیر ثقہ لوگوں کی روایات پر اعتماد کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ ان کو ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی فاسق شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو نفسِ واقعہ کی اچھی طرح تحقیق کیے بغیر اس کی بات پر اعتماد کر کے کوئی اقدام نہ کر بیٹھو، مبادا کہ تم جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر کسی بے گناہ گروہ کے خلاف اقدام کر گزرو جس پر تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

فاسق سے مراد شریعت کے حدود و قیود سے بے پروا لوگ ہیں۔ لفظ 'نبأ' کی تحقیق اس کے محل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم خبر ہوتی ہے جس کو باور کر لینے یا اس پر عمل کرنے سے دُور رس نتائج کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس طرح کی اہم خبر اگر کوئی ایسا شخص دے جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہو تو عقل اور اخلاق دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بات اس وقت تک باور نہ کی جائے جب تک خبر اور مخبر دونوں کی اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والے نے فاسد محرکات کے تحت خبر دی ہو اور خبر یا تو بالکل جھوٹی ہو یا کسی بدنیتی سے اس میں ایسی کمی بیشی کر دی گئی ہو کہ سننے والوں کے جذبات میں اس سے جوش و اشتعال پیدا ہو۔ لفظ 'جہالت'، یہاں جوش و ہیجان کے معنی میں ہے اس کی تحقیق جگہ جگہ اس کتاب میں ہم کر چکے ہیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۙ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ نِعۡمَۃً ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ (۷-۸)

صحیح رویہ

یہ اسی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ جب تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے تو تمھیں اپنی رایوں اور اپنے مشوروں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ رسول کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرو بلکہ تمھیں ان کے پیچھے چلنا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں اس وجہ سے تمھاری دنیا اور آخرت کی فلاح ان کی پیروی میں ہے نہ کہ اپنے جذبات کی پیروی میں۔ اگر تمھیں کوئی رائے پیش کرنی ہو تو ادب سے اپنی رائے پیش کر کے فیصلہ رسول کی صوابدید پر چھوڑ دو۔ یہ خواہش نہ کرو کہ تمھاری ہر رائے لازماً مان ہی لی جائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمھاری بہت سی رائیں خام ہوتی ہیں، اللہ کا رسول ان سب کو اگر مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے وہ تمھاری انہی رایوں کو مانتے ہیں جو صائب ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت تمھیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی راہنمائی حاصل ہے تو اس نعمت کی قدر کرو اور اپنے ربّ کے شکر گزار رہو۔

'عنت' کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں۔ 'لَعَنِتُّمۡ' یعنی تم بڑی مشقت و مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اگر کوئی مریض طبیب کی صوابدید پر عمل کرنے کے بجائے چاہے کہ طبیب اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو تو ایسے مریض کا خطرے میں پڑ جانا ایک امر بدیہی ہے۔

زبان کے بعض لطائف

'وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس زحمت و مشقت سے بچانے ہی کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ایمان کو تمھاری نگاہوں میں محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں رچا یا بسایا اور کفر، فسق اور عصیان کو تمھاری نگاہوں میں مکروہ و مبغوض ٹھہرایا تو اس اہتمام کا حق یہ ہے کہ اب تمھارے اندر ایمان کی محبت و محبوبیت قائم و دائم رہے اور کبھی تمھارے کسی قول و فعل سے اس پر کفر و عصیان کا کوئی دھبہ نہ پڑنے پائے۔

'حَبَّبَ' اور 'کَرَّہَ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس اہتمام خاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی نگاہوں میں ایمان کو محبوب اور کفر و فسق کو مبغوض بنانے کے لیے اپنے رسول کے ذریعہ سے فرمایا۔ دورِ جاہلیت کی تاریکی میں تمام اقدار بالکل پلٹ ہو گئے تھے۔ شیطان نے ایمان کو لوگوں کی نگاہوں میں مکروہ و مبغوض اور کفر و فسق کو محبوب و مطلوب بنا دیا تھا۔ ایمان اس طرح تہ بہ تہ پردوں کے اندر محجوب و مستور ہو گیا تھا کہ ان کو چاک کر کے ایمان کے حقیقی حسن و جمال کو خلق کے لیے بے نقاب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بن گیا تھا۔ اسی طرح کفر کو شیطان نے مصنوعی غازوں سے اس طرح

پُرفریب بنا دیا تھا کہ اس کی اصل گھنونی شکل وصورت لوگوں کو دکھانا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوئی کہ اس نے اپنا رسول بھیجا جس نے ایک طویل جدوجہد اور جہاد کے بعد ایمان کو اس کی اصلی محبوب شکل میں لوگوں کو دکھایا اور اس کے جمال کو ان کے دلوں میں بسایا۔ اسی طرح کفر کے چہرے کے مصنوعی غازہ کو اتار کر اس کی اصل مکروہ اور گھنونی شکل سے لوگوں کو آشنا اور اس سے بیزار کیا۔ اسی مضمون کو یہاں 'حَبَّبَ اِلَی' اور 'کَرَّہَ اِلَی' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے۔ یعنی ایمان اور کفر دونوں کو ان کی حقیقی شکل وصورت میں تمہارے آگے پیش کیا جس سے تم ایمان کے دلدادہ بنے اور کفر سے بیزار ہوئے۔ گویا یہ دونوں فعل 'قدّم' کے مضمون پر متضمن ہیں اور حرف 'اِلَی' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں 'حَبَّبَ' کے مفعول کی حیثیت سے تو صرف 'ایمان' کا ذکر ہے لیکن 'کَرَّہَ' کے ساتھ کفر، فسق اور عصیان تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے کردار پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ابھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان باتوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے جو ایمان کی ضد ہیں۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کو وضاحت سے یہ بات بتائی جائے کہ صرف کفر ہی ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ فسق وعصیان کے قسم کی ساری باتیں بھی اسی شجرۂ ملعونہ کے برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی مبغوض ٹھہرایا۔

لفظ 'فسق' یوں تو قرآن میں کفر کی جگہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں چونکہ یہ کفر کے ساتھ آیا ہے اس وجہ سے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکم عدولی ہوگی جس کا ارتکاب کوئی شخص ایمان کا مدعی ہوتے ہوئے کرے۔ لفظ 'عصیان' یہاں موقع ومحل اشارہ کر رہا ہے کہ رسول کی نافرمانی کے لیے آیا ہے۔ رسول کے خلفاء و امراء کی نافرمانی بھی چونکہ بالواسطہ رسول ہی کی نافرمانی ہے اس وجہ سے یہ چیز بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔

'اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'

فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے دلوں میں ایمان کا جمال گھر کیے ہوئے ہے اور جو کفر، فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار و نفور ہیں، درحقیقت اصل ہدایت پر ہیں اور یہ ہدایت ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے انعام سے حاصل ہوئی ہے اس وجہ سے ان کو اس پر اپنے رب ہی کا شکر گزار رہنا چاہیے، تمام کاروں کی طرح اس وہم میں کسی کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ اس کو یہ چیز از خود مل گئی ہے اور وہ خدا ور رسول کا کوئی محسن بن گیا ہے۔ 'علیمٌ حکیمٌ' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی تقسیم کسی اندھے کی تقسیم نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کی نعمت انہی کو دیتا ہے جن کو وہ اس کا اہل

پاتا ہے۔

یہ آیت مدینہ کے مسلمانوں کی تعریف میں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے برابر فیضیاب اور اللہ کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے تھے اور سیاق و سباق دلیل ہے کہ اس میں ان خام کار مسلمانوں پر تعریض بھی ہے جن کی خامیوں پر سورہ کی ابتداء ہی سے تبصرہ ہو رہا ہے اور جن کا تعلق اطرافِ مدینہ کے قبائل سے تھا۔

ایک بے بنیاد شانِ نزول

آیت ۶ کے تحت ہمارے مفسرین نے، اپنی عادت کے مطابق، ایک شانِ نزول کا بھی ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو تحصیلِ زکوٰۃ کے لیے بنی مصطلق کے پاس بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو بنی مصطلق کے لوگ بشکلِ جلوس ان کے خیر مقدم کے لیے نکلے۔ ولید نے گمان کیا کہ یہ لوگ ان سے لڑنے کو نکلے ہیں۔ وہ ڈر کر فوراً وہاں سے واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا[1]۔ یہ خبر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق پر نہایت برہم ہوئے اور ان کی سرکوبی کے لیے آپؐ نے ایک دستہ بھیج دیا یا بھیجنے کا فیصلہ فرما لیا کہ اتنے میں بنی مصطلق والوں کو اطلاع ہو گئی اور ان کے سردار نے فوراً مدینہ حاضر ہو کر بقیدِ قسم حضورؐ کو اطمینان دلایا کہ ہم نے تو ولید کی شکل بھی نہیں دیکھی، زکوٰۃ روکنے کا کیا سوال ؟ ان کی طرف سے صفائی کے بعد ان کا معاملہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن ہمارے مفسرین کے نزدیک ولیدؓ کی اسی روایت کی بنا پر یہ آیت اتری اور مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے کوئی عاجلانہ قدم نہ اٹھایا کریں۔

ہمارے مفسرین کوئی نہ کوئی شانِ نزول تو تقریباً ہر آیت کے تحت درج کرتے ہیں، اوپر آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ ...... الاٰیۃ' کے تحت بھی انھوں نے ایک شانِ نزول کا حوالہ دیا ہے لیکن اس سے ہم نے اس وجہ سے تعرض نہیں کیا کہ بعض ناقدین نے اس پر جرح بھی کر دی ہے مگر اس شانِ نزول پر سب متفق ہیں اس وجہ سے اس سے تعرض ناگزیر ہے۔

شانِ نزول سے متعلق وہ اصولی حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جس کا ذکر ہم نے مقدمۂ تفسیر میں کیا ہے کہ سلف کسی آیت کے تحت اگر کسی واقعہ کا ذکر شانِ نزول کی حیثیت سے کرتے ہیں تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بعینہٖ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آیت سے اس واقعہ کا حکم بھی مستنبط ہوتا ہے۔ یہ رائے اصولِ تفسیر

---

[1] بعض راویوں کا بیان ہے کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کے دل میں پہلے سے بنی مصطلق کے خلاف رنجش تھی اسی وجہ سے ان سے ملے بغیر واپس آ گئے اور یہ بات بنائی کہ انھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کے ماہرین کی ہے اس وجہ سے میں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی معلوم ہے کہ شانِ نزول سے متعلق روایات بیشتر ضعیف بلکہ بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے ان کو عقل و نقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لینے سے اسی فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے آیت زیر بحث میں اہلِ ایمان کو روکا گیا ہے۔

اس شانِ نزول کو درایت کی کسوٹی پر جانچیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے جب کہ ولیدؓ کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی جس سے معلوم ہو سکتا کہ نعوذ باللہ وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی بلکہ ان کی ثقاہت و عدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیل زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضورؐ ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شانِ نزول کو باور کر لیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرما دیتے تھے جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کی بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے چہ جائیکہ اس کا صدور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولیدؓ استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگجو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آ گئے تھے اور اپنا تاثر انھوں نے حضورؐ کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری کو قرار دی جا سکتی ہے لیکن از روئے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جا سکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو، تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ولیدؓ اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسی اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری سپرد کر دیتے؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لوگوں سے مخفی رہے، یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو سکے!

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی ولیدؓ ہیں جن کو سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر

بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمان غنیؓ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص ازروئے نصِ قرآن فاسق قرار پا چکا ہے اور گورنری تو درکنار اسلامی قانون کی رو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے؟ اگر ناواقف تھے تو یہ ماننا ہے کہ حضرت عثمانؓ جیسے خلیفۂ راشد، جن کو جامع قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، نعوذ باللہ، قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے جتنا علم شانِ نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔

میں نے اس شانِ نزول کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ اضطراب اس کے ہر پہلو میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیبی دستہ روانہ کر دیا تھا، بعض میں ہے کہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرما لیا تھا اور بنی مصطلق کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو عندی کنفسی (جو میرے نزدیک میری اپنی ذات کی طرح ہے) ساتھ ہی حضرت علیؓ کے شانے پر تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی کہ اس مہم کو یہ سر کریں گے۔ بعض روایات میں اس کے برخلاف یہ ہے کہ اس مہم پر آپؐ نے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں، حالانکہ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کی کوئی بات آئی بھی تو آپ نے ٹال دی اور لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ پیغمبرؐ کو اپنی رایوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میرے نزدیک یہ شانِ نزول روافض کی ایجادات[1] میں سے ہے جس سے انھوں نے صرف ولیدؓ ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے بلکہ حضرت عثمانؓ کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض از راہِ کنبہ پروری[1] اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ پھر کوفہ کی گورنری کے دوران میں ان ظالموں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے فسق کے ایسے واقعات کی روایت کی ہے جن کو سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی ان ظالموں کی ذہانت پر آتی ہے اور رونا اپنے مفسرین کی سادگی پر کہ اس قسم کی بے سروپا روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ان کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹)

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ حضرت ولیدؓ سیدنا عثمان غنیؓ کے رشتہ دار بھی تھے۔

مگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں تصادم ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری

اوپر کی آیت میں اس بات کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان اصلاحِ احوال کی کوشش کرو۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پارٹی مصالحت پر آمادہ نہ ہو یا مصالحت کے بعد مصالحت کے شرائط کے خلاف دوسری پارٹی پر تعدی کرے تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو تعدی کرنے والی پارٹی سے جنگ کرنی چاہیے یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

'تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ' سے مراد اس فیصلہ کے آگے جھکنا ہے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ اگر کوئی پارٹی اس مصالحت سے گریز اختیار کر رہی ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکنے سے گریز اختیار کر رہی ہے۔ اس لیے کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی بات کا حکم دیا ہے اور جب اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو اس کی حیثیت 'اَمْرُ اللّٰهِ' کی ہے۔

'فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا'۔ یعنی مسلمانوں کے اس اجتماعی ایکشن کے بعد اگر وہ فیصلہ کے آگے سر جھکا دے تو اس بنیاد پر اس کے خلاف کوئی مزید کارروائی نہیں کی جائے گی کہ اس نے سرکشی کی روش اختیار کی، بلکہ فریقین کے درمیان انصاف کے تقاضوں کے مطابق صلح کرا دی جائے گی جس فریق کا نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ٹھیک ٹھیک کرا دی جائے گی۔

لفظ 'اَقْسِطُوْا' اسی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ کسی کے ساتھ بے جا رعایت کی جائے نہ کسی کو انصاف کے خلاف دبایا جائے بلکہ بے رو رعایت جو کچھ عدل کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

چند اجتماعی اصول جو آیت سے نکلتے ہیں

اس آیت سے مندرجہ ذیل اجتماعی اصول نکلتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمان اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نہ تو اس سے بالکل الگ تھلگ رہیں اور نہ ان کے لیے یہ جائز ہے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ کون حق پر ہے کون ناحق پر، محض خاندانی، قبائلی اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے ساتھی اور کسی کے مخالف بن جائیں بلکہ انھیں ساری صورتِ معاملہ سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو بلکہ جنگ ہی پر ضد کرے یا مصالحت کے لیے من مانے طور پر ایسی شرطیں پیش کرے جو عدل کے منافی ہوں تو اس صورت میں مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کے خلاف طاقت استعمال کر کے اس کو مصالحت کے شرائط کے آگے جھکنے پر مجبور کریں۔

اس طرح کی نزاعات میں غیر جانبدار مسلمان اللہ و رسول کی ہدایات اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کے مصالحت کے لیے جو شرطیں طے کریں گے فریقین پر ان کی اطاعت اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح شریعت کے احکام کی اطاعت لازمی ہے، یہاں تک کہ جو فریق اس سے انحراف اختیار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔

مصالحت ہو جانے کے بعد اس کی شرائط کے خلاف اگر کوئی فریق دوسرے فریق پر تعدی کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا قرار پائے گا۔ مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اس کی سرکوبی کریں۔

موجودہ زمانے کی ایک شکل

یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایات اس صورت حال کے لیے دی گئی ہیں جب نزاع مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان واقع ہو اور ان کی ایک مرکزی طاقت فریقین کے درمیان مداخلت کرنے کے پوزیشن میں ہو۔ اس زمانے میں یہ پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سی چھوٹی بڑی مسلمان حکومتیں الگ الگ قائم ہو گئی ہیں۔ ان کے درمیان اگر خدانخواستہ کوئی جنگ چھڑ جائے تو دوسری مسلمان حکومتوں کے لیے اس قضیہ سے بالکل الگ تھلگ رہنا تو جائز نہیں ہے، مصالحت کی کوشش، جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے، ہر ایک کو کرنی ہوگی البتہ عملاً مداخلت کا معاملہ صورتِ حال پر منحصر ہے۔ جس کا تعلق وقت کے سیاسی تقاضوں سے ہے۔ اگر صورتِ حال اجازت دے گی تو تعدی کرنے والے فریق کو حق کے آگے جھکانے کے لیے اس کے خلاف طاقت استعمال کرنا بالکل جائز ہوگا اور اگر اس سے مزید بین الملّی یا بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو عملی مداخلت سے تو گریز اختیار کیا جائے گا لیکن مصالحت کی جدوجہد سے گریز کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۱۰)

یعنی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان کسی نزاع کا برپا ہونا ہی اول تو ان کی باہمی اخوت کے منافی ہے لیکن شیطان کی انگیخت سے کوئی نزاع برپا ہو ہی جائے تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ اس آگ کو مزید بھڑکانے کی۔

'وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ' یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اگر تمھارے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا جو بھائیوں اور بھائیوں کے درمیان قتل و خون کا سبب ہوا یا تم محض قومی، قبائلی، علاقائی یا سیاسی

مصلحتوں کی خاطر کسی پہلو سے اس خون خرابے میں حصہ لینے والے بنے تو یاد رکھو کہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو اس کی قائم کی ہوئی اس اخوت کو ہمیشہ استوار و پائدار رکھنے کی کوشش کریں گے، نہ خود اس میں کوئی رخنہ پیدا کریں گے نہ اپنے امکان کے حد تک کسی کو اس میں کوئی رخنہ پیدا کرنے کا موقع دیں گے۔

'بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ' میں مثنیٰ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جنگ دو بھائیوں ہی کے درمیان ہو، بلکہ یہ مثنیٰ مسلمانوں کے دو گروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثنیٰ کا اس طرح استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۲۔ قرآن میں جرح و تعدیل کا ماخذ

ہمارے محدثین اور فنِ رجال کے ائمہ نے سورۂ حجرات کی اسی آیت ـــــ إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ـــــ کو ماخذ قرار دیا ہے راویوں پر جرح و تنقید کے علم کا جس کی بدولت اسماء الرجال کا عظیم الشان فن وجود میں آیا جو ان علوم میں سے ایک ہے جن کے بانی ہونے کا شرف دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی فاسق کسی اہم واقعے کی خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ یہ حکم یوں تو عام ہے، ہر ایسی خبر کی تحقیق ضروری ہے جو دور رس نتائج کی حامل ہو لیکن کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کوئی روایت کرے تو اس کی تحقیق و تنقید بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور واجب الاطاعت ہادی ہیں۔ آپ کی ہر بات بلکہ ہر ادا امت کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے منسوب کر کے کوئی غلط روایت کر دی جائے اور وہ تحقیق کے بغیر قبول کر لی جائے تو یہ چیز دنیا میں بھی موجبِ خسران بن سکتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت میں اگرچہ فاسق ہی کی روایت کی تحقیق کا حکم ہے لیکن اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی نکلی کہ اگر کوئی راوی مجہول ہو، نہ اس کا فسق معلوم ہو نہ اس کی ثقاہت، تو اس کی تحقیق بھی ضروری ہو گی، کیونکہ ایک مجہول راوی کی روایت قبول کر لینے میں اندیشہ ہے کہ ممکن ہے راوی فاسق ہو۔ چنانچہ محدثین نے مجہول راویوں کی بھی اچھی طرح تحقیق کی تاکہ ان کا فسق یا ان کی عدالت واضح ہو جائے۔ اگر کسی راوی کی تحقیق میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی تو اس کو مجہول قرار دے کر اس کی روایت انھوں نے رد کر دی۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ تحقیق اسی صورت میں ضروری ہو گی جب فاسق کوئی ایسی روایت کرے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو، اس لیے کہ یہاں لفظ 'نَبَأ' وارد ہوا ہے جو کسی اہم اور دُور رس نتائج کی حامل خبر ہی کے لیے آتا ہے۔ عام خبر یا واقعہ کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ چنانچہ روزمرہ زندگی کے عام معاملات میں فاسق یا کافر کی خبر مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت میں راوی اور روایت دونوں کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ فرمایا گیا ہے کہ 'اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو'۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'تَبَیَّنُوْا' کا مفعول راوی بھی ہے اور روایت بھی بلکہ روایت کا مفعول ہونا زیادہ واضح ہے اس لیے کہ راوی کا فسق تو یہاں معلوم ہی ہے۔ کسی روایت کی تحقیق میں جس طرح راوی کی ثقاہت، عدالت اور فقاہت اہمیت رکھتی ہے اسی طرح خود روایت کے الفاظ، اس کا موقع و محل، دوسری روایاتِ باب کے ساتھ اس کی مخالفت یا موافقت، عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کا مرتبہ اور سب سے زیادہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اور اس قبیل کی دوسری چیزیں بھی اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر صرف راوی کی تحقیق پر کفایت کر کے یہ چیزیں نظر انداز کر دی جائیں تو تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محدثین زیادہ زور صرف راوی کی تحقیق پر صرف کرتے ہیں، نفسِ متن پر ان پہلوؤں سے غور کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ حالانکہ ان پہلوؤں سے تحقیق کیے بغیر تحقیق کا حق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہرگز ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے متنِ حدیث پر غور کرنے کے لیے اصول وضع کیے اور اس کا نام درایت رکھا۔ اس خدمتِ خاص میں سب سے بڑا حصہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے صرف فقہ ہی پر احسان نہیں کیا ہے، بلکہ فنِ حدیث کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگر ہمارے علماء ان اصولوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق پاتے تو حدیث کے خلاف وہ فتنہ ہرگز نہ اٹھ سکتا جو فتنہ پردازوں نے اٹھا دیا اور جس نے گمراہ فرقوں کے لیے دین میں دراندازی کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے 'تدبرِ حدیث' پر اپنی پیشِ نظر کتاب لکھنے کی توفیق اور مہلت بخشی تو اس کے مقدمہ میں ان شاء اللہ ان اصولوں کی قدر و قیمت میں واضح کروں گا۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے محدثین کرام نے فاسق اور مجہول راویوں کی جو پردہ دری کی ہے وہ قرآن کے اسی واضح اور قطعی حکم کی تعمیل میں کی ہے لیکن اس زمانے میں بعض خوش فہم حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ راویوں کے عیوب کھولنا ہے تو غیبت جس کو قرآن نے اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں حرام قرار دیا اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے

تعبیر فرمایا ہے لیکن محدثین نے 'حکمتِ عملی' کے تحت اس حرام کو جائز بنایا تاکہ فاسق راویوں کی روایات سے دین کو بچائیں۔ پھر اس نکتہ سے ان حضرات نے ایک اور اس سے بھی زیادہ عمیق و دقیق نکتہ پیدا کر لیا کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے ایک 'قائد تحریک اسلامی' کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ 'حکمتِ عملی' کے تقاضوں کے تحت جب ضرورت محسوس کرے کسی حرمت کو حلت سے بدل دیا کرے۔ اِن نکات پر اپنے ناچیز خیالات ہم اپنے مقالات میں ظاہر کر چکے ہیں۔ یہاں ان پر تنقید کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ جب قرآن نے فاسق اور مجہول راویوں کی پردہ دری اور ان کی روایات کی تحقیق کا حکم خود اس صراحت کے ساتھ دیا ہے تو محدثین اس خدمت کے لیے غیبت جیسی ناپاک چیز کو 'حکمتِ عملی' کے تحت جائز بنانے کی زحمت کیوں اٹھاتے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ راویوں پر جرح کو غیبت قرار دینے کا سہرا ہمارے ارباب تصوف کے سر ہے۔ تصوّف کی ساری عمارت، چونکہ ضعیف اور بے بنیاد روایات ہی پر قائم ہے، اس وجہ سے جب محدثین نے راویوں کی چھان بین کا کام شروع کیا تو ان حضرات کو محسوس ہوا کہ اگر محدثین اسی بے خوفی کے ساتھ یہ کام کرتے رہے تو تصوّف کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ اس خطرے سے تصوّف کو بچانے کے لیے ان حضرات نے یہ نکتہ نکالا کہ یہ محدث حضرات تو لوگوں کی غیبت کرتے پھرتے ہیں۔ صوفیوں کا یہ نکتہ ان کے اپنے حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے اسی نکتہ کو ہمارے اس دور کے بعض ذہنوں نے اپنی 'حکمتِ عملی' کے لیے اپنا لیا اور اس کے بل پر ایک ایسا اصول وضع کر دیا جو سارے دین ہی کا تیا پانچا کر کے رکھ دے۔

آخر میں اس آیت سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے۔ بعض محدثین اور فقہاء فاسق کی روایت قبول کرنے کے باب میں اس کے فسق عملی کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے عقائدی فسق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی عملی فسق مثلاً جھوٹ اور بدکرداری وغیرہ میں مبتلا ہو تو اس کی روایت یا شہادت تو بے شک قبول نہیں کی جائے گی، لیکن اگر وہ صرف کسی فاسقانہ عقیدہ میں مبتلا ہے تو مجرد اس کے فسادِ عقیدہ کی بنا پر اس کی روایت یا شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ تجربہ گواہ ہے کہ جتنی جھوٹی روایتیں فسادِ عقیدہ میں مبتلا راویوں نے گھڑی ہیں اتنی فسادِ عمل میں مبتلا راویوں نے نہیں گھڑی ہیں۔ یہ انہی کی گھڑی ہوئی روایتیں ہیں جو سیرت، تفسیر، تصوّف اور تاریخ کی کتابوں میں بھری ہوئی ہیں اور جن سے اہلِ بدعت و ضلالت نے اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان علماء پر رحم فرمائے جنھوں نے فاسد العقیدہ راویوں کو یہ چھوٹ دے کر ملت کو ایک ایسے فتنہ سے دوچار کر دیا جس

سے اہلِ حق کے لیے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار کام ہوگیا ہے۔

ہمارے نزدیک فسقِ عملی و فسقِ عقائدی کی یہ تقسیم بے معنی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اوپر جو کلیہ عام فاسقوں کے بارے میں بیان ہوا ہے وہی فاسد العقیدہ راویوں کے بارے میں بھی عقل و نقل کے موافق ہے یعنی ان کی روایت اور شہادت ان امور میں تو قبول کی جائے گی جن میں ایک کافر کی روایت بھی قبول کی جا سکتی ہے، لیکن اہم امور بالخصوص معاملاتِ دین میں ان کی روایت یا شہادت قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ آگے آیات ۱۱—۱۳ کا مضمون

اوپر آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمامِ خاص کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے مسلمانوں کو کفر و فسق اور عصیان سے بچانے کے لیے خاص اپنے فضل سے فرمایا۔ اب آگے بعض ان باتوں سے روکا گیا ہے جو ایمان کے منافی اور داخلِ فسق ہیں اور جن سے دلوں کے اندر اس فساد کی تخم ریزی ہوتی ہے جو پورے معاشرے کو مسموم کر کے رکھ دیتا ہے اور جس کا سدِّباب نہ ہو تو جن کو اللہ تعالیٰ نے رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کے وصف سے ممتاز فرمایا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۳

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُواْ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓاْ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُواْ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱجْتَنِبُواْ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُواْ وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

ترجمۂ آیات: ۱۱-۱۳

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق اڑائے، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ٹھہریں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا عجب وہ ان سے بہتر نکلیں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے! اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ۱۱

اے ایمان لانے والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے! سو اس چیز کو تو تم نے ناگوار جانا! اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا، مہربان ہے۔ ۱۲

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہمدگر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی علیم و خبیر ہے۔ ۱۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۱)

منافیٔ ایمان باتوں سے اجتناب کی تاکید

'یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کا خطاب یہاں صرف خطاب ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ آگے وہ برائیاں بیان ہو رہی ہیں جو داخلِ فسق اور منافیٔ ایمان ہیں۔ اس خطاب سے اہلِ ایمان کو گویا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان سے مشرف ہو چکے ہیں ان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ ایمان کے بعد فسق کے داغ دھبوں سے اپنے دامن کو آلودہ کریں۔

فرمایا کہ ایمان میں داخل ہو جانے کے بعد نہ مردوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو حقیر خیال کر کے ان کا مذاق اڑائیں نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو لیکن قیامت کے دن کھلے گا کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہلِ دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی قیامت کے دن پتہ چلے کہ خدا کی بادشاہی میں جو مقام اس کا ہے وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔

یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے ہوا ہے حالانکہ بظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ 'لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ' کے عام الفاظ ان کے لیے بھی کافی تھے۔ لیکن قرآن نے فضائل و رذائل دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر ان مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے جہاں تاکید کے ساتھ ان کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنہ سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں یہی دوسری صورت ہے۔ جس برائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے وہ عورتوں کے اندر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے ان کا اندازِ خطاب و کلام ان عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔

یہاں جن باتوں سے روکا گیا ہے ان کا ایک خاص باطن ہے اور مقصود درحقیقت اسی کی بیخ کنی ہے۔ پیرے کی آخری آیت میں اس باطن کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو فتنے ایجاد کیے ہیں ان میں ایک بہت بڑا فتنہ نسل و نسب، خاندان، برادری، کنبہ اور قبیلہ کے شرف و امتیاز کا فتنہ بھی ہے۔ جو لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں (اور بہت کم ایسے خوش قسمت نکلتے ہیں جو اپنے کو اس فتنہ سے محفوظ رکھ سکیں) ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقابل میں حقیر خیال کرتے ہیں اور جب حقیر خیال کرتے ہیں تو لازماً ان کے قول، فعل اور رویہ سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ چیزیں پختہ ہو کر ان کے ہاں روایت کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں بلکہ ان کا بس چلتا ہے تو وہ ان کو مذہب کا درجہ بھی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں میں برہمنوں نے، یہود میں بنی لاوی نے اور عربوں میں قریش نے اسی طرح تقدس کا ایک ایسا مقام اپنے لیے پیدا کر لیا جس کو چیلنج کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں رہ گیا۔ یہی حال ہر قوم کا ہوا ہے اور مساواتِ انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود آج بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان جو اس فتنہ کی بیخ کنی کے لیے برپا کیے گئے تھے وہ بھی آج نہ جانے کتنی برادریوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک 'ہمچو من دیگرے نیست' کے نشہ سے سرشار ہے جس کا اظہار ہر قوم و قبیلہ کے عوام و خواص کے بیانات اور نعروں سے ہوتا رہتا ہے جس سے فطری طور پر دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے جو عداوت و بغضاء کی شکل اختیار کر کے بالآخر خون خرابے اور تقسیم و تفریق تک نوبت پہنچا دیتی ہے۔

یہاں قرآن نے مسلمانوں کو اسی آفت سے محفوظ رہنے کی ہدایت فرمائی کہ تم کو اللہ نے اپنے فضل سے جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی بخشی ہے۔ تمہارا معاشرہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ، کی اساس پر قائم ہے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ بنائے گئے ہو تو اپنے دوسرے بھائیوں کو حقیر سمجھ کر یا ان کو اپنے طنزیہ اور حقارت آمیز الفاظ کا ہدف بنا کر اس معاشرہ کا حلیہ مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ، یہ اس اصل حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس بات میں صحیح رہنمائی دینے والی ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد نسل، نسب، خاندان، برادری، قوم قبیلہ اور مال و دولت پر نہیں بلکہ آدمی کے دین و تقویٰ پر ہے اور اس بات کا فیصلہ کل کو قیامت کے دن ہو گا کہ کس کا تقویٰ زیادہ ہے اور وہ اللہ کے نزدیک اشرف و اعلیٰ ہے اور کون اپنے تمام ادعائے حسب و نسب اور غرور عز و شرف کے باوجود خدا کے نزدیک بالکل بے وزن اور بے حقیقت ہے۔

طنز اور پھبتی کی ممانعت

'وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'۔ 'لمز' کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اس پر کوئی طنز آمیز فقرہ چست کر دینا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ آیت ۹، میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے کہ 'وَالَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' یعنی جب غریب مسلمان اپنی گاڑھی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو منافقین ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان پر باندازِ استخفاف طنزیہ فقرے چست کرتے ہیں کہ لو، آج حاتم کی قبر پر لات مارنے یہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے زہر آلود فقرے قائل کے حسد کی بھی غمازی کرتے ہیں اور اس کے کبر و غرور کی بھی، اور ان کا اثر دوسروں پر یا تو حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا نفرت و عناد کی صورت میں اور یہ دونوں ہی چیزیں معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والی ہیں۔

'اَنْفُسَكُمْ' یہاں اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح النسآء کی آیت ۲۹ میں 'لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ' (اپنے آپ کو قتل نہ کرو) آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر طعن کرتا ہے وہ گویا اپنے ہی اوپر طعن کرتا ہے اس لیے کہ تمام مسلمان آپس میں 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' کے اصول پر بھائی بھائی ہیں تو جس نے اپنے کسی بھائی کو اپنے کسی طعن و طنز کا ہدف بنایا اس نے گویا اپنے ہی سینہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور اپنے ہی کو مجروح کیا۔

'وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ'۔ 'تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ' کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرنا ہے۔ اچھے القاب سے ملقب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے اسی طرح برے القاب کسی پر چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجویہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور ان کا اثر نہایت دور رس اور نہایت پائدار ہوتا ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں اور اگر معاشرے میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے برے القاب ایجاد کرنے میں لگا دیں تو پھر اس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اس کی وحدت لازماً پارہ پارہ ہو کے رہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے اندر یہ ذوق بدرجۂ کمال ترقی پر تھا۔ قبیلہ کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب وہی مانا جاتا جو دوسروں کے مقابل میں اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے اور حریفوں کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ ان کے ہجویہ اشعار پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ اس فنِ شریف میں انھوں نے کتنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کی اس چیز نے ان کو کبھی ایک قوم بننے نہیں دیا۔ وہ برابر اپنوں ہی کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے ان کو انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آشنا کیا جس کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ قرآن نے یہاں ان کو دورِ جاہلیت کے انہی فتنوں سے آگاہ کیا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان و اسلام کی برکات سے نوازا ہے تو اس کی قدر کرو، شیطان کے ورغلانے سے پھر انہی لاف زنیوں اور خاک بازیوں میں نہ مبتلا ہو جانا جن سے اللہ نے تمھیں بچایا ہے۔

'بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ'۔ 'بِئْسَ' اور 'نِعْمَ' کے اندر فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک معنی خیز ترجمہ یہ ہوگا کہ 'نہایت ہی برا لفظ ہے فسق ایمان کے بعد'۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح کہیں 'الشریر کاسمہ' شریر کا تو لفظ بھی برا ہے پھر شریر کے بیسے ہونے کا کیا ٹھکانا ہے! ہماری زبان میں بھی کسی شئے کی انتہائی برائی کے اظہار کے لیے یہ اسلوب موجود ہے۔ مثلاً کہتے ہیں 'بھائی' اس چیز کے تو نام سے بھی گھن آتی ہے'۔

'بَعْدَ الْاِیْمَانِ' کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوئے ہوتے اور تم سے کوئی بات فسق کے قسم کی صادر ہو جاتی تو یہ چیز زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی لیکن جب تمھیں اللہ نے ایمان کی حلاوت سے آشنا کر دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'وَکَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ' تو اب تو تمھیں 'فسق' کے نام سے بھی گھن محسوس کرنی چاہیے چہ جائیکہ تم سے کسی عملِ فسق کا صدور ہو!

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے یہ سب فسق میں داخل ہیں اور اہلِ ایمان کی حسِ ایمانی اتنی بیدار رہنی چاہیے کہ ارتکابِ فسق تو در کنار لفظ فسق سے بھی وہ نفور و بیزار رہیں۔

'وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'۔ یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس وضاحت کے بعد بھی اس قسم کے کسی فسق کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں سے توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ظالم وہی ٹھہریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے ایمان کی برکتیں بھی واضح کر دی ہیں اور ان کو کفر و فسق کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے وہ اس کے نتائج سے لازماً دوچار ہوں گے اور یہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۱۲)

یہ اہلِ ایمان کو از سرِ نو خطاب کر کے بعض ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر

آتی ہیں لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقویٰ کی روئیدگی کے لیے بالکل ناساز گار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جن کو ایمان عزیز ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آفتوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔

بدگمانی

پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں سے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنالے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے اس کو کسی گوشے میں محفوظ کر لے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے۔ اس پہلو سے معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد ہے۔ اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کے رد و قبول کے معاملے میں بھی بے پروا و سہل انکار نہ ہو بلکہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز رہے۔ اہل ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے اِلّا آنکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس ایمانی اخوت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں ان سب کو سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ مچھلیوں کے شوق میں جو شخص ایسا اندھا بن جائے گا اندیشہ ہے کہ اسی شوق میں کسی دن وہ اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھے گا۔ قرآن نے یہاں اسی خطرے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ گمانوں کے زیادہ درپے نہ ہو کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن کو بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ کرے اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اس کے بُرے پہلو کو اسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے جب اس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اس بات کے مقابل میں اہون ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حقدار سے بدگمانی رکھے۔ حدیث شریف میں مومن کی تعریف یہ آئی ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ (مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے)۔ اس زمانہ میں لوگوں کا عام پسندیدہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھو اِلّا آنکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے گوں کا آدمی ہے۔ اس چیز کو لوگ سیاست اور زیرکی خیال کرتے ہیں۔ دشمن کے مقابل میں تو بے شبہ زیرکی و ہوشیاری ضروری ہے۔ 'اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ' کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے

ہیں لیکن اہلِ ایمان کے مقابل میں یہ سیاست کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ان کو اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونے کی قرآن نے ہدایت فرمائی ہے؟

تجسس

دوسری بات آیت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا تَجَسَّسُوْا (ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو)۔ جس طرح اوپر والے ٹکڑے میں اچھے گمان سے نہیں بلکہ برے گمان سے روکا گیا ہے اسی طرح یہاں ممانعت اس ٹوہ میں لگنے کی ہے جو بُرے مقصد سے ہو۔ یعنی تلاش اس بات کی ہو کہ دوسرے کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی بات ہاتھ آئے جس سے اس کی خامیوں سے آگاہی اور اس کے اندرونِ خانہ کے اسرار تک رسائی ہو۔ یہ چیز کبھی تو حسد کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے کہ حریف کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو سامنے آئے جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کبھی بغض و عناد کی شدت اس کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس کی عندالضرورت تشہیر کر کے مخالف کو رُسوا کیا جا سکے۔ اس زمانے میں اس نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کر لی ہے جس کو جدید اخبار نویسی نے بہت ترقی دی ہے۔ بعض اخبار نویس رات دن کسی نہ کسی اسکینڈل کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ شاطر وہ اخبار نویس سمجھا جاتا ہے جو کسی نمایاں شخصیت کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی ایسا اسکینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جس سے اس کا اخبار یا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اس طرح کا تجسس ظاہر ہے کہ اس اخوت اور باہمی ہمدردی کے بالکل منافی ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے، اس وجہ سے اہلِ ایمان کو اس سے روکا گیا ہے۔ رہا وہ تجسس جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حالات کا اس مقصد سے کرتا ہے کہ اس کی مشکلات و ضروریات میں اس کا ہاتھ بٹا سکے یا ایک اسلامی حکومت اس غرض سے کرتی ہے کہ رعایا کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے تو یہ تجسس نہ یہاں زیرِ بحث ہے اور نہ یہ ممنوع ہے بلکہ ہر شریف پڑوسی کے لیے یہ نہایت نیکی کا کام ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے حالات و مسائل سے آگاہ رہے تاکہ ان کی مشکلات میں ان کی مدد کر سکے اور حکومت کے لیے تو یہ صرف نیکی ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ رعایا کے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کا اہتمام رکھے تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

غیبت

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے) غیبت کے معنی کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔ اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز و ہم خیال اور شریک مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم ان سے یہ

اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔ غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھنونا فعل بناتی ہے اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت و حمایت کا مقصد حاصل ہوتا نہ کسی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض خوش فہم کسی کی برائی کے ذکر کی ہر صورت کو غیبت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدثین کا راویوں پر جرح کرنا، کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا، کسی کے منکر پر نکیر کرنا، کسی کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانا، کسی کے باب میں کسی مشورہ چاہنے والے کو اس کے کسی واقعی عیب سے آگاہ کرنا اور اس قبیل کی ساری ہی باتیں ہیں تو داخلِ غیبت، لیکن یہ غیبتیں حکمتِ عملی کے تحت جائز کر دی گئی ہیں۔ پھر وہ یہیں سے اپنے لیے ایک شرعی اصول یہ نکال لیتے ہیں کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے انھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کی حکمتِ عملی کسی حرام کو مباح کرنے کی اگر مقتضی ہو تو وہ اس کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کے خلاف ایک نہایت شدید قسم کا فتنہ ہے جس سے بہت سے نئے فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم نے اس کی تردید میں مستقل مضامین بھی لکھے ہیں اور یہاں بھی ہم آگے ایک مستقل فصل میں اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

'اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا فَکَرِہۡتُمُوۡہُ'۔ یہ غیبت کے گھنونے پن کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کی، اس کے پیٹھ پیچھے، برائی بیان کرتا ہے وہ گویا اس حال میں اس کا گوشت کھا رہا ہے جب کہ وہ مردہ پڑا ہوا اور اپنی مدافعت سے بالکل قاصر ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا، تو جب تم اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اسی طرح کی مکروہ چیز، غیبت کو کیوں گوارا کرو! 'مَیۡتًا' یہاں 'اَخِیۡہِ' میں مضاف سے حال پڑا ہوا ہے اور یہ تصویر ہے اس کی اپنی مدافعت سے بے بسی کی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ'۔ یہ تنبیہ بھی ہے اور توبہ و اصلاحِ حال کی ترغیب بھی۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو جو لوگ اس طرح اپنے بھائیوں کا گوشت مفت کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو اس کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے تمھیں بروقت تنبیہ فرما دی ہے تاکہ توبہ اور اصلاح کر کے اپنے کو اس خطرہ سے محفوظ کر لو۔ اگر تم نے توبہ کر لی تو اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں (۱۱ - ۱۲) میں جن چھ باتوں سے روکا گیا ہے ان پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اوپر کی تین باتیں ــــ مذاق اڑانا، طعن کرنا اور برے القاب چپاں کرنا ــــ ان برائیوں میں سے ہیں جن کا ارتکاب انسان علانیہ پبلک میں کرتا ہے۔ باقی تین برائیاں ــــ سوءظن، تجسس اور غیبت ــــ انسان کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کو وہ دوسروں سے چھپا کر یا اپنے محرمان راز کے اندر محدود رکھ کر کرتا ہے۔ ان دونوں ہی قسم کی برائیوں کی ممانعت اسلامی تزکیہ و تطہیر کے اس اصول پر مبنی ہے جو قرآن میں وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام: ۱۲۰) (اور گناہ کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں ہی کو چھوڑ دو) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو ان برائیوں سے پاک نہیں کرتا جو اس کے باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، اس وقت تک اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے علّام الغیوب ہونے کا وہ شعور راسخ نہیں ہوتا جس کے بغیر دل کے اندر تقویٰ کی روئیدگی بالکل خارج از امکان ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۱۳)

نسلی اور خاندانی غرور پر ضرب

ایک عام خطاب سے یہ اس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کا یک قلم خاتمہ کر دیا جو ان برائیوں میں سے اکثر کا سبب بنتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ فرمایا کہ اے لوگو! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ ہم نے سب کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تمام بنی نوع انسان کا آغاز آدمؑ اور حوّا ہی سے ہوا ہے اس وجہ سے باعتبار خلقت کسی کو کسی پر کوئی شرف و تفوق حاصل نہیں ہے۔ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے۔ کسی خاص خاندان یا قبیلہ کو اللہ تعالیٰ نے بجائے خود یہ امتیاز نہیں بخشا ہے کہ جو اس میں پیدا ہو وہ اللہ کے ہاں معزز بن جائے اور دوسروں کے مقابل میں وہ اپنے کو اشرف و اعلیٰ سمجھنے لگے۔ جس طرح اللہ نے لوگوں کی شکلوں، ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا تاکہ لوگ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں تاکہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ ان حد بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی خاندان یا قبیلہ کے لوگ اس پندار میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ اللہ کے نزدیک معزز ہیں، اس نے ان کو دوسروں پر کوئی برتری بخشی ہے۔ اللہ کے ہاں عزت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ، یعنی اس مقرر کردہ معیار پر لوگوں کو پرکھنے میں اللہ تعالیٰ کو کوئی

زحمت یا کوئی مغالطہ پیش آنے کا امکان نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر ایک کے ہر قول و فعل کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو عزت کا مستحق ہوگا وہ اپنا عزت کا مقام پاکے رہے گا، اگرچہ وہ کتنے ہی گمنام اور حقیر خاندان کے اندر سے اٹھا ہو اور جو اس کا مستحق نہیں ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بڑا قرشی و ہاشمی اور سید و نجیب الطرفین ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس کو اسی کھڈ میں پھینکے گا جس کا وہ سزاوار ہوگا۔

۵۔ اس مجموعۂ آیات کی بعض ہدایات کی وضاحت

اس مجموعۂ آیات میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کی بقدر ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہم کرتے آئے ہیں، لیکن تجسس اور غیبت کے بعض پہلو مزید وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہاں ہم ان کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں۔

کیا حکومت کے لیے بھی لوگوں کے حالات کا تجسس جائز نہیں ہے

اس زمانے میں چونکہ فرد کی آزادی کا تصور ذہنوں پر بہت غالب ہے اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے جس طرح عام افراد کو دوسروں کے احوال کے تجسس سے روکا ہے اسی طرح حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کا تجسس کرے۔ اس کو اپنا احتساب صرف ان معاملات تک محدود رکھنا چاہیے جو علانیہ طور پر اس کے نوٹس میں آجائیں۔ رہے اندرون خانہ کے معاملات تو وہ حکومت کے دائرۂ احتساب سے خارج ہیں۔ اس کی تائید میں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رات میں ایک شخص کے گانے کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا تو آپ دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا اے دشمنِ خدا، کیا تو نے گمان کر رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا۔ امیر المومنین، جلدی نہ کیجیے، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے اکٹھے تین گناہ کر ڈالے ہیں۔ اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہو اور آپ دیوار چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ داخل ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انھوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بعض حضرات نے مکارمِ اخلاق اور ترغیب و ترہیب کی نوعیت کی کتابوں میں درج کی ہے لیکن نہ سند کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ ہے اور نہ متن ہی کے پہلو سے یہ قابلِ اعتبار ہے۔ سند کے ضعف کے لیے تو یہی بات کافی ہے کہ بہت سے لوگ خاص طور پر اربابِ تصوف و اخلاق و موعظت کی روایات میں تحقیقِ سند کی اہمیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ جس قسم کے قصوں سے ان کے

نزدیک کوئی مفید سبق حاصل ہوتا ہو ان کو بے تکلف بلا تحقیق سند و متن اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں۔ رہا اس کا متن تو اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ واقعہ بالکل ہی بعید از عقل و قیاس ہے۔

اول تو یہی بات ناقابلِ قیاس ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ میں، اور وہ بھی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں، ایسی جسارت کر سکے کہ شاہد و شراب کے ساتھ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف ہو کہ گانے کی آواز حضرت عمرؓ کو باہر گلیوں میں سنائی دے اور ان کو اس بزم عیش میں خلل انداز ہونا پڑے۔ اگر عین مرکزِ اسلام میں، فاروق اعظمؓ کے دور میں، شیطان کی جسارت کا یہ حال رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ بھی شیطان کو مرعوب نہ کر سکے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) جس راستہ سے گزرتے ہیں شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ کو قرآن و حدیث کے یہ احکام معلوم نہیں تھے کہ کسی کے گھر میں اس کی دیوار پھاند کر داخل ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت ملے تو داخل ہونا چاہیے ورنہ تین بار سلام کر کے چپکے سے الٹے پاؤں واپس ہو جانا چاہیے۔ کیا کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے یہ باور کر سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے ان صریح احکام سے حضرت عمرؓ کو پہلی بار ایک رند شاہد باز نے آگاہ کیا! کیا حضرت عمرؓ کو کبھی سورۂ نور اور سورۂ حجرات کی تلاوت کا، العیاذ باللہ، موقع نہیں ملا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنی یہ تینوں غلطیاں نہایت سعادت مندی سے تسلیم کر لی تھیں تو اپنے عمّال اور گورنروں کو یہ ہدایت نامہ کیوں نہیں جاری فرمایا کہ اب تک میں غلطی پر تھا کہ لوگوں کے گھروں کا تجسس کیا کرتا تھا، اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس میں اکٹھی تین باتیں خلافِ شریعت ہیں اس وجہ سے تم لوگ اندرونِ خانہ کے معاملات سے تعلق نہ رکھو۔ لوگ اپنے گھروں میں جو اودھم چاہیں مچائیں، اگر تمھیں شبہ گزرے تو دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت مانگو، اگر اجازت ملے تو گھر کے اندر جاؤ ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آؤ۔ یہاں تک ہمیں علم ہے حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا بلکہ متعدد واقعات تاریخوں میں، ایسے موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ ان کے عمّال بھی تجسّس کرتے رہے اور خود حضرت عمرؓ بھی اس حد تک تجسّس کرتے تھے کہ راتوں میں دودھ پیتے بچے روتے، تو وہ ان کے رونے کا سبب معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک اسلامی حکومت میں اگر کچھ لوگ اپنے گھروں میں شرابیں پئیں، بازاری عورتوں سے رنگ رلیاں منائیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم کریں یہاں تک کہ بم اور اسٹین گن کے ذخیرے بھی جمع کر چھوڑیں، تو بھی حکومت کی پولیس کو یہ حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے گھروں میں گھس کر ان کے عیش کو مکدر کرے، یہاں تک کہ خلیفۂ وقت کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بدون اذن وہ ان کے گھروں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکے اور کبھی غلطی سے اگر ایسی جرأت کر بیٹھے تو بس اتنی ہدایت نرما دیا کرے کہ آئندہ آپ لوگ اس طرح کی باتوں سے احتیاط کریں۔

یہ روایت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے تعرض کیا جاتا لیکن اس کو اس زمانے میں ان لوگوں نے بڑے اعتماد سے پیش کیا ہے جو رات دن اسلامی حکومت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض کرنا پڑا۔ بہر حال یہ روایت ہمارے نزدیک بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ ایک اسلامی حکومت لوگوں کے اخلاق و کردار کی بھی محافظ ہوتی ہے اور ملک کے امن، عدل اور اس کی سلامتی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اس کو کوئی شبہ گزرے وہ اس کا تجسس کرے لیکن ہر حق کے استعمال پر کچھ اخلاقی و قانونی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا لحاظ حکومت کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اگر ان کا لحاظ نہیں کرتی تو خواہ اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے لیکن عنداللہ وہ لوگ مجرم ٹھہریں گے جنھوں نے ایک ایسے حق کو پبلک کے بے گناہ افراد کو پریشان کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کو امن، عدل اور رعایا کی حفاظت کے لیے عطا ہوا تھا۔

مستحسن تجسس

رہے عام افراد تو ان کو اس باب میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

— جو تجسس کسی کی بھلائی کی خاطر، نیک ارادہ، نیک مقصد سے ہو وہ، جیسا کہ ہم آیت کے تحت عرض کر چکے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ نہایت نیکی کا کام ہے۔ قرآن میں ہدایت ہے کہ خوددار غریبوں کی مدد کے لیے ان کو ڈھونڈھ کر خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔ یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تم سے لپٹ کر سوال کریں گے۔

— اگر کسی شخص کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس کی درپردہ سرگرمیاں دوسرے بے گناہ افراد کے جان و مال اور آبرو کے لیے خطرہ ہیں یا ملک کے امن، عدل اور سلامتی کو ان سے نقصان متصور ہے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اصلاح کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں یا اس کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں سمجھائی ہے۔

— اگر کسی شخص کی کوئی ایسی برائی علم میں آئے جو اس کی ذات ہی تک محدود ہو تو اس کو نصیحت کرے، اگر نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اگر اس پوزیشن میں نہ ہو تو اس سے غضِ بصر کرے اور پردہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے جو دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں لیکن اگر برائی متعدی نوعیت کی ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرے جو انکار منکر

والی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے کا طریقہ

قرآن و حدیث کے سمجھنے میں لوگوں کو زیادہ مغالطہ اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ آیات واحادیث کا موقع و محل معیّن کرنے میں لوگ تدبّر سے کام نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حدیثوں میں اپنے مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن کوئی صاحب مجرد اس حدیث کی بنا پر اگر یہ فتویٰ دے بیٹھیں کہ دوسروں کی نیکی بدی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہمیں صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے، کسی سے کوئی بدی ہمارے علم میں آئے بھی تو اس پر ہمیں پردہ ڈالنا چاہیے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا، تو گو اس فتوے کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے لیکن یہ فتویٰ ذہنوں میں بڑی الجھن پیدا کر دے گا، اس لیے کہ دوسری حدیثوں میں یہ بات بھی نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو، طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے، اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ الجھن ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ دونوں حدیثوں کا موقع و محل معیّن کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر دونوں کا موقع و محل معیّن ہو جائے تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ ایک شخص کو اگر آپ دیکھتے ہیں کہ کھڑا ہو کر پیشاب کر رہا ہے تو یہ خیال کر کے غضِّ بصر بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو۔ اگر عذر نہ واضح ہو تو اس کو عمدہ طریقہ سے نصیحت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ تہذیب و شائستگی اور اسلامی آدابِ طہارت کے خلاف ہے۔ اگر نصیحت کر سکنے کے پوزیشن میں نہ ہوں تو اس کے اس اجڈپن پر پردہ ڈالیے، اس کا اشتہار نہ دیجیے۔ ان شاء اللہ آپ کی یہ پردہ پوشی آپ کے لیے عنداللہ موجبِ اجر ہوگی۔ لیکن ایک شخص کے متعلق اگر آپ یہ علم رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے گھر میں شراب کی بھٹی بنا رکھی ہے یا حشیش کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے یا اسلحہ چھپا رکھا ہے یا چکلہ قائم کر رکھا ہے اور آپ پولیس اور حکومت کو اطلاع دے سکنے کے پوزیشن میں ہونے کے باوجود اس خیال سے اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو میرے نزدیک یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس طرح کی خوش فہمی میں پڑے ہوئے لوگ ثواب کمانا تو درکنار اپنے ایمان ہی گنوا بیٹھیں گے۔

غیبت کے باب میں بعض لوگوں کی غلط فہمی

غیبت کے باب میں بھی بعض لوگوں نے قلتِ تدبر کے سبب سے اسی نوع کا خلطِ مبحث پیدا کر دیا ہے۔ وہ غیبت کے حدود معیّن کرتے وقت بالکل بھول گئے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح غیبت کی نہی وارد ہوئی ہے اسی طرح جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر، خیر خواہی

مسلمین کے احکام بھی نہایت مثبت اور قطعی الفاظ میں وارد ہوئے ہیں۔ جب ان دونوں میں تطبیق کا سوال پیدا ہوا اور کوئی تطبیق ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے یوں تطبیق پیدا کر ڈالی کہ میں تو یہ ساری باتیں داخلِ غیبت لیکن یہ اس لیے مباح کر دی گئی ہیں کہ حکمتِ عملی ان کی مقتضی تھی۔ حالانکہ جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر اور نصحِ مسلمین کے احکام مباحات میں سے نہیں بلکہ واجباتِ دین میں سے ہیں۔ اسلامی نظام کا سارا جمال و کمال انہی پر منحصر ہے۔ راویوں کی تحقیق اور جرح و تعدیل پر علم شریعت کی بنیاد ہے۔ شہادتِ حق اس امت کا وہ فریضۂ منصبی ہے جس کے لیے یہ دنیا میں برپا کی گئی ہے۔ انکارِ منکر کے ساتھ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس امت کے قیام و بقار کو وابستہ کیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی صرف اخوت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اسی سورہ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ یہ ایمان کا بھی تقاضا ہے۔ یہ چیزیں امت پر غیبت کو مباح کر کے نہیں فرض کی گئی ہیں بلکہ ایمان کے تقاضوں کے تحت فرض کی گئی ہیں۔ رہی غیبت تو اس کا ایک خاص دائرہ ہے جس کی وضاحت آیت کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اس کی حرمت کسی پہلو سے بھی دین کے ان فرائض میں مخل یا مانع نہیں ہے کہ اس کو حکمتِ عملی کی خاطر مباح کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ نہ محدثین نے اس کو جائز قرار دیا ہے نہ مجددین و مصلحین نے اور نہ کسی مسلمان کو اپنے کسی دینی فرض کے ادا کرنے کے لیے کبھی اس کو مباح کرنے کی ضرورت پیش آسکتی۔ اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو ان لوگوں کو آسکتی ہے جو اسلامی شریعت کو اپنی حکمتِ عملی کی بازیگاہ بنانا چاہتے ہوں۔

۶۔ آگے آیات ۱۴-۱۸ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جس میں ان لوگوں کے باطن سے پردہ اٹھایا ہے جن کے رویہ پر ابتدائی پانچ آیات میں نکیر فرمائی ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اطرافِ مدینہ کے بعض قبائل اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن مرکز سے دور ہونے کے باعث ان کی تربیت اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بغیر لڑے بھڑے اسلام میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن گمان کیے ہوئے بیٹھے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ادب و احترام کس طرح ملحوظ رکھ سکتے تھے جو ایمان کا مقتضی تھا۔ چنانچہ ان سے اس طرح کی باتیں صادر ہو جاتی تھیں جن پر ابتدائی آیات میں گرفت فرمائی گئی ہے لیکن اندازِ خطاب عام ہی رہا تاکہ جن کے اندر بھی یہ خامیاں ہوں وہ ان کی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ یہ صورتِ حال جن باتوں کی تعلیم کی مقتضی ہوئی وہ بتا دی گئیں۔ اب آخر میں ان کے نام کی تصریح کے ساتھ ان کی اصل بیماری کا پتہ دے

دیا تاکہ وہ اس کے علاج کی طرف متوجہ ہوں اس لیے کہ اس بیماری کے ہوتے ایمان کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۱۸

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

ع ۲ ۸ ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۴-۱۸

اہل بدو نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ ان کو بتا دو کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی اور ابھی ایمان تمھارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ ۱۴-۱۵

کہہ دو، کیا تم اپنے دین سے اللہ کو آگاہ کر رہے ہو! درآنحالیکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۱۶

یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق بخشی، اگر تم سچے ہو۔ اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے غیب کو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۷-۱۸

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

ان لوگوں کے غرور پر ضرب جو اپنے کو اسلام کا محسن سمجھتے تھے

'اعراب' سے مراد اطرافِ مدینہ کے وہی دیہاتی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتے ہیں تو آپ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے برابر کے آدمی کو خطاب کرتا ہے۔ اگر کبھی آپ سے ملنے آتے ہیں تو آتے ہی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بلا تاخیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کریں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گھر کے اندر تشریف فرما ہوتے ہیں تو یہ انتظار کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتے بلکہ گھر کے باہر ہی سے آپ کو نام لے کر پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس گنوارپن میں جہاں تربیت سے محرومی کو دخل تھا وہیں اس بات کو بھی دخل تھا کہ یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر کسی جنگ وجدال کے اسلام میں داخل ہو کر آپ کے اوپر احسان کیا ہے جس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا اور اسلام کا محسن سمجھیں اور ہر موقع پر ان کی ناز برداری فرمائیں۔ ان لوگوں کی اسی ذہنیت پر یہاں ضرب لگائی جا رہی ہے۔

'قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا'۔ فرمایا کہ یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں! ان کے اس قول

کا حوالہ یہاں محض ان کے اقرارِ ایمان کی حیثیت سے نہیں دیا گیا ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ بات وہ بطورِ اظہارِ احسان کہتے تھے۔ یعنی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بات بات میں یہ احسان جتاتے تھے کہ انھوں نے ایمان قبول کر کے آپ کی عزت و شوکت بڑھائی ہے۔ اس وجہ سے وہ حقدار ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ ان کا لحاظ فرمائیں اور جو مشورے وہ دیں ان کو بسر و چشم قبول کریں۔

'قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا' پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ان کو جواب دلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ تمھارا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ تم ایمان لائے ہو البتہ یہ دعویٰ تم کر سکتے ہو کہ تم نے اطاعت کر لی ہے۔ لفظ 'اسلام' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی ظاہری اطاعت کے معنی میں ہے۔ اسلام کا حقیقی مفہوم تو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے کا ہے، لیکن یہ مجرد ظاہری اطاعت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ان دونوں معنوں کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان لوگوں کی نسبت ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ دعوتِ ایمان سے زیادہ اسلام کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر یہ لوگ مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اس وجہ سے ایمان کی روح ان کے دلوں میں ابھی نہیں اتری تھی البتہ اسلام کے سیاسی اقتدار کے ماتحت یہ لوگ آ گئے تھے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جواب دیا کہ ایمان کا دعویٰ تو ابھی تمھیں زیب نہیں دیتا البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسلام کے اقتدار کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ اس جواب کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ جب تم نے اسلام کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر اطاعت کی ہے تو یہ چیز جتانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی مغلوبیت ہی ہے، پس یہ فرق ہے کہ تم بغیر مقابلہ کیے مغلوب ہو گئے اور یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کا احسان جتاؤ۔

ایمان کی حقیقت

'وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ' یعنی ابھی اپنے ایمان کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ، اس نے تمھارے دلوں کے دروازے پر دستک ضرور دی ہے لیکن وہ دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔ یہ ایمان اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں معتبر ایمان وہ ہے جو رگ و پے میں اترے اور دل کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگ لے کہ اس سے الگ ہو کر سوچنا اور کوئی عمل کرنا انسان کے لیے آسان نہ رہ جائے۔

'وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا' یہ ان کے اظہارِ احسان پر تنبیہ ہے کہ اگر تم ایمان لائے یا تم نے اسلام کی کوئی خدمت کی تو اس کا احسان کیوں جتاؤ! اللہ تمھارے کسی عمل میں ذرا بھی کمی کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر چھوٹے بڑے عمل کا بھرپور صلہ دینے والا ہے۔ ایک کرو گے، ستر پاؤ گے۔ تمھارا ہر عمل تمھارے ہی کام آنے والا ہے، خدا کے کام آنے والا

نہیں ہے تو جب تم اپنا ہی کام کر رہے ہو تو اس کا احسان اللہ اور رسول پر کیوں رکھتے ہو!

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ' اللہ تعالیٰ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ وہ تمہاری کوتاہیوں اور خامیوں سے درگزر فرمائے گا، صلہ دینے میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تمہارے اعمال کی قیمت کم کرنے کے لیے تمہارے چھوٹے چھوٹے نقائص کو بہانہ بنائے۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر اب تک تمہارے ذہن میں یہ غلطی سمائی رہی ہے کہ اسلام کے لیے تم نے جو کچھ کیا یہ اللہ اور رسول پر تمہارا احسان ہے تو اب اس تنبیہ کے بعد تم اس غلطی کی اصلاح کرو اور اللہ سے مغفرت مانگو، وہ تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ (۱۵)

حقیقی اہل ایمان کے اوصاف

فرمایا کہ ہر مدعی ایمان، اللہ کے نزدیک مومن نہیں بن سکتا۔ حقیقی مومن اللہ کے نزدیک وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر صدق دل سے ایمان لائے، پھر شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ مال و جان دونوں سے اللہ کی راہ میں برابر جہاد کیا۔ اپنا مال بھی دین کی تقویت و تائید کے لیے صرف کیا اور جان قربان کرنے کی نوبت آئی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں لیکن اپنے تذبذب کے سبب سے اس راہ میں نہ کوئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہیں اور نہ جان و مال کی قربانی کا کوئی حوصلہ رکھتے ہیں، وہ محض دکھاوے کے مخلص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ 'جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ' کا ذکر ان کے عدم تذبذب کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔ ایک شخص اگر ایک نصب العین کے لیے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تو یہ ایک ناقابل انکار شہادت اس بات کی ہے کہ اس کو اس نصب العین کی صداقت پر پورا یقین ہے اور اگر وہ اس کی خاطر نہ مال قربان کرنے پر تیار ہے نہ اپنی جان کو کسی خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اگرچہ وہ اس کے عشق میں کتنی ہی لاف زنی کرے لیکن اس کا عمل گواہ ہے کہ وہ اس کے باب میں ابھی مبتلائے شک ہے۔

قُلۡ اَتُعَلِّمُوۡنَ اللّٰہَ بِدِیۡنِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ (۱۶)

یعنی یہ لوگ بڑے سرپرستانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں تو ان سے پوچھو کہ کیا

تم لوگ اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو! اگر یہ لوگ اللہ کو آگاہ کر رہے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ ہر بات سے باخبر ہے۔ وہ فعلاً بھی ہر چیز کو جانتا ہے اور صفتہً بھی ہر بات سے باخبر ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو اپنے ایمان پر ناز ہے تو اس پر وہ کسی ایسے کے سامنے ناز کریں جو ان کے دین و ایمان سے بے خبر ہو۔ اس کے سامنے ناز کرنے سے کیا فائدہ جو اس کائنات کے ہر سر و علانیہ سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ کیا جو ہر چیز سے آگاہ ہے وہ ان کے ایمان کے طول و عرض سے آگاہ نہیں ہوگا۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۷)

مدعیانِ احسان کو جواب

ان لوگوں کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولنے کے بعد ان کے دعوائے اسلام کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ لوگ تمھارے اوپر (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے۔ یعنی ان کا زعم یہ ہے کہ اسلام لا کر انھوں نے پیغمبر کی عزت بڑھائی اور اسلام کو قوت و شوکت بخشی اس وجہ سے وہ پیغمبر اور اسلام دونوں کے محسن ہیں اور پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا احترام کریں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم فی الواقع اپنے دعوے میں سچے ہو تو تمھارا احسان میرے اوپر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تمھارے اوپر ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی توفیق بخشی۔ 'اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ' کے الفاظ پر نظر رہے، یعنی اول تو تمھارا ایمان و اسلام کا دعویٰ ہی محض لاف زنی ہے اور اگر تمھاری بات میں کچھ صداقت ہے تو تمھیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمھیں اس کی توفیق بخشی۔ 'هَدٰىكُمْ' کے بعد 'لِ' کا صلہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں توفیق کے مضمون پر متضمن ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کی کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت کر کے کوئی شخص نہ اللہ و رسول پر کوئی احسان کرتا نہ دین پر بلکہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے کہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ احسان، درحقیقت، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے کر اس کے لیے ابدی فیروز مندی کی راہ کھولتا ہے۔ یہاں اس بات پر بھی نظر رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جواب نہیں دلوایا گیا کہ تم لوگ اپنے ایمان و اسلام کا احسان مجھے نہ جتاؤ، بلکہ میرا احسان تمھارے اوپر ہے کہ میں نے تمھارے سامنے ہدایت کی راہ کھولی۔ اگر یہ جواب دلوایا جاتا تو اس کا ایک محل تھا، لیکن نبی جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت

کی راہ پر لانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دے لیکن لوگوں کو ہدایت کی توفیق دینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی توفیق بخشنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے اور معاملہ کا سارا انحصار اسی توفیق بخشی پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸)

وہی آیت ۱۶ والا مضمون ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمایا کہ اپنے ایمان و اسلام کو زیادہ جتانے اور جتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں کو خود جانتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز دعویٰ نہیں بلکہ عمل ہے۔ اگر عمل کرو گے تو تمہارا دعویٰ بغیر اظہار و اعلان کے اللہ کے ہاں ثابت ہو جائے گا اور اگر عمل نہیں کرو گے تو زبان سے کتنا ہی دعویٰ کرو، یہ بالکل بے حقیقت و بے سود ہو گا۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس گروپ کی آخری سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

رحمان آباد
۱۳ر دسمبر ۱۹۷۶ء
۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ

تدبرِ قرآن

۵۰

قٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ قٓ سے سورتوں کا چھٹا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں کل سترہ سورتیں ہیں۔ جن میں سے سات سورتیں ــــ قٓ، ذاریات، طور، قمر، رحمان اور واقعہ ــ بالترتیب مکی ہیں۔ صرف سورۂ رحمان کو بعض مصاحف میں مدنی ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اس کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے۔ پوری سورہ کا مدنی ہونا تو درکنار اس کی کوئی ایک آیت بھی مدنی نہیں ہے۔

سورۂ واقعہ کے بعد دس سورتیں ــــ حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون تغابن، طلاق اور تحریم ــــ مدنی ہیں۔

اس گروپ کا جامع عمود بعث اور حشر و نشر ہے۔ اس کی تمام مکی سورتوں میں یہ مضمون ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ اگرچہ قرآن کے بنیادی مطالب، دوسرے گروپوں کی طرح، اس میں بھی زیر بحث آئے ہیں لیکن وہ اسی جامع عمود کے تحت آئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو مدنی سورتیں اس میں شامل ہیں وہ بھی اسی اصل کے تحت ہیں۔ بعث اور حشر و نشر پر ایمان کا لازمی نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت ہے۔ مدنی سورتوں میں اسی تسلیم و اطاعت کے وہ مقتضیات بیان ہوئے ہیں جن کے بیان کے لیے زمانۂ نزول کے حالات داعی ہوئے ہیں۔

مکی سورتوں میں تمام رد و قدح کفارِ قریش کے عقائد و مزعومات پر ہے اور وہی ان میں اصلاً مخاطب بھی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اگر خطاب ہے تو بطور التفات و تسلی ہے۔

مدنی سورتوں میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کی کمزوریاں زیر بحث آئی ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ایمان کے تقاضوں سے ابھی اچھی طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ انہی کے ضمن میں اہل کتاب بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس دور میں اہل کتاب بھی قریش کی حمایت اور اسلام کی مخالفت کے لیے میدان

میں اتر آئے تھے، دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر منافقین کا گروہ جو گھس آیا تھا وہ بیشتر انہی اہل کتاب کے زیر اثر تھا۔

اس گروپ کی پہلی سورہ ـــ قٓ ـــ ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

ب ۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود بعث یعنی زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ قرآن نے جب لوگوں کو آگاہ کیا کہ مرنے کے بعد لوگ از سر نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے آگے اپنے اعمال و اقوال کی جوابدہی کے لیے پیش ہوں گے تو یہ چیز قریش کے لیڈروں پر بہت شاق گزری کہ انہی کے اندر کا ایک شخص مدعیٔ نبوت بن کر ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ پھر زندہ کیے جائیں گے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد لوگ از سر نو زندہ ہوں! اس سورہ میں لوگوں کے اسی استبعاد کو موضوع بحث بنا کر ان کے شبہات کے جواب دیے گئے ہیں۔

ج ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۵) قرآن کی عظمت و رفعت شاہد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو شاعری یا کہانت کے قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں، یہ انکارِ قیامت کے لیے انھوں نے ایک بہانہ تلاش کیا ہے۔ ان کو تعجب اس بات پر ہے کہ انہی کے اندر سے ایک شخص اٹھ کر انھیں ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد جب وہ سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو از سر نو زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات ان کے نزدیک بہت مستبعد ہے۔ وہ قرآن کو استکبار کی بنا پر ماننا نہیں چاہتے ہیں اس وجہ سے اس کو کہانت اور شاعری قرار دیتے ہیں۔ یہ کہانت و شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کو جھٹلا کر وہ ایک شدید قسم کی ذہنی الجھن اور ایک کھلے ہوئے تناقض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مرنے کے بعد زمین ان کے جن اجزاء کو تحلیل کرتی ہے اللہ نے ان کو بھی جان رکھا ہے اور لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس کے پاس ایک رجسٹر بھی ہے۔

(۶ - ۱۱) آسمان و زمین کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی شہادت دے رہی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین میں اسی لیے ودیعت فرمائی ہیں کہ جن کے اندر خشیت و انابت ہو وہ ان سے یاد دہانی و رہنمائی حاصل کریں۔ یہ نشانیاں مرنے کے بعد دوبارہ

اٹھائے جانے کو بھی ثابت کر رہی ہیں اور ان سے جزاء و سزا اور توحید کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۱۲-۱۴) کفارِ قریش کو تہدید کہ استکبار میں مبتلا ہو کر ایک واضح حق کی تکذیب نہ کرو۔ تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ان پر اللہ کی وعید پوری ہو کے رہی۔ اگر انہی کی چال تم چلو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان سے مختلف ہو۔

(۱۵-۱۸) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب کتاب پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق اور صفتِ علم سے استدلال اور لوگوں کے افعال و اقوال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس نے جو اہتمام کر رکھا ہے اس کی طرف اشارہ۔

(۱۹-۳۵) قیامت کی تصویر۔ مکذبین کو جن حالات سے سابقہ پیش آئے گا ان کی تفصیل۔ قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو اس روز جو سرفرازی حاصل ہوگی اس کا بیان۔

(۳۶-۳۷) قریش کو تنبیہ و تہدید کہ اپنی قوت و شوکت پر زیادہ نہ اتراؤ اور اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ان پر زوال نہیں آسکتا، تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اللہ نے ان کو عین ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ خدا کی زمین، اپنی وسعتوں کے باوجود، ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے جن کے پاس عبرت پذیر دل اور سننے والے کان ہیں۔

(۳۸-۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔ حصولِ صبر کے لیے اہتمامِ نماز کی تاکید۔ مخالفین کے معاملے کو اس دن پر محمول کرنے کی ہدایت جس کا ظہور لازمی ہے۔ اس امر کی وضاحت کہ آپ کی ذمہ داری انذار تک محدود ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیجیے جو اللہ کی وعید سے ڈرنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے تو اس کے نتائج سے خود دوچار ہوں گے۔

سُوۡرَۃُ قٓ

مَکِّیَّۃٌ ——— آیات ۴۵

آیات ۱-۱۵

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قٓ ۚ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ﴿۱﴾ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ
مِّنۡهُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ هٰذَا شَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ﴿۲﴾ ءَاِذَا مِتۡنَا
وَکُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ ﴿۳﴾ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا
تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡهُمۡ ۚ وَعِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ ﴿۴﴾ بَلۡ کَذَّبُوۡا
بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ فَهُمۡ فِیۡۤ اَمۡرٍ مَّرِیۡجٍ ﴿۵﴾ اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا
اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ کَیۡفَ بَنَیۡنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ
فُرُوۡجٍ ﴿۶﴾ وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَیۡنَا فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَاَنۡۢبَتۡنَا
فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ ﴿۷﴾ تَبۡصِرَۃً وَّذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ
مُّنِیۡبٍ ﴿۸﴾ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ
جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِیۡدِ ﴿۹﴾ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ
نَّضِیۡدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَاَحۡیَیۡنَا بِهٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ
الۡخُرُوۡجُ ﴿۱۱﴾ کَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّاَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَ

وَثَمُودُ ﴿١٢﴾ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ﴿١٣﴾ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ﴿١٤﴾ أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾

ع ۱۵ / ۱۵

ترجمۂ آیات ۱-۱۵

یہ سورۂ قٓ ہے۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی! بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ لوٹائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو بہت بعید ہے!! ۱-۳

ہم نے جان رکھا ہے جو کچھ زمین ان کے اندر سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی ہے۔ بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلایا ہے جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ پس وہ ایک صریح تضادِ فکر میں مبتلا ہیں۔ ۴-۵

کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں! اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاد دہانی کے لیے! اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی۔ اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں، بندوں کی روزی کے لیے۔ اور ہم نے اس سے مُردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہوگا۔ ۶-۱۱

ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، ثمود، عاد، فرعون اور لوط کے بھائیوں اور اصحب الایکہ اور قوم تبع نے بھی جھٹلایا۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہماری وعید ان پر واقع ہو کر رہی۔ کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے! بلکہ یہ لوگ از سرِ نو پیدا کیے جانے کے باب میں مبتلائے شک ہیں۔ ۱۲-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۱)

قرآن اپنی حقانیت پر خود گواہ ہے

'قٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ مبتداء، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، یہاں بھی محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ سورۂ قٓ ہے۔

'مَجِیْدٌ' کے معنی بزرگ، برتر اور باعظمت کے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ ہر کلام متکلم کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے اسی طرح اس کا کلام بھی بزرگ و برتر ہے اور یہ برتری و بزرگی قرآن کی ایک ایک آیت سے نمایاں ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق قرآن کو سنے یا پڑھے اور اس کی عظمت و شوکت سے متاثر و مرعوب نہ ہو۔ اگر کوئی اس کی عظمت و جلالت سے متاثر نہ ہو تو وہ یا تو نہایت ہی بلید ہے یا اس کا دل بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ آدمی تو درکنار اگر یہ قرآن پہاڑوں پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتے۔

'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' جملہ قسمیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس باعظمت و برتر کتاب کی قسم کھائی ہے اور قسم سے متعلق ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح کی تمام قسمیں بطور شہادت ہیں۔ یعنی قسم مقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت سے کھائی جاتی ہے۔ یہ قسم بھی مقسم علیہ پر دلیل ہے اگرچہ وہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں کلام کا سیاق و سباق اس کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہو۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ صٓ میں موجود ہے۔ فرمایا ہے:

'صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۚ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (۱-۲) (اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد پنجم، صفحات: ۵۰۹-۵۱۰) تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہاں قرآن کی عظمت و جلالت کی قسم ان لوگوں کی تردید میں کھائی گئی ہے جو اس کو شاعری، کہانت سحر یا القائے شیطانی کے قسم کی چیز قرار دیتے تھے۔ قرآن کی عظمت، شہادت میں پیش کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ یہ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کا منبع یہ سفلی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے جس کا ذریعہ جبریل امین ہیں، اور جس کا منبع لوح محفوظ ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ بروج میں فرمایا ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۱-۲۲) — بلکہ یہ باعظمت قرآن ہے اور اس کا منبع لوح محفوظ میں ہے۔

یہی بات سورۂ تکویر میں یوں فرمائی گئی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۚ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ (۱۹-۲۷)

یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ قوت والا اور عرش کے مالک کے نزدیک باسوخ ہے۔ وہ مطاع اور مزید برآں امانتدار ہے۔ اور تمہارا ساتھی کوئی دیوانہ نہیں ہے اور اس نے اس کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان رجیم کا القاء نہیں ہے، تو کہاں بھٹکے جاتے ہو! یہ تو دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے۔

قرآن کی عظمت کے اسی پہلو کی طرف لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۲) (باطل نہ اس کے آگے سے اس میں آسکتا اور نہ اس کے پیچھے سے) اور لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ: ۷۹) (اور اس کو صرف پاکیزہ ہی لوگ چھوتے ہیں) اور اس مضمون کی دوسری آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔ سورۂ شعراء کے آخر میں قرآن کو کہانت اور شاعری کی تہمت سے بری کرنے کے جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت سورہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے، خاص طور پر وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (الشعراء: ۲۱۰-۲۱۱) کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کے انذارِ قیامت کو یہ بہانہ بنا کر نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ القائے شیطانی ہے ان کی تردید کے لیے قرآن کی معجزانہ بلاغت اور اس کی لاہوتی حکمت ہی کافی ہے۔ نادان ہیں وہ جو اس کو کسی جن یا شیطان کا کلام سمجھتے ہیں۔ یہ جن

یا شیطان کا کلام نہیں بلکہ خدائے عزیز و حکیم کا اتارا ہوا کلام ہے۔

بو بہر جام جم از کان جہانِ دگر است

بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ (۳-۲)

مخالفین کی مخالفت کی اصل علت

یہاں 'بَلْ' اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے اس اعتراض کو محض حقیقت سے فرار کے لیے ایک بہانہ قرار دیا ہے۔ اس 'بَلْ' کے مضمرات کھولیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو لوگ قرآن کو جنات و شیاطین کا القاء قرار دیتے ہیں ان کی تردید کے لیے قرآن کی عظمت و جلالت ہی کافی ہے۔ ان کے فرار کی اصل وجہ وہ نہیں ہے جو وہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کو اس بات پر تعجب ہے کہ ایک شخص انہی کے اندر سے ان کے لیے منذر بن کر اٹھا جو ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اپنے اندر ہی کے ایک آدمی کو خدا کا رسول تسلیم کر لینا چونکہ ان کے دلوں پر بہت شاق ہے، اس وجہ سے اس کی تکذیب میں انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مر کر، سڑ گل جانے کے بعد لوگ اٹھائے جائیں گے! یہ اٹھایا جانا بہت بعید از عقل ہے! اس آیت پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قرآن کے نزدیک ان کے اس فرار کی اصل علت ان کا استکبار ہے۔ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس وجہ سے وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے بھی منکر ہیں اور قیامت کو بھی ایک بعید از قیاس چیز قرار دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ استکبار میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اتنے بلید نہیں ہیں کہ اللہ کے کلام اور کاہنوں کی خرافات میں امتیاز نہ کر سکیں۔ اور قیامت کے اثبات کے جو دلائل قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے ان کو سمجھنے سے قاصر رہ جائیں۔

اس استکبار کی تفصیل پیچھے کی سورتوں میں گزر چکی ہے کہ یہ لوگ اوّل تو اپنی ہدایت کے لیے کسی رسول کی ہدایت کے قائل ہی نہیں ہیں اور اگر کسی درجے میں قائل ہیں بھی تو ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا یا مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو رسول بناتا۔ ان سرداروں کے ہوتے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو رسول بنا دے جو ایک بالکل غریب آدمی ہے۔

ان اعتراضوں کے جواب پیچھے کی سورتوں، بالخصوص چوتھے گروپ میں جس کا جامع عمود اثباتِ رسالت ہے اور جو الفرقان سے شروع ہوتا ہے، تفصیل سے دیے جا چکے ہیں۔ یہاں گروپ کے مضمون کے تقاضے سے ان کے ان شبہات سے تعرض کیا ہے جو وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے

جانے کے امکان پر وارد کرتے تھے اور جن کو قرآن اور رسول کی مخالفت کے لیے، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا انھوں نے بہانہ بنا رکھا تھا۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴)

مخالفین کے شبہات کا جواب

فرمایا کہ دوبارہ زندہ کیا جانا اس وجہ سے ان کو بعید از امکان معلوم ہو رہا ہے کہ جسموں کے سڑ گل کر خاک میں مل جانے کے بعد ان کے اجزاء کو زمین کی تہوں سے فراہم کرنا، ان کے خیال میں، ناممکن ہے۔ یہ مغالطہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کو اپنے علم پر قیاس کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جسمِ انسانی کے جن اجزاء کو زمین تحلیل کرتی ہے، وہ ان سب کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ جس نے ہر چیز کو خلق کیا ہے اور جس کے حکم ہی سے ہر چیز پر موت طاری ہوتی ہے، اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے! 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے؟) اور جب وہ جانتا ہے تو جب وہ چاہے گا ان تمام اجزاء کو فراہم کر کے ہر ایک کے جسم کو از سرِ نو تشکیل کر دے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ جس نے ہر چیز کو عدمِ محض سے وجود بخشا اور اس کو اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، آخر دوبارہ اس کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر دینے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی؟

'وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ' یعنی اپنے ذاتی علم کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا سارا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے ایک دفتر بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس میں یہ بھی درج ہے کہ کون شخص زمین کی کس پہنائی میں دفن ہے اور اس کے جسم کے اجزاء کہاں کہاں ہیں اور ہر شخص کے تمام اقوال و افعال بھی اس میں درج ہیں۔ نادانوں کو قیامت کے باب میں جس طرح یہ شبہ پیش آتا ہے کہ سڑ گل کر مٹی میں مل جانے کے بعد جسمِ انسانی کے اجزاء کو فراہم کرنا اور ان کو از سرِ نو جسم کی تشکل میں تشکیل کرنا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی پیش آتا ہے کہ ہر شخص کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ ایک دن وہ سب کا حساب کرنے اور سب کو سزا اور جزا دینے بیٹھے؟ اس ٹکڑے نے اس شبہے کو بھی صاف کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے تمام اقوال و اعمال کا ریکارڈ بھی ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔

یہ ریکارڈ محفوظ رکھنے کا معاملہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے لیے تو اچنبھے کا ہو سکتا تھا لیکن اس زمانے میں سائنس نے جو انکشافات کیے ہیں ان کو جاننے کے بعد، اگر کوئی شخص قرآن کے اس دعوے میں شک کرے تو ایسے ہٹ دھرموں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی قائل نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اس وقت مانیں گے جب ان کے ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے پکڑا دیے جائیں گے۔

لیکن اس وقت کا ماننا بالکل بے سود ہوگا۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ (۵)

لفظ 'حق' اسی سورہ کی آیت ۱۹ اور آیت ۴۲ میں قیامت کے لیے آیا ہے لیکن یہاں 'لَمَّا جَآءَهُمْ' کا قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے جو قیامت سے لوگوں کو آگاہ کر رہا تھا لیکن لوگ اس کی تکذیب کر رہے تھے اور اس کی تکذیب کے لیے بہانہ کے طور پر قیامت کے خلاف وہ شبہات پیش کر رہے تھے جو اوپر بیان ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے ان شبہات سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گویا قیامت فی الواقع ایک بہت بعید از امکان چیز ہے اور یہ اس کا انکار جو کر رہے ہیں تو اس کے لیے معقول وجوہ ان کے پاس ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک بالکل بدیہی حق کی تکذیب کی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ ان کے سامنے بالکل واضح طور پر آگیا۔

'لَمَّا جَآءَهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن مجید جس قیامت کی خبر دے رہا ہے وہ حق تو پہلے بھی تھی لیکن اب تک یہ لوگ اس کے باب میں اگر گرفتار شبہات رہے تو ان کے پاس کچھ عذر بھی تھا کہ یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا اُمّی تھے لیکن اب وہ کیا عذر کر سکتے ہیں جبکہ وہ ایک ایسے حق کا انکار کر رہے ہیں جو نصف النہار کے سورج کی طرح ان کے سروں پر چمک رہا ہے!

مکذبین قیامت کا تضادِ فکر

'فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ'۔ 'امر مریج' کی تشریح اہل لغت 'امر مختلط' یا 'امر ملتبس' کے الفاظ سے کرتے ہیں، یعنی ایک ایسی صورتِ حال جس میں نہایت واضح قسم کا تناقض و تضاد ہو۔ 'مرج' کے معنی 'خلط' یعنی گڈمڈ کر دینے کے ہیں۔ سورۂ رحمان میں ہے۔ 'مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ' (۱۹) (اس نے کھاری اور شیریں دونوں قسم کے دریا چھوڑے جو آپس میں ٹکراتے ہیں)۔ قرآن کی تکذیب کر کے مکذبین جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے یہ اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے کہ یہ لوگ ایک صریح قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہو کے رہ گئے تھے۔ ایک طرف یہ خدا اور اس کی ان تمام صفات کا اقرار کرتے ہیں جو قیامت کو لازم کرتی ہیں، دوسری طرف قیامت کا انکار کرتے ہیں جو اس اقرار کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اس طرح وہ ایک ایسی ذہنی الجھن میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس الجھن سے نجات کی واحد راہ وہی ہے جو قرآن ان کو بتا رہا ہے، لیکن اس کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں حالانکہ حق کی تکذیب کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آدمی اپنی تکذیب کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتنی دلیلیں ایجاد کرتا ہے وہ سب اس کے موقف کے بودے پن کو عریاں کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے اسی تضادِ فکر کی طرف سورۂ ذاریات میں، جو اس کی توام سورہ ہے 'اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ' (۸) (بے شک تم لوگ

ایک شدید قسم کے 'تناقض میں گرفتار رہو' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۶۶ 'بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ... الآیۃ' کے تحت ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کی گمراہی میں سب سے زیادہ دخل اس کے اسی تضادِ فکر کو ہے۔ یا تو وہ اپنی سہل انگاری کے سبب سے رطب و یابس ہر قسم کے نظریات اپنے ذہن میں جمع کر لیتا ہے یا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں صحیح نظریات و عقائد کے ساتھ باطل نظریات بھی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی زندگی مجموعۂ اضداد بن جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے افکار کا برابر جائزہ لیتا رہے، تنقید کی صلاحیت مردہ نہ ہونے دے، اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں حق کے ساتھ باطل کا جوڑ ملانے کی کوشش نہ کرے تو وہ شیطان کے اس فتنہ سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۶-۸)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف اشارہ

یہ اللہ تعالیٰ نے مکذبینِ قیامت کو اپنی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی ان بدیہی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اوپر اور نیچے ہر جگہ نظر آتی ہیں اور ہر اس شخص کے اندر بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں جس کے سینہ میں اثر پذیر اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔

سب سے پہلے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی کہ کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ دیکھتے کہ کس طرح ہم نے اس کو بلند کیا، اس کو ستاروں سے سجایا اور یہ ہماری قدرت و حکمت کا اعجاز ہے کہ ایسی ناپیدا کنار چھت میں کہیں کسی رخنہ کی نشان دہی وہ نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی قدرت و حکمت کا یہ کرشمہ وہ اپنے سروں پر دیکھتے ہیں، کیا اس کے لیے ان کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا؟

اس کے بعد قدرت و حکمت کے ساتھ اپنی ربوبیت اور پرورش کے اہتمام کی طرف بھی توجہ دلائی کہ نو ذرا یا کہ وہ اپنے نیچے دیکھیں کہ کس طرح ہم نے زمین کو ان کے قدموں کے نیچے بچھایا ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں اور اس میں طرح طرح کی چیزیں اگا رکھی ہیں جو ان کی غذا کے کام آتی ہیں اور جن کی خوش منظری ان کی ہامرہ نوازی بھی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت و حکمت اور جس کی پروردگاری کی یہ شانیں وہ دیکھ رہے ہیں کیا اس کے لیے دشوار ہے کہ وہ ان کے مر جانے کے بعد، ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ کیا

جس پروردگار نے ان کی پرورش کا یہ اہتمام کر رکھا ہے وہ ان کو اس طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ کھائیں، پئیں، عیش کریں، ان سے کبھی اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک درس گاہ معرفت ہے

'تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے اندر اپنی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی یہ شانیں اس لیے نمایاں فرمائی ہیں کہ جو لوگ توجہ کرنے والے ہیں، ان کے اندر یہ بصیرت اور یاد دہانی پیدا کریں۔ 'تَبْصِرَةً' سے مراد آنکھوں کے اندر بصیرت پیدا کرنا ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر اس حقیقت تک پہنچ سکیں جس کی طرف ظاہر رہنمائی کر رہا ہے اور 'ذِكْرٰى' سے مراد غفلت کے حجاب کو دور کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے چپہ چپہ کو ایسے عجائب اور کرشموں سے بھر دیا ہے جو آنکھوں کے پردے اٹھانے اور دلوں کے جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہ کرشمے ان پر کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر اثر پذیری کی حس موجود ہو۔ جو لوگ اپنی محسوس پرستی کی وجہ سے اپنی یہ حسِ لطیف مردہ کر چکے ہوں ان کے لیے یہ ساری کائنات ایک عالمِ ظلمات ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگیوں اور گل کاریوں کی محتاج نہیں تھی جو اس کے ہر گوشے میں نمایاں ہیں، لیکن قدرت نے اس فیاضی کے ساتھ اس کے اندر اپنی شانیں جو دکھائی ہیں تو اسی لیے دکھائی ہیں کہ انسان کی وہ حسِ لطیف جو قدرت، حکمت، حسن اور فیض و کرم سے اثر پذیر اور بیدار ہوتی ہے وہ بیدار ہو اور اس چمن کے ایک ایک پتہ پر جو درسِ حکمت ثبت ہیں وہ ان کو سیکھے اور سمجھے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ خالق نے ہر انسان کے اندر توجہ اور انابت کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے وہ اس کو بروئے کار لائے۔ اگر کوئی شخص اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو ایسے بلید و بے حس جانوروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس نے انسان کو ذی ارادہ ہستی جو بنایا ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جو شعور اس کو عطا ہوا ہے اس کی قدر کرے اور اس کی رہنمائی میں آگے کے لیے قدم اٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو خدا کی طرف سے مزید روشنی عطا ہوتی ہے ورنہ جو کچھ اس کو عطا ہوتا ہے وہ بھی اس کی ناقدری کی پاداش میں سلب ہو جاتا ہے۔

ان آیتوں میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کے لیے بعض حوالے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں، ان لوگوں کو خطاب کر کے، جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد خیال کرتے تھے، فرمایا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ — کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل ۹۹) — آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ان کی طرح پھر پیدا کر دے۔

منکرینِ قیامت کے اسی شبہ کا جواب سورۂ نازعات میں ان الفاظ میں دیا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۟ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۪ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۪ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۙ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ (النّٰزعٰت: ۲۷-۳۳) — کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پھر اس کو اچھی طرح ہموار کیا، اور اس کی رات کو ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا۔ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو لنگر انداز کیا۔ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے برتنے کے لیے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں قدرت، عظمت، حکمت اور ربوبیت کے وہ سارے پہلو، کچھ مزید وسعت کے ساتھ، سمٹ آئے ہیں، جن سے سورۂ قٓ کی زیرِ بحث آیات میں قیامت کے وقوع، اس کی ضرورت اور اس کے مقتضائے صفاتِ الٰہی ہونے پر استدلال فرمایا گیا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۹-۱۱)

آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ ایک اور پہلو سے

یہ آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک اور زاویہ سے توجہ دلائی جس سے آسمان و زمین کے درمیان توافق کے پہلو سے توحید کی شہادت بھی ملتی ہے۔ ان کے اندر ربوبیت کے جو اسباب ودیعت ہیں ان سے جزا و سزا کا لزوم بھی سامنے آتا ہے اور بارش سے مردہ زمین کے اندر جو حیاتِ تازہ نمودار ہوتی ہے اس سے حیات بعد الممات کے وقوع کا بھی مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔

'مَآءً مُّبٰرَكًا' سے مراد وہ بارش ہے جو باعثِ زرخیزی و شادابی ہو۔ بعض مرتبہ ایسی بارش بھی ہوتی ہے جو زرخیزی کے بجائے تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور وہ قوموں کے لیے عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں 'مبارک' کی صفت اسی شبہ کے ازالہ کے لیے ہے۔

'حَبَّ الْحَصِيْدِ' سے وہ اجناس مراد ہیں جن کا وِرَد عمل میں آتا ہے اور جو ذخیرہ کی جاتی ہیں مثلاً گندم اور جو وغیرہ۔ باغوں کے ساتھ 'حَبَّ الْحَصِيْدِ' کے ذکر سے مقصود اس اہتمامِ ربوبیت کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کائنات کے رب نے اپنے بندوں کے لیے فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں

کے لیے باغوں میں تازہ اور لذیذ پھل بھی پیدا کیے اور کھیتوں میں غذائی اجناس بھی اگائیں جو پکنے پر کاٹ کر ذخیرہ کر لی جاتی اور برابر کام آتی ہیں۔

'وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ'۔ بظاہر 'جَنّٰت' کے بعد نخل کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس لیے ہوا کہ عرب کا خاص میوہ یہی تھا جو ان کے لیے بہترین پھل بھی تھا اور بڑی حد تک ان کی غذائی ضرورت بھی پوری کرتا تھا۔ اس کی درازقامتی اور اس کے تہ بہ تہ خوشوں کی طرف اشارہ مخاطب کے اندر مشاہدۂ کائنات کی حس اور شکرگزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہے کہ وہ قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھے اور ان سے وہ اثر لے جو ایک حساس اور بیدار دل کو لینا چاہیے۔

'رِزْقًا لِّلْعِبَادِ'، یعنی تہ بہ تہ خوشے خود اپنی صورت سے گواہی دے رہے ہیں کہ خالق نے ان پر اپنی قدرت، حکمت اور صناعی اس فیاضی کے ساتھ اس لیے صرف فرمائی ہے کہ اس کے بندے ان سے بہرہ مند ہوں، ان کے اندر اس کی حکمت و ربوبیت کی شانوں کا مشاہدہ کریں اور ان نعمتوں کا حق پہچانیں کہ ایک دن لازماً ان کی بابت اس سے پرسش ہونی ہے۔

'وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ'۔ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کو اس سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے۔ فرمایا کہ جس بارش کی یہ برکتیں دیکھتے ہو اسی بارش کا یہ کرشمہ بھی ہے کہ زمین جو بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی کسی سبزہ یا روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا، بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے چپے چپے سے ایک حیاتِ تازہ نمودار ہو جاتی ہے اسی پر قیاس کر و مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو بھی، جس سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے، لیکن تم اس کو ناممکن خیال کر رہے ہو۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۱۲-۱۴)

قریش کو تہدید

یہ قریش کو تہدید ہے کہ ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، ثمود، عاد، فرعون، قوم لوط، اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے بھی اسی طرح تکذیب کی جب کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان پر اچھی طرح حق کو واضح کر دیا۔ بالآخر اس تکذیب کے جس انجام سے ان کو آگاہ کیا گیا تھا وہ ان کے سامنے ظاہر ہو کر رہا۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اگر اس تکذیب پر اڑے رہ گئے تو جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ لازماً آ کے رہے گا اور آسمان و زمین کی کوئی طاقت ان کو خدا کی پکڑ سے بچا نہ سکے گی۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کے بعد لازماً

ظہور میں آتی ہے۔ اس کی وضاحت ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

اس تہدید کی طرف اشارہ اوپر آیت ۵ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہاں اس اشارے کے بعد کلام کا رُخ دلائلِ معاد کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ دلائل کے بعد اس اشارے کی وضاحت فرما دی کہ اس عبارت کے ساتھ یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں تو اپنی ان پیش رو قوموں کے انجام کو سامنے رکھیں جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفرِ کردار کو پہنچ چکی ہیں۔

اصحاب الرس

یہاں جن قوموں کا ذکر آیا ہے ان سب کا حوالہ مختلف پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے اور ہم بقدرِ ضرورت ان کی تاریخی حیثیت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اصحاب الرّس کا ذکر سورۂ فرقان کی آیت ۳۸ میں آیا ہے۔ اس کے تحت ہم ان کے بارے میں مفسرین کے اقوال کے حوالے بھی دے چکے ہیں اور اپنی رائے بھی ظاہر کر چکے ہیں۔ اگرچہ قوموں کے ذکر میں ترتیب یہاں تاریخی نہیں ہے لیکن قومِ نوح کے بعد معاً اصحاب الرّس کا ذکر اس بات کا قرینہ ضرور ہے کہ ان کا تعلق قدیم اقوامِ بائدہ سے ہے جن میں اکثر کی تاریخ بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

'کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ' کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان کی طرف ایک رسول کی بعثت ہوئی جس کی انھوں نے تکذیب کی اور اس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا جس نے ان کو فنا کر دیا۔ تفسیر کی کتابوں میں ایک روایت یہ بھی نقل ہوئی ہے کہ اس قوم نے اپنے رسول کو کنوئیں میں دفن کر دیا تھا۔ 'رَسّ' کنوئیں کو کہتے ہیں، اس وجہ سے ان کا نام اصحاب الرّس ہوا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رسولوں میں سے کسی کا اس کی قوم کے ہاتھوں قتل ہونا ثابت نہیں ہے۔ 'رَسّ' کے معنی کنوئیں کے ہوں بھی تو اس کی طرف نسبت کے لیے اس واقعہ کی صحت ضروری نہیں ہے۔

'فرعون' کے ساتھ اس کی قوم کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اصل مجرم کی حیثیت درحقیقت فرعون ہی کو حاصل تھی۔ اسی نے اپنی قوم کو گمراہ کیا۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے 'وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى' (۷۹) (اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور اس نے ان کو ٹھیک راہ نہ دکھائی) یہی بات دوسرے الفاظ میں یوں ارشاد ہوئی ہے 'اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى' (۲۴) (فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے)۔

'قَوْمُ تُبَّعٍ' کا ذکر سورۂ دخان کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۱۵)

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

اوپر کی آیات ۶-۱۱ میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام کے ساتھ اپنی اس قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے جو آسمان و زمین کے ہر گوشے سے نمایاں ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ان لوگوں کو قائل کرنا تھا جو مرنے کے بعد از سرِ نو اٹھا کھڑے کیے جانے کو بعید از امکان

تصور کرتے تھے۔ یہ انہی لوگوں کے سامنے سوال رکھا ہے کہ یہ لوگ ہمارے آسمانوں اور ہماری زمین کو دیکھ کر بتائیں کہ کیا پہلی بار ہم ان کو بنانے سے عاجز رہے! 'عَیِیَ بِالْاَمْرِ' کے معنی کی وضاحت اہلِ لغت نے 'اِذَا لَمْ یَهْتَدِ لِوَجْهِ عَمَلِهٖ' کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی کوئی شخص ایک کام کرنے سے عاجز رہ جائے، اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ یہ کس طرح انجام دیا جائے۔

'بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ' یعنی یہ لوگ یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتے کہ ہم پہلی بار آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ ان کو اعتراف ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خالق ہم ہی ہیں۔ البتہ ان کو اس باب میں تردد ہے کہ از سرِ نو ہم ان کو نہیں پیدا کر سکیں گے! ہمارے نزدیک اس جملہ کا انداز طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پہلی بار پیدا کرنے میں ہم کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو دوبارہ کیوں رکاوٹ پیش آئے گی! ان لال بجھکڑوں سے کوئی پوچھے کہ کسی چیز کو پہلی بار بنانا مشکل ہوتا ہے یا دوسری بار! اگر ایک نقاش، نقشِ ثانی نقشِ اول کے مقابل میں زیادہ بہتر کھینچ سکتا ہے تو ہم دنیا کو از سرِ نو زیادہ آسانی سے کیوں نہیں پیدا کر سکتے!

۲- آگے آیات ۱۶-۳۵ کا مضمون

آگے کی آیات میں پہلے اس اہتمام کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے کر رکھا ہے۔ اس کے بعد قیامت کے ظہور اور مجرمین کے حاضر کیے جانے کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے بعد مجرمین کے جہنم میں ڈالے جانے اور ان کے باہمی لعن طعن کا بیان ہے۔ پھر اس فضل و انعام کی تفصیل ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں پر فرمائے گا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶-۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ ﴿۱۹﴾ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیْدٌ ﴿۲۱﴾

لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ
الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿۲۳﴾
أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
مُّرِيبٍ ﴿۲۵﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي
الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿۲۶﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ
فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ
إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ
لِّلْعَبِيدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ
مِن مَّزِيدٍ ﴿۳۰﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿۳۱﴾ هَٰذَا
مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿۳۲﴾ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ
وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿۳۴﴾
لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿۳۵﴾

ع ۲ / ۱۴ / ۱۶

ترجمۂ آیات: ۱۶-۳۵

اور انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں اس کے دل میں جو وسوسے گزرتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ ۱۶

دھیان رکھو جب کہ دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں، ایک دائیں بیٹھا اور دوسرا بائیں بیٹھا۔ وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا ہے مگر اس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔ ۱۷-۱۸

اور موت کی غشی شدنی کے ساتھ آپہنچی! یہ ہے وہ چیز جس سے تو کتراتا

رہا تھا! اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہوگا۔ اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے! اور اس کا ساتھی کہے گا، یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ تم جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے، معاند، خیر سے روکنے والے، حدود کو توڑنے والے، مبتلائے شک کو، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہرائے تو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں۔ ۱۹-۲۶

اس کا ساتھی شیطان کہے گا، اے ہمارے رب میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود نہایت دور کی گمراہی میں پڑا رہا۔ ارشاد ہوگا، اب میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں نے پہلے ہی تمہیں اپنی وعید سے آگاہ کر دیا تھا۔ میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ۲۷-۲۹

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے، کیا تو بھر گئی! اور وہ جواب دے گی کہ ابھی اور بھی ہیں! اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی، ذرا بھی دور نہ ہوگی۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع کرنے والے اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے کے لیے جو خدائے رحمان سے ڈرا غیب میں، اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل کے ساتھ۔ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ! یہ ہمیشگی کا دن ہے۔ ان کو ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ ۳۰-۳۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۱۶)

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

قیامت کے باب میں جہاں نادانوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ انسان کے مرکھپ جانے اور زمین میں رل مل جانے کے بعد اس کے تمام اجزائے جسم کو فراہم کرنا اور از سرِ نو زندہ کر کے کھڑا کر دینا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی بہتوں کو لاحق ہوتا ہے کہ ایک ایک شخص کے خلوت و جلوت کے تمام اقوال و افعال کا ریکارڈ کون رکھ سکتا ہے کہ ایک دن سب کا حساب کرنے بیٹھے اور ہر ایک کو جزا و سزا دے۔ یہ دونوں شبہات بالکل توام ہیں۔ اس وجہ سے اوپر آیت ۴ میں اجمالی طور پر دونوں کا جواب دیا ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ پہلے شبہ کی تردید فرمائی ہے۔ اب یہ دوسرے شبہے سے تعرض فرمایا ہے اور دلائل سے اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور اس کے اقوال و اعمال تو درکنار اس کے دل میں جو وسوسے خطور کرتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خالق ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جوڑ جوڑ، بند بند کو استوار کیا ہے تو لازم ہے کہ وہ اس کے تمام چیزوں کے دروبست اور ان کے عمل سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں توجہ دلائی ہے: 'أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا)۔ اگر خالق اپنی مخلوق کی تمام جزئیات سے باخبر نہ ہو تو وہ اس کی حفاظت اور اس کے بقاء کا انتظام کس طرح کرے گا؟

'وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ'۔ 'وَرِيد'، رگِ جاں کو کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف محاورہ ہے جو غایت درجہ قرب کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ کوئی شخص اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اگر وہ ہم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو ہم اس سے دور ہیں۔ ہم ہر شخص کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت ہر شخص کا ہر پہلو سے احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا تمام ظاہر و باطن ہر لمحہ ہماری نگاہوں میں ہے۔

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۱۷-۱۸)

لوگوں کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے مزید اہتمام

'عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ' میں تالیفِ کلام یوں ہے: 'عن الیمین قعید و عن الشمال قعید' (ایک داہنے بیٹھا ہوا، دوسرا بائیں بیٹھا ہوا) عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق بتقاضائے ایجاز ایک جگہ لفظ 'قَعِيدٌ' محذوف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہ اس مزید اہتمام کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اول تو بذاتِ خود ہر شخص کے وساوس و خطراتِ قلب تک سے اچھی طرح باخبر ہے، مزید برآں اس نے اتمامِ حجت کے لیے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ ہر شخص پر دو دو فرشتے مامور کر رکھے ہیں۔ جن میں سے ایک اس کے دہنے بیٹھا ہوتا ہے، دوسرا بائیں۔ جونہی وہ کوئی لفظ بولتا ہے اپنے پاس ایک مستعد نگران اس کو نوٹ کرنے کے لیے حاضر پاتا ہے۔

یہاں اعمال کے نوٹ کیے جانے کا ذکر اگرچہ لفظوں میں نہیں ہے لیکن وہ علیٰ سبیل التغلیب اس میں داخل سمجھے جائیں گے، اس لیے کہ جب زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے نوٹ کیے جانے کے لیے یہ اہتمام ہے تو ہاتھ پاؤں سے انجام دیے ہوئے اعمال کے نوٹ کیے جانے کا اہتمام تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں فرشتوں میں تقسیمِ کار ہے۔ جو فرشتہ دائیں جانب مامور ہوتا ہے وہ نیک اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ جو بائیں طرف ہوتا ہے وہ بُرے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ شہادت کے معاملے میں چونکہ دو گواہوں کی گواہی دین میں معتبر مانی گئی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی دو دو فرشتے مامور فرمائے۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آدمی کے وساوس و خطراتِ قلب ان فرشتوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ اس کی ستاری ہے کہ اس نے بندوں کے دلوں کے بھیدوں کا علم اپنے ہی تک محدود رکھا ہے۔

اتمامِ حجت کے لیے ایک اور اہتمام

اس اہتمام کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کا کر رکھا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کے ہاتھ پاؤں اور کان آنکھ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے تمام اقوال و اعمال کی گواہی دیں گے۔ ہم جو کچھ زبان سے بولتے ہیں اس کا سارا ریکارڈ ہمارے کان محفوظ کر رہے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی پوری فلم ہماری آنکھوں کی تحویل میں ہے۔ یہی حال ہمارے دوسرے اعضاء و جوارح کا ہے۔ ہم جو کچھ بھی کہتے یا کرتے ہیں سب خدا کے مامور کیے ہوئے پاسبانوں کے سامنے اور اسی کے بخشے ہوئے اعضاء و جوارح کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ پھر یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ایک ایک قول و فعل کو کس طرح جان سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا!

'اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ' میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'اِذْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یہاں چونکہ غافلوں کو ایک حقیقتِ نفس الامری کی یاددہانی کی جا رہی ہے اس وجہ سے کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے گا جس سے مخاطب کو تنبہ ہو۔ یعنی دھیان رکھو، خیال رکھو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ صاحبِ کشاف نے ایک دوسری شکل اختیار کی ہے، لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۱۹)

قیامت ایک شدنی ہے

'حَقّ' سے مراد وہی قیامت ہے جس کی قرآن خبر دے رہا تھا اور جس کی تکذیب کا ذکر اوپر آیت ۵ میں گزر چکا ہے۔ چونکہ وہ ایک شدنی اور ایک اٹل حقیقت ہے، اس وجہ سے اس کو 'حق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ماضی کا صیغہ اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو بہت دُور نہ خیال کرو بلکہ ایک آئی ہوئی چیز سمجھو۔ جتنے دن زندگی کے باقی ہیں بس اتنی ہی دیر قیامت کے آنے میں ہے۔ جونہی موت کی بے ہوشی طاری ہوئی قیامت گویا اس کے ساتھ ہی آگی کھڑی ہے۔ اس وقت صورت حال خود تمھیں بتا دے گی کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے تھے بالآخر وہ آ ہی گئی۔

قیامت ہر آدمی کی موت کے ساتھ لگی ہوئی ہے

قیامت کی یہی حقیقت احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: 'مَنْ مَّاتَ فقد قامت قیامتہ' (جو مرا اس کی قیامت آگئی) اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد برزخ کی جو زندگی ہے وہ درحقیقت قیامت ہی کا دیباچہ ہے۔ موت کے ساتھ ہی عالمِ آخرت کے احوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اہل ایمان کو ایمان کی حقانیت اور اس کے اچھے انجام کی شہادت مل جاتی ہے اور کفار کے سامنے اس انجام کے ظہور کا آغاز ہو جاتا ہے جس کی وہ دنیا کی زندگی میں تکذیب کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے باب میں اس کے منکروں کے ذہن کی صحیح تعبیر

'ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ' یہ بات زبانِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور قولاً بھی ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم دیکھ لوگے کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے وہ بالآخر سر پر آ ہی دھمکی۔ 'حَادَ يَحِيْدُ' کا صحیح مفہوم راستہ سے کترا کر چلنا ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے قیامت کے باب میں ان لوگوں کے رویے کی جو اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ قیامت سے بے پروا ہو کر زندگی گزارتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ قیامت کے دلائل ان سے مخفی ہیں، اس کے آثار تو ہر قدم پر موجود ہیں لیکن جو لوگ سیدھی راہ نہیں اختیار کرنی چاہتے وہ ان سے کترا کر چلتے ہیں، لیکن اس وقت یہ کیا کریں گے جب وہ ان کے سامنے آن کھڑی ہوگی۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (۲۰)

یعنی اس کے بعد بس نفخِ صُور ہی کا مرحلہ ہے۔ صُور پھونکا جائے گا اور وہ دن ظاہر ہو جائے گا جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اور تم اس کی تکذیب کیے جا رہے ہو۔ اس کو بھی اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ سے ادا کیا ہے تاکہ نگاہوں کے سامنے مصوّر ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر حشر و نشر بہت دُور کی بات ہے جب صور پھونکا جائے گا تو ایسا محسوس کروگے کہ جس مدت کو تم بہت دراز سمجھتے تھے وہ پلک جھپکتے

گزر گئی۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۲۱)

روزِ قیامت کی پیشی کی تصویر

یہ نفخِ صُور کے بعد کا مرحلہ ہے۔ اس دن ہر جان اپنے رب کے آگے پیشی کے لیے اس طرح حاضر کی جائے گی کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے سے اس کو ہانکنے کے لیے مامور ہوگا اور دوسرا اس کے قوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔ یہی مفہوم آیت سے متبادر بھی ہوتا ہے اور یہی سلف سے منقول بھی ہے۔ بعض لوگوں نے 'سائق' اور 'شہید' دونوں سے ایک ہی فرشتہ مراد لیا ہے کہ وہی ہانک کرلائے گا بھی اور وہی گواہی بھی دے گا۔ بعض لوگوں نے 'سائق' سے فرشتہ کو مراد لیا ہے لیکن 'شہید' سے آدمی اور اس کے عمل کو۔ یہ دونوں قول ہمارے نزدیک کمزور ہیں۔ پہلا عربیت کے پہلو سے کمزور ہے اور دوسرے میں صریح تکلّف ہے جس سے آیت کے الفاظ ابا کر رہے ہیں۔

بعض لوگوں نے انہی دونوں فرشتوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۸ میں گزرا ہے لیکن یہ بات بھی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں فرشتے، آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ آدمی کے اقوال و اعمال لکھنے پر مامور ہوتے ہیں۔ اگر انہی کو خدا کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے آدمی کو حاضر کرنا بھی ہے تو دونوں کی ایک ہی حیثیت ہونی چاہیے۔ یعنی دونوں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔ اس بات کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب دونوں مامور ایک ہی حیثیت سے تھے تو ایک کی حیثیت تبدیل کیوں ہو جائے گی؟ بہرحال ان میں سے کوئی قول بھی ضعف سے خالی نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ وہی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا کہ نفخِ صُور کے بعد ہر شخص کی پیشی اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس طرح ہونی ہے کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے پیچھے اس کو ہانکنے کے لیے ہوگا اور دوسرا اس کے آگے آگے تمام اقوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۲۲)

پیشی کے وقت ایک تنبیہ

اس وقت اس کو اللہ تعالیٰ متنبہ فرمائے گا کہ اس دن سے تم غفلت میں پڑے رہے تو آج ہم نے تمھاری آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹا دیا۔

'فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ' یہ فقرہ اس کی تفضیح کے لیے طنز کے انداز میں ہوگا کہ آج تو تمھاری نگاہیں بہت تیز ہیں! جس چیز کا امکان تمھیں کہیں دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا آج اس کا ہر گوشہ کس طرح تمھارے آگے بے نقاب ہوگیا ہے!

یہ آیت اس آیت کے معارض نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے انکار کرنے والے قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے ان دونوں کا موقع و محل ہم واضح کر چکے ہیں۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۲۳)

مجرم کی پیشی عدالت میں

قرینہ دلیل ہے کہ 'قرین' سے مراد انہی دو میں سے کوئی ایک ہے جو 'سائق' اور 'شہید' کی حیثیت سے اس کو لے کر عدالتِ الٰہی میں حاضر ہوں گے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس شیطان کو مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والے پر مسلط کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ شیطان نہ تو کسی کے بارے میں یہ کہہ سکنے کی پوزیشن میں ہوگا کہ یہ شخص جو میری تحویل میں تھا حاضر ہے، اور نہ وہ اس دن کسی کو بہکانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے گا۔ آگے اس کا قول آ رہا ہے کہ جب اس کے جال میں پھنسے ہوئے لوگ اپنی گمراہی کی ذمہ داری اس پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف اعلانِ براءت کرے گا کہ 'رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ' (قٓ : ۲۷) (اے ہمارے رب! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا بلکہ یہ خود نہایت دُور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا)۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس سے انہی دو میں سے کوئی ایک مراد ہے۔ یہ سوال کہ ان میں سے کون مراد ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ اس سے 'شہید' بھی مراد ہو سکتا ہے اور 'سائق' بھی، اس لیے کہ یہ بات دونوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ چنانچہ اصحابِ تاویل نے اس میں اختلاف کیا بھی ہے۔ میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ بات 'سائق' کہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرم اصلاً چارج میں اسی کے ہوگا اور اسی پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کو عدالت میں پیش کرے۔ چنانچہ جب وہ اس کو عدالت میں حاضر کر دے گا تو ایک فرض شناس سپاہی کی طرح اپنے فرض سے سبک دوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرے گا کہ 'هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ' (یہ جو میری تحویل میں ہے، حضور کے سامنے حاضر ہے!)

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (۲۴)

ایک سوال اور اس کا جواب

'اَلْقِيَا' مثنیٰ کا صیغہ ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم کن دو فرشتوں کو دیا جائے گا۔ عام طور پر اربابِ تاویل نے اس کا مخاطب انہی دو فرشتوں کو قرار دیا ہے جن کا ذکر اوپر 'سائق' اور 'شہید' کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ انہی کو حکم ہوگا کہ ہر ناشکرے معاند کو جہنم میں جھونک دو۔ اس تاویل میں بظاہر کوئی ضعف نظر نہیں آتا۔ ان دونوں کو یہ حکم دینے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہی اس کو جہنم میں ڈالیں بھی۔ یہ محض حکم کا بیان ہے۔ اس کی تعمیل میں وہ مجرم کو جہنم میں جھونکنے والے فرشتوں کے حوالہ کر دیں گے اور وہ اس کو جہنم کے اس طبقے میں، جو اس درجے کے مجرمین کے لیے خاص ہوگا، ڈال دیں گے۔

اس مثنیٰ سے متعلق زمخشریؒ نے ایک قول مشہور ادیب مبرّد کا بھی نقل کیا ہے کہ فصحائے عرب مثنیٰ کا صیغہ بعض اوقات مجرد تکرارِ فعل کے مفہوم کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً امرا القیس

کے قصیدے کا مطلع ہے: قِفَا نَبْكِ من ذكرى حبيب ومنزل، اس کا ترجمہ عام طور پر تو لوگ یوں کرتے ہیں کہ میرے دونوں ساتھیو، ٹھہرو ذرا جاناں اور منزل جاناں کی یاد میں دو آنسو بہا لیں۔ مبرّد کے اس قول کی روشنی میں 'قفا' کے معنی صرف 'ٹھہرو، ٹھہرو' کے ہوں گے۔ دو مخاطب فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح 'القیا' کا مفہوم آیت میں اس کے نزدیک 'ڈال دو، ڈال دو' ہوگا۔ مقصود اس سے اظہارِ غضب اور تاکیدِ حکم ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ حکم دو فرشتوں کو دیا جائے گا یا دو سے زیادہ فرشتوں کو۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہی بات سورۂ 'حاقہ' میں جمع کے صیغے سے بھی فرمائی گئی ہے: خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۰-۳۲) (اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو، پھر اس کو دوزخ میں داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے، اس کو جکڑ دو) میں نے اس قول کا حوالہ صرف غور و تحقیق کے مقصد سے دیا ہے۔ مجھے اس پر پورا جزم نہیں ہے۔ البتہ مزید تحقیق سے اس کے حق میں اطمینان بخش شواہد فراہم ہو جائیں تو اس سے بعض مشکلات کے حل میں مدد ملے گی۔ جہاں تک احوالِ آخرت کا تعلق ہے ان کے باب میں سلامتی کی راہ میرے نزدیک یہ ہے کہ الفاظ قرآن سے جو مفہوم متبادر ہو آدمی اس پر ایمان رکھے۔ زیادہ کھوج کرید میں نہ پڑے۔

'كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ'۔ 'کفّار' کے معنی ناشکرے اور منکر حق کے ہیں اور 'عنید' کے معنی معاند کے۔ لفظ 'کفر' اصلاً خدا کی ناشکری اور اس کے حقوق کے انکار کے لیے آتا ہے۔ خدا کے حقوق میں کسی سلیم الفطرت کے لیے کسی بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ان کا منکر صرف کافر ہی نہیں بلکہ کفّار ہے اور اس کی اس کفاری پر مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ ان حقوق کا معاند مخالف بن کر اٹھ کھڑا ہو کہ دوسرے بھی ان کے ادا کرنے والے نہ بن سکیں۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ (۲۵-۲۶)

خدا کے حقوق کے منکر لازماً بندوں کے حقوق کے بھی منکر ہوں گے

جو خدا کے حقوق کے منکر و معاند ہوں گے لازماً وہ اس کے بندوں کے حقوق کے معاملے میں بھی نہایت بخیل و ممسک اور دوسروں کو ان سے روکنے والے ہوں گے اور ساتھ ہی وہ 'معتدی' یعنی حدود سے تجاوز کرنے والے حقوق کو غصب کرنے والے بھی ہوں گے۔ لفظ 'خیر' یوں تو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے عام ہے لیکن انفاق کی نیکی کے لیے یہ معروف ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے۔ لفظ 'مناع' میں رکنے اور روکنے دونوں کا مفہوم موجود ہے۔ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ صرف خود ہی بخیل بننے پر قانع نہیں رہتے بلکہ دوسروں کو بھی بخیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی بخیلی کا راز فاش نہ ہو۔ مزید برآں اس طرح کے لوگ 'معتدی' بھی ہوتے ہیں۔ یہ صرف اتنے

پر صبر نہیں کرتے کہ دوسروں کے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں ان کو دبائے بیٹھے رہیں بلکہ تعدی کر کے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی ان کے پاس نہ رہنے پائے بلکہ اس کے مالک بھی یہی بن بیٹھیں۔ 'مُرِیبٍ' کے معنی مبتلائے شک کے ہیں۔ یوں تو یہ لفظ عام ہے۔ توحید یا آخرت جس باب میں بھی شک ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن قرآن میں اس کا معروف استعمال اس شک کے لیے ہوا ہے جو قیامت کے بارے میں ہو، جو اس سورہ میں موضوع بحث ہے۔ یہاں اس صفت کا ذکر ان تمام صفات کی اصل کی حیثیت سے ہوا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ قیامت کے باب میں شک ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ناشکرا، معاند، بخیل اور تعدی کرنے والا بناتا ہے۔ چنانچہ ان تمام بیماریوں کے ذکر کے بعد اس اصل بیماری کا پتہ بھی دے دیا جس سے یہ تمام بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

'اَلَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ'۔ یہ آخر میں اسلوب بدل کر، خاص اہتمام کے ساتھ، شرک کا ذکر فرمایا۔ 'شرک' تمام دین و اخلاق کا ہادم اور تمام فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ شرک کے ساتھ قیامت کو کوئی مانے بھی تو یہ ماننا بالکل بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ اگر آدمی اس وہم میں مبتلا ہو کہ فلاں خدا کا شریک یا اس کا ایسا چہیتا ہے کہ وہ جو بات چاہے خدا سے منوا سکتا ہے تو پھر اس کے لیے قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ وہ اپنے زعم میں اس کو راضی رکھ کے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون بن سکتا ہے!

یہاں عربیت کے اس اسلوب پر بھی نظر رہے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ جب صفات کا ذکر حرفِ عطف کے بغیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی نگاہ میں رہے کہ یہاں صفات کے بیان میں ترتیب فروع سے اصول کی طرف ہے۔ ناشکری اور بخل سے آغاز کیا ہے، انکار قیامت اور شرک پر ختم کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی اگر قیامت کے باب میں مشتبہ اور شرک میں مبتلا ہو تو اس کا کردار وہ بنتا ہے جو ان آیات میں بیان ہوا۔

'فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ' یہ اسی اوپر والے 'اَلْقِیَا' کی تاکید ہے۔ اوپر فرمایا کہ اس کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کی صفات کا حوالہ دینے کے بعد مزید شدت و تاکید کے ساتھ فرمایا کہ اس کو جہنم کے 'عَذَابِ شَدِیْد' میں جھونک دو۔ 'جَھَنَّم' کے متعلق یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کے سات دروازے اور متعدد طبقات ہوں گے۔ مذکورہ صفات کے کرداروں کے لیے اس کے عذاب شدید میں داخل کرنے کا حکم ہوگا۔

قَالَ قَرِیْنُہٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُہٗ وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۲۷-۲۸)

یہ جہنم کے بارے میں، داخل ہونے کے بعد کا ماجرا بیان ہو رہا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد ہر ایک اپنی گمراہی کا الزام اس شیطان پر تھوپنا چاہے گا جو سنتِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔ شیطان جب دیکھے گا کہ اس کو مجرم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرے گا کہ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (اے ہمارے رب، میں نے اس کو طغیان میں نہیں مبتلا کیا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ وہاں سے اس کے لیے بازگشت کا امکان باقی نہیں رہا)۔ شیطان کے قول مَآ اَطْغَيْتُهٗ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گمراہی کی دعوت دینے سے انکار کرے گا۔ قرآن میں تصریح ہے کہ وہ یہ اعتراف کرے گا کہ اس نے گمراہی کی دعوت ضرور دی لیکن اس دعوت کو قبول کرنے والا یہ خود بنا اس پر اس کو اس نے مجبور نہیں کیا۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ (ابراہیم: ۲۲)	اور جب معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچی بات کہی تھی وہ اس نے پوری کر دی اور میں نے تم سے جھوٹے وعدے کیے تھے سو میں نے خلاف ورزی کی اور مجھ کو تمھارے اوپر کوئی اختیار تو حاصل تھا نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ میں نے تمھیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہی تو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے ہی کو ملامت کرو۔ اب تو نہ میں تمھارا فریادرس بن سکتا اور نہ تم میرے فریادرس بن سکتے۔

'وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گمراہی میں اتنی دور نکل جا چکا تھا کہ اس کے لیے حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ سے اپنے آپ کو بہت دور کر لیتے ہیں وہ بالآخر توفیقِ ہدایت سے محروم ہو کر شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ گویا شیطان نے اس بات کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ شخص اگر اس کے ہتھے چڑھا تو اس وجہ سے کہ اپنی ضلالت پسندی کے سبب سے یہ سنتِ الٰہی کے مطابق اس کا مستحق بن چکا تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح شیطان قیامت کے روز اپنے پیرؤوں سے اظہارِ براءت کرے گا اسی طرح وہ لیڈر بھی ان لوگوں کی گمراہی کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کریں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوئے ہوں گے۔ یہ بات قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے۔ ہم سورۂ ابراہیم سے

ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (ابراہیم: ۲۱)

اور سب کے سب اللہ کے آگے پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو بڑے بنتے رہے، کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آپ لوگ اللہ کے عذاب میں سے بھی کچھ حصہ ہٹانے والے بنیں گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہوتی تو ہم تمھیں بھی صحیح راہ بتاتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم روئیں پیٹیں یا صبر کریں، ہمارے لیے اب کوئی مفر نہیں!

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ۔ اس تو تکار پر اللہ تعالیٰ ان کو متنبہ فرمائے گا کہ اب میرے سامنے تمھارا یہ جھگڑا بالکل بے سود ہے۔ یہ الزام بازی کسی کو بھی اس کی گمراہی کی ذمہ داری سے بری قرار دینے والی نہیں بن سکتی۔ میں نے اپنی وعید سے ہر ایک کو پہلے سے آگاہ کر دیا تھا اس وجہ سے حجت تمام ہو چکی ہے اور کسی کے لیے بھی کسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

'وعید'، سے اشارہ اس وعید کی طرف ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت آگاہ فرما دیا تھا جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا تھا کہ اگر تو نے مجھے مہلت دی تو میں اولادِ آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا، جس کو تو گمراہ کر سکے، گمراہ کر لے۔ میں بھی آگاہ کرتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کریں گے، خواہ جنات ہوں یا انسان، میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اس وعید کے بعد اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے نبی اور رسول بھیجے جو وقفہ وقفہ کے ساتھ آ کر، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بھی آگاہ کرتے رہے اور شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی کے انجام سے بھی جو گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد وہ جن نتائج سے دوچار ہوں گے ان میں انھوں نے جان بوجھ کر گویا خود چھلانگ لگائی ہے۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۹)

یہ اسی بات کی مزید وضاحت اور تاکید ہے۔ فرمایا کہ جس بات سے میں پہلے سے آگاہ کر چکا ہوں، اب تمھارے ایک دوسرے پر الزام دھرنے یا رونے دھونے سے وہ بدلی نہیں جا سکتی۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں بالکل قطعی اور اٹل ہیں۔ یہ جو کچھ تمھارے سامنے آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال کا ثمرہ ہے اس وجہ سے اب اس کو بھگتو۔ میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم

کرنے والا نہیں ہوں۔

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

'وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہم کر چکے ہیں کہ جب مبالغہ پر نفی آتی ہے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین عام طور پر اس اسلوب سے چونکہ ناواقف ہیں اس وجہ سے وہ اس کو 'لَيْسَ بِظَالِمٍ' کے معنی میں لیتے ہیں اور مترجمین اپنے ترجموں میں انہی کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ یہ الفاظ قرآن سے صریح بے پروائی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مقصود یہی کہنا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظالم نہیں ہے تو زبان کا سادہ اسلوب چھوڑ کر اس مطلب کے ادا کرنے کے لیے 'لَيْسَ بِظَلَّامٍ' کا اسلوب کیوں اختیار کیا جاتا؟ قرآن میں ہر لفظ اور ہر اسلوب کا ایک خاص مقام ہے جس کو اچھی طرح سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل ممکن نہیں ہے۔

کلامِ عرب میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ شعرائے جاہلیت میں سے امراؤ القیس نے اپنے اشعار میں 'اَلْمَرْءُ لَيْسَ بِقَتَّالٍ' اور 'اَلْمَرْءُ لَيْسَ بِفَعَّالٍ' کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس کے حریف نے اس کو جنگ اور قتل کی دھمکی دی تھی تو اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے حالانکہ اس بزدل میں قتل و قتال کا ذرا بھی داعیہ نہیں ہے۔ 'لَيْسَ بِفَعَّالٍ' اس کے اندر کچھ بھی کر سکنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ بعض دوسرے شعراء نے بھی مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نوع کی ترکیبیں استعمال کی ہیں لیکن افسوس ہے کہ دمِ تحریر میرے پاس دواوین نہیں ہیں۔ تاہم میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر مجھے پورا اطمینان ہے۔

قرآن میں یہی بات دوسرے اسلوب میں بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۴۰) اللہ ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (۴۴) اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔

اگر کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ 'مبالغہ فی النفی' کا جو ضابطہ ہم نے بیان کیا ہے وہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ہماری تاویل کی صحت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ قاعدہ عربی میں، ایک جزئیے کی حیثیت ہی سے سہی، موجود ہے۔ جب یہ قاعدہ موجود ہے تو قرآن کی تاویل میں تمام ائمۂ فن کے نزدیک یہ اصول مسلّم ہے کہ کسی آیت میں دو تاویلوں کا امکان ہو تو اس تاویل کو ترجیح دی جائے گی جو احسن اور بظاہر قرآن کے مطابق ہو۔ یہاں ہماری تاویل کے حق میں کئی باتیں موجود ہیں۔

— یہ عربیت کے اسلوب کے مطابق ہے۔
— یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے شایان شان ہے اس لیے کہ وہ بہر حال ہر شائبۂ ظلم سے پاک ہے۔ وہ نہ نیکوں پر کوئی ظلم کرے گا نہ بدوں پر۔
— قرآن کے نظائر و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہمارے مفسرین میں سے صرف صاحب کشاف نے اس آیت کے اشکال سے تعرض کیا ہے، لیکن انھوں نے جس طرح اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کے مسلکِ اعتزال کی تائید تو نکل آتی ہے لیکن ساتھ ہی بعض دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے انھوں نے تعرض نہیں کیا۔

ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے اطاعت گزار بندوں پر ظلم کرے تو یہ بڑا ظلم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا ظالم نہیں ہے۔

صاحبِ کشاف کی اس تاویل پر یوں تو بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن ہم بخیالِ اختصار صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آیت میں اطاعت گزاروں یا نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ 'عَبِیْد' (بندوں) کا لفظ ہے جو تمام بندوں کو عام ہے، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ہر ایک سے متعلق یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ تحدید و تخصیص بالکل بے دلیل بلکہ قرآن کے الفاظ کے خلاف ہے۔

دوسری یہ کہ آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرمائی ہی ہے ان لوگوں کو مخاطب کر کے جو جہنم کے مستحق تھے۔ ان کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ تمھارے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جس کے تم سزاوار تھے۔ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کشاف کی اسی تاویل کو اس دور کے بعض لوگوں نے اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خالق ہے، وہ خالق ہو کر اگر اپنی مخلوق پر ظلم کرے تو یہ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا درآنحالیکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہے کہ وہ بہت بڑا ظالم بن جائے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ظلّام ہونے کی نفی فرمائی۔

یہ بات کہنے والوں کو شاید علم نہیں ہے کہ ہمارے متکلمین کے سوادِ اعظم نے تو اسی دلیل کی بنا پر کہ خدا خالق ہے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ خدا کے کسی فعل پر ظلم و جور کا حکم لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ اگر نیکوں کو جہنم میں ڈال دے تو یہ بھی عدل ہے اور اگر نافرمانوں کو جنت بخش دے تو یہ بھی عدل ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پرانے متکلمین کی یہ بات غلط ہونے کے

باوجود اتنی غلط نہیں ہے جتنی غلط اس دور کے نئے متکلمین کی بات ہے۔

دوسرے ان حضرات نے اس پہلو پر بھی غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ظلم و جور کی جو نفی کی ہے تو اپنی صفاتِ عدل، رحمت اور حکمت کی بنا پر کی ہے۔ اس بنیاد پر کہیں اس کی نفی نہیں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس وجہ سے وہ بڑا ظالم نہیں بن سکتا۔

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ان حضرات کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا، وہ یہ کہ اگر یہ فلسفہ صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ غیر خالق کی طرف سے مخلوقاتِ الٰہی پر ظلم ہو تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظلم ہو لیکن وہ ظلّام نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ فرعون و ہامان اور نمرود و شدّاد بھی ان کے نزدیک بڑے ظالم نہیں ہوں گے اس لیے کہ وہ خالق نہیں تھے اور بڑا ظلم صرف وہی ہوتا ہے جو خالق سے صادر ہو۔ معلوم نہیں یہ علم کلام ان حضرات نے کس مکتب میں پڑھا ہے کہ جو خالق و رازق ہے وہ اگر ظلم کرے تو وہ ظلّام ہو جائے اور جو نہ خالق ہیں نہ رازق وہ اگر ظلم ڈھائیں تو صرف ظالم رہیں۔

بہرحال یہ ساری موشگافیاں، خواہ قدیم متکلمین و مفسرین کی ہوں یا نئے مترجموں و مفسروں کی، عربی زبان کے اس اسلوب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (۳۰)

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

فرمایا کہ اس دن کو اچھی طرح یاد رکھو جس دن ہم دوزخ سے سوال کریں گے کہ تو اچھی طرح بھر گئی یا نہیں! وہ جواب دے گی ابھی اور بھی ہیں! یہ سوال و جواب صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ واقعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بنائی ہیں وہ سب اس کے سوال کو سمجھتی بھی ہیں اور ان کے جواب بھی دیتی ہیں۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے صامت چیزوں کو بھی ناطق بنا دے۔ قرآن میں ہے کہ جب مجرموں کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ حیران ہو کر ان سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰمٓ السجدۃ: ۲۱) (ہمیں اسی خدا نے ناطق بنا دیا جس نے ہر چیز کو ناطق بنایا)۔

یہ سوال و جواب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور اس کے بے پایاں غضب کی تصویر ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ میں بھرتے ہوئے ذرا بھی اس کو تردد لاحق نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری بے نیازی سے سب کو جہنم میں پھینکوا دے گا اور پھر جہنم سے پوچھے گا کہ کیوں تیرا پیٹ اچھی طرح بھر گیا یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار خلقت کو جہنم میں جھونکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو کچھ تاسف ہوگا کہ اپنی پیدا کی ہوئی اتنی مخلوق کو میں نے آگ میں جھونک دیا بلکہ اس کے جوشِ غضب کا یہ حال ہوگا کہ اور بھی ہوں تو ان کو بھی وہ جہنم کا ایندھن بنا دے۔

'وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'۔ جہنم کے اس جواب کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جس جوشِ غضب کے ساتھ یہ سوال فرمائے گا اسی جوش کے ساتھ وہ بھی جواب دے گی کہ اور بھی ہوں تو میرے اندر بڑی سمائی ہے، ان کو بھی لائیے۔ دوسرا یہ کہ دوزخیوں کی اس کثرت کو دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے جائے گا اور وہ بے حوصلہ ہو کر جواب دے گی کہ کیا اور بھی ہیں! اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ دونوں مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن میں پہلے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مفہوم لینے میں دوزخیوں پر اللہ تعالیٰ کے جوشِ غضب اور جہنم کے جوشِ غضب میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے اور یہی بات دوزخ کے لیے موزوں ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پورے جوش و ولولہ کے ساتھ کرے۔ دوسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ دوزخ کی وسعت کا بیان اس انداز سے ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کو تنبیہ کیا جا رہا ہے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھلا اتنی مخلوق کو بھرنے کے لیے اتنی وسیع دوزخ کہاں سے لائی جائے گی۔ آیت 'لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۔۔۔۔ الاٰية' (الحجر: ۴۴) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے[1]۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض مقامات میں دوزخ کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جب دوزخی اس میں جھونکے جائیں گے تو معلوم ہو گا کہ وہ جوشِ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ 'اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۙ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ' (الملک: ۷-۸) یہی مضمون سورۂ ہود کی آیت ۱۰۶ میں بھی ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۳۱)

متقیوں کی عزت افزائی

دوزخیوں کے بعد اب یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ ان کی تشریف و تکریم اس طرح ہو گی کہ جنت، ایک پیشکش کی طرح، ان کے قریب لائی جائے گی، اس تک پہنچنے کے لیے انھیں کوئی زحمتِ سفر نہیں اٹھانا پڑے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور نہیں ہو گی۔ 'غَيْرَ بَعِيْدٍ' میرے نزدیک 'جنت' سے حال واقع ہے۔ اس حال کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'قریب لانے' کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ وہ بہت دور سے قریب لائی جائے گی جس میں کچھ وقفہ صرف ہو گا؛ بلکہ وہ بالکل قریب ہی ہو گی لیکن اہل جنت کی عزت افزائی کے لیے مزید قریب لائی جائے گی۔ لفظ 'بعید' اگرچہ مذکر ہے لیکن اس کا مؤنث سے حال پڑنا عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ زمخشریؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور مجھے اس کی رائے سے اتفاق ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (۳۲)

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات: ۶۰۶ - ۶۰۷

یعنی جنت کو قریب لا کر ان الفاظ کے ساتھ اہلِ جنت کو اس میں داخل ہونے کا پروانہ دیا جائے گا کہ یہ ہے وہ صلہ جس کا آپ لوگوں سے دنیا میں نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔ اب اس وعدے کا ایفاء ہو رہا ہے۔ مضارع سے پہلے عربیت کے قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے، یعنی "مَا كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ"۔ "هٰذَا" سے اشارہ اسی جنت کی طرف ہے لیکن یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق اس سے علی سبیل التاویل صلہ اور انعام مراد ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

"لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ" یہ اہلِ جنت کے اس کردار کا بیان ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ اوپر اہلِ دوزخ کا کردار آیات ۲۵-۲۷ میں بیان ہو چکا ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اب یہ اس کے مقابل میں مستحقینِ جنت کا کردار بیان ہو رہا ہے کہ یہ اپنے رب کی طرف برابر رجوع رکھنے والے، اس کے حدود و قیود کی حفاظت کرنے والے تھے۔ ان دونوں صفتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسری کا تعلق عمل سے۔ اگر آدمی کا دل زندہ و بیدار ہو تو زندگی کے تمام ہنگاموں کے اندر اس کا دل برابر اپنے رب کی طرف رجوع رہتا ہے۔ کسی وقت بھی اس پر ایسی غفلت یا سرکشی کی حالت طاری نہیں ہوتی کہ اسے خدا کے حدود و محارم کا بھی کچھ ہوش نہ رہے اور وہ ان کو توڑ تاڑ کے رکھ دے۔ نفس کی کسی اکساہٹ کے باعث اگر اس سے کبھی تجاوز صادر ہو جاتا ہے تو اس کا دل فوراً متنبہ ہوتا ہے اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے پھر اپنے رویّہ کی اصلاح کر لیتا ہے۔ ان دو لفظوں کے اندر ایک صحیح مومن کا باطن و ظاہر دونوں بیان ہو گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ایک باوفا مومن ہونے کے لیے ترکِ دنیا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی امتحان یہ ہے کہ وہ اس کارزارِ حیات میں رہتے ہوئے اپنے اوّاب و حفیظ ہونے کو ثابت کرے۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ہر شخص کے لیے شب و روز میں پانچ مرتبہ مسجد کی حاضری اسی اوابیت کو زندہ رکھنے کے لیے ہے۔ اس طرح گویا مومن اپنے مرکزِ ثقل سے وابستہ رہتا ہے اور شیطان اس پر کبھی اتنا قابو نہیں پاتا کہ اس کو فواحش و منکرات میں مبتلا کر دے۔ "اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ" (العنکبوت: ۴۵)۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (۳۳)

اوپر مستحقینِ دوزخ کے بارے میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ وہ دربابِ قیامت مبتلائے شک رہے اور اللہ کے مقابل میں انھوں نے دوسرے سہارے بنا لیے۔ وہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ یہی دونوں چیزیں درحقیقت ام الامراض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں اس کے مقابل میں اہلِ جنت کے باب میں فرمایا کہ یہ اس قسم کے کسی وہم میں نہیں مبتلا ہوئے بلکہ غیب میں رہتے، خدائے رحمان سے

ڈرتے رہے اور چونکہ انھوں نے خدا کے سوا کوئی اور سہارا تلاش نہیں کیا اس وجہ سے اپنے رب کے حضور میں ایک ایسے دل کے ساتھ حاضر ہوئے جس کی ساری توجہ اپنے رب ہی کی طرف رہی اس لیے کہ ان کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں، کسی اور سے انھوں نے لو نہیں لگائی۔

دین کی ایک عظیم حکمت

'مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ' میں خدا کی صفت 'رحمٰن' کا حوالہ دین کی ایک عظیم حکمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ بالآخر ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس دنیا میں ایک 'اوّاب' اور 'حفیظ' کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے 'کفّار' اور 'عنید' بن کر اس میں دھاندلی مچائی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نیکی اور بدی، ظلم اور عدل دونوں اس کی نگاہوں میں یکساں ہیں۔ درآنحالیکہ یہ بات اس کی رحمانیت و رحیمیت کے بالکل منافی ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ لازمی تقاضا بیان فرمایا ہے کہ وہ قیامت کا دن ضرور لائے گا۔ 'کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ط لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ' (الانعام: ۱۲) (اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے کہ وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا) اہلِ ایمان چونکہ اپنے رب کی اس صفت اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے رہے اس وجہ سے انھوں نے قیامت کو اٹل حقیقت سمجھا اور اس کے لیے برابر بیدار رہے۔

'بِالْغَیْبِ' میں 'ب' ظرفیہ ہے۔ منکرینِ قیامت کے باب میں تو اوپر ارشاد ہوا کہ قیامت کے دن ان کے سامنے جب حقائق آشکارا ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ 'لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ' (قٓ: ۲۲) (تم اس دن سے غفلت میں رہے تو ہم نے تمھاری نگاہوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تو تمھاری نگاہیں بہت تیز ہیں) اس کے برعکس ان اہلِ ایمان کا حال یہ رہا کہ اسی دنیا میں رہتے اور آخرت کے حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کیے بغیر، مجرد آفاق و انفس کے دلائل اور نبیوں کی تعلیم کی بنا پر وہ آخرت کو مانتے اور اپنے رب سے ڈرتے رہے۔

'قلب منیب' سے مراد وہ دل ہے جو رنج و راحت اور امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کی طرف متوجہ رہا۔ کسی حال میں بھی اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور سے اس نے لو نہیں لگائی۔

اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ ط ذٰلِکَ یَوْمُ الْخُلُوْدِ (۳۴)

ابدی بادشاہی

یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اب نہ اس میں تمھارے لیے ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ابدی بادشاہی کا جو وعدہ تم سے کیا گیا تھا اس کے دیے جانے کا وقت آگیا۔ یہ بادشاہی تم سے کبھی چھینی نہیں جائے گی اور نہ کبھی اس

میں کوئی خدشہ پیدا ہوگا۔ سورۂ حجر کی آیت ۴۶ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ (اس میں داخل ہوجاؤ، کامل سلامتی کے ساتھ، ہر اندیشہ سے بےخوف ہوکر) قرآن میں اس بات کا ذکر بھی جگہ جگہ آیا ہے کہ فرشتے سلام کے ساتھ اہلِ جنت کا خیرمقدم کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سلام و پیام کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن ان کا محل اور ہے۔ یہاں مدعا وہی ہے جس کی تائید سورۂ حجر کی آیت سے ہو رہی ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۳۵)

اس میں ان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جو وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی لیکن ہمارے پاس ایسی نعمتیں بھی ہوں گی جن کا ان کو کوئی تصور بھی نہیں ہوگا کہ وہ ان کے ارمان کرسکیں لیکن ہم ان کے چاہے بغیر ہی وہ نعمتیں بھی ان کو دیں گے۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (السجدۃ: ۱۷) (پس کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے)۔

۴۔ آگے آیات ۳۶ - ۴۵ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے قریش کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنی موجودہ قوت و صولت کے غرّے میں خدا سے لڑنے کی جسارت نہ کرو۔ تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو قوت و صولت میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئی ہیں لیکن جب خدا نے ان کو پکڑا تو وہ اپنے کو بچا نہ سکیں۔ اگر تمھارے پاس سمجھنے والے دل اور سننے والے کان ہیں تو ان کی سرگزشتوں میں تمھارے لیے بڑا درسِ عبرت ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ ہم آسمان و زمین کو پیدا کرکے تھک نہیں گئے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ نہ کرسکیں گے۔ پس کان لگائے ہی رکھو۔ وہ دن آہی رہا ہے جب خدا کا منادی پکارے گا اور سب قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ پس صبر کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ تمھاری ذمہ داری لوگوں کو مومن بنا دینا نہیں ہے، بلکہ صرف اس قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو ہماری وعید سے آگاہ کر دینا ہے جو آگاہ ہونا چاہیں ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۴۵

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا

فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖۗ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾ وَ اسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ ﴿۴۱﴾ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ﴿۴۳﴾ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ﴿۴۵﴾

ع ۳ / ۱۶ / ۱۷

ترجمۂ آیات: ۳۶-۴۵

اور کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کر چھوڑیں ان سے پہلے جو قوت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں تو جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر کو، ملکوں میں، چل کھڑا ہوا کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ! بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی یاددہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات سننے کے لیے کان لگائیں، متوجہ ہو کر۔ ۳۶-۳۷

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو، چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو، اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے

طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے ڈھلنے کے بعد بھی۔ ۳۸ ۔ ۴۰

اور کان لگائے رکھو جس دن منادی بہت قریب کی جگہ سے پکارے گا جس دن یہ سنیں گے چیخ کو شدنی کے ساتھ۔ وہ دن نکل کھڑے ہونے کا ہو گا۔ بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹنا ہو گا۔ اس دن زمین ان کے اوپر سے کھل جائے گی اور وہ تیزی سے نکلتے ہوں گے۔ یہ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔ ۴۱ ۔ ۴۴

ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اور نہ تم ان پر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہو۔ پس اس قرآن کے ذریعے سے ان لوگوں کو یاد دہانی کر دو جو میری وعید سے ڈرتے ہوں۔ ۴۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (۳۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، اپنی جگہ سے ہلائے نہیں جا سکتے۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں گزری ہیں جو قوت و عظمت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ان میں سے اگر کچھ ہلاک ہونے سے بچ بھی رہے تو وہ مختلف ملکوں میں، جدھر جس کا سینگ سمایا، وہ ادھر کو کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

'نَقَّبَ فِی الْاَرْضِ' کے معنی ہیں 'سَارَ فِیْهَا طَلَبًا لِلْمَهْرَبِ' (اور وہ زمین میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا) 'هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ' ان کے چل کھڑے ہونے کے محرک کا بیان ہے کہ سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں جدھر کو جس کا منہ اٹھا وہ ادھر ہی کو چل کھڑا ہوا۔

جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔ قوم کے کارفرما عناصر، جو سارے فساد کے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ تو تباہ ہو جاتے ہیں، عوام میں سے جو بچ رہتے ہیں وہ قومی جمعیت کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد پراگندہ ہو کر جس کو جہاں پناہ ملنے کی توقع ہوتی ہے وہ اسی طرف کا رخ کر لیتا ہے۔

قوموں کی تباہی کی مختلف صورتیں

قرآن میں جن قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کی پوری عذاب الٰہی سے تباہ ہو گئیں، مثلاً قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ۔ بعض قوموں کا حال یہ ہوا کہ ان کے مترفین و متکبرین تو تباہ ہو گئے، رہے ان کے اتباع و عوام تو وہ ادھر ادھر پراگندہ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کی صورت یہی ہوئی۔ وہ خود تو اپنے اعیان اور پوری فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا۔ باقی جو پیچھے رہ گئے تھے وہ حکومت کی تباہی اور اپنے حریفوں کے ڈر سے پناہ کی تلاش میں تتر بتر ہو گئے۔

اسی سے ملتے جلتے حالات ملکِ سبا میں پیش آئے۔ بے شمار افراد تو اس سیلاب ہی کی نذر ہو گئے جو ان پر آیا۔ جو بچ رہے وہ علاقہ کے بنجر اور معاشی حالت بالکل ابتر ہو جانے کے باعث مجبور ہوئے کہ پناہ کی تلاش میں دوسرے علاقوں کا رُخ کریں۔ یہود پر جو تباہیاں آئیں ان کی نوعیت بھی یہی تھی۔ جو قتل و نہب سے بچے وہ دنیا کے کونے کونے میں آوارہ ہو کر پھرے۔ خود ہماری تاریخ میں بھی اس کی نہایت عبرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ بغداد پر، قرطبہ پر، دلی پر جو تباہیاں آئیں کیا ان کے احوال تاریخ میں مذکور نہیں ہیں؟ ان کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں صرف قریش ہی کو تنبیہ نہیں ہے بلکہ خود ہمارے لیے بھی اس میں بڑا درس ہے بشرطیکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے 'فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ' کے یہ معنی لیے ہیں کہ انھوں نے اپنے دورِ عروج میں اپنی فاتحانہ ترک تازیوں سے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ لفظ 'تنقیب' عربی میں فاتحانہ جولانیوں کے لیے نہیں آتا بلکہ ڈر اور خوف سے، جائے پناہ کی تلاش میں، زمین میں نقب لگانے کے لیے آتا ہے۔ اہلِ لغت نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اوپر ہم اس کا حوالہ دے چکے ہیں۔ کلامِ عرب کے شواہد سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور بعد کا ٹکڑا 'ھَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ' نہایت واضح طور پر اس معنی کے حق میں ہے۔ ورنہ یہ جملہ بالکل بے محل ہو کر رہ جائے گا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (۳۷)

قریش کو تنبیہ اور آنحضرتؐ کو تسلی

'ذٰلِکَ' کا اشارہ انہی قوموں کی سرگزشت کی طرف ہے جن کا بالاجمال اوپر کی آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ان قوموں کی سرگزشت میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے بشرطیکہ عبرت حاصل

کرنے والے دل اور بات کو توجہ کے ساتھ سننے والے کان ہوں۔

لفظ 'قلب' اپنے حقیقی یعنی دلِ زندہ کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کو احساس کرنے، عبرت حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لیے بنایا ہے۔ جب تک آدمی کا دل یہ کام کرتا ہے اس وقت تک اس کا دل زندہ ہے اور جب تک دل زندہ ہے اس وقت تک آدمی بھی زندہ ہے۔ اس لیے کہ آدمی کی حقیقی زندگی اس کے دل کی زندگی ہی سے ہے۔ اگر دل یہ خصوصیات کھو بیٹھا تو پھر آدمی بھی مردہ ہے اگرچہ اس کی رگوں میں کتنا ہی خون دوڑتا پھرتا ہو۔

'اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ'۔ یعنی اگر دل پوری طرح بیدار نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو انسان کے اندر ہو کہ کوئی معقول آدمی اس کو کوئی بات سنائے تو وہ اس کو توجہ سے سنے۔ یہ توجہ بھی انسان کے لیے بڑی خیر و برکت کا باعث ہے۔ اس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لیے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی؟

اگرچہ سیاقِ کلام یہاں قریش کو تنبیہ و ملامت کا ہے لیکن اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی بھی ہے کہ تم جو قرآن سنا رہے ہو اگر قریش کے لیڈروں کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نہ تو ان کے دلوں کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہی ہے اور نہ یہ کان کھول کر تمھاری بات توجہ سے سننے ہی کے لیے تیار ہیں تو آخر تم اپنی بات کس طرح ان کے دلوں میں اتار سکتے ہو؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۳۸-۴۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین

اب کلام کا رخ واضح طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی اور تلقینِ صبر کے مضمون کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ ہم آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں تھک تھیں گئے ہیں کہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز رہ جائیں گے۔ اطمینان رکھو کہ جس دن سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ آکے رہے گا۔ ان کی باتوں پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔

'فی ستۃ ایام' کا مطلب

'وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ'۔ آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'ایام' سے

یہاں مراد خدائی ایّام ہیں اس وجہ سے یہ ادوار کے مفہوم میں ہیں۔ یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر چھ دنوں کی قید کے ساتھ ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس اہتمام کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو اس کائنات کی تخلیق میں ملحوظ ہے اور جو اس بات پر دلیل ہے کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آئی ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے بلکہ یہ ایک با مقصد کارخانہ ہے اور اس کے با مقصد ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کی غایت واضح ہو۔

'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ'۔ یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ چھ دن مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ہم کو تکان لاحق ہوگئی ہے اور اب دوبارہ اس دنیا کو پیدا کرنے کا حوصلہ ہم نہ کر سکیں گے۔ ہم جس طرح پہلے تازہ دم تھے اسی طرح اب بھی تازہ دم ہیں اور جس طرح پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے سے بھی عاجز نہیں رہیں گے۔ اس فقرے کا انداز کچھ طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی از سرِ نو خلقت کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ ہمارا دم خم اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس میں سرِ مو فرق نہیں آیا ہے۔ اس میں ضمناً یہود کے اس خیال پر بھی تعریض ہے جو تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

'فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ'۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر ہے کہ یہ جو کچھ تمھاری تکذیب میں کر رہے ہیں اس پر صبر کرو۔ 'مَا يَقُوْلُوْنَ' سے اشارہ مکذبین کی اسی طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال آیات ۲-۳ میں گزر چکی ہے۔ 'فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ' (۲-۳) (تو کافروں نے کہا یہ تو نہایت عجیب بات ہے! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو اٹھائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو نہایت مستبعد ہے!) مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا جو اللہ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے وہ لازماً اپنی غایت کو پہنچ کر رہے گی۔ ہم اس کو پیدا کر کے تھک نہیں گئے ہیں کہ اس کو دوبارہ نہ پیدا کر سکیں لیکن جو لوگ دل کے اندھے ہیں وہ اس حقیقت کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس طرح کے لوگوں کی مخالفت پر تمھیں بہر حال صبر کرنا ہے تو صبر کرو تاآنکہ ان کے سامنے حقیقت اس طرح ظاہر ہو جائے کہ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

حصولِ صبر کی تدبیر

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ'۔ یہ صبر حاصل کرنے کی تدبیر بتائی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرے تعلق کے بغیر وہ صبر پیدا نہیں ہو سکتا جو مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم آدمی کے قدم جادۂ حق پر استوار

رکھ سکے۔ اسی حقیقت کی طرف دوسری جگہ یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ' (النحل: ۱۲۷) (اور تم صبر نہیں کر سکتے مگر اللہ کی استعانت سے) اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ چونکہ نماز ہے اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کے مقابل میں جہاں جہاں صبر کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہاں نماز کے اہتمام کی تاکید ضرور فرمائی گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی جگہ جگہ گزر چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی نہایت واضح اور مؤثر مثالیں آئیں گی۔

'فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ' - یہ نماز کی تعبیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے پہلو سے ہے۔ یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے۔ ایک 'تسبیح' دوسرا 'حمد'۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک و منزّہ قرار دینا جو اس کی شان کے منافی ہیں۔ 'حمد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس کو ان صفات سے متصف قرار دینا جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ یہ نفی اور یہ اثبات دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اسی رسوخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے۔ اگر ان کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصور غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اس کے سارے نظامِ فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

اوقاتِ نماز اور ان کی حکمت

'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ' - یہ ان خاص خاص اوقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح خاص اہتمام سے مطلوب ہے۔ یوں تو اللہ کی یاد ہر وقت زندگی بخش ہے، اس کی یاد ہی سے دل زندہ اور روح مطمئن رہتا ہے لیکن اس دنیا کے دوسرے کاموں میں جس طرح اوقات اور فصلوں و موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادات میں بھی اوقات و ساعات کا لحاظ ہے۔ نمازوں کے لیے جو اوقات خاص کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کے اندر جو اوقات اس کائنات میں کسی بڑے تغیر کی علامت ہیں، جو عالم کے متصرفِ حقیقی کی عظمت و قدرت کی یاددہانی کرنے والے ہیں اور جن میں اس کائنات کی دوسری نمایاں چیزیں بھی اپنے خالق کے آگے سرفگندہ ہوتی ہیں، وہی اوقات ہماری نمازوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اور خاص الخاص وقت فجر کا ہے۔ جب رات اپنی بساط لپیٹتی ہے، ستارے اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور نئے دن کی سحر طلوع ہوتی ہے؛ اور پھر اس کے ٹھیک مقابل میں عصر کا وقت ہے جب دن کی سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہیں اور سورج اپنے رب کے آگے سربسجود ہو جانے کے لیے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ چنانچہ آیت میں پہلے انہی دونوں وقتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ 'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ' سے

فجر کا وقت مراد ہے اور 'قَبْلَ الْغُرُوْبِ' سے عصر کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں نمازوں کی ہمارے دین میں جو اہمیت ہے وہ قرآن اور حدیث دونوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔

شب کی نمازیں

'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' دن کی دو اہم نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی طرح شب میں بھی اپنے رب کی تسبیح کرو۔ شب میں دو نمازیں ہیں۔ شب کے پہلے حصہ میں عشاء اور آخری حصہ میں تہجد۔ تہجد اگرچہ فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن تربیتِ صبر کے پہلو سے سب سے زیادہ اہمیت اسی نماز کو حاصل ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے اور سورۂ مزمل کی تفسیر میں، ان شاء اللہ، اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'ادبار السجود' کا صحیح مطلب

'وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ' 'ادبار' جمع ہے 'دبر' کی، جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ 'سجدوں کے بعد بھی اس کی تسبیح کرو'۔ لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں سجود مصدری معنی میں ہے اور اس سے مراد آفتاب کا سجود ہے جس کے طلوع و غروب کے قبل کی نمازوں کا ذکر اوپر والے ٹکڑے میں ہو چکا ہے۔ یعنی جس طرح سورج کے طلوع و غروب سے پہلے نماز کے اوقات ہیں اسی طرح سورج کے سجود کے بعد بھی تسبیح کے اوقات ہیں۔ چونکہ سورج کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اس وجہ سے دوبارہ اس کی تصریح کی ضرورت نہیں ہوئی۔ لفظ 'ادبار' کا قرینہ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ یہاں اسی کے سجود کے بعد کی نماز کا ذکر ہے جس کے طلوع و غروب سے پہلے کی نمازوں کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اگر دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں 'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' کے الفاظ نہ آ گئے ہوتے تو بات کے سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی۔ اس صورت میں تالیف کلام یوں ہوتی کہ 'سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور اس کے سجود کے بعد کے اوقات میں تسبیح کرو'۔ اس تالیف میں ہر شخص کا ذہن آسانی سے اس طرف منتقل ہو جاتا کہ 'سجود' سے مراد سجودِ شمس ہے لیکن تالیفِ کلام یوں ہوتی تو اس سے حکمتِ دین کا ایک اہم نکتہ واضح نہ ہو سکتا جو اس آیت میں واضح فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں نمازوں کی ترتیب دین میں ان کی اہمیت و عظمت کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے۔ یہ ترتیب مقتضی ہوئی کہ سب سے پہلے فجر کا ذکر آئے، اس کے بعد عصر کا، چنانچہ 'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ' کے الفاظ سے ان دونوں کا ذکر ہوا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ قرآن و حدیث دونوں میں ان نمازوں کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ' سے عشاء اور تہجد کی نمازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو شب کی نمازوں میں وہی اہمیت رکھتی ہیں جو دن کی نمازوں میں فجر اور عصر کی نمازوں کو حاصل ہے۔ اس کے بعد 'اَدْبَارَ السُّجُوْدِ' کے الفاظ سے ظہر اور مغرب کی نمازوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوک الشمس اور سجودِ شمس کے اوقات سے تعلق رکھتی ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ' کے تحت ہم سورج کے 'دلوک' کے مختلف مراحل کی وضاحت کر چکے ہیں[1] یہاں لفظ 'سجود' ہے اور اس کے بھی مختلف درجے ہیں۔ سورج اور دوسرے کواکب کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے ان کے زوال اور غروب کے تمام مراحل مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سارے ہی مراحل مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی جب وہ سمت راس سے جھکتا ہے، جب وہ مرأی العین سے نیچے آتا ہے، پھر جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں انہی تین اوقات میں ہیں۔ یہاں عصر کی نماز کا ذکر، اس حکمت کے تحت جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، خاص اہتمام کے ساتھ اوپر 'قَبْلَ الْغُرُوْبِ' کے الفاظ سے ہو چکا ہے اس وجہ سے دو نمازیں باقی رہ گئیں۔ ایک ظہر جو سورج کے سجود کے پہلے مرحلے کے بعد ہے اور دوسری مغرب جو اس کے سجود کے آخری مرحلے کے بعد ہے۔ گویا اس آیت میں ان تمام اوقات کی طرف اشارہ ہے جن میں ہماری پانچوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم سے انہی اوقات کی ضابطہ بندی فرما دی۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں، یہاں نظائر نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ قارئین کے اطمینان کے لیے صرف ایک آیت سورۂ طٰہٰ کی ہم نقل کرتے ہیں جس میں یہ سارا مضمون نہایت واضح الفاظ میں آگیا ہے۔ فرمایا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (۱۳۰)	پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں۔

'اطراف النھار' کے الفاظ کے مضمرات کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہو چکی ہے تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے[2]

وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ (۴۱)

'استماع' کے معنی توجہ سے کان لگائے رکھنے کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس دن کو جھٹلاتے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات ۵۲۳-۵۲۴

[2] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد چہارم، صفحات ۲۴۴-۲۴۵

ہیں تو جھٹلانے دو، تم ان کی باتوں کی پروا نہ کرو۔ بلکہ اس منادی کی آواز سننے کے لیے برابر کان لگائے رکھو جو نہایت قریب کی جگہ سے پکارے گا۔ اس منادی سے مراد وہی 'نفخِ صُور' کا منادی ہے جس کا ذکر اوپر 'وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ط ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ' کے الفاظ سے ہو چکا ہے۔ 'مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آج تو ان غافلوں کو یہ باتیں بہت دُور کی اور نہایت ہی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں لیکن اس دن ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ گویا اس کے کانوں ہی میں پکارا جا رہا ہے۔ یہ اسلوبِ کلام بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ دُخان میں 'فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ (۱۰)' ہے۔ اس سے مقصود ایک تو واقعہ کی قطعیّت اور اس کی ہولناکی کا اظہار ہے، دوسرے اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ اس کے ظہور کا وقت آیا ہی سمجھو، معلوم نہیں کب منادی پکار دے۔

آیت میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور یہ خطاب نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر یہ بلید لوگ اس عظیم ساعت سے نچنت ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ تم ہر لمحہ اس کے ظہور کے انتظار ہی میں رہو۔ قیامت کے معاملے میں ایک عاقل کو جس طرح چوکنا رہنا چاہیے یہ آیت اس کی صحیح تصویر ہے۔ اوپر آیت ۱۹ میں یہ مضمون بیان ہو چکا ہے کہ اس کو ہر شخص اپنے سر پر کھڑی ہی سمجھے۔ یہ ہر آدمی کی موت کے ساتھ ہی لگی ہوتی ہے اور موت نہ معلوم کس گھڑی آدھمکے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو بہت بعید سمجھتے ہیں۔

یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ط ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ (۴۲)

یہ 'یَوْمَ' اوپر والے 'یَوْم' سے بدل ہے۔ اور 'صَیْحَة' سے مراد نفخِ صُور کا صیحہ ہے۔ 'حق' سے مراد، جیساکہ آیت ۱۹ میں وضاحت ہو چکی ہے، قیامت ہے۔ اس لفظ سے اس کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک اٹل حقیقت اور شُدنی ہے۔

فرمایا کہ اس دن کی صدائے صُور کے لیے برابر کان لگائے رکھو جس دن یہ تکذیب کرنے والے اس کی چیخ، اس شُدنی کے ظہور کی منادی کی حیثیت سے سنیں گے۔ وہ دن ان کے قبروں سے نکلنے کا ہوگا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (۴۳)

یہ اس خروج کی دلیل بیان فرما دی کہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، تو ہمارے لیے ان کو دوبارہ زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ یہ دلیل اوپر وضاحت سے بیان ہو چکی ہے۔

'وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ' یہ اسی اوپر والی آیت کا ایک اور واضح نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ جب ہم ہی

زندگی بخشنے والے اور ہم ہی موت دینے والے ہوئے تو اس سے نہ صرف یہ بات لازم آئی کہ ہم دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قادر ہیں بلکہ یہ بات بھی لازم آئی کہ سب کی واپسی بھی ہماری ہی طرف ہوگی۔ اگر کوئی اس مغالطہ میں مبتلا ہے کہ قیامت ہوئی تو اس کے مزعومہ شرکا روشفعاء اس کے کام آنے والے بنیں گے تو یہ مغالطہ وہ اپنے ذہن سے نکال دے۔ جن کو زندگی کے معاملے میں کوئی دخل نہیں، جو موت کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے وہ آخرت میں ملجاو ماویٰ کس طرح بن جائیں گے!

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۴۴)

قیامت کے دن قبروں سے نکلنے کی تصویر

یہ اس دن لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ نفخ صُور کے بعد زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ اس سے نہایت تیزی سے نکلتے ہوئے ہوں گے۔ 'سِرَاعًا' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ اس تیزی سے نکلنے کی تصویر قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جس طرح پتنگے اور ٹڈیاں نکلتی ہیں اسی طرح لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

'ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ' یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ لوگوں کو زمین سے برآمد کرنے کے لیے کوئی بڑا اہتمام کرنا پڑے گا جو ہم نہیں کر پائیں گے یا اس میں بڑا وقت صرف ہوگا۔ یہ سارا کام چشم زدن میں چٹکی بجاتے ہوگا۔ یہ ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۴۵)

اوپر آیت ۳۹ میں فرمایا تھا 'فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ' پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کو ہم خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم خوب جانتے ہیں تو تم کیوں غم کرو۔ معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم اس کا مداوا کریں گے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔

'وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ' اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم ان کو مومن بنا دینے کے کام پر مامور کر کے نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں کو یاددہانی کرنا ہے، وہ تم کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کا انجام یہ خود بھگتیں گے۔

جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

'فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ' یہ اسی بات پر سورہ ختم فرمائی ہے جس سے اس کا آغاز فرمایا تھا۔ قرآن ہی کے ذکر سے یہ شروع ہوئی تھی اسی کی یاددہانی آخر میں فرما دی کہ تمھاری ذمہ داری صرف تذکیر ہے اور تذکیر کے لیے یہ قرآن کافی ہے تو اسی کے ذریعہ سے ان لوگوں کو یاددہانی کر دو جو میری وعید سے ڈرنا چاہتے ہیں۔ جو نہیں ڈرنا چاہتے اور تمھاری تصدیق

کے لیے تم سے کسی عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو ان کی تقدیر کے حوالے کر دو۔ وہ اس کا انجام دیکھ لیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ ماٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

رحمان آباد
۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء
۲۷ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ

تدبّرِ قرآن

٥١

الذّٰریٰت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــــ قٓ ـــــ کی مثنیٰ ہے۔ سورۂ قٓ کی تفسیر میں آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کے اس دعوے کو بعید از امکان قرار دیتے تھے کہ لوگ مرنے کے بعد از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس سورہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر قرآن کے اندازِ عذاب کو بھی ثابت کیا گیا ہے اور جزار و سزا کو بھی۔ سورہ کا عمود اس کی تمہید ہی میں ان الفاظ سے واضح فرما دیا گیا ہے: ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ﴾ (بے شک جو وعید تم کو سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچی ہے اور جزار و سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی)۔

خطاب قریش کے مکذبین ہی سے ہے اور استدلال کی بنیاد تمام تر آفاق و انفس کے دلائل پر ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ میں بھی اسی طرح تسلی دی گئی ہے جس طرح سابق سورہ میں دی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۴) ہواؤں کے عجائب تصرفات اور سرما کے دھاریوں والے بادلوں کے حوالہ سے ان غفلت کے ماتوں کو انذار جو قرآن کی وعیدِ عذاب اور اس کے وعدۂ جزاء و سزا کا مذاق اڑاتے اور بانداز استہزاء مطالبہ کر رہے تھے کہ جس جزاء و سزا کے دن سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کہاں ہے، اس کو لا یا کیوں نہیں جاتا! ان لوگوں کو تنبیہ کہ پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے۔ اور جس روزِ جزاء و سزا سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک امرِ واقعی ہے۔ ان میں شک وہی لوگ کر رہے ہیں جن کی عقلیں الٹ گئی ہیں۔ اس دن کے لیے جلدی مچانے والے عنقریب اس کا مزا چکھیں گے۔ اس دن ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ دن جس کے لیے تم جلدی مچاتے ہوئے تھے!

(۱۵-۱۹) ان خدا ترسوں کے صلہ کا بیان جو غفلت کی سرمستیوں میں کھوئے رہنے کے بجائے نماز، استغفار اور انفاق کے ذریعہ سے اس دن کے لیے برابر تیاریوں میں سرگرم رہے۔

(۲۰-۲۳) جزاء و سزا کی جو نشانیاں زمین و آسمان اور آفاق و انفس میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ اور آخر میں اصل دعوے کا بتقیدِ قسم اعادہ کہ جس طرح لوگوں کے لیے ایک لفظ کا بول دینا نہایت آسان ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے اس دنیا کو اس کے فنا ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کر دینا نہایت آسان ہے۔

(۲۴-۳۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قومِ لوط کے واقعہ کی طرف اشارہ کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قومِ لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو فنا کر دیا جنھوں نے حضرت لوط کی تکذیب کی اور ان لوگوں کو نجات بخشی جو ان پر ایمان لائے۔ یہ اس بات کی تاریخی شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور اس کے اس قانونِ مکافات کی ایک نشانی قومِ لوط کی سرزمین میں موجود ہے جس سے وہ لوگ عبرت حاصل کر سکتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

(۳۸-۴۶) فرعون، عاد، ثمود اور قومِ نوح کے واقعات کی طرف ایک اجمالی اشارہ کہ ان قوموں نے بھی مکافاتِ عمل کے قانون سے بے پروا ہو کر زندگی گزاری اور اپنے رسولوں کے انذار کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ قاہرہ سے سب کو تباہ کر دیا۔ اس کے لیے اس کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا بلکہ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں نے ہی ان سب کا ستھراؤ کر کے رکھ دیا۔

(۴۷-۶۰) خاتمۂ سورہ جس میں پوری سورہ کا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور جس نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اس کے لیے دنیا کو از سرِ نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ جزا و سزا شدنی ہے اور سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہونی ہے تو خدا ہی کی طرف بھاگو۔ اس کے سوا کسی اور سے لو نہ لگاؤ۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب ہی کے ساتھ ان کی قوموں نے یہی سلوک کیا جو تمھاری قوم تمھارے ساتھ کر رہی ہے۔ تو ان سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ صرف ان لوگوں کو یاددہانی کرو جو یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ اطمینان رکھو کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ نہ دوسروں کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ میں اس بات کا حاجتمند ہوں کہ لوگ مجھے کھلائیں۔ میں خود سب کا روزی رساں اور بڑی قوت و طاقت رکھنے والا ہوں۔ یہ جو بندے میری بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے سب سے بے نیاز ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے ان کی کفالت اور نصرت کے لیے میں کافی ہوں۔ دوسرے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ رہے یہ ظالم لوگ تو اس دنیا میں سے ان کا جو حصہ مقدر ہے وہ پائیں گے۔ ان کے جلدی مچانے کے سبب سے اللہ تعالیٰ ان کو اس مہلت سے محروم نہیں کرے گا جو اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہے، لیکن بالآخر ان کو اسی دن سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔

سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ

مَكِّيَّةٌ ______ آيات: ۶۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات: ۱-۱۴

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝۳ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝۱۱ يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۲ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴

ترجمۂ آیات: ۱-۱۴

شاہد ہیں تند ہوائیں، جو اڑاتی ہیں غبار۔ پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ۔ پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ۔ کہ جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جارہی ہے وہ سچ ہے اور جزاء وسزا بے شک واقع ہو کے رہے گی۔ شاہد ہے دھاریوں والا آسمان! بے شک تم ایک اختلاف میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی رو گردانی کرتے ہیں جن کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ اٹکل کے تیر تکے

چلانے والے ہلاک ہوں! غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، بالکل بے خبر۔ پوچھتے ہیں جزاء و سزا کا دن کب آئے گا! جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے! چکھو مزا اپنے فتنہ کا، یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے! ۱-۱۴

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا (۱-۴)

'و' قسم کے لیے ہے اور قسم شہادت کے لیے

'وَالذّٰرِیٰتِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور اس بات کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح اشیاء کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں اس کا مقصود ان اشیاء کی تعظیم نہیں، بلکہ ان کو اس دعوے پر شہادت کے لیے پیش کرنا ہے جو قسم کے بعد مذکور ہوتا ہے یا سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے؛ چنانچہ یہ قسم بھی شہادت ہی کے لیے ہے۔ اس کا ترجمہ اگر شہادت کے لفظ سے کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ زیادہ معنی خیز ہوگا۔

'ذاریٰت'

'ذٰرِیٰتٌ'، غبار اڑانے والی ہواؤں کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہواؤں کی صفت کے طور پر آتا ہے۔ لیکن یہ اپنے موصوف کے لیے اس طرح معروف ہو چکا ہے کہ اس کے قائم مقام کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ 'ذٰرِیٰتٌ' کے بعد لفظ 'ذَرۡوًا' کے اضافے سے معنی میں اسی طرح کا اضافہ ہو گیا ہے جس طرح 'ضُرِبَ ضَرۡبًا' کے اندر تاکید فعل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی تاکیدات کا مفہوم اردو ترجمے میں منتقل کرنا بعض اوقات مشکل ہوتا ہے۔ یہاں اگر ہواؤں کے ساتھ 'تند' کا اضافہ کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ مفہوم ادا ہو جائے گا۔

'ف' کے ساتھ عطف کے فوائد

'فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا'۔ جب صفات کا عطف 'ف' کے ساتھ ہو تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ ان کے اندر ترتیب ہے، دوسری اس بات پر کہ یہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف کی ہیں۔ عربیت کے اس قاعدے کی رو سے یہاں جو تین صفتیں 'ف' کے ساتھ بیان ہوئی ہیں وہ لازماً ہواؤں ہی کی ہوں گی۔ جن لوگوں نے ان کو الگ الگ چیزوں کی صفت مانا ہے ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی۔

سورۂ عادیات میں ہے۔

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۱ - ۵)	گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے دوڑتے ہیں، پھر ٹھوکروں سے چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر صبح کو دھاوا کرتے ہیں، پھر غبار اٹھاتے ہیں، پھر غول کے اندر گھس جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صفتیں الگ الگ چیزوں کی نہیں ہیں، بلکہ گھوڑوں ہی کی ہیں اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بیان میں ترتیب بھی ملحوظ ہے۔

کلام عرب میں بھی اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ ہم صرف ابن زیابہ کا ایک مشہور شعر نقل کرتے ہیں۔

یا لهف زیابة للحارث المصابح ، فالغانم ، فالآئب

(زیابہ کی طرف سے افسوس ہے حارث پر، جس نے غارت گری کی، لوٹا اور چل دیا)

'وِقْرٌ' کے معنی بوجھ اور بار کے ہیں۔ یوں تو اس سے ہر وہ بوجھ اور بار مراد ہو سکتا ہے جس کو ہوائیں اٹھاتی ہیں، مثلاً غبار اور کنکر وغیرہ لیکن اس کا معروف استعمال بادلوں کے لیے ہے۔ مثلاً

'وِقْر'

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا ۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ (الاعراف: ۵۷)	اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر اپنے بارانِ رحمت سے پہلے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی مردہ زمین کی طرف اور وہاں بارش برسا دیتے ہیں۔

'جاریات' کا مفہوم اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

'فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا': یہ صفت بھی ہواؤں ہی کی ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کشتیاں مراد لی ہیں ان کی رائے اس قاعدے کے خلاف ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ 'یُسْرًا' کے معنی آہستہ اور نرم کے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے تند اور غبار انگیز ہوائیں چلتی ہیں جو مختلف سمتوں سے بادلوں کو ہانک ہانک کر لاتی اور جس علاقہ کو سیراب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، اس پر ان کو تہ بہ تہ جما دیتی ہیں۔ پھر ہوا کی رفتار نرم ہو جاتی ہے اور مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

'تقسیم امر' کا مفہوم

'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا'۔ 'قسم الامر' کے معنی ہوں گے کہ جس کے لیے جو بات طے تھی یا جو امر مقدر تھا وہ اس کو پہنچا دیا۔ یعنی یہ ہوائیں بادلوں کو لاد کر لانے کے بعد اپنے رب کے حکم کے مطابق تقسیم امر کرتی ہیں۔ یعنی جس جس علاقہ کے لیے جتنا پانی برسانے کا حکم ہوتا ہے اتنا برسا دیتی ہیں۔ بعض کو جل تھل کر دیتی ہیں، بعض کو نیم تشنہ اور بعض کو خشک چھوڑ جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے

دیتا ہے تو بعض علاقوں پر وہ طوفان و سیلاب بن کر نازل ہوتی ہیں اور پورے علاقے کا علاقہ ان کی زد میں آ کر تباہ ہو جاتا ہے۔ ہواؤں کے تصرفات اور ان کے فرق و امتیاز کی نیرنگیاں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ ہوتا ہے، دوسری قوم کے ساتھ کچھ۔ کسی قوم کے لیے یہ ابرِ رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہیں، کسی قوم کے لیے طوفانِ عذاب بن کر۔ آگے، ان شاء اللہ، اس کی تفصیل آئے گی۔

اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّاِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ (۵-۶)

قسم کا مُقسم علیہ

یہ اوپر کی قسم کا مُقسم علیہ ہے۔ یعنی ہواؤں کے یہ عجائب تصرفات، جن کا تم برابر مشاہدہ کرتے رہتے ہو، اس بات پر شاہد ہیں کہ جس چیز کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی۔

'توعدون' کا مفہوم

'اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ': استاذ امام فراہیؒ کے نزدیک 'تُوۡعَدُوۡنَ' 'وعد' سے ہے جس کے تحت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن کا نبیوں کی زبانی وعدہ کیا گیا ہے، یعنی حشر نشر، جزا سزا اور رحمت و نقمت وغیرہ۔ وہ 'اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ' کو اسی پر عطف خاص علی العام کی حیثیت دیتے ہیں؛ لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ 'تُوۡعَدُوۡنَ'، 'وعید' سے ہے اور یہاں اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کے مکذبین پر نازل ہوتا ہے۔ گویا ہواؤں کے عجائب تصرفات کی قسم یہاں میرے نزدیک دو چیزوں پر کھائی گئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ قریش کو جس عذاب کی بصورت تکذیب دھمکی دی جا رہی ہے اور جس کو وہ محض ایک دھونس گمان کر رہے ہیں وہ دھونس نہیں ہے بلکہ بالکل سچی دھمکی ہے اور اس طرح وہ جزا و سزا بھی ایک امر شدنی ہے جس کو وہ بہت بعید از امکان سمجھ رہے ہیں۔

میرے اس رجحان کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں، لیکن ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف تین باتوں کی طرف اشارہ کافی ہے۔

ایک یہ کہ اس طرح مقسم علیہ کے دونوں اجزاء کا محل بالکل بے تکلف الگ الگ متعین ہو جاتا ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں ان پر نازل ہوا اگر وہ اپنی تکذیب پر اڑی رہ گئیں، دوسرے اس عذاب سے جس سے لازماً ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اگر ان کا خاتمہ کفر ہی پر ہوا۔ ان دونوں عذابوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہ حقیقت مقتضی ہے کہ یہاں ان دونوں عذابوں کا ذکر ہو جب کہ قسم ان دونوں پر شاہد ہے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

تیسری یہ کہ آگے رسولوں کی تکذیب کرنے والی بعض قوموں کا حوالہ قرآن نے اسی وعید کی تصدیق کے طور پر دیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ان کی تباہی میں ہواؤں کے تصرفات کو قرآن نے خاص طور پر نمایاں فرمایا ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ عذابِ دنیا کی وعید کا ذکر تو فعل سے کیا ہے اور آخرت کی جزاء و سزا کا ذکر اسم 'دین' سے کیا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اس دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ ایک امر حادث اور مشروط بشرائط و حالات ہوتا ہے۔ لیکن جزاء و سزا کا قانون اس دنیا کی خلقت کی غایت اور اس کا لازمی نتیجہ ہے اس وجہ سے پہلے کو فعل سے تعبیر فرمایا اور دوسرے کو اسم سے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷)

'ذات الحبک' کی تحقیق

'سَمَآءُ' سے آسمان کو بھی مراد لے سکتے ہیں اور بادلوں کو بھی۔ یہ دونوں معنوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن آسمان کو مراد لیں گے تو یہاں لازماً 'ذات الحبک' کی صفت کے ساتھ ہی مراد لیں گے۔ اس وجہ سے اصل تحقیق طلب چیز یہ صفت ہی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں اس لفظ کی تحقیق کلامِ عرب کے شواہد کی روشنی میں بیان فرمائی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حَبْكٌ" کے معنی باندھنے اور گرہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ اس مضبوطی و استواری کے لیے استعمال ہوا جو کسی چیز کی بناوٹ میں پیدا کی جائے۔ اسی سے 'حَبَاكٌ' ہے جس کی جمع 'حُبُكٌ' آتی ہے۔ "حُبُكٌ" ان دھاریوں، شکنوں اور راہوں کو کہتے ہیں جو کسی گف اور مضبوط بناوٹ کے کپڑے میں نمایاں کی گئی ہوں ...... فراء کی تحقیق یہ ہے کہ 'حُبُكٌ' سے مراد وہ لہریں اور شکنیں ہیں جو ریت یا ساکن پانی میں، جب کہ اس پر ہوا چل گئی ہو، پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بادلوں کی تعریف میں استعمال ہونے لگا کیونکہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آسمان میں تہ بہ تہ موجوں اور تو بر تو روئی کے گالوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ امرؤ القیس فلک بوس محلوں کی تعریف کرتے ہوئے، جن پر بادل چھائے ہوئے ہیں، کہتا ہے۔

مکللة حمرا ذات اسرة لها حبك كانها من وصائل

(ان محلوں پر سرخ دھاریوں والے بادل چھائے ہوئے ہیں گویا کہ دھاریوں والی چادریں ہیں)

یہ موسم سرما کے بادلوں کی تعریف ہے اور یہ ان کے رنگ اور ان کی تہوں کی نہایت صحیح تصویر ہے......

جن لوگوں نے 'ذات الحبک' سے برج و کواکب مراد لیا ہے، خواہ اس کی مضبوطی و استواری کے پہلو سے یا اس وجہ سے کہ اس میں تارے ٹنگے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔

...... یہ لفظ دھاریوں، شکنوں، لہروں اور خطوط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کی روشنی میں یہ قسم سرما کے سرخ دھاریوں والے بادلوں کی ہے جو شمال کی بادِ تند کے ساتھ نمایاں ہوتے اور جن کو پچھلی معذّب قوموں کی تباہی میں، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، بڑا دخل رہا ہے۔ گویا ہواؤں کی قسم کے بعد یہ بادلوں کی قسم اسی قسم کی تکمیل ہے اس لیے کہ ہواؤں اور بادلوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اس قسم کے اضافے سے ہواؤں کی ہلاکت انگیزی کے پہلو کی طرف خاص طور پر اشارہ مقصود ہے۔

اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۸)

مخالفین کو ملامت

قرینہ شاہد ہے کہ یہ ٹکڑا جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ مخالفین کے رویہ پر ان کو ملامت ہے۔ جوابِ قسم اوپر گزر چکا ہے اور یہ دوسری قسم اوپر والی قسم ہی کی تکمیل ہے اس وجہ سے اس کے بعد جوابِ قسم کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ مکذبین کو سرزنش کر دی گئی کہ تم لوگ ایک صریح قسم کے اختلاف اور تناقضِ فکر میں مبتلا ہو ورنہ ان شہادتوں کے ہوتے نہ وعیدِ عذاب کو جھٹلانے کی گنجائش ہے، نہ وعدۂ جزاء و سزا میں شک کرنے کی۔

قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ وضاحتِ قرینہ کی بنا پر جوابِ قسم حذف کر کے اس کی جگہ کوئی سرزنش و ملامت کا جملہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ قٓ میں گزر چکی ہے۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ (قٓ: ۱-۲)

یہ قٓ ہے۔ قرآن بزرگ و برتر کی قسم (یہ کلام الٰہی ہے) بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس ایک آگاہ کرنے والا انہی میں سے آیا تو کافروں نے کہا یہ تو عجیب بات ہے!

اس آیت میں دیکھیے جوابِ قسم مذکور نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ مخالفین کو ان کی صریح دھاندلی پر ملامت کر دی گئی ہے۔ یہی اسلوب سورۂ بروج میں بھی اختیار فرمایا گیا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۚ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (البروج: ۱-۴)

قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور شاہد و مشہود کی! ناس ہوں آگ کی گھاٹی والے!

مخالفین کا تضادِ فکر

قولٍ مختلف سے قیامت اور جزاء و سزا کے باب میں ان کے تضادِ فکر اور تضادِ قول کی طرف اشارہ ہے۔ مشرکین عرب کے بارے میں ہم جگہ جگہ یہ لکھ چکے ہیں کہ ان میں سب قیامت کے کھلے منکر ہی نہیں تھے بلکہ انکار کرنے والوں کے ساتھ ان کے اندر ایک گروہ مذبذبین کا بھی تھا جو صریح

طور پر انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو ایک مستبعد بات سمجھتے تھے۔ اسی طرح ان کے اندر ایک بہت بڑا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو قیامت کو بعید از امکان تو نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا گمان یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کا معاملہ ان کے شرکا و شفعاء سے متعلق ہوگا، وہ اپنے پجاریوں کو اپنی شفاعت سے بچا لیں گے۔ یہ لوگ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے لیے وہ تمام صفتیں تسلیم کرتے تھے جو اس کی بدیہی اور لازمی صفات ہیں اور جو جزا و سزا کو لازم کرتی ہیں دوسری طرف ان کے بدیہی نتائج و لوازم کے بارے میں یا تو مبتلائے شک تھے یا ان کا انکار کرتے تھے۔ ان کی اسی ذہنی الجھن کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ مقصود ان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ قرآن ان کو جس بات سے آگاہ کر رہا ہے وہ تو اس کائنات کی ایک بدیہی حقیقت ہے بشرطیکہ یہ لوگ اپنے ذہن کو سیدھی راہ پر سوچنے دیں، اس میں غیر فطری اڑنگے نہ ڈالیں۔ پچھلی سورہ میں فَهُمۡ فِىۡۤ اَمۡرٍ مَّرِيۡجٍ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک دونوں جگہ ایک ہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے۔

يُّؤۡفَكُ عَنۡهُ مَنۡ اُفِكَ (۹)

یہ جملہ 'قولِ مختلف' کی صفت نہیں بلکہ ایک مستقل جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے ذہن کو تناقض سے پاک کر کے سوچیں تو جزا و سزا کا معاملہ بالکل بدیہی حقیقت ہے لیکن جن لوگوں کی عقل الٹ دی جاتی ہے وہ اس سے برگشتہ کر دیے جاتے ہیں۔ 'اَفِكَ' کے معنی اُلٹ دینے کے ہیں اور 'مافوک' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ (الصف : ۵) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے یعنی ان لوگوں نے اپنی عقل صحیح طور پر استعمال نہیں کی اس وجہ سے قانونِ الٰہی کے مطابق ان کی عقل الٹ دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کو وہ چیز بھی نظر نہیں آرہی ہے جس کی شہادت اس کائنات کے ہر گوشے سے مل رہی ہے۔

قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ ۙ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ غَمۡرَةٍ سَاهُوۡنَ (۱۰-۱۱)

گمان کا سہارا لینے والوں کی تباہی

یہ جملہ بھی ملامت و سرزنش کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اٹکل کے تیر تکے چلانے والے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے آفاق و انفس اور ارض و سما کی وہ تمام دلیلیں جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ بصیرت سے محروم ہونے کے باعث اب ان کا تمام اعتماد قیاس و گمان پر رہ گیا ہے۔ اسی قیاس و گمان کے بل پر وہ اس واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہیں جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہے حالانکہ گمان کسی درجے میں بھی ان کے لیے حق کا بدل نہیں بن سکے گا بلکہ ایک دن ان پر واضح ہو جائے گا

کر حق کے انکار کے لیے انھوں نے وہم و گمان کا جو سہارا لیا یہی ان کی تباہی کا اصل سبب بنا۔

جو امور جتنے ہی اہم ہیں اسی کے لیے اتنا ہی اہتمام ہے

'خرص' کے معنی اندازہ اور تخمینہ کرنے کے ہیں 'خرص النخل والکرم' کے معنی ہیں کھجور کے درخت یا انگور کی بیل کے پھلوں کا اندازہ کیا۔ 'خرص فی الحدیث' کے معنی ہوں گے کہ ایک امر پر غور کیے بغیر اس کے بارے میں ایک اٹکل پچو بات اڑا دی۔

انسان کی زندگی سے متعلق جو امور جتنے ہی اہم اور دُور رس نتائج کے حامل ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اتنا ہی زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔ اٹکل اور اندازوں پر وہی امور اس نے چھوڑے ہیں جن کی انجام کار کے پہلو سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ جن امور کی خاص اہمیت ہے، جو دُور رس نتائج کے حامل ہیں اور جن پر انسان کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے قیاس و گمان پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان میں ہر پہلو سے اس نے حجت تمام کر دی ہے تاکہ انسان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ ان امور میں اٹکل کے گھوڑے دوڑانا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اندھیری رات میں اللہ کی بخشی ہوئی روشنی کو گل اور اپنی آنکھیں بند کر کے محض اٹکل سے راستہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

انسان کے لیے اس کی عاقبت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی پہلو کو بھی مبہم نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر جہت سے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما دی ہے تاکہ گمراہی کا اندیشہ نہ رہے۔ آسمان و زمین میں اس نے قدم قدم پر نشانات راہ گاڑ دیے ہیں جو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آنکھیں دے دی ہیں جو ان نشانات کو دیکھ سکتی ہیں اگر انسان آنکھیں کھلی رکھے۔ عقل بخشی ہے جو ان اشاروں کو سمجھتی ہے یا سمجھ سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھائے۔ علاوہ ازیں انسان کی فطرت میں وہ تمام داعیات و محرکات ودیعت فرما دیے ہیں جو صحیح سمت میں قدم بڑھانے، خطرات کا مقابلہ کرنے اور انسان کو برابر بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ پھر مزید اور سب سے اعلیٰ و اشرف انتظام یہ فرمایا کہ اپنے نبیوں، رسولوں اور اپنی اتاری ہوئی کتابوں کے ذریعہ سے اچھی طرح واضح فرما دیا کہ زندگی کی صحیح شاہراہ کیا ہے اور اس راہ کے لیے کیا زاد و راحلہ مطلوب ہے۔

اتنے گوناگوں اہتمام کے بعد بھی اگر انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے محض اپنی اٹکل سے اپنے لیے کوئی اور راہ ڈھونڈنے کے درپے ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسے روشنی سے نفرت ہے، وہ تاریکی ہی میں بھٹکنا چاہتا ہے۔

اٹکل کی پیروی کا سبب

'اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ'۔ یہ ان اٹکل کے تیر تکے چلانے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے اس بات کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے خدا کی روشنی چھوڑ کر اپنا رہنما اٹکل

کو کیوں بنایا ہے! فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خواہشاتِ نفس کے اندھیرے میں گھرے ہوئے ہیں اور ان پر ایسی غفلت طاری ہے کہ اس کا تسلسل کبھی ٹوٹتا ہی نہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش کریں۔ 'غَمْرَۃٌ' سے مراد خواہشاتِ نفس اور مطامعِ دنیا کی تاریکی ہے۔ 'سَاهُوْنَ' خبر کے بعد دوسری خبر ہے جس سے ان کی غفلت کا تسلسل ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیز ان پر اس طرح مسلّط ہے کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا کبھی نام ہی نہیں لیتے۔ اگر کبھی کوئی ان کو جگانے اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ چیز ان کے دلوں پر شاق گزرتی ہے اور وہ اپنے کو مطمئن رکھنے کے لیے جو غلط سے غلط سہارا بھی مل جاتا ہے اس پر تکیہ کر لیتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۲)

منکرینِ جزا کا معارضہ

یعنی وہ جزاء و سزا سے آگاہ کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ سوال کرتے ہیں کہ جس یوم الجزاء سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اس کا ظہور کب ہوگا! اس سوال کے اندر انکار، استہزاء اور جلدبازی تینوں ہی باتیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر فی الواقع اس طرح کا کوئی دن آنے والا ہے تو وہ آتا کیوں نہیں! اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو ہمارے کان پک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہ محض ایک ہوا ہے جس سے تم ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہو۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو اس کو لاؤ۔ اس کو دیکھے بغیر ہم تمھاری ان خیالی باتوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں!

یہ سوال نقل کرنے سے قرآن کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس قماش کے لوگ حقائق سے گریز اختیار کرنے کے لیے اسی طرح کے بہانوں کی آڑ میں چھپتے ہیں حالانکہ انھیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ اگر یوم الجزاء کا آنا آفاق و انفس کے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا ظہور اس کائنات کے خالق کی صفات کا لازمی تقاضا ہے تو اس دلیل سے اس کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اس سے ڈرانے والے اس کو دکھا نہیں سکتے یا اس کا وقت نہیں بتا سکتے۔ اس قسم کا معارضہ ایک حقیقت کو ظن و تخمین سے جھٹلانے کے ہم معنی ہے اس وجہ سے قرآن نے ان لوگوں کے لیے 'خَرّٰصُوْنَ' کا لفظ استعمال فرمایا۔

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ (۱۳)

جوابِ منکرین کی ذہنیت کے مطابق

یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، انکار اور استہزاء کے لیے تھا، اس وجہ سے قرآن نے جواب ان کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر دیا۔ یہ امر واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح کے سوال کرتے تھے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ اس کے ظہور کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا علم نہ ہونے سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے وقت اور دن سے تعرض کرنے کے

بجائے اس صورتِ حال کی تصویر ان کے سامنے رکھ دی جس سے اس دن سابقہ پیش آئے گا کہ یہ جزا کا دن اس وقت ظہور میں آئے گا جب یہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ اس دن ان کا یہ حشر ہوتا ہے۔

لفظ 'فتن' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جلانے اور تپانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کسی کو امتحان میں ڈال کر جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں بھی۔ یہاں 'یُفْتَنُوْنَ' سے دو معنوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو جلانے اور تپانے کے معنی کی طرف، دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ جس آگ پر یہ لوگ تپائے جائیں گے یہ ان شہوات و زخارف کی آگ ہوگی جن سے وہ دنیا میں آزمائے گئے اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ جزا کے دن سے بے پروا ہوئے۔ آگے اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۴)

لفظ 'فتنة' یہاں میرے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے یعنی دنیا کی وہ چیزیں جو تمھیں فتنہ میں ڈالنے والی بنیں اور جن کے عشق میں مبتلا ہو کر تم آخرت سے برگشتہ ہوئے، اپنی اصلی شکل و صورت میں وہ تمھارے سامنے نمایاں ہو گئیں، اب ان کا مزا چکھو۔ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

۲۔ ابر و ہوا کے تصرفات میں جزا و سزا کی شہادت کے پہلو

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے اوپر کی قسموں اور ان کے مُقسم علیہ کے باہمی تعلق پر مزید غور کر لیجیے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ قسمیں درحقیقت اپنے مُقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سورہ کی تمہید میں دو چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اور ان قسموں کے بعد دو دعوے رکھے گئے ہیں۔ قسم ہواؤں کے عجائب تصرفات اور دھاریوں والے بادلوں کی کھائی گئی ہے اور دعویٰ ایک تو یہ کیا گیا ہے کہ جس عذاب کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے اس کو جھوٹ نہ سمجھو بلکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دوسرا یہ کہ جس روزِ جزاء و سزا سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ خیال کرو بلکہ وہ پیش آ کے رہے گا۔

اب دعوے اور دلیل میں مطابقت کے پہلوؤں پر غور کیجیے۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ 'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ' (بے شک جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے)۔ اس ٹکڑے کی شرح کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جس سے ہر رسول نے

اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر اس نے اپنی تکذیب کی روش نہ بدلی تو وہ لازماً عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجائے گی۔

اس دعوے پر ابر و ہوا کے تصرفات میں شہادت کا پہلو یہ ہے کہ کوئی قوم، خواہ کتنے ہی وسائل و ذرائع اور کتنی ہی قوت و جمعیت کی مالک ہو، وہ اپنے آپ کو خدا کی گرفت سے باہر نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے کوئی بڑی مورچہ بندی نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ اپنی ہواؤں اور اپنے بادلوں ہی کے ذریعہ سے جب چاہے اس کو فنا کر دے سکتا ہے۔ یہ جس طرح انسان کے وجود و بقا کے لیے ناگزیر ہیں اسی طرح اس کو فنا کر دینے کے لیے بھی بے پناہ ہیں۔ آگے تاریخ کی روشنی میں اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اسی سورہ میں قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ فرعون کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں دکھایا ہے کہ ان قوموں کو بھی اپنی قوت و شوکت پر بڑا ناز تھا۔ اس غرور میں انھوں نے اللہ کے رسولوں کی وعید کا مذاق اڑایا اور مطالبہ کیا کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ بالآخر وہ عذاب ان پر آدھمکا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ وہی ہوا جو زندگی کے لیے ناگزیر ہے ان کے لیے طوفانِ قیامت بن گئی اور وہی ابر جس کو دیکھ کر وہ خوشی سے ناچنے لگے کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف ۲۴) (یہ ہم کو سیراب کر دینے والا بادل ہے) ان کے لیے قہرِ الٰہی بن گیا۔ یہاں اس اشارے پر قناعت فرمائیے۔ آگے ان قوموں کی تباہی کی تفصیلات آرہی ہیں۔ وہاں قرآن نے دکھایا ہے کہ دنیا کی یہ عظیم قومیں اسی غرور میں مبتلا ہوئیں جس میں قریش مبتلا ہیں بالآخر ان کو اللہ تعالیٰ کی ہواؤں اور اس کے بادلوں ہی نے چشم زدن میں خس و خاشاک بنا کر اڑا دیا اور وہ ان کے مقابل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹک سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ لشکر آج بھی موجود اور اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ تاریخ ان کے کارناموں پر شاہد ہے!

اسی طرح دوسرے دعوے یعنی جزا اور سزا کے حق ہونے پر بھی یہ متعدد پہلوؤں سے شاہد ہیں۔

ہوا اور بادلوں کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کی جو شانیں ظاہر ہوتی ہیں ان سے قرآن نے جگہ جگہ متعدد بنیادی حقائق پر استدلال کیا ہے۔ ان کے اندر کوئی ایک نشانی نہیں ہے بلکہ گوناگوں نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ انسان ان پر غور کرے۔ اس باب میں ایک جامع آیت یہ ہے۔ فرمایا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	اور دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ	میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا پس
مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ	اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص	زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے
وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ	اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و
بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ	زمین کے درمیان مسخر ہیں ان لوگوں کے لیے
لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ٥	بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لینے
(البقرة : ۱۶۴)	والے ہیں۔

اس آیت میں ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے اور آخر میں فرمایا ہے کہ ان کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں توحید، معاد، رسالت ہر چیز پر ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان نشانیوں کا بالاجمال حوالہ دیں گے جن کا تعلق مُقسم علیہ یعنی جزاء و سزا سے ہے۔

جزاء و سزا سے متعلق ایک بہت بڑا شبہ منکروں نے یہ پیش کیا کہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا بعید از قیاس ہے۔ یہ شبہ پچھلی سورہ میں تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے۔ اس شبہے کی تردید میں قرآن نے جو دلیلیں پیش کی ہیں ان میں ایک نمایاں دلیل، جس کا ذکر گوناگوں اسلوبوں سے بار بار ہوا ہے، ابر و ہوا کے تصرفات ہی سے تعلق رکھنے والی ہے۔ معاد کو مستبعد سمجھنے والوں کو جگہ جگہ یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم آئے دن اس دنیا میں قدرت کا یہ کرشمہ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل چٹیل اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے اور اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی اور روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ دفعۃً کسی گوشے سے ہوا اٹھتی ہے، وہ بادلوں کو ہانک کر لاتی ہے، ان کو ایک خاص علاقے کے افق پر تہ بہ تہ جماتی ہے۔ پھر بادلوں سے مینہ برسنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے تمام علاقہ جل تھل ہو جاتا ہے اور چند دن بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہی رقبہ جو بالکل مردہ تھا زندگی سے معمور ہو کر لہلہانے لگتا ہے۔ جس قدرت کی یہ شانیں آئے دن دیکھتے ہو تمھارے مر کھپ جانے کے بعد اگر وہ تمھیں زندہ کرنا چاہے گی تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا!

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جگہ جگہ جزاء و سزا کے لازم ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ اس کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بھی بند ہوتا ہے اور زمین بھی بند ہوتی ہے۔ نہ آسمان پانی برساتا اور نہ

زمین کوئی چیز اگاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جانب سے سازگار ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو سیراب کر دیتی ہیں جس سے زمین اپنے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ تمھارے باغ لہلہا اٹھتے ہیں، تمھارے کھیت شاداب ہو جاتے ہیں، تمھارے میدان سبزہ سے بھر جاتے ہیں جن سے تم بھی بہرہ مند ہوتے ہو اور تمھارے جانور بھی۔ غور کرو کہ جس خدا نے تمھاری پرورش کا یہ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین اور اپنے ابر و ہوا سب کو تمھاری خدمت میں مصروف کر رکھا ہے کیا وہ تم کو اپنے باغوں اور چمنوں میں عیش کرنے کے لیے اسی طرح چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور شکرگزاری کی زندگی بسر کی اور کس نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کیا! ہر نعمت کا یہ حق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس شعور سے عاری صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فطرت کو بالکل مسخ کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ مکافات پر بھی شہادت پیش کی ہے کہ انھی ہواؤں اور بادلوں کو دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اور دوسری قوم کے لیے عذاب۔ انھی ہواؤں کے تصرف سے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور انھی کی گردش سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس خلق کا خالق دیّان ہے۔ وہ نیکوں اور بدوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا بلکہ ہر ایک کے ساتھ اپنے عدل اور اپنی رحمت کے تقاضوں کے مطابق معاملہ کرے گا۔ اوپر ہواؤں کی تعریف میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان ہواؤں کی یہ صفت گویا ان کے خالق کی صفت عدل کا مظہر ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایک دن ایسا لازماً آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ تقسیم امر فرمائے گا۔ جو نجات و رحمت کے حقدار ہوں گے ان کو رحمت و مغفرت سے نوازے گا اور جو عذاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔

۳۔ آگے آیات ۱۵-۱۹ کا مضمون

اوپر ان لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو جزا و سزا سے بالکل بے خبر ہو کر لا ابالیانہ زندگی گزارتے رہے۔ اگر کسی نے اس خوابِ غفلت سے ان کو بیدار کرنے کی کوشش کی تو اس کا منہ انھوں نے اس جواب سے بند کرنے کی کوشش کی کہ جزا و سزا کا کوئی دن ہے تو وہ کہاں ہے؟ اس کو لاؤ

اور دکھاؤ۔ اب ان کے مقابل میں ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو اس دن کو ایک حقیقت سمجھ کر برابر اس سے ڈرتے اور اس کے لیے تیاریوں میں مصروف رہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۱۹

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٥﴾ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ﴿١٦﴾ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۹

بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ پا رہے ہوں گے جو کچھ ان کے رب نے ان کو بخشا۔ بے شک وہ اس سے پہلے خوب کاروں میں تھے۔ وہ راتوں میں کم ہی سوتے تھے اور صبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا۔ ۱۵-۱۹

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۱۵)

تقویٰ کی روح

'مُتَّقِین' ایک جامع صفت ہے جو قرآن میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر زندگی گزارنے والے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً مراد وہی ہیں لیکن اوپر کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو آخرت اور جزا و سزا سے بےنیت لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے یہاں، تقابل کے اصول پر، اس صفت کے اندر جزاء و سزا کے اندیشہ کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس سے خاص طور پر وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک دن ہر قول و فعل کا حساب دینا اور حدود الٰہی سے ہر تجاوز کی سزا بھگتنی ہے۔ درحقیقت جزاء و سزا کا یہی اندیشہ تقویٰ کی اصل روح ہے۔ جس تقویٰ کے اندر یہ رُوح نہ ہو وہ محض نمائشی اور کاروباری تقویٰ ہے جس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نسبت فرمایا کہ بے شک یہ لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اوپر لاابالیانہ زندگی گزارنے والوں

کا انجام یہ بیان ہوا کہ وہ جن زخارف پر ریجھ کر آخرت سے بے پروا ہوئے انہی کی آگ پر تپائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب ان زخارف کا مزہ چکھو۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے چونکہ آخرت کے مقابل میں دنیا کے زخارف کو کوئی وقعت نہیں دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو باغوں اور چشموں میں اتارے گا۔ 'جنّت' اور 'عیون' دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آخرت کی نعمتوں کی جامع تعبیر ہیں۔ 'فِیْ' یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لوگ جنت کی نعمتوں میں بالکل گھرے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لیے ہر طرف نعمت ہی نعمت ہوگی۔

اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰہُمْ رَبُّہُمْ ط اِنَّہُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ (۱۶)

جنھوں نے دنیا میں خدا کی پابندیوں کا احترام کیا ان کے لیے آخرت میں آزادی

یہ ان نعمتوں سے ان کے آزادانہ متمتع ہونے کی تصویر ہے۔ 'اٰخِذِیْنَ' حال واقع ہے اس وجہ سے میرے نزدیک یہ صورتِ حال کی تصویر کا فائدہ دے رہا ہے یعنی وہ دمبدم وہ کچھ پا رہے ہوں گے جو ان کے رب نے ان کو عطا فرمایا۔ 'مَآ اٰتٰہُمْ رَبُّہُمْ' میں صیغۂ ماضی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جہاں تک دیے جانے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ اور وعدہ تو ان کے رب نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے، اس بات میں ان کو کسی نئے فیصلے کا انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اب صرف ان نعمتوں سے متمتع و محظوظ ہونے کا دور ہوگا۔ وہ جس چیز کے خواہشمند ہوں گے اپنے رب کے بخشے ہوئے غیر فانی ذخائر میں سے لیں گے اور جتنا چاہیں گے اور جب چاہیں گے لیں گے۔ ان کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ انھوں نے دنیا میں اپنے رب کی عائد کردہ پابندیوں کا احترام کیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ ان کو تمام نعمتیں بخش کر آزاد چھوڑ دے گا کہ اب ان سے جس طرح چاہو متمتع ہو، تم پر کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔

تقویٰ کے اندر احسان کی روح

'اِنَّہُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ'۔ یہ ان کے اوپر اس بے پایاں انعام کی علت بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے دنیا کی زندگی میں 'محسنین' میں رہے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان پر یہ انعام فرمائے گا۔ 'محسنین' کا ترجمہ ہم نے اس کتاب میں جگہ جگہ 'خوب کار' کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہ صفت صرف ان لوگوں کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کے اندر جزاء و سزا کا عقیدہ راسخ ہو۔ یہ عقیدہ جن کے اندر راسخ ہوتا ہے وہ ہر کام اس طرح کرتے ہیں گویا وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو بہرحال ان کو دیکھ رہا ہے۔

'متقین' کے لیے 'محسنین' کا لفظ استعمال کر کے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ جزاء و سزا پر یقین رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کا تقویٰ محض ظاہر دارانہ تقویٰ

نہیں تھا بلکہ اس کے اندر احسان کی روح تھی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تقویٰ اللہ تعالیٰ کے
ہاں قدر و قیمت رکھتا ہے اور یہ جزا و سزا کے راسخ اعتقاد سے پیدا ہوتا ہے۔

تقویٰ اور احسان کی بعض علامات

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۱۷)

یہ ان کے تقویٰ اور احسان کی علامات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ راتوں کو کم سوتے تھے
یعنی وہ بے فکروں اور لا اُبالیوں کی طرح اپنی راتیں عیش کے بستروں میں نہیں بلکہ روزِ حساب کی تیاریوں
میں گزارتے تھے، ان کی راتوں کا زیادہ حصہ خدا کے آگے سجود و قیام اور ذکر و فکر میں بسر ہوتا۔
یہ فکرِ آخرت کا ایک لازمی اثر بیان ہوا ہے۔ جن کو آخرت کی فکر ہوتی ہے وہ گھوڑے بیچ کر
نہیں سوتے۔ ان کو یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ ممکن ہے یہ زندگی کی آخری رات ہو اس وجہ سے
ان کی نیند کھٹکے کی نیند ہوتی ہے۔ وہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں
کی معافی مانگتے ہیں۔ اسی طرح کے لوگوں کا حال دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: تَتَجَافٰى
جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (السجدۃ: ۱۶)
(ان کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، بیم و امید کے ساتھ، اور
جو روزی ہم نے ان کو بخشی ہے اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں)۔

اس جملہ کی تالیف کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، لیکن مطلب ہر شکل میں ایک ہی ہوگا۔ ایک
شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَلِيْلًا هُجُوْعُهُمْ (ان کا شب میں سونا تھوڑا تھا) دوسری شکل یہ
ہو سکتی ہے کہ كَانُوْا يَهْجَعُوْنَ قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ (رات میں وہ تھوڑا سوتے تھے) الغرض نحوی تالیف
کی صورتیں تو مختلف ہو سکتی ہیں لیکن مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم اس
سے مختلف لیا ہے، لیکن ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی۔ اس
وجہ سے اس سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔

'هُجُوْع' کے معنی سونے کے ہیں اور اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہلِ تقویٰ اور
اہلِ احسان کی یہ خاص علامت ہے کہ وہ رات میں کم سوتے ہیں، زیادہ حصہ اس کا وہ اللہ تعالیٰ کی
یاد، ذکر و فکر اور توبہ و استغفار میں گزارتے ہیں۔ یہی بات قرآن کے نظائر سے بھی نکلتی ہے، مثلاً
يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (المزمل: ۱-۲) (اے چادر میں لپٹنے والے، رات میں
قیام کر، بجز تھوڑے حصہ کے) اس کے بعد مقدار کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ
مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ (المزمل: ۳-۴) (آدھی رات قیام کر یا اس سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ اضافہ
کر لے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ شب بیداری ان اہلِ تقویٰ کی خاص علامات میں سے ہے

جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس مرتبہ کے حصول کی تمنا رکھتے ہیں ان کے لیے بھی اس کا اہتمام لازمی ہے۔ رہے ہما شما جو ان عقبات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کے لیے بعض رخصتیں ہیں جن کی وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مزمّل کی تفسیر میں آئے گی۔

وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (۱۸)

پَو پھٹنے سے کچھ پہلے کا وقت سحر کا وقت ہے۔ یہ ان کی تمام شب خیزی اور تمام رکوع و سجود کی غایت بیان ہوئی ہے۔ یعنی آخری کام ان کا یہ ہوتا ہے کہ سحر کے وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں کہ رب کریم جزا و سزا کے دن ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور ان کو اپنے دامن عفو و کرم میں جگہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ نہ تو اس بات کے متوقع ہوتے کہ اس شب بیداری اور رکوع و سجود کے صلہ میں ان کو حضور و شہود کا کوئی بڑا مقام حاصل ہوگا اور نہ وہ اس طرح کی کسی چیز کے طلبگار ہی بنتے بلکہ ان کی طلب صرف یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ ان کی شب کی تمام عبادت و ریاضت کا اختتام استغفار پر ہوتا ہے۔

اسلام میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصد

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلام میں عبادت و ریاضت کا مقصود دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصود کشف، مشاہدہ، تجلّیِ ذات، ذات خداوندی میں انضمام اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں ہیں۔ جوگی، سنیاسی اور راہب جو ریاضتیں کرتے ہیں ان سے ان کے پیش نظر یہی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اسلام میں ریاضت و عبادت کا اصل مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز اگر عبادت کے مقصد کی حیثیت حاصل کر لے تو اسلام میں اس عبادت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہندوؤں کے فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں صوفیوں کے ایک طبقہ نے بھی عبادت و ریاضت کا مطمح نظر انہی چیزوں کو بنا لیا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا اس وجہ سے ان کے تزکیۂ نفس کی ساری جدوجہد نے ایک بالکل ہی مختلف راہ اختیار کر لی۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کتاب 'تزکیۂ نفس' میں اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

استغفار کے لیے سازگار ساعت

قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ استغفار کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت آخر شب اور سحر کا وقت ہے۔ اس وقت، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت استغفار کرنے والوں کے انتظار میں ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت سے فائدہ اٹھانے کا حوصلہ صرف طالب صادق ہی کر سکتے ہیں۔ ہر بوالہوس یہ حوصلہ نہیں کر سکتا کہ رات رکوع و سجود میں گزارے۔ پھر صبح کو مغفرت کا سائل بن کر اپنے رب کے دروازے پر حاضر ہو۔ اللہ کے جو بندے یہ حوصلہ دکھاتے

ہیں ان کا یہ حوصلہ ہی ان کے اخلاص کا ضامن ہوتا ہے، اس وجہ سے اللہ کی رحمت ان کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہے۔ اصل جالب رحمت تو بندے کا خلوص ہے۔ جب یہ چیز موجود ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس فضل و رحمت کی کیا کمی ہے!

وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (۱۹)

محسنین خدا کے حقوق کی طرح بندوں کے حقوق بھی پہچانتے ہیں

یعنی یہ 'محسنین' جس طرح خدا کا حق پہچاننے والے تھے اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے والے تھے۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنے نفس ہی کا حق نہیں، بلکہ سائلوں اور محروموں کا حق بھی سمجھتے تھے اور اس کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس طرح اہل حق کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے کہ ان کے پاس جو مال ہے وہ تنہا انہی کا ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ خدا نے اگر ان کی ناگزیر ضروریات سے ان کو زیادہ دیا ہے تو یہ دوسروں کا حق ہے جو ان کی امانت میں دیا گیا ہے۔ اس امانت کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے مستحقین کو ادا کی جائے۔ اگر یہ امانت ادا نہ کی گئی تو یہ خیانت ہوگی اور ہر خیانت کی خدا کے ہاں پرسش ہونی ہے۔

'محروم' سے کون مراد ہیں؟

'محروم' سے مراد یوں تو ہر وہ شخص ہے جو مال سے محروم ہو لیکن اس کے مفہوم میں وہ لوگ خاص طور پر شامل ہیں جو پہلے صاحب مال رہے ہوں بعد میں کسی افتاد نے ان کو محروم بنا دیا ہو۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن میں لفظ 'غارمین' استعمال ہوا ہے اور ان کو صدقات کے مستحقین میں شامل کیا گیا ہے۔ محرومین میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور پر جو لوگ کبھی صاحب مال رہ چکے ہوں ان کو اپنی خودداری بہت عزیز ہوتی ہے۔ یہاں یہ لفظ چونکہ 'سائل' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ محتاج ہیں جو سوال نہیں کرتے۔ اس طرح کے خودداروں کی خودداری کی لاج رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اس طرح کے محتاجوں کی مدد کے لیے مال رکھنے والوں کو خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ مال داروں کے دروازوں پر سائل بن کر حاضر ہوں گے۔ سورۂ بقرہ میں اس طرح کے خودداروں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ	یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کی
سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ	راہ میں معروف ہیں، تلاشِ معاش کی جدوجہد
ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُہُمُ	میں زمین میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے
الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ	حال سے ناواقف ان کی خودداری کے سبب
تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا	سے ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ تم ان کو چہرے بشرے

يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ (البقرۃ: ۲۷۳) — سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔

۵۔ آگے آیات ۲۰-۲۳ کا مضمون

آگے کی آیات میں سورہ کے اصل عمود یعنی جزا و سزا کے مضمون کو ازسرِ نو لیا ہے۔ اوپر صرف ابر و ہوا کے تصرفات سے استدلال تھا آگے آفاق و انفس کے ان تمام دلائل کی طرف اشارہ فرمایا جو اس کائنات کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں بشرطیکہ لوگ ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں اور ان سے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان پر یقین کریں۔ فرمایا۔

آیات ۲۰-۲۳

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾

ع ۱ / ۲۳ / ۱۸

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۳

اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم، یہ بات شدنی ہے، جس طرح تم بول دیتے ہو۔ ۲۰-۲۳

۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۲۰)

آسمان و زمین اور انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر جزا و سزا کی جو نشانیاں مذکور ہوئی ہیں اس آیت کا عطف انہی پر ہے۔ ابر و ہوا کی نشانیوں کا تعلق زمین و آسمان کے درمیان کی نشانیوں سے ہے۔ اب آگے آسمان و زمین اور خود انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور اقرب فالاقرب کے اصول پر سب سے

پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا، اس کے بعد انفس کی نشانیوں کی طرف، پھر آسمان کی نشانیوں کی طرف۔ یوں تو ان چیزوں سے قرآن نے اپنی دعوت کے تمام بنیادی حقائق ـــــ توحید، معاد، رسالت ـــــ پر استدلال کیا ہے جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے لیکن یہاں سورہ کے عمود کے تقاضے سے صرف معاد اور جزاء و سزا کی نشانیوں ہی کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے ہم بھی اپنی بحث صرف جزاء و سزا کے دلائل ہی تک محدود رکھیں گے، اور جس طرح قرآن نے اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں گے اس لیے کہ یہ تمام بحثیں پچھلی سورتوں میں پوری تفصیل سے گزر چکی ہیں۔

سب سے پہلے سورۂ نبا کی مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے جن میں قرآن نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی مختلف چیزوں سے معاد اور جزاء و سزا پر استدلال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ (النبا: ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو ایک گہوارہ نہیں بنایا؟ اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں گاڑیں؟ اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ اور تمہاری نیند کو دافعِ کلفت نہیں بنایا؟ اور رات کو پردہ پوش نہیں بنایا؟ اور دن کو معاش کا وقت نہیں ٹھہرایا؟ اور تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس میں ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور بدلیوں سے دھڑا دھڑ برستا پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے غلّے اور نباتات اور گھنے باغ اگائیں؟ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے!!

ان آیات میں اپنی قدرت، رحمت اور ربوبیت کے ان گوناگوں آثار سے، جو آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود ہیں اور جن کا مشاہدہ ہر شخص بادنیٰ توجہ کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت ثابت کی ہے کہ یہ کارخانہ بے مقصد اور عبث نہیں ہو سکتا اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ اس دلیل کے ہر پہلو کی وضاحت سابق سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم مختصر الفاظ میں زمین کی چند نشانیوں کی طرف، جو جزاء و سزا پر دلیل ہیں، اشارہ کریں گے۔

ـــــ امکانِ معاد پر قرآن نے زمین کے آثار سے یوں دلیل قائم کی ہے کہ دیکھتے ہو کر زمین بالکل مردہ

[illegible]

اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی و روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی گھٹا بھیجتا ہے اور بارش کا ایک ہی چھینٹا اس کو زندگی اور شادابی سے معمور کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان برابر دکھا رہا ہے وہ لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے گا تو کیا نہیں کر سکے گا۔

— اس زمین میں رب کریم نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اہتمام کر رکھے ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ سوال کیا ہے کہ کیا جس رب کریم نے تمہاری پرورش کے لیے یہ سامان کر رکھا ہے وہ تمھیں اس زمین میں یوں ہی مطلق العنان چھوڑے رکھے گا اور کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ ان لوگوں سے باز پرس کرے جنھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کا ذریعہ بنایا ہو اور ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا ہو! کیا تم ایسے حکیم و کریم پروردگار کے متعلق یہ گمان رکھتے ہو کہ وہ کوئی کھلنڈرا ہے جس کی نگاہوں میں نیکی و بدی یکساں ہے اور کیا تم اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو کہ تمھارے رب کی یہ بے پایاں نعمتیں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتیں!

— اس زمین میں قوموں کی تباہی کے جو آثار ہیں قرآن نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ یہ قومیں اپنے طغیان و تمرد کے باعث اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ ان کی تباہی کے بعد ان کے آثار اس نے اس لیے محفوظ رکھے ہیں کہ ان کے بعد آنے والی قومیں ان سے سبق حاصل کریں کہ اس کائنات کا خالق اس دنیا کے خیر و شر سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ جب کسی قوم کا طغیان حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو وہ لازماً اس کے قانونِ مکافات سے دوچار ہوتی ہے۔ قوموں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ایک ایسا دن بھی وہ لائے گا جس میں اس کا ہمہ گیر عدل ظاہر ہوگا۔ ہر شریر اپنی شرارت کی سزا بھگتے گا اور ہر نیکوکار اپنی نیکی کا بھرپور صلہ پائے گا۔

یہ زمین کے چند نہایت واضح آثار کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے جو جزا و سزا پر دلیل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی گوناگوں نشانیاں ہیں جن کی طرف قرآن نے توجہ دلائی اور ہم نے اس کتاب میں ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان کے اعادے میں طوالت ہوگی۔

حقائق کو ماننے کا حوصلہ نہ ہو تو دلائل کام نہیں دیتے

لِلْمُوْقِنِیْنَ، یعنی زمین میں نشانیوں کی تو کمی نہیں ہے۔ قدم قدم پر نشانیاں موجود ہیں۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں، غور کرنے والی عقلیں اور غور و فکر کے نتائج پر یقین کرنے والے دل ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقت کو قبول کرنے کے لیے مجرد یہ چیز کافی نہیں ہے کہ اس کے دلائل موجود ہیں بلکہ اس کے لیے یہ چیز بھی ضروری ہے کہ مخاطب کے اندر دلائل پر غور کرنے

اوران کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر آدمی کے اندر یہ ارادہ نہ ہو تو وہ واضح سے واضح حقیقت کو جھٹلا دینے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اس دنیا میں حقائق کی تکذیب صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ ان کے حق میں دلائل نہیں تھے یا ان کو پیش کرنے والے موجود نہیں تھے بلکہ اکثر و بیشتر نہ ماننے کی خواہش ان کی تکذیب کی محرک ہوئی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۱)

انفس کے بعض دلائل کی طرف اشارہ

یہ روز جزا و سزا پر انفس کے دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن نے جس طرح آفاق سے اپنی دعوت کے تمام بنیادی اجزا پر استدلال کیا ہے۔ اسی طرح انفس سے بھی تمام اصولی مطالب پر دلیل قائم کی ہے جن کی وضاحت اس کتاب میں ان کے محل میں ہم کرتے آرہے ہیں۔ یہاں ہم بالاجمال صرف جزاء و سزا سے متعلق چند باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

— قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا حقیر پانی کی ایک بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر، ایک بھلا چنگا انسان بنا کھڑا کرتا ہے اور اس کو گوناگوں ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے آراستہ کر دیتا ہے کیا اس کے لیے یہ ناممکن خیال کرتے ہو کہ تمھارے مرکھپ جانے کے بعد تم کو از سر نو زندہ کر کے اٹھائے اور تمھارے تمام اعمال و اقوال کا حساب کرے! جب پہلی بار تمھارا پیدا کیا جانا اس کے لیے ناممکن نہیں ہوا تو دوبارہ یہی کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا؟ اسی ضمن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ہر آدمی ہر روز اپنے اندر زندگی، موت، برزخ اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے مشاہدات کو یوں ہی نہ گزر جانے دے بلکہ ان پر غور کرنے کی عادت بھی ڈالے۔

انسان کے مرتبۂ خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے آگے اس کی پیشی ہو

— انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری قوتوں اور قابلیتوں سے اس کو مسلح کیا ہے، ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ایک خاص دائرہ میں اختیار و ارادہ کی امانت کا حامل ہو کر آیا ہے جس کی بنا پر خدا نے اس کو اپنی خلافت کے مرتبۂ بلند پر سرفراز فرمایا ہے۔ اس امانت و خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ایک دن وہ اپنے رب کے آگے پیش ہو تاکہ جس نے اس امانت و خلافت کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا ابدی انعام حاصل کرے اور جس نے اس امانت میں خیانت اور خلافت پا کر بغاوت کا ارتکاب کیا ہو وہ اس کی ابدی سزا بھگتے۔ گویا جزاء و سزا انسان کے مرتبۂ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں بھی بیان ہوئی ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اس کو نہایت

خوبصورت تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے۔

انسان کے اندر نفس لوّامہ کا وجود قیامت کے وجود کی دلیل ہے

— تیسری اہم حقیقت جو سورۂ قیامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ واضح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نفسِ لوّامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس کو جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت کرتا ہے۔ اسی نفسِ لوّامہ کی قسم کھا کر جزاء و سزا کے حق ہونے پر اس کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اگر انسان کو وجود میں لانے والا نیکی پر انعام اور بدی پر سزا دینے والا نہ ہوتا تو انسان کے اندر وہ اس نفسِ لوّامہ کو کیوں ودیعت فرماتا جو اس کو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رکھے؟ اس کا ودیعت کیا جانا تو اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس مجموعی کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو روزِ قیامت مقرر کر رکھا ہے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہر انسان کے سینے میں رکھ دے جو اس کو برابر اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا رہے کہ جس خدا نے اس کو وجود بخشا ہے وہ اس کی نیکی اور بدی سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ جزاء دسزا دینے والا ہے۔ گویا یہ انسان کے اندر ایک چھوٹی سی عدالت اس عدالتِ کبریٰ کی یاد دہانی کے لیے ہے جو قیامت کے دن قائم ہوگی۔ اسی بنا پر انسان کو عالمِ اصغر کہا گیا ہے اس لیے کہ اس پورے عالم کا ایک عکس اس کے آئینہ میں موجود ہے۔

سورۂ قیامہ میں فرمایا گیا ہے کہ جزاء و سزا کی شہادت ہر آدمی خود اپنے اندر پا رہا ہے اگرچہ وہ اس کی تکذیب کے لیے کتنے ہی بہانے پیدا کرے، 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ' (القیامۃ: ۱۴-۱۵) اسی طرح اسی سورہ میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کی عدالت کے سامنے جرم کرتا ہے، 'بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ' (القیامۃ: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے سامنے شرارت کرے) اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ خدا کی ایک چھوٹی سی عدالت اس کے ضمیر کے اندر ہی موجود ہے اس وجہ سے جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے وہ درحقیقت اسی عدالت کے سامنے کرتا ہے اور یہ اس کی ایک کھلی ہوئی جسارت ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'نفسِ لوّامہ' انسان کو متنبہ کرنے کا فرض اس وقت تک برابر انجام دیتا رہتا ہے جب تک انسان اس کی مسلسل خلاف ورزی سے اس کو بالکل مردہ نہ بنا دے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

'اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'۔ انسان کا نفس چونکہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ کیا اتنی قریب کی نشانیاں بھی تم کو نظر نہیں آ رہی ہیں! یعنی اگر زمین کے اطراف و اکناف تمہارے احاطے سے باہر ہیں، اگر آسمان تمہاری دسترس سے بعید ہے تو کیا تمہارا نفس بھی تم سے دور ہے

کہ تم اس کے اندر جھانک کر ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے!

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲)

آسمان کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اب یہ آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھو اس کے اندر تمہارا رزق بھی ہے اور وہ عذاب بھی ہے جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے۔ 'رزق' سے مراد بارش ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ سبب بول کر مراد اس سے مسبّب کو لیا ہے جو عربیت کا معروف اسلوب ہے۔ 'وَمَا تُوعَدُونَ' سے، جیسا کہ آیت ۵ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، وہ عذاب مراد ہے جس سے لوگوں کو پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض کا حوالہ آگے اسی سورہ میں آ رہا ہے۔

یعنی یہ آسمان تو آئے دن تمہارے سامنے جزا و سزا کی شہادت دیتا رہتا ہے اسی کے اندر سے اللہ تعالیٰ تمہارا رزق بھی برساتا ہے اور اسی کے اندر سے نافرمانی و سرکشی کرنے والوں پر جب چاہے عذاب بھی برسا دیتا ہے۔ نہ رحمت کے لیے اسے کوئی الگ اہتمام کرنا پڑتا اور نہ نقمت کے لیے کوئی الگ توپ نصب کرنی پڑتی۔ تو جس کا یہ جمال و جلال برابر دیکھتے ہو اس سے کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ جب چاہے اسی چیز کو تمہاری تباہی کا ذریعہ بنا دے جو تمہاری زندگی کا ذریعہ ہے! پھر جس کی رحمت و نقمت کی یہ شانیں اس دنیا میں دیکھ رہے ہو آخر یہ کیوں یقین نہیں کرتے کہ وہ خیر و شر کے معاملے میں بے تعلق یا غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ وہ بروں کو لازماً سزا دے گا اور نیکوکاروں کو لازماً صلہ دے گا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (۲۳)

خلاصۂ بحث

اب یہ ان تمام نشانیوں کو سمیٹ دیا اور آسمان و زمین دونوں کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس روزِ جزا و سزا کی تم کو یاددہانی کی جا رہی ہے اور پیغمبر کی تکذیب کے جس نتیجہ سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ اس میں خدا کو ذرا بھی مشکل نہیں پیش آئے گی۔ جس طرح تمہارے لیے زبان سے کوئی لفظ بول دینا نہایت آسان ہے اسی طرح خدا کے لیے یہ سب کچھ کر دینا نہایت آسان ہے۔ اس کے سارے کام اس کے کلمۂ 'کُن' سے ہو جاتے ہیں۔

'اِنَّهٗ' میں ضمیر کا مرجع وہی مقسم علیہ ہے جو اوپر گزر چکا ہے یعنی 'اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝' اس کا ذکر اوپر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کی طرف اشارہ کے لیے ضمیر کافی ہوئی۔ پہلے آسمان و زمین کی چند نشانیوں کا حوالہ دے کر اس کی قسم کھائی پھر پورے آسمان و زمین کے رب کی قسم کھا کر وہی بات دُہرا دی جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جس طرح ہر مصنوع سے اس کے صانع کے مزاج و مذاق کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح آسمان و زمین کی نشانیوں سے ان کے

خالق کی صفات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جزا و سزا دینے والا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین میں یہ چیز کہاں سے نمایاں ہوتی؟

قیامت کے وقوع کی وضاحت ایک مثال سے

'اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ'۔ لفظ 'حق' کے اندر دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جزا و سزا ایک حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ شدنی ہے، اس کے وقوع کو کوئی ناممکن نہ خیال کرے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو خدا اس کو پلک جھپکتے سامنے کر دے گا۔ اس کا ایک حقیقت ہونا اوپر کے دلائل آفاق و انفس سے واضح ہو چکا ہے۔ اب یہ اس کے وقوع کو ایک تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ یہ کام آسمان و زمین کے رب کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جب اس نے آسمان و زمین پیدا کر دیے اور اس کام میں اس کو ذرا مشکل پیش نہیں آئی تو لوگوں کو حساب کتاب کے لیے دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہو گا؛ جس طرح تمھارے لیے ایک لفظ کو بول دینا آسان ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بڑے سے بڑے کام کو کر دینا آسان ہے۔ اس کو کسی کام کے لیے کوئی اہتمام یا سر و سامان نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ ہر کام اپنے 'کلمۂ کُن' سے چشم زدن میں کر دیتا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (النحل: ۴۰)	جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا بس یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰي ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰسٓ: ۸۱-۸۲)	کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہو گی کہ ان کے مثل پیدا کر دے! ہاں، وہ اس بات پر قادر ہے۔ وہ بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اس کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات میں یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا کو دوبارہ پیدا کر دینا تو اس کے لیے اول بار پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ	اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے اس سے بھی

عَلَيْهِ ط (الروم: ۲۷) آسان ہے۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ تمثیل بھی ہمارے سمجھانے کے لیے محض ایک تمثیل ہے ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک لفظ کو بولنا بھی اتنا آسان نہیں ہے جتنا اللہ تعالیٰ کے لیے سارے جہان کو پیدا کر دینا۔ ہم ایک لفظ بولنے کے لیے نہ جانے کتنے ادوات و آلات کے محتاج ہیں جو سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن میں بعض جگہ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ، پلک جھپکنے کی تمثیل بھی آئی ہے۔ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (القمر: ۵۰) (ہمارا حکم تو بس پلک جھپکنے کی طرح ہے) یہ بھی ایک تمثیل ہی ہے، جس سے ہمیں اس کے اختیار مطلق کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ان تمثیلات و تشبیہات سے متعلق وہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جو سورۂ آلِ عمران میں بیان ہوئی ہے۔

استاذ امامؒ کا ایک نکتہ

یہاں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ اوپر زمین، نفس اور آسمان کی جن نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ان کے باہمی نظم کی وضاحت اپنی تفسیر میں مولاناؒ نے یوں فرمائی ہے[1]:

"اس جامع کلام کے اندر جو خوبصورت ترتیب پائی جاتی ہے اور اقرب فالاقرب کا جو اصول اس میں ملحوظ ہے، پچھلے مباحث سے بڑی حد تک اس کی وضاحت ہو گئی ہے لیکن اس پر مزید غور کیجیے تو ایک اور لطیف نکتہ بھی سامنے آئے گا۔"

"اس ٹکڑے میں وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ، سے لے کر وَمَا تُوْعَدُوْنَ، تک پہلے زمین کا ذکر آیا ہے پھر نفس کا پھر آسمان کا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نفس ایک ایسی چیز ہے جو زمین اور آسمان دونوں کے درمیان ہے اور اس کے اندر دو پہلو ہیں۔ ایک مادی دوسرا روحانی۔ ایک پہلو سے یہ زمین کی طرف رجحان رکھتا ہے، دوسرے پہلو سے آسمان کی طرف۔ اس کے بعد ان تینوں کے اندر جو نشانیاں پائی جاتی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (آسمان اور زمین کے رب کی قسم، یہ حق ہے) فرما کر اس جامع دلیل سے پردہ اٹھایا ہے جو انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا و سزا کی اصل دلیل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی پروردگاری کی دلیل۔ پھر مِثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (جس طرح تم بولتے ہو) کی تمثیل کے ذریعہ سے اس استدلال کو تقویت پہنچائی ہے اور یہ تمثیل اسی نفس کی صفات سے ماخوذ ہے جو ایک عالم اصغر ہونے کے پہلو سے تمام زمین و آسمان کا ایک آئینہ ہے۔ یہ گویا اوپر والی بات وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کی طرف اشارہ ہوا۔"

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

۷۔ آگے آیات ۲۴ - ۴۶ کا مضمون

آگے قرآن نے انہی دعاوی کے حق میں، جو اوپر مذکور ہوئے، تاریخ کی شہادت پیش کی ہے اور قرآن کا یہ عام اصول ہے کہ وہ عقلی و انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو تاریخی شواہد بھی پیش کرتا ہے تاکہ مخاطب کے سامنے بات اچھی طرح مُبرہن بھی ہو جائے اور اگر دلوں کے اندر اثر پذیری کی کچھ رمق ہو تو ان سے لوگ عبرت بھی حاصل کریں۔ ان واقعات پر غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ ان میں تین پہلو ملحوظ ہیں۔

— ایک یہ کہ جن قوموں کی ہلاکت بیان ہوئی ہے ان کی تباہی میں ابر و ہوا کے تصرفات کو خاص دخل رہا ہے۔ اس پہلو سے یہ واقعات گویا ان قسموں کی تصدیق ہیں جو اوپر کھائی گئی ہیں۔

— دوسرا یہ کہ ان میں جزا کے دونوں پہلو نمایاں ہوئے ہیں، رحمت بھی اور نقمت بھی۔ ایک ہی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک قوم کے لیے عذاب بن گئی اور دوسری قوم کے لیے ذریعۂ نجات۔

— تیسرا یہ کہ اللہ کی گرفت بالکل بے پناہ ہے۔ کوئی قوم کتنی ہی زور آور ہو لیکن اللہ تعالیٰ جب اس کو فنا کرنا چاہتا ہے تو چشم زدن میں فنا کر دیتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴ - ۴۶

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾

فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ كَانَ فِيۡهَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدۡنَا فِيۡهَا غَيۡرَ بَيۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكۡنَا فِيۡهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ﴿۳۷﴾ وَفِىۡ مُوۡسٰٓى اِذۡ اَرۡسَلۡنٰهُ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكۡنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذۡنٰهُ وَجُنُوۡدَهٗ فَنَبَذۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ وَهُوَ مُلِيۡمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِىۡ عَادٍ اِذۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الرِّيۡحَ الۡعَقِيۡمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنۡ شَىۡءٍ اَتَتۡ عَلَيۡهِ اِلَّا جَعَلَتۡهُ كَالرَّمِيۡمِ ﴿۴۲﴾ وَفِىۡ ثَمُوۡدَ اِذۡ قِيۡلَ لَهُمۡ تَمَتَّعُوۡا حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوۡا مُنۡتَصِرِيۡنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۴۶﴾

ع ۲ ۳

ترجمۂ آیات ۴۶-۲۴

کیا تمھیں ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی! جب وہ اس کے پاس آئے تو انھوں نے السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی سلام سے جواب دیا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ہیں! پھر وہ نظر بچا کر اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ان کے لیے فربہ بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لایا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر بولا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں! تو اس نے ان سے ایک قسم کا اندیشہ محسوس کیا۔ انھوں نے اس سے کہا، تم اندیشہ ناک نہ ہو اور اس کو ایک ذی علم فرزند کی خوش خبری دی۔ پھر اس کی بیوی حیران ہو کر بڑھی۔ اس نے اپنا ماتھا ٹھونکا اور بولی کہ کیا ایک

بڑھیا، بانجھ اب جنے گی! وہ بولے کہ ایسا ہی فرمایا ہے تیرے رب نے۔ وہ بڑا ہی حکیم و علیم ہے۔ اس نے پوچھا، اے فرستادو، اس وقت آپ کے سامنے مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کے اوپر سنگِ گِل کی بارش کر دیں جو نشان لگائے ہوئے ہیں تیرے رب کے پاس ان لوگوں کے لیے جو حدود سے آگے بڑھ جانے والے ہیں۔ پھر وہاں جتنے اہلِ ایمان تھے ان کو ہم نے نکال لیا۔ تو وہاں ہم نے بجز ایک گھر کے کسی کو مُسلم نہیں پایا اور ہم نے اس میں ایک بڑی نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ۲۸-۳۷

اور موسیٰ کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے اس کو فرعون کے پاس بھیجا ایک واضح سند کے ساتھ تو اس نے گھمنڈ کے ساتھ منہ موڑا اور بولا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے یا خبطی۔ تو ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا اور ان کو پھینک دیا سمندر میں۔ اور اس کے لیے وہ خود سزاوارِ ملامت تھا۔ ۳۸-۴۰

اور عاد کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے ان پر بادِ خشک چلادی۔ وہ جس چیز پر سے بھی گزرتی ریزہ ریزہ کر کے چھوڑتی۔ ۴۱-۴۲

اور ثمود کے واقعہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ان سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت کے لیے اور عیش کر لو۔ تو انھوں نے سرکشی سے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ان کو پکڑ لیا کڑک نے اور وہ دیکھتے رہے۔ پھر نہ وہ اٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔ ۴۳-۴۵

اور قوم نوح کو بھی ہم نے اس سے پہلے پکڑا۔ یہ لوگ بھی نافرمان تھے۔ ۴۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۴)

تاریخی سرگزشتوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نقمت کی شہادت

اوپر آیت 'وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ' کے تحت ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں رحمت اور نقمت دونوں ہی ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو جس کے لیے چاہے رحمت بنا دے اور اسی چیز کو جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ آسمان سے بارش ہوتی ہے جو اہل زمین کے لیے ایک عظیم رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آگے کی تاریخی سرگزشتوں کی تمہید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ سے اٹھائی ہے جس میں قوم لوط کے انجام سے پہلے یہ دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو فرشتے قوم لوط کے لیے قہر الٰہی لے کر آئے وہی فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر پہنچے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ خطاب انہی مکذبین سے ہے جن پر اس سورہ میں حجت تمام کی جا رہی ہے۔ جماعت کو جب واحد کے صیغہ سے خطاب ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ استفہامیہ اسلوب بیان بھی بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ آگے جو بات کہی جا رہی ہے وہ اہمیت رکھنے والی ہے، اس کو ہر شخص سنے اور گوش دل سے سنے۔

لفظ 'ضَيْف' واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کی صفت 'مُكْرَمِيْنَ' آئی ہے۔ لفظ 'مکرمین' سے اشارہ اس آؤ بھگت، خیر مقدم، تواضع اور ضیافت کی طرف ہے جس کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مہمانوں کے لیے فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ ان مہمانوں کی شرافت و وجاہت ان کی شکل و صورت ہی سے ظاہر تھی۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان کی ضیافت کی تیاریوں میں لگ گئے اور انتہائی عجلت میں جو بہتر سے بہتر سامان ضیافت ممکن تھا، وہ انھوں نے کر ڈالا۔ لیکن یہی مہمان جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو ان کی قوم ان مہمانوں کی بے حرمتی کے درپے ہو گئی اور حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے خود اپنی حرمت

داؤ پر لگا دینی پڑی۔ بالآخر ان مہمانوں کو اپنا اصلی رخ ان نابہنجاروں کے لیے بے نقاب کرنا پڑا اور انھوں نے اس پوری قوم کا بیڑا غرق کر دیا۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْہِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ (۲۵)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پاس آنے والے مہمان

یعنی ان مہمانوں نے شرفاء اور صالحین کے طریقہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان کا جواب سلام سے دیا۔ ان کے اس سلام سے اجنبیت کا پردہ تو ایک حد تک اٹھ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اطمینان ہو گیا کہ شریف اور صالح مہمان ہیں لیکن ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس مقصد سے آئے ہیں؟ یہ تو بالکل اجنبی لوگ ہیں!

'قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ' کے الفاظ انھوں نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے دل میں کہے۔ دل میں سوال پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ اس علاقے میں اول تو شرفاء و صالحین کی تعداد تھی ہی نہایت محدود، پھر جو تھے بھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلقین و متوسلین ہی میں سے تھے اس وجہ سے ان کو نہایت حیرت ہوئی کہ اس قحط الرجال میں، اس دیار میں، ایسے ثقہ و شریف لوگ کہاں سے نکل آئے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ لفظ 'قول' جس طرح زبان سے کہی ہوئی بات کے لیے آتا ہے اسی طرح دل میں کہی ہوئی بات کے لیے بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی موجود ہیں، جن میں سے بعض پیچھے گزر چکی ہیں اور بعض آگے آئیں گی۔ مہمانوں کے سلام کا جواب تو انھوں نے تو لاً دیا لیکن یہ بات انھوں نے دل میں کہی۔ اس لیے کہ یہ بات زبان سے کہنے کی نہیں تھی۔

فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۲۶)

لفظ 'روغ' کسی کام کو نظر بچا کر اور کاوا لگا کر کرنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کو دیکھتے ہی، ان کی نظر بچا کر، اپنے گھر کی طرف گئے کہ ان کی ضیافت کا سامان کریں۔ مہمانوں کی نظر بچا کر اس لیے کہ انھوں نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ ان کا یہ اہتمام مہمانوں کی طبیعت پر بار ہو۔ کریم النفس، شریف اور فیاض میزبان کی میزبانی کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مہمان کی ضیافت کا اہتمام اس طرح کرتا ہے کہ اس کو تکلف کا احساس نہ ہو۔

'فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ' یعنی ان مہمانوں کی ضیافت کے لیے انھوں نے گلے کا ایک فربہ بچھڑا ذبح کرا دیا اور اس کا بھنا ہوا گوشت ان کے آگے پیش کیا۔ 'عِجْلٍ سَمِیْنٍ' کے الفاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فیاضی کا اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے چند مہمانوں کی ضیافت کے

لیے ایک پورا بچھڑا ذبح کرا دیا۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انھوں نے پورا بچھڑا مہمانوں کے آگے پیش کر دیا ہو۔ بعض اوقات کُل بول کر اس سے جزمراد لیتے ہیں۔ یہ اسلوب جس طرح ہر زبان میں ہے اسی طرح عربی میں بھی ہے۔

فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۲۷)

حضرت ابراہیمؑ کا ایک اندیشہ

اس جملہ میں کچھ حذف ہے جس پر قرینہ دلیل ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ سامانِ ضیافت ان کے سامنے پیش کیا لیکن جب دیکھا کہ مہمان کھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا رہے ہیں تب انھوں نے نہایت محبت کے ساتھ ان کو کھانے کی دعوت دی۔ بعض دوسرے مقامات میں قرآن نے اس حذف کو کھول بھی دیا ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۲۸)

یعنی جب مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو قدرتی طور پر وہ اجنبیت کچھ اور بڑھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باوّلِ وہلہ محسوس فرمائی تھی اور انھوں نے اپنے دل کے اندر ایک اندیشہ محسوس کیا۔ سورۂ ہود میں اشارہ موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر اندیشہ ضیافت قبول نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوا: فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ (ھود: ۷۰) (جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان کو بیگانہ محسوس کیا اور ان سے دل ہی دل میں ڈرا)۔

معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ لوگ بشر نہیں ہیں، جیسا کہ انھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ فرشتے ہیں۔ فرشتوں کا کھانا نہ کھانا ایک معروف بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے مخفی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان کے علم میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ فرشتے جب آتے ہیں تو کسی بڑی مہم ہی پر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاس ہی قومِ لوط کا فسادِ اخلاق اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا جس کے سبب سے وہ ہر وقت خدا کے عذاب کی زد میں تھی۔ ان حالات و قرائن کی موجودگی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہونا کچھ بعید نہیں تھا کہ شاید اب قومِ لوط کی شامت آگئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تردّد کو فرشتوں نے تاڑ لیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں اور مزید اطمینان پیدا کرنے کے لیے ان کو ایک ذی علم فرزند کی خوشخبری بھی دی۔ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی اس لیے کہ یہ مجرد فرزند کی نہیں بلکہ ذی علم فرزند کی خوش خبری تھی جس کے اندر یہ بشارت بھی مضمر تھی کہ یہ فرزند صاحب نبوّت ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ خوش خبری پا کر خود اپنے باب میں تو مطمئن ہو گئے لیکن

فرشتوں کی مہم کے باب میں ان کے ذہن میں سوال باقی رہا جس کا اظہار انھوں نے بعد میں کیا جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ (۲۹)

فرزند کی خوشخبری پر حضرت سارہ کے تاثرات

یہ بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلند آواز سے دی گئی تھی اس وجہ سے ان کی بیوی سارہ نے جو پاس ہی کھڑی تھیں، سن لی۔ اس سے ان کو جو حیرت اور ساتھ ہی جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے! چنانچہ وہ یہ سنتے ہی اپنے تعجب کے اظہار کے لیے لپکیں اور خاص نسوانی انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں کہ میں تو ایک بڑھیا بانجھ ہوں، کیا اب اس عمر اور اس حالت میں میں جنوں گی! حضرت سارہ کے اس فقرے کے ایک ایک لفظ کے اندر جو حیرت، جو خوشی اور اس کی بشارت کی تصدیق مزید کی جو خواہش جھلک رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

'فِیْ صَرَّةٍ' یعنی وہ تعجب اور حیرانی کی حالت میں لپکیں۔ عربی میں محاورہ ہے: صَرَّ الفرسُ اذنیہ، گھوڑے نے اپنی کنوتیاں کھڑی کیں۔ اسی سے 'فِیْ صَرَّةٍ' کا محاورہ نکلا ہے جو تعجب اور حیرانی کی حالت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

'فَصَكَّتْ وَجْهَهَا' یعنی انھوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ یہ عورتوں کے اظہار تعجب کا طریقہ ہے۔ جب وہ کسی بات پر حیرت کا اظہار کرتی ہیں تو پیشانی پر ہاتھ مار کر بات کہتی ہیں۔ ان دو لفظوں میں قرآن نے ان کی حیرت اور خوشی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ (۳۰)

فرشتوں کی اطمینان دہانی

فرشتوں نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کے رب نے ایسا ہی حکم دیا ہے اور جب اس نے حکم دیا ہے تو یہ بات پوری ہو کے رہے گی۔ نہ آپ کا بڑھیا بانجھ ہونا اس میں مانع ہوگا اور نہ آپ کے شوہر کا بڑھاپا۔ اللہ تعالیٰ حکیم و علیم ہے۔ اس کی حکمت اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اسباب اسی کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جب چاہے گا ان کو آپ کے لیے سازگار کر دے گا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۳۱)

حضرت ابراہیم کا سوال اور اس کی نوعیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے باب میں اطمینان ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ لوگ فرشتے ہیں تو انھوں نے ان سے سوال کیا کہ اے فرستادو! اس وقت آپ لوگوں کے سامنے مہم کیا ہے؟ یہ سوال انھوں نے اس وجہ سے کیا کہ ان پر یہ حقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، واضح تھی کہ فرشتے جب اس طرح آتے ہیں تو کسی بڑی مہم ہی پر آتے ہیں۔ مجرد فرزند کی

خوش خبری مقصود ہوتی تو اس کے لیے اس اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ لفظ 'خَطْبٌ' عربی میں کسی بڑے اور اہم کام ہی کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں چونکہ قومِ لوط سے متعلق اندیشہ موجود تھا اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اگر یہی مہم ہے تو بات واضح ہو جائے۔ خاص طور پر ان کو حضرت لوط علیہ السلام، ان کے اہلِ بیت اور ان کے ساتھیوں کی بڑی فکر تھی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں تفصیل بھی موجود ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوئی کہ قومِ لوط پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے تو انھوں نے قومِ لوط کے اہلِ ایمان کے باب میں اپنے رب سے بڑا مجادلہ کیا۔ اس مجادلہ کی اللہ تعالیٰ نے بڑی تعریف فرمائی ہے اور اس کو حضرت ابراہیم کی دردمندی کی شہادت میں پیش کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ (۳۲)

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے قومِ لوط کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ نہیں کیا لیکن سورۂ ہود میں ہے: قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ (ھود: ۷۰) (انھوں نے کہا تم نہ ڈرو، ہم تو قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں) ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں نے قومِ لوط کا ذکر ان کے کردار اور نام دونوں کے ساتھ کیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس قوم کے مستحقِ عذاب ہونے کا پہلو واضح ہو جائے لیکن قرآن نے بہ تقاضائے بلاغت اس سورہ میں ان کے نام کا ذکر حذف کر کے صرف ان کے قومِ مجرم ہونے کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ پہلو واضح ہو سکے کہ قومِ لوط کو جس عذاب سے دوچار ہونا پڑا اپنے عمل کی پاداش میں ہونا پڑا۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی بات اس سورہ کا عمود ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَیْھِمْ حِجَارَۃً مِّنْ طِیْنٍ ہ مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُسْرِفِیْنَ (۳۳-۳۴)

یہ فرشتوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد واضح فرمایا کہ ہم بھیجے گئے ہیں کہ اس مجرم قوم پر کنکروں کی بارش کر دیں۔ یہاں 'علیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان پر ایسی بارش کریں کہ بالکل پامال کر کے رکھ دیں۔

'حِجَارَۃً مِّنْ طِیْنٍ' سے مراد وہ کنکر ہیں جو مٹی سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن میں لفظ 'سجّیل' بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ (ھود: ۸۲) (اور ہم نے اس پر سنگِ گِل کی بارش کر دی)۔ 'سِجِّیْل' دراصل فارسی کے سنگِ گِل سے معرب ہے۔ یہاں 'حِجَارَۃً مِّنْ طِیْنٍ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی ہے۔

'مُسَوَّمَۃً' کے معنی نشان زدہ کے ہیں۔ یہ لفظ میرے نزدیک 'حِجَارَۃ' سے حال پڑا ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ پتھر نشان لگا کر قومِ لوط کے استیصال کے لیے خاص کیے ہوئے ہیں۔ جن علاقو

یں سڑکوں کی تعمیر کنکروں سے ہوتی ہے وہاں دیکھا ہوگا کہ مزدوران کے چٹے لگا کر ان پر نشان بھی لگا دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بحق سرکار محفوظ ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ وقت کے وقت اتنے پتھر کہاں ملیں گے جو پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہوں۔ ان کے چٹے پہلے سے لگے ہوئے ہیں اور ان پر خدائی نشان بھی لگے ہوئے ہیں کہ یہ کارِ خاص کے لیے محفوظ ہیں، کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ سورۂ ہود میں یہ تصریح بھی ہے کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (ھود: ۸۳) (اور یہ پتھر ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہیں ہیں) یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس زمین پر وہ چلتے پھرتے ہیں وہیں سے بلکہ ان کے قدموں کے نیچے سے خدا کی مامور باد تند اس کو اٹھائے گی اور ان کے اوپر اس کی بارش کر دے گی۔

'لِلْمُسْرِفِيْنَ' سے اشارہ قومِ لوط کے اشرار کی طرف ہے۔ 'اسراف' کے معنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے تجاوز کے لیے آیا ہے۔ یہاں اس سے مراد قومِ لوط کی وہ بے حیائی ہے جس میں وہ من حیث القوم مبتلا تھی۔ جو قوم اللہ تعالیٰ کے حدود کے معاملے میں دیدہ دلیری کی یہ روش اختیار کر لیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی سرکوبی کے لیے اپنی مسخر کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کے طغیان و اسراف کا اس کو مزا چکھا دیتی ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۳۵-۳۷)

قومِ لوط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

فرشتوں کی بات اوپر کی آیت پر ختم ہوئی۔ اب یہ آگے کی سرگزشت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ اس کے بعد اس نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؛ فرمایا کہ عذاب نازل کرنے سے پہلے ہم نے اس بستی کے اندر سے ان لوگوں کو نکال لیا جو اہلِ ایمان تھے۔ 'فِيْهَا' میں ضمیر کا مرجع قومِ لوط کی بستی ہے۔ چونکہ یہ مثالیں 'وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ' کے تحت بیان ہو رہی ہیں اس وجہ سے ضمیر بغیر مرجع کے آ گئی۔ قرینہ کی موجودگی میں اس طرح ضمیر کا آنا عربی زبان میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کے بعد جب کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب آیا ہے تو اس سے وہ لوگ بچا لیے گئے ہیں جو ظہورِ عذاب سے پہلے رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ سنتِ الٰہی تمام رسولوں کی سرگزشتوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔ قومِ لوط کے باب میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے آل و اتباع کو ہدایت ہوئی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان حدود سے باہر نکل جائیں

جن کے لیے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس طرح باہر نکلیں کہ کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔

'فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ'۔ یعنی اس بستی میں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی گھر مسلمانوں کا نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ یہ گھرانا حضرت لوط علیہ السلام ہی کا تھا اور اس کے اندر سے بھی، قرآن میں تصریح ہے کہ، ان کی بیوی الگ کر دی گئی اس لیے کہ اس کی ساری ہمدردیاں حضرت لوط علیہ السلام کے بجائے اپنی قوم ہی کے ساتھ تھیں۔

قومِ لوط کے اندر اہلِ ایمان کی اس کمی کی طرف، خاص اہتمام کے ساتھ، قرآن نے جو اشارہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ کُن عذاب کسی قوم پر اس وقت نازل فرماتا ہے جب پوری قوم کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔ اہلِ ایمان اس کے اندر یا تو بالکل معدوم ہو جاتے ہیں یا ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ معدوم ہی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو مجادلہ قومِ لوط کے بارے میں منقول ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عدل و رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ایک قابلِ توجہ بات

ایک خاص بات یہاں اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اوپر والی آیت میں لفظ 'مُؤْمِنِينَ' استعمال ہوا ہے اور آیت زیرِ بحث میں 'مُسْلِمِينَ' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اوپر والی آیت میں نجات کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ عذاب سے نجات صرف سچے اہلِ ایمان ہی پاتے ہیں۔ اس دوسری آیت میں علاقے کا حال بیان ہوا ہے کہ ایک خاندان کے سوا وہاں مسلمانوں کا کوئی گھرانا سرے سے تھا ہی نہیں۔ اس گھرانے کے لیے لفظ 'مُسْلِمِينَ' استعمال فرمایا جس میں وسعت ہے۔ اس کے اندر پختہ اور خام، بالغ اور نابالغ سب سما سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ظاہری اعتبار سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اس میں شامل تھی لیکن آخری وقت میں وہ اس سے خارج کر دی گئی۔

زمین کے بعض آثارِ عذاب

'وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ'۔ یعنی قومِ لوط کی بستی میں ہم نے ایک نہایت واضح نشانی ان لوگوں کی عبرت پذیری کے لیے چھوڑی جو اللہ کی زمین میں اس کے قہر و غضب کی نشانیاں دیکھنا اور ان سے سبق حاصل کرنا چاہیں۔ یہاں اوپر کی آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ یہ اسی دعوے کی شہادت زمین کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جو قریش سے مخفی نہیں تھے۔ ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ قومِ لوط کے مساکن —— سدوم اور عمورہ —— حجاز اور شام کی گزرگاہ پر تھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے برابر گزرتے رہتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان آثار کو دیکھتے ہوئے وہ پیغمبر کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ لوگ

اسی وقت مانیں گے جب یہ طوفان بلاخود ان کے سروں پر سے گزر جائے گا۔

اس سنگباری کی نوعیت جو قوم لوط پر ہوئی

اب یہاں مختصر طور پر اس سنگ باری کی نوعیت بھی سمجھ لیجیے جس کا ذکر آیت ۳۳ میں ہوا ہے تاکہ سورہ کی تمہید میں غبار انگیز ہواؤں اور دھاریوں والے بادلوں کی جو قسم کھائی گئی ہے، اس کے ساتھ اس سرگزشت کا ربط واضح ہو جائے۔

استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس عذاب کی نوعیت پر مفصل بحث کر کے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر برسانے والی بادِ تند) بن گئی جس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ قومِ لوط ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ (العنکبوت : ۴۰) (اور ان مکذبین میں وہ بھی ہیں جن پر ہم نے کنکر برسانے والی بادِ تند چلادی) نیز انہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (الحجر: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو بالکل تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کی قسم کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوا چلی کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین بوس ہو گئیں اور اوپر سے کنکروں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا، جیسا کہ فرمایا ہے: وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۚ (النجم: ۵۳-۵۴) (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا، پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز سے ڈھانک دیا)۔"

آخر میں قوم لوط کے عذاب سے متعلق تورات کے بیان پر تنقید کر کے خلاصۂ بحث مولانا فراہیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا۔ اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو مزید یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان کے اوپر حاصب کے ساتھ رعد و برق کا عذاب بھی آیا۔"

اس تفصیل کی روشنی میں غور کیجیے تو قوم لوط کی سرگزشت میں ان دونوں قسموں کی شہادت موجود ہے جو اوپر کھائی گئی ہیں۔ یعنی غبار انگیز ہوا کے تصرفات کو بھی اس میں دخل ہے اور سرملکے دھاریوں والے بادلوں کو بھی۔

قوم لوط کا واقعہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بھی زیر بحث آیا ہے۔ اگر مزید تفصیل مطلوب ہو تو

ان سورتوں کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان شاء اللہ بحث کا ہر گوشہ صاف ہو جائے گا۔

وَفِیْ مُوْسٰٓی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۳۸)

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف اشارہ

اس کا عطف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت پر ہے۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کے عدل و انتقام کی نشانیاں ہیں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں بھی اس کی نشانیاں موجود ہیں۔

لفظ 'سُلْطَانٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ واضح سند کے معنی میں بھی قرآن میں آیا ہے اور رعب و دبدبہ کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ ان دونوں معنوں پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں عطا فرمائیں ان کے خدائی سند ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ فرعون نے محض استکبار کے سبب سے ان کو سحر قرار دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دیکھ کر فرعون اور اس کے اعیان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایسا رعب جم گیا کہ انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود وہ آخر وقت تک ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔

فَتَوَلّٰی بِرُکْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۳۹)

'رُکْنٌ' کے معنی مونڈھے کے ہیں اور 'ب' سے یہاں تعدیہ کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز سے تکبر کے ساتھ اعراض کرتا ہے تو شانے اور مونڈھے جھٹک کر منہ پھیرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ اس نے غرور کے ساتھ منہ پھیرا۔ قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ (بنی اسرآءیل: ۸۳)　　　اور جب ہم انسان پر اپنا فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور گھمنڈ سے منہ موڑتا ہے۔

سورۂ حج آیت ۹ میں اسی متکبرانہ اعراض کی تعبیر 'ثَانِیَ عِطْفِهٖ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔

'وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ' یعنی کبھی ان کو ساحر کہہ کر ان کی تکذیب کی اور کبھی ان کو خبطی ٹھہرایا۔ جب ان کے معجزے دیکھے تو کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے اور جب ان کی دعوت سنی تو کہا کہ یہ شخص خبطی ہے جو ایک ایسے خدا کا رسول ہونے کا مدعی ہے جس کی شکل کسی نے نہیں دیکھی۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ (۴۰)

یعنی تب ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہاں فوجوں کا ذکر اس کے سرمایۂ غرور کی حیثیت سے ہوا ہے کہ اس لیے کہ انہی کا اعتماد اس کے تکبر کا اصل سبب تھا۔ فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کی جو شکل ہوئی اس کا ذکر پچھلی سورتوں

میں ہو چکا ہے۔ وہی بات یہاں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ گویا ان کی حیثیت خاک اور راکھ کی ایک مٹھی سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے پناہی کی تعبیر ہے کہ بڑے سے بڑے متکبر کا سارا سرمایۂ غرور اس کی قدرت کے آگے ایک مشتِ خس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

'وَهُوَ مُلِيْمٌ' یعنی اس انجام کے لیے سزاوارِ ملامت وہ خود ہی تھا، کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے سے اس کو نیک و بد سے اچھی طرح آگاہ کر دیا لیکن غرور نے اس کو عقل و ہوش سے اس طرح عاری کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح سوچنے سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوا اور اپنی پوری قوم کو اس نے ہلاکت کے گھاٹ پر لے جا اتارا۔

یہاں فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کے واقعہ کی نوعیت واضح نہیں فرمائی لیکن قرآن کے دوسرے مقامات اور تورات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصلی دخل ہوا کے تصرفات ہی کو تھا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس واقعہ پر بحث کرنے کے بعد خلاصہ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی نوعیت

"اس واقعہ میں ہوا کے عجیب و غریب تصرفات کو جو دخل ہے اور جس کی طرف قرآن نے سرسری اشارہ کیا ہے، تورات کی سفر خروج میں اس کی نوعیت یہ بیان کی گئی ہے۔"

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا" (خروج: باب ۱۴-۲۱)

"یہ پوربی آندھی رات بھر چلتی رہی اور صبح کو تھم گئی۔ ہوا کے زور سے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج، خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا۔ پھر جب آندھی تھم گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والی فوج غرق ہو گئی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورۂ دخان میں ہے۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ	اور میرے بندوں کو راتوں رات نکال لے
مُّتَّبَعُوْنَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ط	جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا اور
اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝	سمندر کو ساکن چھوڑ دو۔ بے شک ان کی فوج غرق
(الدخان: ۲۳-۲۴)	ہونے والی فوج ہو گی۔"

"وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا' میں 'رهو' کے معنی سکون کے ہیں اور دریا کا سکون ظاہر ہے کہ ہوا کے سکون ہی سے ہوتا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۵	اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت کی، میرے بندوں کو

أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ۝ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ (طٰہٰ: ۷۷-۷۸)

راتوں رات نکال لے جاؤ اور ان کے لیے راہ نکالو سمندر میں خشک۔ نہ تم کو پکڑے جانے کا خوف ہوگا نہ ڈوبنے کا اندیشہ تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو سمندر میں سے ان کے اوپر چھا گئی جو چیز چھا گئی۔"

"سفر خروج: باب ۱۵ - ۱۰ میں حضرت موسیٰؑ کا ترانۂ حمد یوں نقل ہوا ہے۔

"تو نے اپنی آندھی کو پھونک ماری تو سمندر نے ان کو چھپا لیا۔"

"سفر استثناء: باب ۱۱ - ۴ میں ہے:"

اور اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحر قلزم کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمھارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں۔"

"خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو تند ہوا کے ذریعے سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعے سے ہلاک کیا یعنی رحمت اور عذاب دونوں کے کرشمے ہوا ہی کے عجیب تصرفات سے ظاہر ہوئے۔"[1]

سورہ کے آغاز میں ہواؤں کی گردش سے جزاء و سزا پر جو شہادت پیش کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بھی اس کی ایک نہایت واضح مثال ہے اور یہ بھی منجملہ ان نشانیوں کے ہے جن کی طرف آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ (۴۱)

قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ

یہ قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑا سامان موجود ہے جب کہ ہم نے ان کے اوپر ایک باد خشک مسلط کر دی۔ 'الریح العقیم' وہ ہوا جو بالکل بے فیض ہو، جو نہ بارش لائے نہ کوئی اور نفع پہنچائے۔ عربی میں بارش لانے والی ہواؤں کو 'لواقح' (بارآور) کہتے ہیں اور بے فیض و مضر ہواؤں کے لیے 'عقیم' (بانجھ) کی صفت آتی ہے۔ مراد اس سے سرما کی ٹھنڈی اور خشک ہوا ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ' (حٰم السجدۃ ۱۶) (پس ہم نے ان کے اوپر ہوائے تند مسلط کر دی نحوست (سرما) کے دنوں میں)۔

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہی۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ (۴۲)

یہ اس ہوا کی ہلاکت انگیزی کی تصویر ہے کہ جس چیز پر بھی اس کا گزر ہوا اس کو اس نے ریزہ ریزہ کر چھوڑا۔ 'رَمِیْم' لکڑی، رسی اور ہڈی وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑوں اور ریزوں کو کہتے ہیں۔ سرد ہوا کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی ٹھنڈک اور خشکی کے سبب سے اشیاء کی قوت اور ان کی تازگی و زندگی ختم کر دیتی ہے اور وہ غیر معمولی طور پر تند بھی ہو تو فصلوں، نباتات اور تمام زندہ چیزوں کو توڑ پھوڑ کر بالکل خس و خاشاک کے مانند بنا دیتی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہی بات یوں بیان ہوئی ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ٭ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (القمر: ۱۹-۲۰) (ہم نے ان کے اوپر بادِ صرصر مسلط کر دی، قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنوں کے کندے ہوں)۔

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ٭ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ (۴۳-۴۴)

قومِ ثمود کے انجام کی طرف اشارہ

عاد کے بعد یہ ثمود کے انجام کی یاد دہانی ہے۔ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے سامانِ عبرت موجود ہے۔ 'اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ' یہ خاص طور پر اس وقت کی یاد دہانی فرمائی ہے جب ان کے سرکش لیڈر نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور ان کے رسول حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو آخری تنبیہ فرمائی ہے کہ بس کچھ دیر اور اس دنیا کے عیش سے بہرہ مند ہو لو، اب تمہاری ہلاکت کی گھڑی سر پر آگئی ہے۔ اس آیت میں جو بات 'حَتّٰی حِیْنٍ' کے مجمل الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۂ ہود میں اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ (ھود: ۶۵) (تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس نے کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن اور کھا پی لو۔ یہ دھمکی جھوٹی نہ ہو گی) اس سے معلوم ہوا کہ اونٹنی کے واقعہ کے بعد ان کو آخری دھمکی کے ساتھ تین دن کی مہلت اور ملی کہ اب بھی وہ چاہیں تو توبہ کر کے اپنے کو اس عذاب سے بچا لیں۔

'فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ'۔ 'عتو' کے معنی گھمنڈ اور نافرمانی کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آئے تو اس کے اندر اعراض کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس آخری مہلت اور اس آخری تنبیہ کی بھی کوئی پروا نہ کی بلکہ نہایت تکبر کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو خدا کی ڈانٹ نے پکڑ لیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

'صٰعِقَة' کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں اور اس سے مراد وہ عذاب ہے جو ان کی سرکشی کی پاداش

میں ان پر آیا۔ سورۂ ہود میں ان کی سرگزشت جو بیان ہوئی ہے اس میں لفظ 'صَیْحَۃ' آیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ڈانٹ ان کے لیے کس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

'وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ' میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں۔

ایک یہ کہ یہ عذاب کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ آیا، یہ لوگ اس کو دیکھتے رہے لیکن اپنا کوئی بچاؤ نہ کر سکے۔

دوسری یہ کہ عذاب دفعتہً ان پر آدھمکا جس کے بعد ان کو ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (القمر: ۳۱) (ہم نے ان کے اوپر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کے باڑے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں کے مانند ہو کے رہ گئے)۔

تیسری یہ کہ یہ اس کو دیکھ کر بالکل سراسیمہ ہو کے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ آگے کے ٹکڑے میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ (۴۵)

یعنی جب انھوں نے کڑک سنی تو ان پر دہشت اور کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ کھڑے نہ رہ سکے بلکہ زمین پر گر پڑے۔ سورۂ اعراف میں ان کا حال یوں بیان ہوا ہے: فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ (الاعراف: ۹۱) (پس ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے)۔

'وَمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ'۔ 'انتصار' کے معنی مدافعت کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے اپنی مدافعت کرنے والے نہ بن سکے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ امرؤ القیس کا شعر ہے۔

فانشب اظفارہ فی النسا   فقلت ھبلت الا تنتصر

(کتے نے اس نیل گاؤ کی ران میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ تب میں نے اس سے کہا، کم بخت! اب تو اپنا بچاؤ کر!)

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے عاد اور ثمود کے عذاب کی نوعیت بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ ابتدائے سورہ کی قسموں کے ساتھ ان سرگزشتوں کا تعلق بھی اچھی طرح واضح ہو جائے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں ان کے عذاب کی یہ شکل بیان فرمائی ہے۔

عاد و ثمود کے عذاب کی نوعیت

"قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے اس پر جو شخص بھی غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی کہ جس تند ہوا سے وہ ہلاک کیے گئے اس کے ساتھ سرا

کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے، ہوا کے ساتھ پانی سے خالی بادلوں اور صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ لا قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ط بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ط رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا (الاحقاف: ۲۴-۲۵)

جب انھوں نے عذاب کو ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا، بولے یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔ یعنی بادِ تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے۔ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز اپنے رب کے حکم سے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی ہوا اور اس کے بادلوں کی ہیں۔ اس زمانے میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ خشکی اور قحط کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۱۹) (اور ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی قائم رہنے والی نحوست کے زمانہ میں) اسی طرح حٰمٓ السجدۃ میں ہے: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (۱۶) (پس ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی نحوست کے زمانے میں)۔

اس کے بعد مولاناؒ نے اپنے دعوے کی تائید میں بعض شعرائے جاہلیت کے حوالے پیش کیے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں۔

"سرما کی یہ تند ہوائیں جب چلتی ہیں تو دھاریوں والے سرخ بادلوں کے ٹکڑے، اولے اور رعد و برق کی آفتیں اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ کلامِ عرب میں اس کی تمام تفصیلات ملتی ہیں......"

"حٰمٓ السجدۃ میں قوم عاد کے عذاب کے ذیل میں صاعقہ یعنی کڑک اور چمک کی بھی تصریح ہے: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۱۳) (اگر وہ اعراض کریں تو ان کو باخبر کر دو کہ میں تم کو اس طرح کی کڑک کے عذاب سے ڈراتا ہوں، جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا)۔"

"اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب نازل فرمایا لیکن اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے اثر پر استدلال کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی جس طرح قوم

عاد پر ہوا کے ساتھ رعد و برق والے بادل بھیجے۔ چونکہ ثمود کی تباہی صاعقہ ہی کے ذریعے سے واقع ہوئی .... اس وجہ سے صرف اسی کا ذکر کیا، بادلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن التزامی طور پر ثبوت ان کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عاد کے ذکر میں ہوا کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بادلوں کا ذکر صرف ایک ہی جگہ کیا ہے[1]"

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۴۶)

قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ

یہ عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر کی سرگزشتوں سے متبادر ہوتا ہے یعنی جس طرح ہم نے قوموں کو پکڑا یا ہلاک کیا اسی طرح ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہلاک کیا۔ مفہوم و معنی پر عطف کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اس کے شواہد پیچھے گزر چکے ہیں۔

یہ آخر میں قوم نوح کے واقعہ کی طرف بھی اجمالی اشارہ کر دیا۔ اگرچہ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سب سے پہلے اسی واقعہ کا ذکر ہونا تھا لیکن قرآن نے یہاں ترتیب تاریخی اختیار نہیں کی بلکہ قریش کو ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی روایات اور جن کے آثار ان کے ملک میں موجود تھے اور جن کی طرف اوپر آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہ مقصد مقتضی ہوا کہ پہلے قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کا ذکر آئے جو زمانی و مکانی دونوں ہی اعتبار سے نسبتہً قریب کے واقعات تھے اس وجہ سے مخاطب پر زیادہ اثر انداز ہو سکتے تھے۔ پھر سب سے آخر میں سب سے پہلے واقعہ کا بھی حوالہ دے دیا تاکہ مخاطب کے سامنے پوری تاریخ آ جائے۔

اس واقعہ کی یاد دہانی کا یہ خاص پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح مذکورہ بالا قوموں کی سرگزشتوں میں آپ نے دیکھا کہ ان کی تباہی میں اصلی عامل کی حیثیت ہوا کے تصرفات کو حاصل ہے جس کی قسم سورہ کے شروع میں کھائی گئی ہے، اسی طرح قوم نوح کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہوا ہی کے تصرف سے ہلاک کیا۔ استاذ امام فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں قوم نوح کی تباہی کی نوعیت پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

"قرآن اور تورات میں قوم نوح کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصلی دخل ہوا کے تصرفات ہی کا رہا ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہے۔

قوم نوح کی تباہی میں اصلی دخل ہوا کے تصرفات کا تھا

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ	اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور
فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا	وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (العنکبوت : ۱۴) رہا۔ پس ان کو پکڑا طوفان نے اور وہ ظالم تھے۔"

"اس آیت میں لفظ 'طوفان' خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ 'طوفان' کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں۔ اہلِ عرب اس سے اس تند ہوا کو مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔"

اس معنی کی تائید میں کلامِ عرب کے بعض شواہد نقل کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی تند ہوا کے لیے اس کے ہم معنی اور اسی کے مشابہ الفاظ ہیں۔ فارسی میں اس کو گردباد کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے سائیکلون (CYCLONE) کا لفظ ہے۔ مصریوں کے ہاں ہوا کا ایک خاص دیوتا تھا جس کو ٹائفون[1] کہتے تھے۔ اس ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آجاتا ہے۔ میں نے کراچی میں اس قسم کا طوفان بچشم خود دیکھا ہے۔ بحرِ ہند کے مشرق سے ایک طوفان اٹھا اور مغرب کی طرف گزر گیا۔ اس کے اثر سے نہایت سخت بارش ہوئی۔ جہاز پہاڑوں سے جا ٹکرائے۔ دوسرے جانی مالی نقصانات بھی بے شمار ہوئے۔ طوفانِ نوح کے جو حالات تورات و قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اس سے مشابہ ہیں۔ سورۂ قمر میں ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓي اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (القمر : ۱۲) ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ کھول دیے اور زمین کے تمام چشمے پھوٹ نکلے۔ پس پانی ٹھہرائے ہوئے اندازہ تک پہنچ گیا۔"

"تورات کی کتاب پیدائش، باب ۔ ۱۱ میں ہے۔

"بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔"

"سورۂ ہود میں ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (ھود : ۴۲) اور وہ کشتی ان کو لے کر ایسی موجوں کے اندر چل رہی تھی جو پہاڑوں کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔

"پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا اسی حالت میں ہوتا ہے جب تند ہوا چل رہی ہو۔"

آخر میں مولانا نے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

---

[1] انگریزی میں (TYPHOON) سمندر کے سائیکلونی طوفانوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے۔ (اصلاحی)

"اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قومِ نوح پر تند و رچکر دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی۔ پاس کے سمندروں کا پانی اُبل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہِ جودی پر جا کے ٹکا۔"

۹۔ واقعات کی ترتیب پر ایک نظر

اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں، آیات کی وضاحت کے ضمن میں ہم ان کی حکمت کی طرف ضروری اشارات کرتے آئے ہیں لیکن استاذ امامؒ نے ان کی ترتیب پر ایک پوری فصل لکھی ہے جس میں نہایت لطیف نکتے بیان فرمائے ہیں۔ اس فصل کا ضروری حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت ابراہیم و حضرت لوط علیہما السلام کی جو سرگزشت یہاں بیان ہوئی ہے اس کا ایک پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اس میں بشارت اور انذار دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی حال ہوا کا بھی ہے جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔ وہ بھی کبھی پیام رحمت بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی صورتِ عذاب بن کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یہ جامع حیثیت مقتضی ہوئی کہ یہاں وہی تمہید کی جگہ پائے۔"

"اس کے بعد قوم لوط کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گزرنے اور ان کے آثار و نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں قسم بہ کے پہلے ٹکڑے وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار اڑاتی چلتی ہیں پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ) سے سب سے زیادہ قریبی مناسبت قوم لوط کی تباہی کے واقعہ ہی کو تھی۔ ان کی تباہی تند ہوا سے ہوئی تھی جس نے ریت اور سنگ ریزوں سے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کی اتنی مقدار ان کے اوپر لا ڈالی کہ اس کے نیچے ان کی بستیاں بھی چھپ گئیں۔"

"علاوہ بریں اوپر جو فرمایا ہے: وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) تو قومِ لوط کی سرگزشت میں اس دعوے کا بھی نہایت واضح ثبوت موجود تھا جس کی وضاحت پیچھے ہو چکی ہے۔"

"اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت ہے۔ یہ سرگزشت قرآن مجید میں بار بار بیان ہوئی ہے اور اس کے اندر نہایت اعلیٰ سبق ہیں۔ اس کو مُقسم بہ کے دوسرے ٹکڑے فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا (پھر بوجھ اٹھا لینے والی، پھر آہستہ چلنے والی) سے نہایت واضح مناسبت ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔"

"یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جن سرگزشتوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ناموں سے شروع کیا ہے ان کے اندر بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے بعد جو سرگزشتیں قوموں کے نام سے سنائی گئی ہیں ان کے اندر انذار کا پہلو غالب ہے۔ قوموں میں سے عاد اور ثمود کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اوپر جو عذاب آیا وہ دھاریوں والے بادلوں (وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ) کی شکل میں آیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جو ترتیب قسموں میں ملحوظ ہے وہی ترتیب قوموں کے ذکر میں بھی ہے۔ عاد اور ثمود کے ذکر میں عاد کو مقدم رکھا ہے اس کی وجہ تقدمِ زمانی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان پر جو عذاب آیا وہ ہوا اور بادل دونوں کے تصرفات کا نتیجہ تھا۔"

"رہی نوح علیہ السلام کی سرگزشت تو وہ تمام قوموں اور امتوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک غیر فانی نشانی ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۙ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (الحآقّۃ: ۱۱-۱۲)	جب پانی حد سے بڑھ گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں اٹھا لیا تاکہ اس سرگزشت کو تمہارے لیے یاددہانی بنائیں اور محفوظ رکھنے والے کان اس کو محفوظ کر لیں۔

"اس سرگزشت کے اندر زمین، آسمان، ابر، ہوا، بادل، کشتی اور پانی سب کے کرشمے جمع ہو گئے ہیں۔ اس جامعیت کے سبب سے اس نے آفاقی و انفسی دلائل کے ایک مجموعہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اوپر ہوا کی جو شہادتیں بیان ہوئیں اور بعد میں زمین و آسمان اور نفس کے جن آثار و دلائل کی طرف اشارے کیے گئے ان سب کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ قومِ نوح کی یہ جامع سرگزشت سنا کر وہ ساری حقیقتیں ممثّل کر کے نگاہوں کے سامنے رکھ دی جائیں۔"

"نیز عاد اور ثمود کو زمین کی خلافت قومِ نوح کے بعد ہی ملی تھی اس وجہ سے بھی مناسب ہوا کہ ان کے ذکر کے ساتھ قومِ نوح کا بھی حوالہ دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال بھی موجود ہے۔

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨ الْاُوْلٰى ۙ وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۭ (النجم: ۵۰-۵۲)	اور اس نے عادِ اول کو ہلاک کیا اور ثمود کو بھی۔ پس ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور اس سے پہلے قومِ نوح کو بھی ہلاک کیا۔ یہی لوگ ظالم و سرکش تھے۔"

"اس آیت میں وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ کے ٹکڑے پر خاص طور پر نگاہ رکھیے۔"

"چونکہ یہ سرگزشت مشہور اور قدیم ہونے کے علاوہ تمام قوموں کی مشترک سرگزشت ہے اس وجہ سے اول تو اس کی طرف اجمالی اشارہ کافی ہوا پھر اس کا ذکر ایک اتمامی سرگزشت کی حیثیت سے کیا گیا۔ نیز ایجاز کی خوبی دیکھیے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے ظاہر ہو گیا کہ ماقبل سے اس کو کسی قدر مستقل اور جداگانہ اہمیت حاصل ہے، چنانچہ 'وَفِیْ نُوْحٍ' نہیں کہا، جیسا کہ اوپر 'وَفِیْ مُوْسٰی' اور 'وَفِیْ عَادٍ' کہا ہے بلکہ اسلوب بدل کر 'وَقَوْمَ نُوْحٍ' فرمایا تاکہ بدلا ہوا اسلوب خود متنبہ کر دے کہ اس سرگزشت کی اہمیت کچھ اور ہے۔"

۱۰۔ آگے آیات ۴۷-۶۰ کا مضمون

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قیامت اور جزا و سزا سے ڈرایا ہے اور اسی ضمن میں توحید کی بھی یاد دہانی فرمائی ہے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ سب کو ایک ہی خدا سے سابقہ پیش آنا ہے، کوئی دوسرا خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں بنے گا۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو سلوک تمہاری قوم تمہارے ساتھ کر رہی ہے یہی سلوک ہر قوم نے اپنے رسول کے ساتھ کیا ہے تو تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ شریروں سے اعراض کرو۔ بس ان کو بات سناؤ جو سنتے ہیں۔ اللہ ہر قدم پر تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔ تم اللہ کے سوا کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہو۔ جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ جلدی نہ مچائیں۔ ان کے لیے جو فرصت مقدر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تو عذاب آ جائے گا اور وہ بڑی سخت چیز ہوگا۔

آیات ۴۷-۶۰

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ

طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

ع ۳ ۱۴ ۲

ترجمۂ آیات ۴۷-۶۰

اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں! اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمھارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے تمھارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۴۷-۵۱

ایسے ہی ان کے اگلوں کے پاس جو رسول بھی آیا اس کو انھوں نے جادوگر یا دیوانہ ٹھہرایا۔ کیا انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی وصیت کر چھوڑی ہے! یہ ہیں ہی سرکش لوگ! پس ان سے تم اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور یاد دہانی کرتے رہو کیونکہ یاد دہانی ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔ ۵۲-۵۵

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ نہ میں ان سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور، قوت والا ہے۔ ۵۶-۵۸

پس ان ظالموں کے لیے بھی ویسا ہی مقرر پیمانہ ہے جیسا ان کے اگلے ہم مشربوں کے لیے تھا۔ تو جلدی نہ مچائیں۔ ان کافروں کے لیے ان کے اس دن کے سبب سے بڑی خرابی ہے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۵۹-۶۰

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۴۷)

قدرت کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

'اَیْد' کے معروف معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ قوت و قدرت کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے۔ 'مُوْسِعُوْنَ' یعنی اس کا اقتدار و اختیار بہت وسیع ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔

اوپر جزا و سزا کے اثبات کے لیے جو تاریخی دلیلیں بیان ہوئی ہیں انہی پر عطف کر کے یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت و عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے سر پر پھیلے ہوئے آسمان اور اس کے عجائب کے اندر کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا جو خدا اس عظیم اور ناپیدا کنار آسمان کو وجود میں لا سکتا ہے اس کے لیے انسان کو اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا مشکل ہو جائے گا! یہی مضمون دوسرے مقامات میں یوں بیان ہوا ہے ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا ......)۔

'وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اس عظیم آسمان کو پیدا کرنے میں ساری قوت نچڑ گئی ہے، اب کوئی اور کام ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے اندر بڑی سمائی اور بڑی قدرت ہے۔ ہم جو چاہیں اور جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں یہی مضمون یوں بھی بیان ہوا ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ' (قٓ: ۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان لاحق نہیں ہوئی۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۴۸)

آسمان کے بعد زمین کی طرف اشارہ

آسمان کے بعد زمین کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو ہم نے کس خوبی سے بچھایا ہے اور ہم کتنے اچھے بچھانے والے ہیں! یعنی زمین پر غور کرو تو اس سے ہماری قدرت و عظمت بھی واضح ہو گی اور ہماری ربوبیّت بھی۔ جس سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ جس خدا نے یہ زمین بنائی ہے اور اس کے اندر انسان کی پرورش کے لیے گوناگوں وسائل پیدا کیے ہیں اس نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بات اس کی حکمت و ربوبیّت کے منافی ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔ حکمت و ربوبیّت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ہر شخص اس دنیا کی زندگی سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس میں خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی یا اپنی مرضی چلائی، اگر اس نے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی ہو تو وہ حقدار ہے کہ اپنی اس شکر گزاری کا صلہ پائے اور اگر اپنی من مانی کی ہو تو وہ سزاوار ہے کہ اپنی اس سرکشی کی سزا بھگتے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ نبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ' سے مقصود اس دنیا کے ان عجائباتِ حکمت و ربوبیّت کی طرف اشارہ کرنا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا خالق صرف ایک بے پناہ قدرت رکھنے والا ہی نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کی قدرت بے پناہ ہے اسی طرح اس کی حکمت، رحمت، پروردگاری اور اس کے جود و کرم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ پھر یہیں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی یہ صفات بھی متقاضی ہیں کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں وہ اپنے بندوں کے درمیان انصاف کرے اور اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی صفاتِ رحمت و ربوبیّت کی نفی ہو جاتی ہے حالانکہ اس دنیا کا ہر گوشہ اس کی شہادت سے معمور ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۴۹)

اس کائنات کا ایک خاص پہلو

یہ اس کائنات کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو بھی اپنے اندر قیامت اور جزا و سزا کی دلیل رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ چنانچہ اوپر آسمان و زمین کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی اپنی غایت اور اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو توحید کی دلیل ملتی ہے کہ ایک مدبر و حکیم ہستی نے یہ دنیا پیدا کی ہے جو اس تمام کائنات سے بالاتر اور سب پر حاوی ہے اور اپنی قدرت ا

حکمت کے تحت اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط پیدا کر کے ان کو صالح نتائج کے ظہور کا ذریعہ بناتی ہے۔
دوسری طرف یہ آخرت کی بھی ایک بدیہی دلیل ہے اس لیے کہ اس دنیا کی ہر چیز جب جوڑا جوڑا
ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچتی ہے تو ضروری ہے کہ اس دنیا
کا بھی جوڑا ہو تاکہ اس میں جو خلا نظر آتا ہے اس جوڑے کے ساتھ مل کر بھر جائے۔ یہ جوڑا آخرت
ہے۔ آخرت کو مان لینے کے بعد یہ دنیا ایک بامقصد و باحکمت چیز بن جاتی ہے اور آخرت کو
نہ مانیے تو ایک بالکل باطل و عبث چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے آخرت کو
نہ ماننے والوں سے جگہ جگہ یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا
کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! اس دلیل کی پوری وضاحت اس کے محل میں
ہو چکی ہے۔ یہاں لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ
اس دنیا میں ہر چیز کا جوڑے جوڑے ہونا اس امر کی یاددہانی کرتا ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا
ہے جس سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور وہ ہے آخرت!

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۰)

آخرت کی یاددہانی

یعنی جب آخرت ہے اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے
کہ اللہ کے رسول کی مخالفت سے باز آؤ، اپنے رب کی طرف بھاگو اور اس دن کے لیے تیاری
کرو جس دن ہر شخص سے اس کے اعمال کی بابت پرسش ہونی ہے اور جس دن خدا کے سوا کوئی
کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

'اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ'۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ایک 'نذیر
مبین' کی حیثیت سے آیا ہوں کہ آخرت کے ظہور سے پہلے پہلے اس کے خطرات سے تمھیں اچھی
طرح آگاہ کر دوں تاکہ کسی کے لیے اس دن عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ اس کے پاس کوئی
اس دن سے آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ میں نے ایک 'نذیر مبین' کی طرح تمھیں اس دن کے احوال
اور اس کی ہولناکیوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب نتائج کی ساری ذمہ داری خود تمھارے
اوپر ہے۔

'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کے اندر جو تلمیح ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ 'مِنْهُ'
سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تمھارے انذار ہی کے مشن پر مامور ہو کر آیا
ہوں۔ بعض لوگوں نے 'مِنْهُ' کو نذیر کے صلہ کے مفہوم میں لیا ہے، لیکن یہ رائے عربیت کے
بھی خلاف ہے اور نظائر قرآن کے بھی۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۵۱)

اس حقیقت کی یاددہانی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں

یہ اوپر کے مضمون کی تکرار نہیں ہے بلکہ ایک اور حقیقت سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ جب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو اس دن تمھارے مزعومہ شرکاء و شفعاء تمھاری مدد کریں گے یا سفارش کر کے خدا کی پکڑ سے تمھیں بچا لیں گے۔ اس قسم کے خیالی سہاروں پر بھروسہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن سابقہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے پیش آئے گا، دوسرے سہارے سب بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مشن پر بھی مامور ہوں کہ تمھیں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دوں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکین اول تو قیامت کو بہت بعید از امکان خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کو گمان یہ تھا کہ ان کا معاملہ تو ان کے شرکاء کے سامنے پیش ہوگا، وہ اپنے زور و اثر سے ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ ان کے اس زعم نے قیامت کو ان کے نزدیک ایک بالکل بے اثر چیز بنا دیا تھا۔ ان کی اسی غلط فہمی پر ضرب لگانے کے لیے قرآن میں قیامت کے ساتھ توحید کا ذکر ضرور آتا ہے۔ پیچھے اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اسی نوعیت کی تنبیہ یہاں بھی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کی اس روش پر غم نہ کرو۔ اس صورت حال سے تمھی کو سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

رسولوں کے ساتھ شریروں کی روش

'قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ'۔ یعنی انھوں نے جب ان کی طلب پر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائیں تو ان کو جادوگر ٹھہرایا اور جب ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا تو ان کو خبطی اور دیوانہ قرار دیا۔ 'ساحر' اور 'مجنون' کے الفاظ بطور مثال نقل ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی مخالفت کے لیے انھوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر ہی لیا اسی طرح تمھاری قوم کے اشرار بھی تمہیں مطعون کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ رسولوں کے ساتھ اشرار کا سلوک ہمیشہ یہی رہا ہے۔ اس میں تمھاری کسی کوتاہی یا کمی کو کوئی دخل نہیں ہے اور نہ یہ صورت حال صرف تمھی کو پیش آئی ہے اس وجہ سے دل گرفتہ نہ ہو بلکہ صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو جس طرح تم سے پہلے اولوالعزم رسولوں نے کیا۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳)

یہ اشرار کی روش کی یکسانی اور اس کے تسلسل پر اظہار تعجب ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے اشرار نے اپنے بعد آنے والی قوم کے اشرار کو یہ وصیت کر چھوڑی ہے کہ تمھارے پاس بھی کوئی رسول آئے تو اس سے وہی سلوک کرنا جو ہم نے اپنے رسول سے کیا ہے۔ چنانچہ ہر آنے والی نسل اپنے اسلاف

کی اس وصیت کی پوری وفاداری کے ساتھ تعمیل کرتی چلی جا رہی ہے۔

'بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ' یہ اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی اس مشابہت کی اصل علت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی (یعنی قریش) اسی طرح کے سرکش ہیں جس طرح کے سرکش پچھلے رسولوں کے مکذبین تھے۔ مزاج کی یہ یکسانی اس بات کا سبب ہوئی کہ یہ بھی وہی ٹیڑھی چال چلیں جو ان کے پیش رو چلے اور پھر لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴)

متمردوں سے اعراض اور نیکیوں کی طرف التفات کی ہدایت

یعنی اس قسم کے شریر لوگوں سے، جو مخالفت کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہوں، تم اعراض کرو۔ رسول کی حیثیت سے انذار و تبلیغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی۔ اب تم عند اللہ بری ہو۔ اب کوئی پرسش ان کے باب میں تم سے نہیں ہونی ہے بلکہ یہ خود سزاوار ملامت ہیں اور اس کا انجام عنقریب دیکھیں گے۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۵)

یعنی شریروں اور سرکشوں سے تو اعراض کرو لیکن ان لوگوں کو سمجھاتے رہو جو تمھاری بات سنتے ہیں۔ ایمان کے طالبوں کو تمھاری تعلیم و تذکیر سے نفع پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی آیت میں اعراض کی جو ہدایت ہے اس کا تعلق قریش کے ان سرکش لیڈروں سے ہے جو غرور کے سبب سے کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے ان کے ایمان کے لیے زیادہ فکرمند تھے کہ یہ ایمان لائیں گے تو اس سے دین کو تقویت حاصل ہوگی اور دوسروں کے لیے ایمان کی راہ کھلے گی۔ یہ مصلحت بجائے خود ایک اہم مصلحت تھی اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدت تک ان کے پیچھے سرگرداں رہے لیکن جب ان پر حجت تمام ہوگئی اور واضح ہوگیا کہ یہ پتھر اپنی جگہ سے کھسکنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۶-۵۸)

دو اہم حقیقتوں کا بیان

قریش کے لیڈروں سے اعراض کے حکم کے بعد ان آیات میں دو نہایت اہم حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اول اس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا ہے تو اپنی کسی احتیاج کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ ہر حال میں ان کی ناز برداری کرتا ہے۔ اس کی سلطنت اپنے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس نے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ اس کی عبادت و اطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کے مدارج حاصل کریں جو اس نے ان

کے لیے مقدّر کر رکھے ہیں۔ اسی مقصد کی یاددہانی کے لیے اس نے اپنے رسول بھیجے تاکہ لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ لیکن رسول کی ذمہ داری صرف حق کو واضح کر دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ اس حق کو لازماً قبول بھی کر لیں۔ رسول نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اگر لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں کہ ان کو ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح راضی کرنے ہی کی کوشش کی جائے۔

گویا اوپر والی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں سے اعراض کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے ان آیات میں اس کی وجہ بیان فرما دی گئی ہے کہ ان متکبرین کے بغیر خدا کا کوئی کام بند نہیں ہو جائے گا کہ تم ان کے پیچھے اپنے کو ہلکان رکھو۔

دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ اللہ کے دین کی دعوت اپنا زاد و راحلہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ جو لوگ اس دعوت کو لے کر اٹھیں ان کا سارا بھروسہ اپنے رب پر ہونا چاہیے۔ انھیں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی عبادت و اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہی چیز ان کی خلقت کی غایت اور ان کی زندگی کا نصب العین ہے جس کا پورا ہونا ہر شکل میں مطلوب ہے۔ اس کی خاطر تو وہ ہر چیز قربان کر سکتے ہیں لیکن اس کو کسی چیز پر بھی قربان نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس جرم میں ان کے دشمن ان پر تمام معاشی راہیں مسدود کر دیں گے تب بھی انھیں اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنا اور یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر انھوں نے اپنے مقصدِ حیات سے انحراف اختیار نہ کیا تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے علی الرغم ان کے لیے رزق کی ایسی راہیں کھولے گا جن کا گمان نہ ان کو ہوگا اور نہ ان کے دشمنوں کو۔ رزّاق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت و تدبیر کا مالک ہے۔ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی قوت بھی اس کی قوت پر غالب نہیں آ سکتی۔

یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو، دعوت کے اس دور میں جب کفار ان کو مکہ سے نکال دینے اور تمام معاشی راہیں ان پر بند کر دینے کی اسکیمیں سوچ رہے تھے، تسلی دی گئی ہے کہ تم اللہ واحد کی بندگی کے اس نصب العین پر ڈٹے رہو جس کے لیے تمھارے رب نے تم کو پیدا کیا ہے۔ رزّاقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ تمھارے لیے غیب سے رزق کی راہیں کھولے گا۔ بندوں کا فرض اپنے رب کی بندگی کرنا ہے۔ رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں کسی پہلو سے بھی عاجز نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن میں ان مواقع میں خاص طور پر بیان ہوا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اغنیاء سے بے نیاز ہو کر اپنے موقفِ حق پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ بعض آیتیں ہم بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ   اور تم اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو،

عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ (طٰهٰ: ۱۳۲)	ہم تم سے رزق رسانی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم ہی تم کو روزی دیں گے اور انجام کار کی کامیابی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں آیا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (الحجر۔ ۸۸)	اور ہم نے ان کفار کی بعض جماعتوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے حال پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو۔

کلام کا موقع و محل سمجھ لینے کے بعد ایک نظر اس کے اجزا پر بھی ڈال لیجیے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ اس آیت میں لفظ 'عبادت' اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی رب کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت۔ مقصود اس حقیقت کا پتہ بتا دینے سے زندگی کے اصل نصب العین کو سامنے رکھ دینا ہے تاکہ ہر انسان واضح طور پر جان لے کہ اسے کس مقصد کے لیے جینا اور کس مقصد کے لیے مرنا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ خدا کی بندگی اس لیے مطلوب نہیں ہے کہ خدا کسی کی بندگی کا محتاج ہے بلکہ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ بندے ہی اس کی بندگی کے محتاج ہیں اس لیے کہ ان کی رفعت و بلندی کا زینہ یہ بندگی ہی ہے۔ اگر اس بندگی سے وہ منحرف ہو جائیں تو پھر ان کی حیثیت حیوانات سے زیادہ نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ان سے بھی فروتر درجے میں گر جاتے ہیں۔ یہاں جنوں اور انسانوں دونوں کا ذکر ایک درجہ کی مخلوق کی حیثیت سے کیا ہے، اس لیے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اختیار کے شرف سے مشرف فرمایا ہے اور دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں مساوی درجے میں مسئول اور بندگی رب کا حق ادا کرنے کی صورت میں یکساں اجر و شرف کے حق دار ہیں۔

مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ۔ یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ ان کے بغیر اس کا کوئی کام بند ہو جائے۔ اس نے نہ تو اپنی مخلوق کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ وہ خود کھانے پینے کا محتاج ہے کہ ان سے یہ چاہے کہ وہ اس کو کھلائیں بلکہ وہ خود ہی سب کا روزی رساں ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ انسان خود اپنے یا اپنی آل و اولاد کے رزق کے لیے اس دنیا میں جو جدوجہد کرتا ہے اس میں اس کی حیثیت ایک آلہ اور ذریعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی کوشش کو بار آور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر اس کا فضل نہ ہو تو آدمی کی ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ فرمایا: أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (الواقعہ: ۶۳-۶۴)

(غور تو کرو اس چیز پر جو تم بوتے ہو! کیا تم اس کو پروان چڑھاتے ہو یا ہم اس کو پروان چڑھانے والے ہیں!)

'وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ' میں مشرک قوموں کے اس وہم پر بھی ایک ضرب ہے جو وہ اپنے دیوتاؤں کی نسبت رکھتی ہیں کہ وہ ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ مند اور محظوظ ہوتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ یعنی حالات کی ظاہری نامساعدت سے بددل ہو کر کوئی خدا کی رزق رسانی و کارسازی کے باب میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔ رزّاق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت کا مالک ہے۔ حالات کی نامساعدت اور مخالفوں کی مزاحمت اس کی تدبیروں کو شکست نہیں دے سکتی۔

'ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ' کی وضاحت مولانا فراہیؒ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمائی ہے۔

"لفظ 'متین' پر چونکہ وقف ہے اس وجہ سے اس کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا اور جب اعراب ظاہر نہیں ہوتا تو اس کی قراءت میں کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اعراب ہے کیا؟ بعض اس کو مجرور سمجھتے اور اس کو 'قوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں۔ 'قوت' دراصل رسی کی لڑ کو کہتے ہیں اور رسی کی مضبوطی کے لیے عربی میں لفظ 'متین' معروف ہے۔ ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ لفظ 'قوت' مؤنث ہے اور 'متین' مذکر ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ 'متین' فعیل کے وزن پر ہے اور یہ وزن عربی میں مذکر اور مؤنث دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہے 'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' (الاعراف: ۵۶) (اللہ کی رحمت محسنوں کے قریب ہے)۔

"بعض اس کو حالتِ رفع میں سمجھتے اور اس کو 'ذوالقوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں، لیکن لفظ 'متین' اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے قرآن میں کہیں اور نہیں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کا فاعل محذوف مانا جائے یعنی 'المتین قوتہ' اس طرح یہ اختلاف محض اعراب کا اختلاف ہوگا، معنی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔"

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ (۵۹)

قریش کو تنبیہ

'ذَنُوْب' بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہے۔ خالی ڈول کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ حصہ اور نصیب کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ ابوذؤیب کا ایک شعر ہے۔

لعمرك والمنايا غالبات　　لكل بني اب منها ذنوب

(تیری جان کی قسم، موت سے مفر نہیں، ہر باپ کے بیٹوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے)

آیت میں 'ذنوب' سے مراد زندگی کی وہ محدود مدت ہے جو ان کفار کے حصہ میں آئی ہے۔ 'لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد قریش کے وہی لیڈر ہیں جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے

ان کے پہلے ہم مشرکوں کو (اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف ہے) ایک مدت مہلت کی دی کہ اس کے اندر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر کے اپنا پیمانہ بھر لیں اسی طرح ان کو بھی ایک مہلت ہم نے عطا فرمائی ہے کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ بالآخر یہ مہلت تمام ہونی ہے اور وہ انجام ان کے سامنے آکے رہے گا جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے تو اس مہلت کو غیر محدود سمجھ کر اس عذاب کے لیے وہ جلدی نہ مچائیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (الکہف: ۵۸) (اور تیرا رب مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے، اگر وہ ان کے جرموں پر فوراً مواخذہ کرنے والا ہوتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک وعدے کا دن ہے جس سے وہ کہیں پناہ نہیں پائیں گے)۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۶۰)

'لِلَّذِينَ كَفَرُوا' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد کفار قریش ہی ہیں جو رسول کے انذار کو محض دھونس خیال کر کے اس کو زچ کرنے کے لیے، مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر اس طرح کا کوئی عذاب آنا ہے تو وہ آجائے، اس کو دیکھے بغیر ہم اس کو ماننے والے نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اس دن کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ وہ بڑا ہی کٹھن دن ہوگا۔ اس دن کے سبب سے ان کو جن ابدی ہلاکتوں سے سابقہ پیش آئے گا ان سے ان کو کوئی پناہ نہ دے سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۱۸ / اپریل ۱۹۷۶ء
۱۸ / ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ الزخرف ـ ۴۳

تفسیر سورۃ الدخان - ۴۴

تفسیر سورۃ الجاثیۃ - ۴۵

تفسیر سورۃ الاحقاف - ۴۶

تفسیر سورۃ محمد - ۴۷

تفسیر سورۃ الفتح - ۴۸

تفسیر سورۃ ق - ۵۰